آجکل

افسانہ نمبر



شراون شک سمت ۱۸۸۵
اگست ۱۹۶۳ء

ایک روپیہ



نوجوان بھوٹیہ عورتیں اپنے مخصوص لباس میں

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل
دہلی

افسانہ نمبر

سالانہ چندہ:۔ ہندوستان میں:۔ سات روپے
پاکستان میں:۔ سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے:۔ ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ:۔ ہندوستان میں:۔ ۶۰ نئے پیسے
پاکستان میں:۔ ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے:۔ ا شلنگ یا ۶ پنس

مرتبہ وشائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند،

ترتیب

سرورق:۔ زندگی عمل: جیون اڈلجا
رسالے کی پشت پر:۔ یوم آزادی کے موقع پر دلّی کے لال قلعہ پر قومی جھنڈا لہرانے کے بعد وزیر اعظم پنڈت نہرو عوام سے خطاب کر رہے ہیں۔

جلد ۲۲ - نمبر ا
شراون شک سمت ۱۸۸۵
اگست ۱۹۶۳ء

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

جنوبی افریقہ کی نسلی تفریق کی پالیسی روز بروز سخت ہوتی جارہی ہے۔ حکومت نے وہاں جو قوانین جاری کئے ہیں وہ نہ صرف مقامی آبادی کے لئے بلکہ پوری انسانیت کے لئے چیلنج ہیں۔ اس کے جواب میں پچھلے دنوں ۳۲۔ افریقی ملکوں نے سلامتی کونسل سے کہا کہ جنوبی افریقہ کی اس پالیسی سے امن عالم کو خطرہ پیدا ہوگیا ہے، اس کا تدارک کیا جائے اور یہ تجویز بھی کی گئی ہے کہ اُسے اقوامِ متحدہ سے نکال دیا جائے۔ ہندوستان کی حکومت بھی اس نسلی تفریق کے خلاف برابر جد و جہد کررہی ہے۔ جنوبی افریقہ سے اس کے سیاسی اور تجارتی تعلقات پہلے ہی منقطع ہوگئے تھے اب جنوبی افریقہ کے سمندری اور بحری جہازوں کے ہندوستان کے بندرگاہوں اور ہوائی اڈّوں پر اُترنے اور وہاں سے گزرنے کی ممانعت کردی گئی ہے۔

روس نے ایک خاتون ویلنٹینا ترشکووا کو خلاء میں بھیج کر خلائی سفر کا ایک اور کارنامہ انجام دیا ہے۔ روس نے ۱۹۵۷ء میں سب سے پہلے مصنوعی سیّارہ خلاء میں بھیجا تھا اور یوری گگارین پہلے خلائی مسافر تھے روس کے اس حالیہ کارنامے سے بلاشبہ اس کی ساکھ بڑھ گئی ہے اور اس کے لئے وہ قابلِ مبارک باد ہے۔ روس کا یہ تجربہ کامیاب رہا ہے کہ عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش خلائی سفر میں کامیاب ہوسکتی ہیں۔ خلائی سفر کی اس تیز رفتار ترقّی کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب ہر شخص خلائی پرواز میں حصّہ لے سکے گا۔

۲۴۔ جون کو ہندوستان میں نیشنل ٹیلیکس سروس کا افتتاح ہوا۔ یہ رسل و رسائل کی ترقّی میں ہماری نمایاں کامیابی کی دلیل ہے۔ اس سروس کے ذریعہ ٹائپ شدہ پیغام کسی تاخیر کے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ ملک میں اور بیرونِ ملک جاسکتا ہے۔ فی الحال یہ سہولت چار بڑے شہروں یعنی دلّی، بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں حاصل ہوگی۔ امید ہے کہ جلد یہ سروس دوسرے مقامات پر بھی جاری کردی جائے گی۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس سروس میں درکار سارا ساز و سامان ہندوستان میں ہی تیار کیا گیا ہے۔

حال ہی میں جنوبی ہند کے کہنہ مشق شاعر حضرت ذائق بنگلوری کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم نے اس علاقے میں شعر و ادب کی ترقی میں نمایاں حصّہ لیا۔ بہت سے شاعر آپ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہیں۔ آپ کا انتقال ادبی دنیا کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

افسانہ نمبر قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ اس شمارے میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کے افسانے شائع کئے گئے ہیں اور ہر زبان کے افسانوی ادب کے بارے میں ایک مختصر تعارفی نوٹ بھی شامل ہے۔ آج کے اردو افسانے سے متعلق ایک مفصل مضمون شاملِ اشاعت ہے جس میں جدید افسانے کا بخوبی جائزہ لیا گیا ہے امید ہے کہ ہماری یہ سعی مشکور ہوگی اور یہ شمارہ قارئین کرام کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ درخواست ہے کہ اس کے باب میں اپنی قیمتی رائے سے مطلع فرمائیں۔

(آسامی افسانہ)

روما داس

کھوٹا روپیہ

آسامی ادب میں مختصر افسانہ ہی ایک ایسی مخصوص صنف ہے جو مغربی ادب کے زیر اثر پیدا ہوئی۔ اگرچہ آسامی زبان میں کہانیاں، داستانیں اور لطیفے قدیم زمانے سے موجود تھے مگر پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں ہی جدید افسانے کی ابتدا ہوئی اور اس کی ترقی میں غیر ملکی افسانہ نویس مثلاً چیخوف، موپاساں، سامرسٹ مام اور دیگر استادانِ فن کی تخلیقات نے اہم پارٹ ادا کیا۔

جدید افسانہ کی خصوصیت ہے حقیقت پسندی اور زندگی کی تنقید۔ لکشمی ناتھ بیزبروا پہلے افسانہ نگار تھے، جنھوں نے مختصر افسانہ کو نئے مقاصد اور جدید تقاضوں سے روشناس کرایا۔ انھوں نے اپنے وسیع مشاہدے اور تجربے کی بناء پر افسانہ کے مواد اور ہیئت کے معاملے میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔

دوسری جنگِ عظیم کے وقت آسامی افسانہ فرائیڈ کے خیالات سے متاثر ہو چکا تھا، اور اس دور کے افسانوں میں جنسیات کا عنصر غالب رہا۔ ہاں جنگ کے بعد اس کا رویّہ بدلا اور اب افسانے میں متوسط درجے کے لوگوں کے مسائل اور کسانوں، مزدوروں کا ذکر ہونے لگا۔ آج کا افسانہ نئے سماجی اور معاشی حالات کا آئینہ دار ہے۔ سیّد عبدالمالک کو جدید افسانہ نگاروں کی صف میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کے علاوہ نوجوان فن کاروں میں تیریندر کمار بھٹاچاریہ، بھبیندر ناتھ سیکیا اور روما داس کے نام قابلِ ذکر ہیں، جنھوں نے جدید افسانہ کو رنگا رنگ موضوعات سے مالا مال کیا۔ مغرب کے آزاد اور حقیقت پسندانہ خیالات سے متاثر ہو کر انھوں نے زندگی کی بے لاگ تنقید کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔

شادی کے ٹھیک ساتویں دن کی بات ہے۔ میں آیا ہوں شیلانگ سے۔ ذمہ داریوں سے بھرپور، ڈاکٹری زندگی سے دو مہینے کی چھٹی لے کر۔ کرایہ پر ایک مکان لے کر ٹھہرا ہوا انتظار کر رہا ہوں کہ میری نئی نویلی دولھن، بوڑھی والدہ اور بہن بھی یہاں آجائیں اور اس طرح شادی شدہ زندگی کی پُرلطف شروعات ہو۔

ٹھیک دس بجے میں ڈاک خانے کے سامنے کھڑا ہوں۔ میرے ہاتھ میں ایک چٹھی ہے۔ جو لفافے میں بند ہے۔ صرف ایک ٹکٹ کی ضرورت ہے۔ ڈاک گھر میں ٹکٹ خریدنے والوں کی بہت بھیڑ ہو رہی ہے میرے پاس ہی لمبی داڑھی والا ایک سکھ ہے اور اس طرف ہے ایک حسینہ جو شاید کسی فرنگی کی بیوی ہی ہو۔ جسم کا ہر ایک حصہ سونے کی طرح چمک رہا ہے۔ آنکھیں جذبات سے بھرپور ہیں۔۔۔۔

میں نے دیکھا وہ ایک روپیہ دے کر کچھ ٹکٹ اور لفافے طلب کرنے لگی۔ پھر اس نے انھیں لے کر پاس ہی کھڑے ہو کر ایک ایک کر کے چٹھیوں پر لگایا اور پتے لکھنے شروع کر دئے۔

میں برابر اس کو دیکھتا رہا۔ اتنے میں اس ٹکٹ بیچنے والے آدمی نے اس عورت کا دیا ہوا روپیہ صندوق میں ڈالا اور دیکھتے ہی چلا اُٹھا "میم صاحب آپ کا دیا ہوا یہ روپیہ کھوٹا ہے۔ یہ نہیں چلے گا۔"

"کھوٹا؟"

"جی ہاں کھوٹا۔ یہ نہیں چلے گا۔"

نوجوان عورت کی آنکھوں میں شرم اور لاچاری کی تصویر اُبھر آئی اس نے کہا۔ "تب میں کیا کروں میرے پاس اور پیسہ نہیں ہے۔ جو ٹکٹ اور لفافے خریدے تھے وہ سب استعمال ہو چکے ہیں۔"

ایک نازک مسئلہ درپیش تھا۔ موقع دیکھ کر لوگ دل لگی کرنے کو تیار ہو گئے۔ نڈر ہو کر میں آگے بڑھا اور نوجوان عورت کے پاس کھڑے ہو کر میں نے بڑے ادب سے انگریزی میں کہا — "میں آپ کی پریشانی بخوبی سمجھ رہا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک بات کہوں۔"

"ہاں ہاں کہیئے۔"

"اگرچہ آپ کا روپیہ لوٹا دیا گیا ہے پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ شاید یہ کھوٹا نہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ میں اسے کسی طرح چلا ہی لوں گا۔ اس لئے میں اپنے پاس سے ایک روپیہ اس کو دے دیتا ہوں اور اس کے بدلے میں آپ کا روپیہ خود رکھ لیتا ہوں۔"

"سمجھ گئی۔ آپ میری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میں ایک ایسی اُلجھن میں پڑی ہوئی ہوں کہ آپ کی اس مہربانی سے منھ موڑنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔"

میں نے کسی کمزوری کا اظہار نہیں کیا، روپیہ بدل کر نوجوان عورت کے ہاتھ سے چٹھیاں لیں اور اس کے ہی پاس کھڑے ہو کر پہلے میں نے اپنی چٹھی پر پتہ لکھا اور اس کے خطوط کے ساتھ اپنا خط بھی لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ قدم ملاتے ہوئے میں سیڑھیوں کے راستے پر آیا کہ اتنے میں اس نے مجھے دیکھ کر ہنستے ہوئے انگریزی میں پوچھا۔ "شاید آپ آسامی لوگ ہیں۔"

میں انگریزی پوشاک ہی پہنتا تھا۔ جو بات چیت ہوئی تھی وہ بھی خالص انگریزی میں۔ اس لئے اس سوال سے تھوڑا سا شک پیدا ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ "آپ کیوں یہ سوال کر رہی ہیں؟"

"اس لئے کہ میں بھی آسامی ہوں۔ شاید آپ نے مجھے دیکھ کر، میری پوشاک اور فیشن دیکھ کر کچھ شک نہیں کیا ہوگا۔ میں ناگاؤں کی کرسٹان لڑکی ہوں۔ میرا نام منی اینڈروز بابرا ہے۔ میری ایک بہن رہتی ہے مدراس میں۔ میں اس کے ساتھ رہ کر وہاں کے کانوینٹ میں پڑھتی تھی۔ میری دوسری بہن یہاں کانوینٹ میں رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اب میں ہوں۔"

"آپ کیا کرتی ہیں، بتلائیں گی کیا!"

"پچھلے سال میں نے مدراس سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ اب میں معلّمہ کی نوکری کی تلاش میں ہوں، اگر مل جائے۔"

میں اس کی بات پر غور ہی کر رہا تھا کہ اتنے میں اس نے پھر کہا۔ "میں آپ کو اور ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔ ابھی ابھی آپ نے جس کے نام خط پوسٹ کیا ہے۔ اس لتیکا بروا کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ بچپن میں ناگاؤں میں ہم ایک ساتھ پڑھتے تھے اور ہم دونوں میں کافی دوستی تھی۔ مجھے خبر ملی ہے کہ لتیکا کی شادی ڈبروگڑھ کے ایک لنڈن سے لوٹے ہوئے صاحب سے ہوئی ہے۔ آپ شاید لتیکا کے کوئی رشتہ دار ہیں۔"

نہ معلوم کیوں میں اصلیت ظاہر نہ کر سکا۔ کہا — "جی ہاں میرا نام مسٹر چلیہا ہے۔ میں آپ کی ساتھی لتیکا کا ایک بہت نزدیکی رشتہ دار ہوں۔ ان لوگوں کے لئے ایک مکان کا انتظام کرنے کے لئے شیلانگ تک آیا تھا۔ یہ سن کر آپ کو مسرت ہوگی کہ لتیکا اور اس کے شوہر دونوں ہنی مون منانے کے لئے شیلانگ آنے کی تیاری میں ہیں۔"

"سچ، اس کو میری بات کہہ دیجئے گا۔ میری یاد آتے ہی وہ بہت خوش ہوگی۔ وہ مجھے کتنا پیار کرتی تھی۔"

مِنی اینڈروز کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اِدھر اُدھر گھوم کر جب میں اپنے گھر پہنچا تو نہ معلوم کیوں میرا دل بوجھل ہو گیا۔ میں نے سوچا۔ زندگی کی بعض حقیقتیں یوں بے وقت ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ تھوڑا آگے یا تھوڑا پیچھے کیوں نہیں ظاہر ہوتیں۔

دن گزرنے لگے۔

ہر صبح لتیکا کے لئے جو مکان میں نے طے کیا، اس کو دیکھنے کے لئے مِنی آتی ہے۔ ہم دونوں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر دھوپ میں چائے پیتے ہیں۔ مِنی میری چائے کی پیالی میں چائے انڈیل دیتی ہے۔ اس کے بعد ہم دونوں پہاڑ پر چڑھنے جاتے ہیں۔ مِنی جوتے اُتار کر ننگے پاؤں چھوٹی بچی کی طرح پانی میں کھیلنے لگتی ہے اور میرے اوپر پانی پھینکنے لگ جاتی ہے۔ پانی کے نزدیک ہی جو گھاس کا تختہ ہے اس پر ننگے پیر چل کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔

اور ایک ہفتہ گزر جاتا ہے۔ مِنی اینڈروز آہستہ آہستہ بیقرار ہو جاتی ہے۔ وہ کہتی ہے۔" لتیکا کے لئے مکان کا بندوبست تو ہو گیا۔ آپ کیوں اسے بلاتے نہیں؟"

جواب میں میں کیا کہوں مجھے کچھ بھی نہیں سوجھتا۔ تو بھی ایک دن ہمت کر کے میں نے کہا " لتیکا نے لکھا ہے کہ ابھی وہ شیلانگ نہیں آئے گی۔"

" کیوں؟"

لتیکا کے خاوند کی زندگی اچانک ایک آفت میں گرفتار ہو گئی ہے۔ شادی کے ٹھیک ایک مہینے کے اندر ہی وہ ایک دوسری عورت سے محبت کرنے لگا۔ بالکل ناجائز بات ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ اس بات کو وہ خود بھی تسلیم کرتا ہے مگر لاچار ہے۔ شادی سے پہلے اس کا چال چلن بہت اچھا تھا۔ شادی کے بعد بھی اس نے لتیکا سے کوئی بے انصافی نہیں کی، پھر بھی اب اس کے لئے اس عورت کو چھوڑنا مشکل ہو گیا ہے۔"

" تو وہ لتیکا کو چھوڑنا چاہتا ہے۔"

" نہیں پہلے کی طرح وہ لتیکا کو پیار کرتا ہے۔ اس لئے وہ اس کا کوئی حل نکالنا چاہتا ہے۔ دو راستوں کے درمیان میں ایک سیدھا راستہ۔"

"تو اس میں سوچنے کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ محبت اور شادی کے معاملے بالکل الگ الگ چیزیں ہیں اور وہ ہمیشہ الگ ہی رہنی چاہئیں۔ بیوی کا، وفادار ہو کر بھی دنیا میں کسی اور سے پیار کرنا ممکن ہے۔"

" تم نے ایک ناممکن بات کہی ہے مِنی۔ شاید تم جانتی ہی ہو گی کہ بیوی عام طور پر تنگ دل ہوتی ہے۔ کسی دوسری عورت کی بات ہو تو درکنار وہ اپنے شوہر کا کسی دوست کی طرف بھی متوجہ ہونا برداشت نہیں کر سکتی۔"

" شاید آپ پُرانے زمانے کی عورتوں کی باتیں کر رہے ہیں۔ پڑھی لکھی ترقی پسند عورتیں کبھی بھی جلن یا نفرت نہیں کرتیں۔ آپ امتحان لے کر کیوں نہیں دیکھتے۔"

میں نے مِنی کو بہت سمجھایا اور کہا — " مِنی دنیا میں بہت سے لوگوں نے اس سے پہلے بھی اس مسئلے کا حل نکالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے تو تم پھر اس کا امتحان لینا کیوں چاہتی ہو۔"

لیکن مِنی نے نہیں مانا۔ اس لئے اپنے پہلے فیصلے کے مطابق میں اپنی بیوی لتیکا، ماں اور بہن کو بلانے پر مجبور ہو گیا۔ میری اور اِلا دونوں کی حالت راستے میں خراب ہو گئی تھی۔ اس لئے آتے ہی ہم بستر پر دراز ہو گئے۔ صرف لتیکا مکان کی ہر ایک چیز کو ٹوہ رہی تھی۔ اتنے میں لتیکا یکایک مِنی اینڈروز کی تصویر دیکھ کر بے چین ہو اُٹھی۔

" یہ مِنی نہیں ہے کیا؟ آپ کو میری سہیلی کی یہ تصویر کہاں سے مِلی؟"

اس کی حیرانی کو دُور کرنے کے لئے میں نے کہا۔ "ہاں تمہاری دوست مِنی کی ہی تو ہے۔ وہ ابھی تک یہاں ٹھہری ہوئی ہے۔" یہ سن کر سچ مچ لتیکا خوشی سے ناچ اُٹھی۔ اسی وقت طوفان کی طرح مِنی اینڈروز کمرے میں داخل ہوئی اور لتیکا سے لپٹ گئی۔ بہت دیر تک دونوں باتیں کرتی رہیں۔ اتنے میں مِنی مجھ سے کچھ کہنے کے لئے مجھے مخاطب کر کے چلّائی — "مسٹر چلیہا!"

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

پربودھ کمار سانیال

(بنگلہ افسانہ)

ترنگ

بنگلہ ادب سنسکرت کے علاوہ فارسی اور اردو سے بھی خاصا متاثر ہوا ہے، خاص کر اس کا افسانوی ادب فارسی اور اردو کے خزانہ سے بہت فیض یاب ہوا ہے۔ ابتدائی دور میں بنگالی افسانہ نگاروں نے الف لیلیٰ کے قصوں اور دیگر رومانی داستانوں کا زبردست تاثر قبول کیا اور انہی داستانوں کی بنیاد پر بہت سی کہانیاں لکھی گئیں۔ جدید بنگالی افسانہ بھی ان تاثرات سے خالی نہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور، پرشورام، بن پھول، کیدار ناتھ بندو پادھیائے جیسے عظیم افسانہ نگاروں کی تخلیقات ان اثرات کی نشان دہی کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ آج کے بنگالی افسانے میں دو زبردست رجحانات پائے جاتے ہیں ایک تو ہے غیر معمولی حقیقت پسندی اور دوسرے مایوسی اور قنوطیت۔ اول الذکر رجحان زیادہ طاقت ور ہے۔ اس کے تحت افسانہ نگار بڑے دل چسپ انداز میں بنگال کی عام زندگی اور سماجی حالات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ بھوتی بھوشن بندو پادھیائے، سیلا جنند امکرجی، پریمیندر امترا، سبودھ گھوش اور پربودھ کمار سانیال اس رجحان کے حامل ہیں۔ جہاں تک دوسرے رجحان کا تعلق ہے، یہ ابھی تجربہ کی منزل سے گزر رہا ہے۔ ان لوگوں نے درد و غم کے گیت گائے ہیں اور وہ بھی ایسا غم جو لامتناہی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جدید افسانہ نگاروں نے بہت سی چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھیں، مگر ان میں ابھی پختگی نہیں آئی۔

اتنی رات کو ٹرین بدلنا بھی ایک مصیبت ہے۔ ایک بڑا بکس، دو سوٹ کیس، پہاڑ جیسا بستر، دو لالٹین، ٹفن کیریر، صراحی، دودھ کی بوتل۔ کیا نہیں ہے سوتے ہوئے تین بچوں کو اُتارنا، اس پر کارتک کی ٹھنڈک، گھر سے دور پچھم میں آب و ہوا بدلنے کے لئے آنے میں سچ مچ بڑی دقت ہے!

"ٹھہرو بہادری رہنے دو، پہلے گاڑی تو رکے۔ اری میّا باہر تو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ایک تو رات، اس پر اتنا کُہرا۔ روشنی بھی تو نہیں دکھائی دیتی باندھ ڈالو بستر کسی طرح کیوں جی قلی تو مل جائیں گے"۔ کپڑوں کو سنبھالتے ہوئے شیل بالا نے شوہر کی طرف دیکھا۔

بھوپتی نے کہا۔ "آب و ہوا کے اثر سے تمہارا جسم تو بہت توانا ہو گیا ہے۔ بچاؤ نہ قلی کا خرچ۔"

شیل بالا ہنستے ہوئے بولی۔ "تمہارا پانچ من سامان کیا مجھ سے اُٹھے گا؟"

"کیا ہرج ہے۔" بھوپتی نے کہا۔ "بنگال کی لڑکی پچھم میں جا کر مرد بن جاتی ہے۔ تم سے اتنا بھی نہ ہو گا۔ اچھا میں مدد کر دوں گا کچھ۔"

"تم۔" شیل بالا بولی۔ "تمھیں تو بخار ہے نا؟ ریپر اچھی طرح اوڑھ لو۔ منٹو کا ہاتھ پکڑ لو، بیتو خود اُتر جائے گی انجو کو مجھے دو۔ اوہ پہلے گاڑی رک جائے، دقت کیا ہے؟"

"بارہ بج رہے ہیں۔"

"ہم لوگوں کو دوسری گاڑی کب ملے گی؟"

"قریب اڑھائی بجے۔"

شیل بالا نے کہا۔ "بابا بڑا ڈر لگتا ہے۔ بخار میں اگر ٹھنڈ لگ گئی تو کیا ہوگا۔ وہاں ویٹنگ روم تو ہوگا۔"

بھوپتی نے کہا۔ "دیوی تم ہو گئی ہو پتی بھگتی میں اندھی۔ کوئی اسٹیشن دیکھا ہے بغیر ویٹنگ روم کے؟"

جھٹکے کے ساتھ گاڑی اسٹیشن پر رکی۔ اتنی رات ہونے پر بھی مسافر قلی یا پھیری والے کسی کی کمی نہیں۔ گاڑی رکتے ہی تین چار قلی دروازے پر آ گئے۔

شیل بالا نے بھوپتی کے گلے اور دونوں کانوں کو مفلر سے باندھا تب اسے نیچے اترنے کا حکم دیا۔

بڑی زبردست عورت ہے۔ ایک بچے کو گود میں لیا دوسرے کا ہاتھ پکڑا ایک آنکھ خاوند پہ رکھی دوسری سامان کی تعداد پر۔ پھر لوگوں کی پرواہ نہ کر کے شور و غل مچاتی ہوئی وہ ٹرین سے نیچے اتری۔ بڑی لڑکی وینو کا ہاتھ پکڑ کر بھوپتی بھی اترا۔ دو قلیوں نے سامان اٹھایا۔

قریب ڈھائی گھنٹہ وقت کاٹنا ہوگا۔ اتنا وقت گزارنے کے لئے اچھی سی جگہ چاہیئے۔

شیل بالا بولی "میں عورتوں کے ویٹنگ روم میں نہیں جاؤں گی۔ پھر تمھاری دیکھ بھال کون کرے گا۔ چلو مردانے ویٹنگ روم میں۔ پہلے تینوں بچوں کے سلانے کا انتظام کر دوں۔ سخت ٹھنڈ ہے چلو چلو، اے قلی ادھر آؤ۔ کیوں جی کہاں ہو تم؟"

بھوپتی بولا — "یہیں تو ہوں۔ بڑی جلدبازی کرتی ہو۔ ذرا بھی صبر نہیں کر سکتیں۔"

"صبر کیسے کروں؟ کیا تم بیمار نہیں ہو؟ اچھے بھلے گھر پہنچ جائیں تو جان بچے۔ اے قلی ادھر لاؤ سامان۔"

پھر آہستہ سے شیل بالا بولی۔ "ارے دیکھو تو کون ہے یہ آدمی تب سے گھوم رہا ہے میرے آس پاس۔"

بھوپتی نے دیکھ کر کہا۔ "کچھ نہیں۔ اتنا گہنا اور ایسا روپ۔ اس کا کیا قصور، اگر گھومتا بھی ہو تمھارے آس پاس۔"

شیل بالا بولی — "کیا طریقہ ہے تمھارا بات کرنے کا! رات میں ڈر لگتا ہے۔ تبھی کہا تم سے۔"

"تمھیں دیکھ کر تو ڈاکو بھی ڈر سے بھاگ جائیں۔"

"کیوں"

"سونے کی چوٹ ہی بے چارے نہ برداشت کر سکیں گے۔"

ویٹنگ روم میں قلیوں نے سامان اتارا۔ بھوپتی نے قلیوں سے ڈھائی بجے کی کلکتہ جانے والی ایکسپریس پر چڑھا کر پیسہ لینے کو کہا۔ وہ راضی ہو کر چلے گئے۔ پھر شیل بالا نے بستر بچھا کر بچوں اور شوہر کے بیچ اس فرش پر ایک چھوٹی سی جگہ اپنے لئے بھی بنالی۔

بھوپتی نے کہا — "میں سو لوں تھوڑا سا۔"

شیل بالا نے کہا۔ "پہلے دودھ تو پی لو، ابھی گرم کئے دیتی ہوں۔"

"اور تم"

"میں جاگتی رہوں گی۔ دو دن کا حساب لکھنا باقی ہے۔ وقت ہی کتنا ہے؟"

"ہے پرمیشور۔"

شیل بالا نے اسٹوو نکالا۔ اس وقت شیل بالا کی نگاہ دروازے کی طرف گئی۔ بہت رات ہونے پر بھی اسٹیشن بالکل سنسان نہیں تھا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ کبھی پھیری والوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ کبھی شنٹنگ کرتے ہوئے انجنوں کی بھپکار۔ جالی دار دروازے میں سے باہر دیکھ کر ہی وہ ڈر گئی۔ دبی اور ڈری ہوئی آواز میں اس نے کہا۔ "سنتے ہو جی، ذرا اٹھو تو۔"

بھوپتی نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا — "کیوں کیا ہے؟"

"وہی آدمی — ایک بار جاؤ تو باہر۔ وہی آدمی ہے، وہی جو گھوم رہا تھا بہت دیر سے۔" یہ کہہ کر شیل بالا نے گہنوں کو کپڑوں کے نیچے چھپا لیا اور اسٹوو چھوڑ کر ایک کونے میں کھڑی ہو گئی۔ اس نے ٹرین میں ہونے والی ڈکیتی کی خبر پڑھی تھی جس کی یاد ابھی تک باقی تھی۔ بھوپتی اٹھا اور دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

شیل کی بات ٹھیک تھی۔ روشنی اور اندھیرے کے درمیان ٹوپی پہنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ وہ بھوپتی کی طرف بڑھا۔

بھوپتی نے کہا۔ "کیا چاہتے ہیں آپ؟"

سر پر ٹوپی ہوتے ہوئے بھی پوشاک بنگالی تھی۔ نوجوان نے ہنس کر کہا۔ "کچھ نہیں چاہئے لیکن دیکھ رہا ہوں آپ لوگوں کو بڑی دیر سے۔"

"آخر کیوں؟ آپ کون ہیں؟"

"کیا پہچان پائیں گے مجھے؟ میرا نام نرنجن چیٹرجی ہے۔ نہیں پہچان پائے نا آپ!"

بھوپتی نے تسلیم کیا کہ نوجوان اُن کے لئے اجنبی ہے۔ پھر بولا "کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟"

نرنجن بولا "معاف کیجئے آپ کو تو تھوڑا جانتا ہوں، پر آپ کی بیوی کو بہت جانتا ہوں۔"

"میری بیوی کو، یعنی جو میرے ساتھ ہیں یہاں۔"

"جی ہاں۔"

"عجیب بات ہے! آپ ہیں کون؟"

نرنجن ہنسا۔ "ان کا نام شیل بالا دیوی ہے، ایک بار بلائیے نہ اُنھیں۔"

بھوپتی نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ بولا۔ "مسئلہ پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ کیا آپ ان کے رشتہ دار ہیں؟"

"بہت کچھ۔"

"یعنی۔"

"یعنی شاستروں کے اعتبار سے نہیں، گاؤں کے تعلق سے۔"

بھوپتی نے کہا۔ "وہ تو گاؤں کی لڑکی نہیں ہیں۔"

نرنجن بڑے اطمینان سے بولا۔ "پہلے کلکتہ شہر کے ایک حصہ کا نام گوبند پور گاؤں تھا۔ ڈرنے کی کیا بات ہے، بلائیے نہ انھیں ایک بار، میں چور ڈاکو نہیں ہوں۔"

بھوپتی ہنس کر بولا۔ "اس سے میرا ڈر تو کم نہیں ہوا۔" یہ کہہ کر اس نے دو قدم اندر جا کر پکارا۔ "ذرا ادھر آؤ۔"

شیل بالا کچھ نہیں سمجھی۔ اس نے اشارے سے کہا۔ "مجھے کیوں بلاتے ہو، میں نہیں آتی۔"

"ارے آؤ آؤ۔ یہ ایک بے خطر آدمی معلوم پڑتے ہیں۔ گاؤں کا رشتہ کیا ہے، ابھی تک نہیں سمجھ پایا۔ لیکن امید ہے کہ وہ خطرے کا نہیں ہے۔"

نرنجن نے کہا۔ "شبہ کی ضرورت نہیں۔ میں ہی اندر آتا ہوں۔" اندر آکر نرنجن نے ٹوپی اتار دی۔ کمرے کی روشنی میں اسے دیکھ کر ہنستے ہوئے شیل بالا نے کہا "ارے تم!"

نرنجن نے پوچھا۔ "بتاؤ تو میں کون ہوں؟"

"تم تو ہم لوگوں کے وہی شری کانت ہو۔"

بھوپتی نے حیرانی سے کہا۔ "شری کانت؟"

"ہاں، پر اصل نام ہے نرنجن۔ بچپن میں بڑا سیدھا سادا تھا ہم اس لئے کہتے تھے شری کانت۔ تم ادھر کہاں آئے تھے۔" یہ کہہ کر شیل بالا اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

"اب تو تم پہچانے بھی نہیں جاتے۔ پہلے کتنے دبلے پتلے تھے اور اب کیسے لمبے چوڑے ہو گئے ہو۔ رنگ بھی صاف ہو گیا ہے۔ یہ سب کیسے ہوا؟"

نرنجن نے کہا۔ "شری کانت کہہ کر پکارو گی تو کچھ نہیں بتاؤں گا۔" اس پر وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے زور سے ہنسے۔

شیل بالا نے ہی پھر بات چیت شروع کی۔ بولی "ارے تم شاید نہیں پہچان پاؤ گے۔ ہماری شادی کی رات تم نے اسے دیکھا تھا۔ آج گیارہ سال ہو گئے ہیں اس بات کو۔ ہم لوگوں کی منّی موسی کا لڑکا ہے۔ ہمارے کرایہ دار تھے یہ لوگ۔ منّی موسی آج کل کہاں ہیں؟"

نرنجن نے کہا۔ "چچا کے یہاں لکھنؤ میں۔"

"تمھاری بہن کہاں ہے! انیما کی شادی ہو گئی۔"

"ہاں وہ سب سسرال ہیں۔"

"شادی کی تم نے نرنجن؟"

"کی ہے۔"

"کہاں ہے بہو۔ کتنے بال بچے ہیں؟"

"ہاں ایک لڑکا ہے۔ یہ پاس کے کمرے میں ہے۔"

شیل بالا خوش ہو کر بولی۔" پاس کے کمرے میں، ٹھہرو میں خود دیکھنے جاؤں گی۔ بھئی ہم لوگ آئے تھے پچھم میں گھومنے پھرنے۔ اب لوٹ رہے ہیں۔ یہاں گاڑی بدلنی ہے۔ ان کی صحت ٹھیک نہیں رہتی ورنہ کچھ اور ٹھہرتے۔"

بھوپتی اب آرام کرسی پر اطمینان سے لیٹ گئے۔

نرنجن نے کہا۔" اب آپ کا نام یاد آ گیا۔ بھوپتی مکھوپادھیائے۔ شادی کے وقت میں وہیں تھا۔ براتیوں کو کھانا بھی میں نے کھلایا تھا۔"

بھوپتی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "گاؤں کے رشتے میں جو میری بیوی کے بھائی ہوتے ہیں، ان کا بہت بہت شکریہ۔"

شیل بالا بولی۔" آخری بات بتلاتے ہوئے شاید شرم آ رہی ہے، نرنجن میری بدائی کے وقت کتنا رو رہا تھا۔ کوئی بھی چپ نہ کرا پاتا تھا۔ میرا آنچل ہی نہ چھوڑتا تھا۔ کہتا تھا۔ میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔ تب میں نے اسے ایک انگوٹھی دی تھی۔ کہو یاد آیا وہ پاگل پن۔"

نرنجن نے کہا۔"سسرال جا کر تم نے بھی چھٹی نہیں لکھی۔ بات ختم ہو گئی۔ ہم لوگ بھی مکان چھوڑ کر چلے گئے۔"

بھوپتی نے ہنس کر کہا۔ "میرا بھی خطرہ دور ہوا۔"

شیل بالا ہنس کر بولی۔ " بھئی ٹھہرو، ان کو تھوڑا دودھ گرم کر کے دے دوں۔ پھر چلتی ہوں تمھاری بہو کو دیکھنے۔" یہ کہہ کر وہ اسٹوو جلانے بیٹھی۔ بوتل کا دودھ کٹورے میں ڈال کر اسے اسٹوو پر رکھ کر پوچھا۔ " تمھارا لڑکا کتنا بڑا ہے؟"

"سال بھر کا۔"

"بہت خوبصورت ہے۔"

نرنجن نے کہا۔ "سب دلھنیں خوب صورت ہوتی ہیں۔"

ارے بابا، سچ؟"

بیچ میں بھوپتی بول اٹھے "اپنا دیکھ کے نہیں سمجھتی۔"

شیل بالا نے کہا "ٹھہرو، تم بڑے بے حیا ہو۔ اچھا نرنجن، تمھاری بیوی تمھیں پیار کرتی ہے؟"

بھوپتی نے پھر کہا۔"بال بچہ ہونے کے بعد یہ سوال بے معنی ہے۔"

شیل بالا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمھاری بیوی سے ہی پوچھوں گی یہ بات۔"

بھوپتی نے پوچھا۔" کہاں تک جائیں گے نرنجن بابو۔"

"اسے بابو کہنے کی ضرورت نہیں۔ نام لے کر ہی پکارو۔ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے وہ نظارہ۔ وہ شیطان لڑکا سارا دن پتنگ اڑانے والا۔ ہمارے گھر میں گھس کر کھلونے توڑ دیتا۔ کتنا مارتا تھا ہم لوگوں کو۔ اس کے مارے اس کی بہنیں اپنے ڈبوں میں پیسہ نہیں رکھ سکتی تھیں۔ یاد آتی ہیں وہ سب باتیں؟"

ہنستے ہوئے نرنجن نے کہا۔ "نہیں۔"

"اچھا چلو اپنی بہو کے پاس۔ سب یاد کرا دوں گی۔ کیوں جی کیا بجا ہے۔"

نرنجن نے گھڑی دیکھ کر کہا۔" کوئی ایک بجا ہے۔ تمھاری گاڑی شاید ڈھائی بجے چھوٹتی ہے۔ میری لکھنؤ جانے والی گاڑی تین بجے جاتی ہے۔"

اسٹوو سے دودھ اتار کر شیل بالا نے خاوند کو ایک پیالہ بھر کے دیا۔ پھر اسٹوو بجھا کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔" بہو پاس کے کمرے میں ہے نا؟ دیکھو جی تم دودھ پی کر سو جاؤ۔ میں ٹھیک وقت پر آ کر جگاؤں گی۔"

بھوپتی نے کہا۔"یہاں کمرے میں بڑا آرام مل رہا ہے ساری رات بھی اگر نہ جگاؤ تو بھی مجھے کوئی تکلیف نہ ہو گی۔"

نرنجن نے کہا۔" اپنی بیوی سے تعارف کرا دوں۔ چلئے نا آپ بھی۔"

بھوپتی نے ہنس کر جواب دیا۔"اپنی بیوی سے میرا آداب کہئے اور گھر پر آنے کی دعوت آج رہنے دیجئے۔ بچے سو رہے ہیں۔ اکیلے رہ جائیں گے۔ کلکتہ جا کر ہی تعارف ہو گا۔"

شیل بالا نے پتی کو کمر تک ایک شال سے ڈھک دیا۔ پھر آہستہ سے کہا۔" میں جلدی ہی لوٹ آؤں گی۔" یہ کہہ کر نرنجن کے ساتھ وہ ویٹنگ روم سے باہر چلی گئی۔

کمرے کی اندر کی روشنی اور بات چیت دلآرام کی وجہ سے باہر کی حالت کا کسی کو خیال نہیں تھا۔ جاڑوں کی رات کے اندھیرے اور کہرے سے پلیٹ فارم پر دُور تک کچھ نہیں سجھائی دیتا تھا۔ سارا اسٹیشن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ روشنی اور اندھیرے میں یہ انجانی جگہ پُر اسرار معلوم ہو رہی تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے مگر ان کو پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ کہاں سے کون آتا تھا، کدھر جاتا تھا۔ سب مل کر کچھ خواب کی سی کیفیت لگتی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اس جھونکے سے شیل بالا کا دل جھوم اُٹھا اور طبیعت میں گُدگُدی پیدا ہوئی۔ وہ جیسے اپنے خول کو چھوڑ کر باہر نکل آئی۔

کچھ دُور جا کر شیل بالا نے کہا۔ "کھوشری کانت تم نے پاس کے کمرے میں کہا تھا نا؟ ہم لوگ اتنی دُور کیوں نکل آئے؟ کہاں ہے تمھاری بیوی؟"

اس کے ہنستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر نرنجن کا دل بھی خوشی سے بھر گیا۔ ٹھہر کر بولا "بُرا نہ ماننا شیل ایک بات کہوں۔ یہی سوچو ہم لوگ پہلے کی طرح ہیں۔"

شیل بالا نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"میں نے شادی نہیں کی۔" نرنجن نے کہا۔

تعجب سے شیل بالا نے اس کی طرف دیکھا۔ بولی "یہ کیسے اپنی بیوی دکھانے کو کہا تھا تم نے۔ یہ کیا سوچیں گے شادی نہیں کی تم نے۔"

"نہیں، تم تھوڑی دیر کے بعد چلی جانا، کیوں؟"

شیل بالا نے کہا۔ "یہ تو ٹھیک ہے، پر تم جھوٹ کیوں بولے اتنے دن بعد ملاقات ہونے پر بھی۔"

نرنجن نے بیچ میں ہی روک کر کہا۔ "شادی نہیں کی کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

"کیا کر رہے ہو آج کل؟"

"ابھی کچھ دنوں سے کلکتہ کے ایک کالج میں پڑھا رہا ہوں۔ اتنے دن بعد تمھیں دیکھ کر بڑا اچھا لگ رہا ہے۔"

"تبھی پہلے مجھے دھوکا دیا۔" ہنستے ہوئے شیل بالا نے پیچھے کی طرف دیکھا۔ پھر بولی "اگر یہ باہر نکل آئے؛ ذرا آگے چلو، کتنے شرارتی ہو تم۔"

نرنجن نے کہا۔ "شرارتی کیوں؟ اب میں تمھارے کھلونے نہیں توڑوں گا۔"

چلتے چلتے شیل بالا نے کہا۔ "ڈال دیا نا مصیبت میں مجھے، اگر انھیں پتہ چل جائے کہ تمھاری بیوی نہیں اور ہم دونوں یہاں گھومنے آئے ہیں تو کیا سوچیں گے؟"

"اچانک یہاں تم سے ملاقات ہو گئی۔ یہ کس نے سوچا تھا۔" نرنجن کہنے لگا۔ "گیارہ برس ہو گئے لیکن ایسا لگتا ہے کل کی بات ہے۔ انسان خواب دیکھتا ہے لیکن ہوتی ہے اس میں گزرے ہوئے زمانے کی کہانی۔"

"تم بڑے عجیب ہو، کیسے پہچانا مجھے اس بھیڑ میں، میں سوچ رہی تھی کہ کون ہے یہ آدمی، جو بار بار مجھے دیکھ رہا ہے۔ وہ آدمی تم ہو گے، کون جانتا تھا۔" شیل بالا نے کہا۔ "سچ، خواب ہی معلوم پڑتا ہے۔ بابا کتنے روئے تھے تم؟ میں بھی کم نہ روئی تھی۔ بچپن کی محبت رُلاتی ہے۔ اب ہم کہاں آ گئے ہیں سمجھ میں نہیں آتا۔ تمھارے چہرے کو دیکھ کر پہلے تو مجھے بڑا تعجب ہوا۔ بتاؤ تو کیا دیکھ رہے ہو؟"

نرنجن نے ہنس کر کہا۔ "دیکھ رہا ہوں تمھیں۔"

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تمھاری کجی آنکھوں کو، بالکل نہیں بدلی ہیں۔"

شیل بالا نے ہنس کر کہا۔ "تم تو پہلے کہتے تھے کہ یہ گندے پانی کے پوکھر ہیں۔"

"ہاں تمھارا چہرہ بھی پہلے جیسا ہے۔"

"چل پاگل، تین تین بچوں کی ماں ہو گئی ہوں، جانتے ہو، چلو ذرا ادھر چلیں۔"

نرنجن نے کہا۔ "ٹھوکر تو نہ لگے گی، اندھیرا ہے۔"

شیل بالا بولی۔ "ہونے دو۔ بڑا اچھا لگ رہا ہے اس ٹھنڈک میں جاتے ہوئے۔"

"اچھے ہو شادی نہ کر کے نرنجن۔ شادی ایک بڑا بندھن ہے۔

یہ گورکھ دھندا گھماتا ہی رہتا ہے۔ اپنے پیروں نہیں چل پاتے، دوسروں کے اشاروں پر ناچنا پڑتا ہے۔ اچھے ہو تم؟"

پلیٹ فارم کی حد پار کر کے وہ ڈھلوان جگہ سے اترنے لگے۔ نہ ان کے سامنے کوئی مشکل تھی اور نہ پیچھے کوئی بندھن، زمان و مکان کی قید انھیں اپنے جی کا وہم ہی لگا۔ اس پردے کو اٹھا کر انھوں نے دیکھا اپنی پچھلی زندگی کو جو حال تک نظر آ گئی۔ وہ اپنی موجودہ حالت کو بھول گئے۔ شیل بالا کی طبیعت میں کسی طرح کی جھجک یا وہم نہیں رہا۔ کیونکہ اس آدمی سے جسے وہ بہت پہلے سے جانتی ہے، خطرے کا امکان نہیں تھا۔ اس اندھیرے راستے میں وقت کی حدوں کو پار کر کے وہ اپنی معصوم فطری زندگی میں آ پہنچی — روایت اور اخلاق کی بندش سے دور۔

نرنجن نے کہا۔ "تمھارے پتی دیو بڑے اچھے لگے۔ بڑے ہنس مکھ ہیں۔ دوستوں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔"

شیل بالا بولی۔ "بڑے کمزور ہیں، ٹھیل ٹھال کر چلانا پڑتا ہے۔ رہنے دو پتی کی بات۔ بتاؤ تو یہ میٹھی خوشبو کس کی ہے شری کانت؟"

"دیکھتی نہیں ہو، دہی گیندے اور گلاب کے پھولوں کو۔ ہوشیاری سے آؤ۔ ریل کی لائن پڑی ہے۔"

شیل بالا نے اس کو بائیں ہاتھ سے پکڑا۔ بولی۔ "بڑا اچھا لگ رہا ہے۔ کیسا سکون ہے یہاں۔ اتنے دن میں ادھر بہت جگہ گھومی، لیکن سچ کہتی ہوں شری کانت: آج میرا دل کھل اٹھا ہے۔ جی چاہتا ہے بیٹھ جائیں یہیں نرم گھاس پر۔ اکہرا کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ کیسی رومانی کیفیت ہے ہوائیں۔"

پرسکون آواز میں نرنجن نے کہا۔ "یہاں کوئی نہیں ہے صرف آسمان، تارے اور ہم ہیں۔ کیسی پراسرار رات ہے۔"

شیل بالا نے کہا۔ "اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات ہے، ہمارا تمھارا ملنا۔ قسمت کے ہاتھوں مجبور تم آ گئے یہاں۔ کل سورج کی روشنی میں شاید اس بات پر میں اعتبار بھی نہ کر سکوں۔ چلو تھوڑی دور اور۔"

"اور آگے چلوگی اس گاؤں کی طرف؟"

"ہاں نے چلو۔ چلو، جدھر خوشی ہو۔"

"اگر لوٹنے میں دیر ہو جائے۔ اگر وہ ہمیں ڈھونڈیں۔"

شیل بالا نے کہا۔ "اس وقت لوٹنا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ یہ رات بڑی نشہ آور ہے مجھے اس نے موہ لیا ہے، چلو اور۔"

نرنجن نے کہا۔ "آج کی رات خوابوں کی رات ہے۔ کل کی صبح بھی عجیب ہوگی۔ اس وقت میری عمر پہچاننے کی نہیں تھی۔ آج بھی پہچاننے سے پہلے ہی تم چلی جاؤگی۔ گیارہ سال تک تمھیں نہیں دیکھا زندگی بھر نہیں دیکھتا تو بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ لیکن آج تمھیں پاکر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ آج ہم ماضی اور مستقبل کے دوراہے پر کھڑے ہیں۔"

ریلوے لائن کی حد کو چھوڑ کر وہ ایک نامعلوم راستہ پر اتر آئے۔ راستہ جانا پہچانا نہیں۔ اس کی ضرورت بھی نہیں۔ دونوں طرف ناگ پھنی کے جھاڑ۔ بیچ بیچ میں میدان اور میدان میں سنتری کی طرح کھڑی ہوئی پیڑوں کی قطاریں — دونوں دھیرے دھیرے چپ چاپ آگے بڑھنے لگے۔

کچھ دور جاکر نرنجن نے پکارا۔ "شیل۔"

شیل بالا نے اس کی کمر میں بایاں ہاتھ ڈال کر کہا۔ "واپس جانے کو مت کہو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

نرنجن نے اس کے کندھے پر دایاں ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آج تم دوسرے کی ہو۔ تو بھی مجھے ہچکچاہٹ نہیں اگر کہوں۔"

"کیا کہو نا۔"

"جو میں ان دنوں کہنا نہیں چاہتا تھا وہ اب منہ پر آ رہا ہے۔ کہتے ہوئے شرم تو آتی ہے۔ مگر اور کوئی چارا نہیں ہے۔"

شیل بالا نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "دیر ہو گئی ہے۔ پھر بھی اگر تم کہنا چاہو گے تو میں بھی دھیان سے سنوں گی، نرنجن۔"

نرنجن نے کہا۔ "خوشی کے مارے رونا آ رہا ہے۔ تمھارے بالوں کی خوشبو گیارہ سال کے فراق کی نشان دہی کرتی ہے۔ محبت کی بات کرنے کی اب عمر نہیں رہی۔ وہ آگ اب ٹھنڈی ہو گئی ہے۔

تمھاری زندگی بھی بدل چکی ہے ..... ہم اب بدل گئے ہیں ۔ صرف ماضی کے تصوّرات باقی ہیں ۔"

شیل بالا دھیمی آواز میں بولی ۔" بہت دیر ہو گئی ہے ۔ کسی دن نہ کہہ سکی ۔ کہا بھی نہ جا سکتا تھی ۔ آج انھیں بیتے دنوں کی یاد آ رہی ہے ۔ نرنجن جب میں نے اپنی طرف دیکھنا نہیں سیکھا تھا اور دوسروں کی طرف دیکھنے کی نگاہ نہیں کھُلی تھی ۔ انھیں دنوں کے بھولے من کے ساتھی ہو تم ۔ تم نے جاننے کی خواہش بھی نہیں کی تھی میں بھی جان نہیں پائی تھی ۔ اس کے بعد تو میری زندگی کا سب کچھ جل کر خاک ہو گیا ۔ آج تم کو دیکھ کر میری معصوم آتما پھر مل گئی ہے اس کا شور کبھی ختم نہیں ہوتا ۔ نرنجن آج تم روپ والے ہو ۔ ان دنوں کا گمرو لڑکا میرا پیارا ہے ۔ بڑا لطف ہے اس میں " یقین کرو گے اس بات پر ۔ "

نرنجن نے کہا ۔" ضرور ! اس لئے اب نئے سرے سے نہیں بتایا جا سکتا کہ تم میری کون ہو ۔ میں نہ تمھارا بھائی ہوں نہ رشتہ دار نہ شوہر ـــــ پھر بھی تمھارے ساتھ نہ جانے کیسا گہرا اٹوٹ رشتہ قائم ہو گیا ہے ۔"

منہ اُٹھا کر کانپتی ہوئی آواز میں شیل بالا نے کہا ۔" رُکنے نہیں دوں گی تمھیں ۔ کہو ۔ بولتے رہو اس اندھیرے میں ۔ کہتے رہو ۔ بس آج کی رات ۔ ان گیارہ سالوں میں ایک دن بھی تمھارا خیال نہیں آیا تھا ۔ پر آج اس وقت تمھارے سوا اور کچھ بھی میرے دل میں نہیں ۔ تمھیں دینے کو کچھ بھی نہیں ہے نرنجن ۔ کچھ لے جانے کا بھی ذریعہ نہیں ہے میرے پاس ــــ پھر بھی میرے دل میں موجیں اُٹھ رہی ہیں جیسے ایک باڑھ آیا چاہتی ہے ۔"

دونوں دھیرے دھیرے جا رہے ہیں سنسان رات میں ۔ انجانے گاؤں میں سے ہو کر ان کا راستہ ہے ۔ کھو جانے کی فکر نہیں ۔ لوٹنے کی جلدی بھی نہیں ۔ یہ جیسے ان کو پوری بربادی کی طرف لے جانے والا سفر ہے ۔

.. میٹھے میٹھے درد اور مدہوشی سے دونوں شل ہو گئے ہیں اور ان میں خاص قسم کی بیداری پیدا ہو گئی ہے ۔ ایک طرف بچّہ کے لئے محبّت ، شوہر کی عزّت ، فرض اور ذمہ داری ، ڈر ، خوف اور روایات اور دوسری طرف دل کے چھپے ہوئے گھاؤ ۔ ایک عجیب نشے میں وہ دونوں چور تھے ۔

" نرنجن ! " اس کے بال کھل گئے تھے ۔ شیل بالا کا جسم اتنا تھک گیا تھا کہ وہ راستہ میں ہی گر جانا چاہتی تھی ۔

منہ پھیر کر صاف آواز میں نرنجن نے کہا ۔" کیوں ؟ "

" الفاظ نہیں نکل رہے ہیں ۔ بتاؤ تو گلا کیوں رُندھا جا رہا ہے ۔"

" سمجھ میں نہیں آتا ۔ اچھا ، لو اب لوٹ چلیں ۔ وہ دیکھو اسٹیشن کی روشنی دکھائی دے رہی ہے ۔"

شیل بالا نے جیسے جاگ کر جذباتی انداز میں اس طرف دیکھا پھر سر کو ایک طرف جھکا کر رُندھے ہوئے گلے سے اس نے کہا ۔

" اگر کوئی تمھاری بُرائی کرے تو میرا قصور بتلانا ۔ کہنا میں ہی تمھیں پھسلا کر لائی تھی ۔"

نرنجن بولا ۔" چلنے میں تکلیف ہو رہی ہے ۔ چلو ابھی پہنچ جاتے ہیں ۔ یہ شاید کوئی دوسرا گاؤں ہے ۔"

شیل بالا نے کہا ۔" نرنجن کچھ دیر اور رہنے دو اپنے ساتھ ۔"

نرنجن نے پکارا " شیل بالا ۔"

" کیا ۔"

" کیا ہم نے بُرا کیا ۔"

" نہیں جانتی ۔"

" کیا یہ پاپ ہے ؟ "

شیل بالا نے کہا ۔" آج میں نے تمھیں اپنے بہت قریب پایا ۔ اگر میں تمھیں بہکا کر لائی ہوں ۔ تو مجھے معاف کرنا ۔"

نرنجن نے کہا ۔" میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ہم لوگوں میں وہ دو بچّہ بچّی ابھی بچے ہوئے ہیں ۔"

راستے کے گھماؤ کی وجہ سے وہ نہیں جان پائے تھے کہ اسٹیشن کے بالکل پاس آ گئے ہیں ۔ یکایک روشنی اور شور کے درمیان پہونچ کر وہ ہکّا بکّا رہ گئے ۔ تیز روشنی سے گھبرا کر شیل بالا

کا جی چاہا کہ وہ پھر سے نرنجن کا ہاتھ پکڑ کر اندھیرے میں بھاگ جائے۔ لیکن اب زیادہ وقت نہیں تھا۔ اس کی گھڑی میں نرنجن نے دیکھا کہ اڑھائی بجنے میں دیر نہیں ہے۔

"آنسو پونچھ ڈالو شیل! اپنا پتہ مجھے دینا۔ ہم اسٹیشن پر آگئے۔"

شیل بالا نے اپنے بال ٹھیک کئے۔ ہنستے ہوئے آنسوؤں کو بھی پونچھ ڈالا۔ آنچل کو ٹھیک کیا۔ بولی۔ "سوچا تھا زمین کے دوسرے سرے پر چلے گئے ہیں مگر ہم تو بیل کی طرح گھانی کے چاروں طرف گھوم رہے تھے۔"

نرنجن نے کہا۔ "جلدی کرو، تمہاری گاڑی کا وقت ہوگیا۔"

لیکن اس کہانی کا تتمہ باقی ہے۔ نرنجن نہیں جانتا تھا، جیسے ہی وہ ویٹنگ روم کے پاس آئے پیچھے سے ایک عورت دوڑ کر ملنے گلے سے چلا اٹھی۔ "ارے تم کہاں تھے اب تک! میں کب سے تمہیں ڈھونڈھ رہی ہوں۔ یہ کون ہے تمہارے ساتھ۔"

شیل بالا چونک کر کھڑی ہوگئی۔ نرنجن بھی ہکا بکا رہ گیا۔

وہ عورت پاس آکر کھڑی ہوگئی اور بولی "میں نے تمہیں نہیں پہچانا۔"

"ان کو! ان کو نہیں پہچان پاؤ گی۔ یہ میرے دوست کی بیوی ہیں۔ ٹھہرو تھوڑا، میں ابھی انہیں ان کے شوہر کے پاس پہنچا دیتا ہوں۔ آپ آیئے بھابی!"

دو گھنٹے پہلے شیل بالا کو نرنجن کی بیوی کو دیکھنے کا جو اصرار تھا اب اس کے لئے اسے کوئی کشش نہیں رہی۔ بات تک نہ کی اس سے شیل بالا نے، اس کا منھ ایک دم لال ہوگیا۔ اپنے دل میں اس نے ایک عجیب طرح کی جھنجھلاہٹ محسوس کی۔ وہ اپنی جھنجھلاہٹ کو دباتے ہوئے بولی "تب کیوں نہیں کہا تھا کہ شادی کرلی ہے۔"

نرنجن نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔ "کچھ لمحوں کے لئے ہی سہی، بچپن کو پھر سے پا سکنے کے لالچ میں۔"

"سب مرد ایک طرح کے ہوتے ہیں۔ رہنے دو میرے ساتھ آنے کی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر ایک بار اپنے منہ کو آنچل سے پونچھ کر شیل بالا ویٹنگ روم میں داخل ہوگئی۔

"کھوٹا روپیہ" (صفحہ ۵ سے آگے)

منی کا یہ عجیب انداز دیکھ کر لتیکا نے ہنستے ہوئے کہا —

"بے وقوف کہیں کی، تو ابھی تک ان کو پہچان ہی نہ سکی۔ یہ مسٹر چلیہا نہیں ہیں یہ ہیں ڈاکٹر ایم۔ دی بروا — میرے خاوند۔"

منی اینڈ روز نے میری آنکھوں کی طرف دیکھ کر شک سے ہنس کر کہا۔ "ڈاکٹر بروا معاف کیجئے گا۔ میں آپ کا نام اچھی طرح نہیں جانتی تھی، لیکن آپ میرا نام اچھی طرح جانتے تھے۔ میں ہوں منی اینڈ روز باربیرا — لتیکا کی بچپن کی دوست اور ہمیشہ ہی دوست بن کر رہوں گی — آپ چاہیں تو مجھے اپنا دوست بنا سکتے ہیں۔"

میرے منہ سے ایک بھی بات نہ نکلی۔ میں آہستہ آہستہ اس کمرے سے باہر نکل آیا۔

دوسری صبح میں اور لتیکا دونوں چائے پی رہے تھے۔ ذرا ہمت سے کام لے کر میں نے پوچھا۔ "لتیکا کل منی اینڈ روز اور تمہارے پیار محبت کو دیکھ کر مجھے بڑا اچھا لگا۔ آج پھر تم دونوں کی ملاقات ہوگی نا؟"

نہیں، ملاقات ہونے کی کوئی امید نہیں — کل منی نے بتلایا کہ آج ہی اس کو مدراس جانا ہے۔ وہ صرف میرے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔"

چند لمحے خاموش رہ کر میں نے پھر پوچھا — "جانے سے پہلے منی نے میرے متعلق کچھ کہا تھا نا۔"

"کچھ کہا تھا...... جو بات ممکن تھا کہ اس نے آپ کے ساتھ پوری نہیں کی تھی آخر اس نے اس کو ہی ناممکن کہہ دیا اور اس کے بعد چلی گئی۔"

اس کے بعد سے میری زندگی میں بہت کچھ تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ مگر اس کھوٹے روپے کی بات ابھی تک میرے دل پر نقش ہے۔ وقت گزرنے کے بعد اب میں اس روپے کی بات سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ میری زندگی کی پہلی محبت کے ساتھ وہ روپیہ سچ مچ ہی کھوٹا تھا اگر نہیں تو وہ کیوں صندوق کے ایک انجان اندھیرے کونے میں پڑا رہا۔ اس کا چلن کیوں ختم ہوگیا۔

بات کی بات

وسنت نے دو تین بار کنکھیوں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ آخر ہمت کر کے بولا — ''چلو سنیما دیکھنے چلیں سُرو!'' دُور بیٹھی سُربالا نے کتاب پہ اپنا سر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا جی نہیں چاہتا۔ آپ ہو آئیے۔'' لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد وسنت نے پھر پوچھا۔ ''سُرو چھ مہینے ہو گئے، پھر بھی تمہارا غصّہ کم نہیں ہوا۔'' سُربالا نے جھوٹی ہنسی ہنسنے کی کوشش کی اور وسنت کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''اس میں غصّہ کس بات کا۔ اور اگر آپ کا اصرار ہے تو میں بھی چلوں گی۔''

وسنت کو اپنا ہونٹ کاٹتے ہوئے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''کس شو میں جائیں گے؟'' سُربالا کی طرف ایک نظر دیکھ کر وسنت نے کہا ''اس کا کچھ مطلب نہیں ہے سُرو!'' ''جیسی آپ کی مرضی!'' یہ کہہ کر سُربالا پھر کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گئی — اتنے میں دودھ والا آیا اور وہ باہر چلی گئی۔ وسنت چھ مہینے پہلے کے اس بدنصیب دن کو یاد کر کے اپنے خشکی مزاج کو

گجراتی افسانہ بھی مغربی ادب کے زیرِ اثر ترقی پذیر ہوا۔ شروع شروع میں وہ تجربات کی منزل سے گزرا۔ اس دور کے افسانوں میں زیادہ تر اخلاقی تعلیم دی جاتی تھی یا پھر ایسے افسانے لکھے گئے جنھیں مغربی افسانوں کا چربہ کہا جا سکتا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں 'گوالنی' کے نام سے ایک افسانہ شائع ہوا۔ اس کے مصنف تھے ملیانل۔ گجراتی افسانوی ادب میں اس کو سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ جدید افسانہ نگاری کا نمونہ اور ہیئت اور مواد کے اعتبار سے نئے امکانات کا حامل تھا۔ اس کے بعد دھن سکھ لال اور کنہیا لال منشی نے افسانہ نگاری کی دنیا میں قدم رکھا۔ ان دونوں افسانہ نگاروں نے فن کو کافی ترقی دی۔ اب متوسط طبقہ کی عام زندگی کی عکاسی ہونے لگی اور سماجی خرابیوں کی طنزیہ انداز میں نشان دہی بھی۔

اس کے بعد دھوم کیتو نے دیہات کے رومانی مناظر اور وہاں کی عام زندگی کی ترجمانی کی ان کے افسانوں میں سچّی ہمدردی کا عنصر غالب ہے۔ انھوں نے سماج کے ادنیٰ ترین طبقہ کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ رام نارائن پاٹھک اور میگھانی نے تحلیلِ نفسی اور جذباتِ محبت کی تجزیہ کاری سے کام لیا۔

گجراتی کے جدید افسانہ نگاروں میں اُما شنکر، سندرم، گلاب داس بروکر اور پنّالال پٹیل کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ان لوگوں نے حقیقت پسندی کے ساتھ سماج کے مختلف مسائل، متوسط طبقہ کی عام زندگی اور عام لوگوں کی نفسیات کی ترجمانی کی ہے۔

جن افسانہ نگاروں نے تکنیک کے نئے نئے تجربے کئے ہیں ان میں جینتی دلال اور سریش جوشی شامل ہیں۔

کوسنے لگا۔ ایک اچھے خاندان میں اس کی پیدائش ہوئی۔ بڑے عیش و آرام میں پلا بڑھا۔ گھر میں سکھ چین کی بنسی بجتی تھی۔ سُربالا کا غریب خاندان وسنت کے بنگلہ کے پیچھے کے آؤٹ ہاؤس میں کرایہ پر رہتا تھا۔ بچپن میں ساتھ کھیل کر وسنت اور سُربالا بڑے ہوئے۔ ان دونوں کی دوستی سے وسنت کے ماں باپ کو کچھ شک ہوا۔ سُربالا کے باپ سے مکان خالی کرنے کو کہہ گیا۔ وہ بھی ہوشیار ہو گئے مگر کچھ دُکھ کے ساتھ۔

مکان خالی کرنے کی جو وجہ تھی، اسے بھانپ کر وسنت نے سُربالا سے وعدہ کیا۔ "میں تمھارے یہاں آتا جاتا رہوں گا اور ایک سال بعد ہم شادی کر لیں گے۔"

اور اپنے وعدہ کے مطابق دوسرے سال بی۔ اے کرنے کے بعد وسنت نے اپنی آبائی جائداد کا لالچ چھوڑ کر سربالا سے شادی کر لی۔ اس کو ساٹھ روپے ماہوار کی ملازمت بھی مل گئی تھی۔

وسنت کی اس قربانی کی قیمت سُربالا ہی نہیں اس کے ماں باپ بھی جانتے تھے۔ اس لئے انھوں نے سُربالا کو لگن کے وقت زیادہ سے زیادہ گہنے اور کپڑے وغیرہ دئے تھے۔

ادھر سُربالا بھی ہمیشہ اس کو ہر طرح سے خوش رکھتی تھی۔ کھانے پینے میں، گھومنے گھامنے میں، ہر طرح سے اس کو آرام پہونچانے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔

سینما کے شوقین وسنت کو وہ ایک نہ ایک سینما دیکھنے کا شوق دلاتی ـــ "آپ کو یہ فلم نہ دیکھنا ہو تو نہ سہی، مجھے تو دیکھنا ہی ہے۔"

وسنت ہنس کر جواب دیتا۔ "لو چلو، میں تمھیں تھیٹر تک پہونچا آؤں۔ وقت پر لینے آ جاؤں گا۔"

سُربالا بڑے پیار سے پوچھتی۔ "اوں، یہ آپ کو اچھا لگتا ہے!"

اور پھر وسنت کو سینما دیکھنے جانا ہی پڑتا۔

اتنی معمولی تنخواہ میں سُربالا جس طرح گھر چلاتی تھی اُسے دیکھ کر وسنت کو بڑا تعجب ہوتا تھا۔ ایک دو بار تو اس نے سُربالا سے پوچھا بھی تھا ـــ "اتنا خرچ کرتی ہو لیکن اس میں سے بیماری آزاری کے لئے کچھ بچت کی گنجائش رکھتی ہو نا!"

سُربالا اس کا ایسا اچھا جواب دیتی کہ وسنت چپ رہ جاتا۔ وہ ایسی سگھڑ بیوی پاکر مطمئن ہو گیا ـــ "ہمیں تو جیسا تم بتا رہی ہو، کام سے کام ہے! باقی تم جانو اور تمھاری بات!"

ان کی اس سکھ بھری زندگی کو پانچ سال گزر گئے۔ ایسی سکھی گھریلو زندگی پر جیسے خدا کو بھی رشک آ جائے۔ کالج کے زمانے کا ایک ہم جماعت، ادب نواز دوست نہ اچانک ملتا اور نہ وہ موپاساں کی اس کہانی کا سارا قصہ سناتا!!

گاڑی چھوٹنے میں کچھ دیر تھی۔ وسنت نے ہی بات شروع کی ـــ "تمھاری آخری کہانی بڑی اچھی تھی۔ اگر تم ایسی ہی کہانیاں لکھتے رہے تو ...."

یہ دوست بیچ میں بول اُٹھا ـــ "کاش! تم نے چیخوف اور موپاساں کو پڑھا ہوتا اور اس میں بھی اس آخری کہانی کو پڑھ کر میں تو جیسے مبہوت ہو گیا ہوں۔" اور وسنت کے چہرے پر اشتیاق کے آثار دیکھ کر اس نے فوراً ہی کہانی کہنا شروع کر دیا..... اس کا لب لباب یہ تھا ـــ پڑھانے کی نوکری کرنے والا معمولی تنخواہ پانے والا ایک آدمی اپنے گھر کی صفائی، سجاوٹ اور انتظام کو دیکھ کر اپنی کفایت کرنے والی بیوی کی تعریف اپنے دوستوں کے سامنے کبھی کبھی کرتا رہتا... اتنے میں اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا اور ماسٹر صاحب کو معلوم ہو گیا کہ بہت کچھ کفایت کرنے پر بھی اتنی تھوڑی تنخواہ میں اپنا گزارہ کرنا بھی مشکل ہے۔ پہلے وہ اپنی بیوی کے ساتھ بار بار سینما دیکھنے جاتا تھا۔ اپنی بیوی کی زیور پہننے کی خواہش پوری کرنے کے لئے نقلی موتیوں کے زیور خریدتا تھا۔ مگر اب تو وہ ساری باتیں خواب بن گئی تھیں۔ اپنی ایسی گرہستی اور اچھی بیوی کو یاد کر کے اس کی تعریف کرتے کرتے اکثر اپنے دوستوں کے سامنے رو پڑتا تھا۔

اس حالت میں وہ اپنی اس چھوٹی تنخواہ کی نوکری بھی

کھو دیتا ہے۔ اپنا پیٹ پالنے کے لئے وہ گھر کا مال اسباب بیچنے لگتا ہے آخر میں تین دن کے فاقہ کے بعد مجبور ہو کر وہ اس نقلی موتیوں کے زیورات کا ڈبہ جوہری کے پاس لے جاتا ہے۔ کچھ دو چار آنے ہی مل جائیں گے، اس امید کے ساتھ۔

لیکن معلوم ہوا کہ یہ سب مال چار لاکھ روپے کی مالیت کا ہے اور یہ بھی اسی دکان سے خریدا ہوا۔ ماسٹر کو بڑا تعجب ہوتا ہے۔ جوہری اس کو یقین دلاتا ہے کہ وہ اس کے ٹھیک دام بتا رہا ہے اور اس کے ثبوت میں وہ پرانی بکری کی بہی دکھاتا ہے۔ یہ فلاں ڈیوک ہیں — فلاں مسز کو دیا ہوا یہ فلاں زیور ہے۔

وسنت کا سر چکر کھانے لگا۔ وہ بڑی مشکل سے گھر تک پہونچ پایا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ اس کے دوست نے جو بات بتائی تھی، وہ اُسے ہوشیار کرنے کے لئے ہی تھی۔ اور وہ اگر صرف کہانی ہو تو بھی اس کے دل میں شبہ پیدا ہوا کہ اس کی بیوی بھی اس کہانی والے ماسٹر کی بیوی جیسی ہونی چاہیئے۔ نہیں تو اتنی سی تنخواہ میں وہ بڑی خوبی کے ساتھ گھر کیسے چلا لیتی ہے۔

ثریا لا نے ایک جوڑ نقلی بندے اور چار آنے کی سفید موتیوں کی مالا کچھ دن پہلے ہی خریدی تھی اور اُسے وسنت کو دکھایا بھی تھا۔ یہ سب یاد کر کے اُسے شبہ ہوا کہ وہ زیور اصلی بھی ہو سکتے ہیں اور اپنے دوستوں میں سے دو ایک کو تو اس نے ڈیوک کی جگہ سمجھ بھی لیا۔

باورچی خانے میں کچھ صفائی کرتی ہوئی بیوی کو اپنے سامنے ہنستے ہوئے وہ دیکھ نہ سکا۔ اس کو اب وہ ڈائن سی لگی۔ بیٹھک کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے غصہ کو بڑی مشکل سے دبا کر ثر بالا سے کہا — ”ذرا ادھر آؤ تو۔“

ثر بالا نے وسنت کو اس عالم میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بہت سے شکوک و شبہات دل میں لئے وہ بیٹھک کے کمرے میں گئی۔ اس نے صفائی سے پوچھا — ”کیوں آپ آج کچھ ناراض ہیں کیا؟“

وسنت نے ثر بالا کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کوٹ اُتارتے ہوئے کہا — ”اسی وجہ سے میں نے تم کو بلایا ہے۔“

ثر بالا نے ہمّت کر کے وسنت کے قریب کی کرسی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا — ”ادھر بیٹھو، نہیں یہ سچ ہے کیا!“

”دیکھو یہ سب ہنسی مذاق میں اڑانے کے لئے میں تم سے نہیں کہہ رہا ہوں“ اور ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے اس نے کہا۔ ”آج مجھے پائی پائی کا حساب چاہیئے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم یہ سب کس طرح نبھاتی ہو۔“

ثر بالا سنجیدہ ہو گئی۔ وہ باورچی خانے سے دو چار منٹ میں ہی حساب کی ڈائری لے آئی اور اُسے وسنت کے پاس ڈال کر بڑی بے رُخی کے ساتھ واپس چلی گئی۔

دو چار منٹ تک ڈائری کے ورق ٹٹولنے کے بعد وسنت زور سے چلّایا ”کہاں ہو؟“

ثر بالا کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ بے خوفی کے ساتھ قدم بڑھاتی ہوئی وہ دروازے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور اس نے پوچھا۔ ”کیا ہے؟“

”یہ تو چالو سال کا حساب ہے۔ مجھے اپنا پورا حساب چاہیئے۔ جب سے گھر چلانا شروع کیا۔ اس دن سے آج تک کا۔“

”میں نے اس کو جمع کر کے تھوڑی رکھا ہے۔“

وسنت کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔ ”اس کے کیا معنی!“

ثر بالا نے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”مہربانی سے آپ یہ بتائیں کہ آپ کو کس طرح کا حساب چاہیئے!“

”گھر کے خرچ کا۔“

”ایسا ہے تو آپ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے۔ میں یہ سب کہیں سے کسی کے بدلے میں لے آتی ہوں، یہی نا!“ ثر بالا خشمگیں نگاہوں سے وسنت کی طرف دیکھتی رہی۔

اس کا یہ انداز دیکھ کر وسنت زور سے چلّا اُٹھا۔ ”اپنا سیانا پن رہنے دو۔ مجھے صاف صاف حساب بتا دو۔“

اور وسنت کے ان آخری لفظوں سے، اس کے کہنے کے ڈھنگ سے، ثر بالا کے نازک اور بھولے دل پر ایسی چوٹ لگی جو اس جنم میں کیا، ہزار جنم میں بھی نہیں مٹ سکے گی۔

اگست ۱۹۶۳ء

(بقیہ صفحہ ۱۲۱ پر)

دیکھا سُنا آدمی

ہندی افسانہ کی ابتداء ۱۹۱۱ء میں ہوئی۔ اس سے پہلے زیادہ تر بنگالی رومانی افسانوں اور انگریزی کے جاسوسی افسانوں کے تراجم شائع ہوا کرتے تھے۔ منشی پریم چند نے ہندی افسانہ کو نئے حالات سے روشناس کرایا اور اس طرح اس کو ایک مستقل حیثیت حاصل ہوئی۔ پریم چند کی روایات کو دوسرے افسانہ نگاروں نے اپنایا۔ ان میں سدرشن، کوشک، بھگوتی چرن ورما، اپیندر ناتھ اشک، نرگن اور وشنو پربھاکر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے افسانوں میں سماجی اصلاح کا احساس اور اخلاقی قدروں کا شعور غالب ہے۔ جینندر کمار نے نفسیاتی تجزیہ سے کام لے کر ہندی افسانہ میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کیا۔

واتسائن کے ہاں روایت اور تجربہ کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ جدید مغربی سائنسی مزاج کے حامل ہیں اور ان کے افسانوں میں عقلیت کا پلّہ بھاری نظر آتا ہے۔ نوجوان افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد ان کے حلقۂ اثر میں شامل ہے۔

یشپال ہندی کے سب سے زیادہ مشہور افسانہ نگار ہیں اور وہ سماجی حقیقت پسندی کے زبردست علم بردار ہیں۔ اس حلقے کے لکھنے والوں میں امرت لال ناگر، بھیروں پرساد گپت موہن راکیش، امرت رائے اور چندر کرن سون رکسا خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ ایک نوجوان طبقہ ابھر رہا ہے، جو کسی مکتبِ خیال سے متعلق نہیں اور نہ اس پر کوئی لیبل لگایا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

تارا کی شادی والدین کے فیصلے سے اور خود اس کی مرضی سے موجودہ زمانے میں جیسے ہمارے سماج میں مناسب سمجھا جاتا ہے، ہوئی۔ والدین نے اچھے رشتہ کے انتظار میں تارا کو ایم۔اے تک پڑھایا اور پھر اُسے گھر میں بیکار بٹھائے رکھنے کے بجائے پی۔ایچ۔ڈی کی تیاری کا بھی شوق دلایا۔ تب ہی ایک دن تارا کے والد نے 'ناردرن اسٹار' اخبار کے شادی کے کالم میں ایک اشتہار پڑھا — ایک مشہور یورپین فرم کے ایڈمنسٹریشن سیکشن میں کام کرنے والے گوڑ، صحت مند، پڑھے لکھے اونچے خاندان کے نوجوان کے لئے پڑھی لکھی مہذب لڑکی کی ضرورت ہے۔ نوجوان کی ماہانہ آمدنی ۵۰۷ روپے، عمر اگلی سالگرہ پہ تیس سال، قد اونچا۔

تارا کے بھائی نے اخبار کے دفتر سے خط و کتابت کی۔ ٹھیک پتہ معلوم کرکے دہلی میں رہنے والے اپنے دوستوں کو لکھ کر سب باتوں کی تصدیق کر لی گئی۔ فوٹو بھی آ گئے۔ کرشن دیال دسہرے کے موقع پر لکھنؤ میں آکر یورپین ہوٹل میں تین دن تک ٹھہرا۔ تارا کے گھر کھانا کھایا۔ دو بار چائے پی۔ سب لوگ ساتھ ساتھ

لکھنؤ میں قابلِ دید مقامات کی سیر کو گئے۔ تارا کو دیال کا مزاج بھی بہت اچھا لگا۔ ایسے خوش مزاج کہ بچوں تک کا دل رکھتے تھے۔ چھ ماہ بعد شادی ہو گئی اور تارا میکے کی بدائی سے اداس مگر دل میں ارمانوں کے لڈو لئے دہلی چلی گئی۔

کرشن دیال نے گول مارکیٹ میں ایک اچھا فلیٹ کرایہ پر لے لیا تھا اور کچھ فرنیچر بھی۔ نئے گھر میں آکر تارا کے لئے صرف ایک ہی کام تھا گھر کو طریقے سے سجانا۔ سجاوٹ کے معاملے میں کرشن دیال سے کئی بار اختلافِ رائے بھی ہو جاتا۔ تارا اپنی رائے پر ڈٹی رہتی۔ کرشن دیال کچھ جھنجھلا کر رہ جاتا اور پھر پسند نہ آنے پر بھی تارا کی بات مان لیتا۔ تارا نے اپنی من مانی کر لی تھی مگر من مانی کرنے میں بھی کچھ بے اطمینانی کی ایک کسک سی دل میں رہتی۔ وہ چاہتی تھی یہ کہہ دیں — جیسے میں کہتا ہوں ویسے ہی کرو، تو میں ویسے ہی کروں۔ مگر وہ نوبت آنے ہی نہ پاتی سب کچھ تارا کی مرضی کے مطابق ہو رہا تھا۔ تارا کو جھکنے کے لئے کسی مجبوری سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔ یہ نہ ہونے پر بھی وہ اپنے شوہر کی خوش مزاجی پر فدا تھی۔

تارا کو دہلی آئے ہوئے ابھی ایک ہی مہینہ گزرا تھا۔ سنیچر وار کو شام کے وقت وہ دونوں نئی دہلی میں ایک دوست کے یہاں سے تانگے پر لوٹ رہے تھے۔ رفیوجی مارکیٹ میں تارا کو کسی نئی دکان پر ایک ڈریسنگ ٹیبل نظر آئی۔ تارا کو قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر ساڑی پہننے کا بہت شوق تھا۔ نئے خوبصورت گھر میں اس کی کمی بہت محسوس ہوتی تھی۔ شوہر کا بازو تھام کر اس نے کہا ——

"ہائے بڑی خوبصورت ٹیبل ہے، ذرا دیکھیں۔"

ٹیبل بالکل نئے نمونے کی واقعی بڑی خوب صورت تھی۔ دوکاندار نے قیمت بتائی ایک سو پچاس روپے۔ کرشن دیال خریدنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے انگریزی میں سمجھایا۔ یہ قیمت بہت زیادہ ہے۔ جلدی کیا ہے، پھر سہی۔ دوکاندار سے پیچھا چھڑانے کے لئے اس نے کہہ دیا۔ ایسی ٹیبل سو روپے میں کہیں بھی مل سکتی ہے۔ دوکاندار نے ٹیبل کی بناوٹ شیشے اور لکڑی کی خوبیاں بتائیں مگر کرشن لال اَڑ گیا — نہیں سو سے ایک پیسہ زیادہ نہیں — دوکاندار دس چھوڑ دینے کو تیار ہوا، پھر بیس۔ گاہک کو کسی طرح مانتے نہ دیکھ کر وہ سو پر ہی آ گیا۔

دیال پھنس گیا تھا۔ اس نے مصیبت ٹالنے کے لئے کہا ——

"ابھی روپے لے کر نہیں آئے ہیں۔ ٹیبل دیکھ لی ہے۔ آکر لے جائیں گے۔"

دوکاندار نے کچھ ایسی نفرت آمیز نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا کہ تارا سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے فوراً پرس کھول کر دس کا نوٹ نکال کر بڑھا دیا اور گھر کا پتہ بتا کر بولی — "پہنچا دو اور باقی لے آؤ۔"

کناٹ پلیس سے گھر کی طرف لوٹتے ہوئے کرشن دیال نے جھنجھلاہٹ ظاہر کی — "تم تو ہر بات پر اڑ جاتی ہو۔ ایسی کیا جلدی تھی۔ ابھی ۲۳۰۰ روپے خرچ کر چکے ہیں۔ تم سے کہا تھا کہ پروموشن کا جھگڑا طے ہو جائے تو لے لیں گے۔"

تارا نے جواب دیا — "چلو ہو گیا۔ سو تو ڈارلنگ تم نے ہی کہہ دئے تھے۔"

دیال نے جواب دیا — "میں تو ٹال رہا تھا۔ تم نے اسے نوٹ دے دیا۔ ٹیبل یہ سو کا بھی نہیں ہے۔ نہ معلوم کیسی لکڑی ہو۔ یہ لوگ تو پوت پات کر سب چیز کو شیشم کی بنا دیتے ہیں۔"

تارا نے شرمندہ ہو کر معافی سی مانگی۔ "ڈارلنگ سیلف ریسپیکٹ کی بات آ گئی تھی۔ کیا کرتی۔"

دیال نے سمجھایا — "اس میں سیلف ریسپیکٹ کی کیا بات تھی یہ تو سودا ہے۔ نہیں لیتے۔ تبھی تو میں ٹال رہا تھا۔"

تارا نے مان لیا — "اچھا جانے دو۔ دس گئے تو کیا ہوا کل ایتوار ہے۔ پرسوں صبح ہی ادھر جاؤ گے تو اس سے کہہ دینا ہمیں دوسری جگہ سے اس سے اچھی میز مل گئی ہے۔ دس اسے رکھ لینے دو۔"

ایتوار کے دن کرشن دیال کو دفتر جانے کی جلدی نہیں تھی۔ دس بجے کا وقت ہوگا۔ ابھی وہ ناشتہ ہی کر رہے تھے کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ نوکر نے جا کر بتایا۔ "کوئی آدمی ڈریسنگ ٹیبل لے کر آیا ہے۔"

"یہ تو اچھی پریشانی ہوئی۔ اب کیا ہوگا؟" دیال چائے کا پیالہ میز پر رکھتے ہوئے تارا سے بولا۔

"اس سے وہی کہہ دیں گے۔ بہت ہوگا تو ٹھیلے کا کرایہ دو روپے اور لے لے گا۔" تارا نے معاملہ سلجھا دیا مگر شوہر کے چہرے پر پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ دیال کچھ جھجکتا ہوا دروازے کی طرف گیا۔

دیال نے باہر آکر دکاندار کو سمجھایا۔ "ہمیں اس سے اچھی اور سستی ڈریسنگ ٹیبل دوسری جگہ مل گئی ہے۔ وہ دس روپے تمہیں رکھو۔"

دکاندار اُبل پڑا۔ "تمہارے منہ میں زبان ہے......"

اس نے گالی بک دی۔

تارا آنچل ٹھیک کرتی ہوئی اپنے خاوند کی مصیبت میں مدد کرنے کے لئے آرہی تھی۔ اس نے دکاندار کی بات سنی۔

دیال نے دکاندار کو غصہ سے ڈانٹا۔ "کیا بکتا ہے۔ نکل جا یہاں سے۔"

دکاندار معمولی چھوٹے قد کا اور میلا کچیلا تھا، مگر دیال کے خوبصورت فلیٹ اور صاف کپڑوں سے مرعوب نہیں ہوا۔ اس نے بھی اونچی آواز میں گرج کر کہا۔ "بکتا تو ہے ــ ابھی سارا بابو پن نکال دوں گا۔"

تارا کا خون کھول اٹھا۔ آگے بڑھ کر اس نے ڈانٹا ــ "تم کس کے حکم سے اوپر آیا۔ چلو نیچے۔"

دکاندار آستین چڑھا کر ایک قدم آگے بڑھا۔ "ہم اپنا پیسہ لینے آیا۔ ہمت ہے تو اتار دے نیچے۔"

تارا بھی غصے میں کانپ اٹھی۔ "یہی ہمت ہے تو لے پیسہ۔ ہمیں ٹیبل نہیں چاہیئے۔"

دکاندار ایک قدم اور آگے بڑھا۔ "پیسہ ہم تمہارے باپ سے لے گا۔ ابھی لے گا۔"

شور سن کر پاس پڑوس کے لوگ بھی نکل آئے تھے۔ تارا کا جی چاہ رہا تھا کہ دیال اس بدتمیز آدمی کو چانٹا مار کر گرا دے۔ سیڑھیوں سے نیچے دھکیل دے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ وہ خود ہی کیوں نہ اسے دھکا دے دے۔ وہ آگے بڑھی ــ "نکلو باہر۔" اس نے کہا۔

دیال نے تارا کو ایک طرف کرتے ہوئے اونچی آواز میں پڑوسیوں کو سناتے ہوئے للکارا ــ "تم کو پیسہ لینا ہے۔ تم پیسہ لو۔ تم لیڈیز کے سامنے بدتمیزی کیوں کرتا ہے۔" اور غصے میں پاؤں ٹپکتا ہوا روپیہ لینے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

تارا اس بے عزتی کو دیکھ کر غصہ سے پاگل ہوگئی۔ وہ دیال کے پیچھے بھاگی گئی۔ الماری سے روپیہ نکالتے ہوئے پتی کا ہاتھ پکڑ کر اس نے کہا ــ "کیا کرتے ہو جی ــ اس نے گالی کیوں دی ــ تم اتنا ڈرتے کیوں ہو؟"

دیال نے بیوی کو ڈانٹ دیا۔ "ہٹو۔" ہاتھ چھڑا کر برآمدے میں آگیا۔ سو روپے کا نوٹ، دکاندار کی طرف پھینک کر اس نے ڈانٹا۔ "چلو نکلو یہاں سے۔"

سو روپے کا نوٹ اٹھا کر بھی دکاندار نے لال آنکھیں گھور کر کہا۔ "چپ رہ، نہیں تو ابھی گردن توڑ دوں گا۔" دیال کے کمرے کے اندر چلے جانے پر ہی وہ زینے کی طرف مڑا۔

دیال نے نوکر کو نئے سرے سے چائے بنا کر لانے کو کہا مگر تارا آنچل میں منہ لپیٹ کر صوفہ پر پڑ کر رونے لگی۔ دیال کو یہ اچھا نہ لگا۔ اس نے چڑ کر ڈانٹا۔ "کیسی پاگل ہو تم۔ وہ جنگلی آدمی ہاتھ چلا دیتا، بے عزتی کر دیتا تو کیا ہوتا۔ روپیے کی ایسی کیا بات ہے۔"

تارا روتے روتے بولی۔ "بے عزتی میں کسر ہی کیا رہ گئی۔ تمہارے بھی تو دو ہاتھ تھے۔"

اس دن دونوں آپس میں نہیں بولے۔ تارا نے دن بھر کچھ کھایا بھی نہیں۔

ڈریسنگ ٹیبل اوپر آگئی تھی مگر اس پر نظر پڑتے ہی تارا کا دل نفرت سے بھر جاتا۔ دیال نے دو تین دفعہ ٹوکا بھی ــ "تمہیں تو ڈریسنگ ٹیبل کا اتنا شوق تھا اب اس کا استعمال ہی نہیں کرتیں۔"

"میرا تو جی چاہتا ہے اسے آگ میں ڈال دوں۔" تارا نے جواب دیا "اس مری نے اتنی بے عزتی کرائی۔"

دیال نے سمجھایا ــ "اس میں ٹیبل کا کیا قصور۔ وہ بدتمیز جنگلی آدمی تھا۔ ایسے وقت شریف آدمی کو پیسے پر تھوک کر اپنی عزت کا

خیال کرنا چاہیئے۔ تارا کو اعتبار ہی نہ ہوتا کہ عزّت بچ گئی ہے۔

دیال عام طور پر اپنے پرموشن کے جھگڑے کا ذکر کیا کرتا تھا۔ اس معاملے میں وہ فکرمند بھی تھا۔ یوروپین سرکل منیجر گرم آب و ہوا میں اچھی طرح تندرست نہ رہنے کی وجہ سے واپس جا رہا تھا۔ دیال کے ماموں فرم کے بورڈ کے ممبر تھے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ اس کی جگہ دیال کو پرموشن دلانے کی کوشش کریں گے۔ سرکل منیجر پچھلے سال ایک ماہ کی رخصت پر تھا تو دیال نے اس کی جگہ کام بھی کیا تھا۔

نندن بھی فرم کا سب منیجر تھا اور دیال سے ایک سال پہلے سے کام کر رہا تھا۔ پچھلے سال سرکل منیجر کی جگہ دیال کو دی جانے پر بھی اس نے مخالفت کی تھی۔ اب اسے چھوڑ کر دیال کو وہ جگہ مستقل طور پر دی جانے کی افواہ اڑی تو نندن نے فرم کو نوٹس دیا کہ اس کی بے عزّتی کئے جانے پر اس کے نوٹس کو استعفیٰ مان لیا جائے۔ دیال کو شبہ ہوا کہ کہیں نندن دھونس میں ہی جگہ نہ لے جائے۔ یہ بھی سُنا تھا کہ سرکل منیجر اور بورڈ کے کئی یوروپین ممبر نندن کے حق میں ہیں۔ اپنا پلڑا بھاری کرنے کے لئے دیال نے بھی نوٹس دے دیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اس جگہ پر عارضی طور سے کام کر بھی چکا ہے۔ جھگڑا بڑھ کر نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ نندن اور دیال میں سے ایک کو فرم چھوڑنا ہی پڑے گی۔

دیال اس جھگڑے سے بہت فکرمند رہتا۔ تارا سے بات کر کے اپنا پکّا ارادہ ظاہر کرتا — اب عزّت کا سوال ہو گیا ہے۔ چاہے نوکری جائے۔ میں دفتر میں کیا منہ دکھاؤں گا۔ میرے لئے بیسیوں نوکریاں ہیں۔ نندن تو اس دفتر میں سوا سو روپے پر کلرک بھرتی ہوا تھا۔ سرکل منیجر کی خوشامد سے جوتیاں رگڑ رگڑ کر پانچ سال میں سب منیجر بن پایا۔ اب یہ دماغ ہے۔ نوکری چھوٹ جائے تو سر کی ڈال کر میدان میں بیٹھنا پڑے۔ اور پھر بات بدل کر کہتا۔ "ویسے ساڑھے سات سو کی نوکری معمولی بات نہیں ہے۔ تم جانتی ہو۔ سوا سو کی ویکنسی کے اشتہار کے جواب میں پانچ ہزار درخواستیں آتی ہیں۔"

تارا ہمّت بندھاتی — "کیا ہے۔ اب تو بات کا سوال ہے۔ جب بات یہاں تک پہنچ گئی ہے تو اب پیچھے کیسے ہٹ سکتے ہیں۔ ہم لوگ ایسے کون بھوکوں مرے جا رہے ہیں اور عزّت کے لئے تو آدمی سر بھی دے دیتا ہے۔"

بورڈ کی میٹنگ سے دو دن پہلے دیال دفتر سے کچھ پہلے آ گیا اور زبردستی چہرے پر ہنسی لا کر بولا — "بیٹا نندن تو گئے۔"

تارا نے ذرا تسلّی سے پوچھا — "چیف منیجر نے فیصلہ کر دیا۔"

دیال نے جواب دیا — "نہیں چیف منیجر کا پی۔ اے کھنّہ اپنا ملنے والا ہے۔ اس نے صبح جاتے ہی بتایا تھا کہ صاحب نے فیصلہ کیا ہے کہ پروٹسٹ کا نوٹس دینے کی وجہ سے دونوں کو ڈسمسل آرڈر دے دیا جائے۔ صاحب آج بورڈ کو رپورٹ بھیجنے والے تھے۔ میں نے جا کر صاحب سے بات کی۔ "میرے لئے فرم کا مفاد اور فیصلہ اہم ہے۔ میں عہدے کا بھوکا نہیں ہوں۔ اگر فرم میری اپیل کو پروٹسٹ سمجھتی ہے تو میں اسے واپس لیتا ہوں۔" میں نے اپنا پروٹسٹ واپس لے لیا۔ نندن بیٹا پروٹسٹ پر ڈٹے ہیں۔ نوکری سے ہاتھ دھوئیں گے۔"

تارا کا سر جھک گیا۔ مگر دیال کہتا چلا گیا۔ "ساڑھے سات سو کی نوکری معمولی چیز نہیں۔ عزّت تو آدمی کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ نندن اب نوکری ڈھونڈتے پھریں گے تو کیا عزّت رہ جائے گی۔ اور کون سی مل جاتی ہے۔"

تارا کا دل جیسے مر گیا۔ نہ ہنس سکی، نہ بول سکی۔ دیال نے نوکر کو چائے لانے کے لئے کہا اور کمرے کے پارٹیشن میں پردے کے پیچھے کپڑے بدلنے کے لئے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف چلا گیا۔ پردے کے پیچھے سے ہی بولا — "تو آج تو پرموشن کی شرط پوری ہو گئی۔ کم سے کم راستے کی رکاوٹ تو دور ہو گئی۔ آج اس ڈریسنگ ٹیبل کا افتتاح ہو جائے۔"

تارا نے آنچل میں منہ لپیٹ لیا اور صوفہ پر لیٹ گئی۔ دیال کپڑے بدل کر آیا تو وہ گم سم بیٹھی تھی۔ "کیوں کیا بات ہے۔" دیال نے پوچھا اور اس کی نظر بیچ کی گول میز پر پڑے تازہ خط کی طرف چلی گئی

اس نے پوچھا "کیا خبر آئی ہے لکھنؤ سے۔"

"میں لکھنؤ جاؤں گی۔" تارا نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔

دیال لفافے سے خط نکال کر پڑھنے لگا۔ خط میں تارا کے بڑے بھائی کی بیماری کا ذکر تھا کہ چار دن سے ایک سا ہی بخار ہے۔ ڈاکٹروں نے خون ٹیسٹ کرانے کے لئے کہا ہے۔

دیال نے تسلی دی "۔ گھبرانے کی تو کوئی بات نہیں۔ خون ٹیسٹ تو ہوہی جانا چاہیئے۔ چاہتی ہو تو ہو آؤ۔ کب جانا چاہتی ہو؟"

"آج ہی رات"۔ تارا نے جواب دیا۔

دیال نے پھر سمجھایا — "ایسے گھبرانے کی کیا بات ہے کل پرسوں چلی جانا۔" تارا نہیں مانی تو وہ مان گیا۔

تارا لکھنؤ پہونچی تو بڑے بھائی کا بخار اتر بھی چکا تھا۔ مگر تارا بہت بے چین اور گم سم بیٹھی رہتی۔ پڑوس کی کوٹھی کی سہیلی وملا بھی ملنے آئی تھی۔ اس سے بھی اس نے کوئی خاص بات چیت نہ کی۔ وملا نے شادی کے بعد راز کی باتیں پوچھیں۔ ہنسانے کی بہت کوشش کی مگر تارا گم سم رہی۔

بھابی دور سے یہ دیکھ رہی تھی۔ نزدیک آگئی اور اس نے بھی وملا سے تارا کے یوں گم سم رہنے کی شکایت کی۔ وملا نے اپنائیت اور ہمدردی سے پوچھا — "تو نے دیکھ سن کر شادی کی تھی۔ کیا بات ہے۔"

بھابی بھی بولیں۔ "بھئی ہم نے تو سب کچھ کیا تھا۔ آدمی دکھا دیا۔ بات کرادی۔ شادی سے پہلے اس سے زیادہ اور کیا دیکھا جا سکتا تھا۔"

وملا نے پھر پوچھا۔ "کیا سچ مچ پسند نہیں۔"

"کیا پسند نہیں۔" تارا نے روکھے پھیکے لہجے میں پوچھا۔

وملا نے پھر جھجک دور کرکے پوچھا — "اور کیا پسند ہوگا تیرے آدمی کے لئے پوچھ رہے ہیں۔"

"آدمی ہی تو نہیں۔" تارا نے جواب دیا۔

بھابی اور وملا سناٹے میں آگئیں۔ کچھ دیر منہ لٹکائے بیٹھی رہیں تارا پھر بھی نہ بولی۔ کچھ دیر بعد وملا دکھ میں کچھ اور بات کئے بغیر چلی گئی تو بھابی نے سمجھایا — "بہن اپنی طرف سے تو سب دیکھ بھال لیا تھا اور کیا کر سکتے تھے۔ ایسی ہی بات ہے تو تو اتنا دل چھوٹا کیوں کرتی ہے۔ علاج معالجہ بھی ہو جاتا ہے۔ اپنا پردا تو رکھنا چاہیئے۔ وملا کے سامنے تو تجھے ایسے نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ وہ ایک ڈھنڈھورچی ہے۔ دنیا بھر میں ڈونڈی پیٹ دے گی۔"

تارا سمجھی اور زیادہ روکھے پن سے بولی — "تو آدمی کیا بس یہی کچھ ہوتا ہے؟"

"بات کی بات" (صفحہ ۱۶ سے آگے)

اتفاق سے سربالا نے بیچے ہوئے اپنے زیورات کے بل پر کپڑے وغیرہ کی خریداری کا حساب بھی جوڑ رکھا تھا۔ اس نے کاغذ ول کے ان دو ڈبوں کو دروازے کے باہر سے ہی وسنت کی طرف پھینکا۔ سربالا اندر کے کمرے میں جب گئی تھی اس وقت سے وسنت اپنے دل میں کچھ پچھتانے لگا تھا اور ان کاغذوں کو دیکھنے کے بعد تو شبہ کی کوئی وجہ رہی نہ تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اس نے پوچھ لیا — "وہ نقلی زیور کیا سچ مچ نقلی ہیں!"

اسی لمحہ اس کی گود میں مالا آگری۔ طوفان کی طرح بھری ہوئی سربالا سامنے آکر کھڑی ہوگئی اور غصہ میں وہ بولی۔ "تو سکھیا تھا کہ ابھی کام تمام ہو جانے کے بعد سنیت کے وار نہیں کیا کرتا۔" یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔

"ذرا جاکر بازار میں پرکھ کروا لیجئے، نہیں تو آپ کے ہاتھ ہی کہیں اصلی نہ ہو جائیں۔" سربالا کے آخری لفظوں میں اس کی آواز بدل گئی تھی، جیسے ٹوٹے ہوئے برتن کی آواز ہو۔

اس واقعہ کو آج چھ مہینے ہو گئے . . . . . . پھر بھی وسنت کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس دن جو خلیج پیدا ہو گئی وہ اتنی ہی ہے، پھر چاہے سربالا سینما دیکھنے چلے یا نہیں۔

دہی والی

کنڑ ادب میں مختصر افسانہ کو اہم مقام حاصل ہے۔ بنگلور کے پی منگیش راؤ کنڑ افسانہ نگاروں کے پیش رو ہیں۔ ان کے بعد کیرور واسو دیو اچاریہ کا نام آتا ہے۔ انھوں نے مراٹھی کی سمپورن کتھا کے انداز میں کہانیاں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔
دورِ جدید کے افسانہ نگاروں میں ماستی وینکٹیش آئنگر کا نام سرِ فہرست ہے۔ انھوں نے کنڑ افسانہ کو ایک نیا موڑ دیا۔ ان کے تمام افسانے اعلیٰ فنی خوبیوں کے حامل ہیں۔ ان کے ہاں بھرپور طنز و مزاح، سلاست بیان اور نفسیاتی مطالعہ کا اثر نمایاں ہے۔ انھوں نے سیاسی، سماجی اور معاشی موضوعات پر بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ آنند اکشرا نے دیہی زندگی کی عکاسی کی ہے اور ان کے رومانی افسانے بھی دل چسپ اور مقبول ہیں۔ بنیدرے کرشن کمار گورتنا، ڈاکٹر گُلگیلی اچھے افسانہ نگاروں کی صف میں شامل ہیں۔ خواتین افسانہ نگاروں میں کورگ کی گورما کا نام قابلِ ذکر ہے۔ ان کے افسانے بڑے مقبول ہیں اسی طرح شریمتی پدما وتی اور شاملا نے بھی اچھے افسانے لکھے ہیں۔
اے۔ این کرشنا راؤ، ٹی۔ آر سبا راؤ، بسوراج کٹی منی، نرنجن کے چنا بسیا ترقی پسند افسانہ نگار ہیں۔ آج کے افسانہ میں کسانوں اور مزدوروں کی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے اور سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔

منگّا ہمیں کئی برسوں سے دہی دے جاتی تھی۔ ہمارے لین دین کا طریقہ شہروں سے مختلف تھا۔ اور جگہ تو آپ اپنی ضرورت کی مقررہ مقدار روزانہ خرید لیتے ہیں اور مہینے کے آخر میں دام چکاتے ہیں۔ یہاں صورت یہ تھی کہ جتنا دہی لیا جاتا تھا اس کی قیمت اسی وقت ادا کردی جاتی تھی اور یہ بھی ضروری نہ تھا کہ ایک ہی مقررہ مقدار روز لی جائے۔ دہی والی تقریباً روزانہ ہمارے گھر کی طرف سے گزرتی تھی۔ پھر وہ ہمارے گھر آجاتی اور پوچھ لیتی کہ ہمیں دہی چاہیئے۔ اگر ضرورت ہوتی تو ہم دہی خرید لیتے اور اس دن کے بازار بھاؤ کے حساب سے دام دے دیتے یا زیادہ سے زیادہ دوسرے دن دام ادا کر دیتے۔ اس کا گاؤں آوالر کے قریب تھا۔ مجھے نام یاد نہیں رہا شاید ننگاپورہ یا اسی طرح کا کوئی نام تھا۔ چونکہ میں منگّا سے ہمدردانہ انداز میں بات چیت کرتی تھی اس لئے وہ کبھی کبھی شہر آتے جاتے ہمارے گھر پر آجاتی۔ وہ آنگن میں بیٹھ جاتی، ادھر اُدھر کی باتیں کرتی یا پان سپاری کھاتی اور کبھی کبھی مانگ بھی لیتی اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد گاؤں واپس چلی جاتی۔ اگر میرے پاس وقت ہوتا تو وہ اپنی گھریلو پریشانیوں کا حال سناتی اور مجھ سے میرے گھر کا حال پوچھتی۔ میرے پاس سنانے کو کچھ نہیں تھا۔ بھگوان کی دیا سے میرے گھر کا حال بالکل ٹھیک تھا۔ زیادہ سے زیادہ بُری خبر صرف میں یہی سنا سکتی تھی کہ بلّی آکر دودھ پی گئی یا رات کو چوہے کھیرے یا ککڑیاں کھا گئے۔

جب میں ایسی باتیں اُسے سناتی تو منگما ہنستی - ہاں یہی دنیا کا رنگ ڈھنگ ہے اور پھر وہ اپنے تجربے سنانے لگتی جس میں اس اس سرکش دنیا کو رام کرنے کے اشارے ہوتے۔ اس طرح ہم اور منگما ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے تھے۔

مہینے بھر کی بات ہے ایک دن منگما میرے گھر آئی اور معمول کے مطابق پوچھنے لگی کہ کیا دہی چاہیئے۔ میں اندر تھی۔ میرے چھوٹے لڑکے نے اثبات میں جواب دیا اور اس کے پاس پہونچ کر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دئے کہ اس میں دہی دے دو۔ منگما بیٹھ گئی اور اس نے دہی کا ایک موٹا ٹکڑا اس کے ہاتھوں میں دے دیا اور بولی "آماں سے کہو جلد آئے مجھے جانا ہے۔" اتنی دیر میں میں باہر آگئی۔ منگما کہنے لگی "امیا۔ تمھارا لڑکا ہیرا ہے ہیرا۔ تم جتنی اچھی ہو، تمھارا لڑکا بھی ویسا ہی ہے — لیکن امیا - اس کا فائدہ کیا ہے - یہ تمھارا بیٹا اس وقت تک تمھارا بیٹا رہے گا جب تک کہ چھوٹا ہے۔ جب بڑا ہو جائے گا تو کوئی اور آجائے گی اور اس کو اپنے بس میں کرے گی - اور جو لڑکا اتنے پیار سے آج ماں ماں پکارتا ہے - پھر یہ بھی نہ پوچھے گا کہ ماں زندہ ہے یا مر گئی"

میں نے کہا - "معلوم ہوتا ہے کوئی بات ہوئی ہے - میرا خیال ہے کہ تمھارا لڑکا تمھارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا۔"

"ہاں - میں سمجھتی ہوں کہ کسی سے اچھے سلوک کی توقع رکھنا بیوقوفی ہے - میرے شوہر نے مجھے چھوڑ دیا۔ مجھے اپنے بیٹے سے بھی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیئے -"

"کیوں منگما، میرا خیال ہے کہ تم اپنے شوہر کے ساتھ خوش تھیں۔"

"بات یہ ہے امیا کہ میں نے کبھی اچھی اچھی ساڑیاں پہننے اور بناؤ سنگار کرنے کی طرف دھیان نہیں دیا دوسری عورت نے ایسا کیا اور میرے شوہر کو ریجھا لیا - میں نے سب کچھ چپ چاپ برداشت کر لینا ہی بہتر سمجھا - لیکن میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ گھر بار اور بیوی بچے اسی کے ہیں اور وہ جب چاہے واپس آسکتا ہے - مجھے اس کی شکایت نہیں کرنی چاہیئے امیا - لوگ کہتے ہیں کہ ہم دودھ دہی بیچتے ہیں جو امرت ہے - یہ گناہ ہے اور مجھے اس گناہ کی سزا ملی - میں نے اپنا شوہر کھو دیا یہ میری قسمت! لیکن امیا تمھیں احتیاط کرنی چاہیئے - جب تمھارا شوہر گھر آئے تو تمھیں اچھی اچھی ساڑیاں پہننی چاہیئیں - مردوں کا کوئی بھروسہ نہیں - انھیں خوبصورت ساڑی اور بلاؤز پہن کر لبھاتے رہنا چاہیئے - پھول اور عطر خریدو اور اپنے کو دلکش بنائے رکھو۔" پھر اس نے میری ساڑی کی طرف دیکھا جو میں پہنے ہوئے تھی اور سر ہلاتے ہوئے کہا - "یہ ساڑی اس وقت کے لئے ٹھیک ہے جب تم اکیلی ہو اور رسوئی میں کام کاج کر رہی ہو لیکن شام کے وقت تمھیں اس ساڑی کو ضرور بدل لینا چاہیئے اور کوئی اچھی اور خوبصورت ساڑی پہن لینا چاہیئے -"

میں ہنسنے لگی - بات اس نے پتے کی کہی تھی لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ یہ سب کچھ جاننے کے لئے اسے برسوں دکھ اور مصیبتیں جھیلنی پڑیں -

"تم ٹھیک کہتی ہو منگما" میں نے کہا -

"دیکھو امیا شوہر کو قابو میں رکھنے کے چار طریقے ہیں - کچھ لوگ کہیں گے کہ جڑی بوٹی کھلاؤ - لیکن جڑی بوٹی بعض مرتبہ نقصان کچھ بھی پہونچا دیتی ہے - ایسی باتوں پر کان نہ دھرنا - یوں انھیں اچھی اچھی چیزیں کھانے کو دو - گھر میں چاہے تکلیف ہی کیوں نہ ہو مگر اچھے کپڑے پہنو، دیکھنے میں اچھی لگو اور ہمیشہ مسکراتی رہو - گھر کی ضرورت کا سامان مہینے میں ایک بار منگوا لیا کرو تاکہ انھیں بار بار بازار نہ جانا پڑے - تھوڑا روپیہ بچا کر رکھو اور جب کبھی وہ مانگیں روپئے دو روپئے دے دیا کرو - شوہر کو قابو میں رکھنے کے لئے یہی جڑی بوٹی درکار ہے اگر کوئی عورت ان باتوں پر عمل کرے تو اس کا شوہر کتے کی طرح اس کے پیچھے پھرے گا - اگر وہ یہ باتیں بھول گئی تو اس کے شوہر کا دل ادھر اُدھر بھٹکنے لگے گا -"

"یہ عورت عقل مند ہے" میں نے دل میں کہا اور پھر وہ چلی گئی -

کوئی پندرہ روز بعد وہ ایک دن صبح کو آئی تو بڑی اداس تھی -

"کیا بات ہے منگما -" میں نے پوچھا -

"کوئی خوشی کی بات نہیں ہے امیا -" اس نے اپنی آنکھوں کو ساڑی کے پلو سے پونچھتے ہوئے کہا - "سمجھتی ہوں کہ کسی کو میری ضرورت نہیں ہے -"

"کیا ہوا؟ کیا بیٹے سے جھگڑا ہو گیا؟"

"جھگڑا! ارے کیا نہیں ہوا امیا۔ میں تمہیں اپنے پوتے کے بارے میں بتا چکی ہوں۔ اس نے کوئی شرارت کی اور اس کی ماں اسے پیٹنے لگی۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے کہا کہ تو کتنی ظالم ہے کہ اس معصوم بچے کو راکھشسنی کی طرح پیٹ رہی ہے۔ پھر وہ ڈھٹائی سے میرے منھ آنے لگی۔ مجھے کوسا اور گالیاں دیں۔ "کیا اس سے بھی تم ایسی باتیں کرتی ہو جس نے تمھارے شوہر کو جنم دیا۔" میں نے کہا۔ "اسے گھر آنے دے وہی اب تیری خبر لے گا۔" جب وہ گھر آیا تو جو کچھ ہوا تھا میں نے اسے کہہ سنایا اور کہا کہ "کیا تم اسے صحیح راستے پر نہیں لا سکتے؟"

"مجھے صحیح راستے پر نہیں لا سکتے۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔" وہ بیچ میں بول پڑی۔ "کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں ہے کہ اپنے بچے کو ٹھیک کر سکوں۔ کیا میں نے اپنے بچے کو اس طرح جنم نہیں دیا ہے جس طرح تم نے اپنے بیٹے کو پیدا کیا ہے۔"

وہ اس کی بیوی ہے اور میں صرف ماں۔ وہ اسے کسی وقت بھی میرے خلاف کر سکتی ہے اور میں کچھ نہیں کر سکتی۔ آخر وہ بولا "ماں دیکھو، یہ اس کا بیٹا ہے۔ تم کیوں بیچ میں دخل دیتی ہو۔ تم اگر کسی کو ٹھیک کرنا چاہتی ہو تو میں موجود ہوں۔"

"تو تمھارا خیال ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔"

"میں غلط صحیح کچھ نہیں جانتا لیکن غالباً تم اس سے انکار نہیں کر سکتیں کہ اسے اپنے بچے کو سزا دینے کا حق ہے۔"

"میں سمجھ گئی۔ تم پوری طرح اس کے بس میں ہو۔ وہ اپنے بچے کو چاہے اور مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کرے اور تمھارے نزدیک یہ سب ٹھیک ہے۔ کل وہ تم سے کہے گی کہ مجھ کو گھر سے نکال دو اور اگر تم ایسا کر بیٹھو تو مجھے تعجب بھی نہ کرنا چاہیئے۔"

"ماں۔ تم مجھے کیا کرنے کو کہتی ہو۔ مان لو اگر تم مجھ سے یہ کہو کہ اگر میری بیوی اس گھر میں رہے گی تو تم نہیں رہو گی۔ یا اگر تم یہاں رہو تو اسے اس گھر میں نہیں رہنا چاہیئے۔ اور اگر مجھے دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو تو دیکھو۔ وہ بیچاری بے سہارا اور بے بس عورت ہے......"

"اور میں بے سہارا نہیں ہوں۔ میری دیکھ بھال کون کرے گا۔"

"تم نے روپے جمع کر رکھے ہیں۔ تمھارے پاس گائیں اور بچھڑے ہیں۔ تم کسی کی محتاج نہیں ہو۔"

"تو تم چاہتے ہو میں تم لوگوں سے الگ ہو جاؤں۔"

"تمھاری مرضی۔ اگر تم اپنا کھانا پینا الگ کرنا چاہتی ہو تو میں روکتا نہیں۔ اس لڑائی جھگڑے سے میں بہت عاجز آ گیا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ آج دوپہر ہی سے میں تم لوگوں سے الگ ہوئی جاتی ہوں۔ تم میاں بیوی خوش رہو۔" اور پھر میں دہی لے کر چلی آئی۔" اپنی بات ختم کرتے کرتے منگما رو پڑی۔ میں نے اسے سمجھایا اور تسلی دی۔ "میں جانتی ہوں کہ جب تم گھر جاؤ گی تو پہلے ہی کی طرح ان کے ساتھ رہو گی۔ گھروں میں ایسی باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں اور خود بخود ختم بھی ہو جاتی ہیں۔"

دوسرے دن جب وہ آئی تو بڑی گمبھیر نظر آ رہی تھی۔ لیکن پہلے کی طرح خوش دکھائی نہ دیتی تھی۔ میں نے پوچھا "کیا بیٹے سے تمھاری صلح ہو گئی۔" "صلح"! کیا تم سمجھتی ہو کہ میری بہو ماں بیٹے میں میل ملاپ رہنے دیگی؟ کل میرے گھر پہونچنے سے پہلے ہی اس نے میرے برتن، دالیں اور چاول سے بھرے ہوئے مٹکے، کچھ نمک اور مرچیں ایک طرف کو رکھ دی تھیں۔ دونوں میاں بیوی کھانا کھا چکے تھے اور وہ چٹائی پر نہایت بے فکری سے پڑی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ لوگ مجھے الگ کرنے کے لئے کوئی بہانہ ڈھونڈھ رہے تھے اور اب انھیں یہ بہانہ ہاتھ آ گیا۔ دیکھو امیا وہ لوگ کیسے بدل گئے ہیں۔ ہر روز آنے سے پہلے میں ان کے بچے کو دہی دیا کرتی تھی۔ آج وہ ٹھیک اس وقت بچے کو لے کر باہر نکل گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ نہیں چاہتی کہ میں بچے سے بھی بات کروں۔"

مجھے تعجب ہوا کہ اتنی معمولی سی بات کا بتنگڑ بن گیا۔ لیکن میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ چند رسمی باتوں کے بعد میں نے اسے رخصت کر دیا۔

اس کے بعد ایک دو روز تک منگما نے ان باتوں کو نہیں چھیڑا۔

میں نے سمجھ لیا کہ وہ الگ رہ رہی ہے۔ پھر ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا کہ مخمل کا جو جیکٹ تم پہنے ہوئے ہو اس کی قیمت کیا ہے؟"

"تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہے منگما؟" میں نے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ اب تک میں اپنے بیٹے اور پوتے کے لئے روپیہ بچاتی تھی۔ اب مجھے روپیہ جمع کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ اپنے لئے مخمل کا جیکٹ خرید لوں۔"

"اس کے دام غالباً سات آٹھ روپے ہیں۔"

وہ چلی گئی اور معلوم ہوتا ہے کہ گھر واپس جاتے ہوئے اس نے مخمل کا جیکٹ خرید لیا کیونکہ جب وہ دوسرے دن آئی تو جیکٹ پہنے ہوئے تھی۔

"تم نے میرا یہ اچھا لباس دیکھا امّیا؟ جب میرا پتی میرے ساتھ تھا تو میں نے کبھی کوئی اچھی ساڑی نہیں خریدی۔ وہ کسی دوسری عورت کا دیوانہ ہو گیا۔ میں اپنے بیٹے کے لئے روپیہ جمع کرنے لگی۔ اور تم جانتی ہو کہ اس نے مجھے الگ کر دیا۔ اب میں مخمل چڑھائے ہوئے ہوں!"

میں سوچنے لگی کہ اس کے لڑکے نے اسے الگ کر دیا ہے۔ اس صدمے کی وجہ سے کیا وہ ذہنی خلجان میں مبتلا ہو گئی ہے۔ جذبات کی شدّت میں بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے۔ مگر میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔

لیکن مخمل کے جیکٹ کا قصہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ اس کی وجہ سے گاؤں کے بعض لوگوں سے جھگڑا ہو گیا۔ گاؤں کا ایک لڑکا بنگلور کے کسی اسکول میں پڑھتا تھا۔ وہ بڑا فیشن ایبل تھا۔ کالر، ٹائی اور پینٹ وغیرہ پہنتا تھا۔ جب اس نے منگما کو دیکھا تو مذاق میں کہا "منگما یہ کون سا تہوار یا خوشی کا موقعہ ہے کہ تم نے مخمل کا جیکٹ پہن رکھا ہے....."

منگما کو غصہ آ گیا۔ "بدتمیز لڑکا۔ زبان سنبھال۔ اگر تو اپنی گردن میں اس کپڑے کا پھندا باندھ سکتا ہے تو میرے مخمل کے جیکٹ پر کیوں اعتراض کرتا ہے۔" دونوں میں تو تو میں میں ہونے لگی۔ لوگ جمع ہو گئے اور منگما کی ہنسی اڑانے لگے۔

یہ سارا واقعہ مجھے دوسرے دن معلوم ہوا۔ بہو نے اس واقعہ کے بعد اپنی رائے ظاہر کی اور منگما کو سنا کر پڑوسیوں سے کہنے لگی۔ "میری ساس میرے لئے ایک بلاؤز نہیں خرید سکتی۔ لیکن تم نے اس کا کپڑا دیکھا ہے؟"

"اپنے بیٹے کے بیاہ کے موقع پر میں نے دلھن کو نکلس، دو بُندے، چوڑیاں اور آویزے وغیرہ دئے تھے۔ اور ہر سال میں اس کے لئے کوئی نہ کوئی زیور خریدتی رہتی ہوں۔ لیکن بہو ان تمام باتوں سے مکر گئی۔" منگما نے اپنے بیٹے سے شکایت کی کہ تمہاری بیوی میرے کپڑوں کو دیکھ کر جلتی ہے اور وہ دنیا بھر سے کہتی پھرتی ہے کہ میں نے اسے کبھی کوئی چیز خرید کر نہیں دی۔ کیا میں نے اسے چوڑیاں، نکلس، بندے نہیں دئے ہیں؟" لڑکے کے کچھ کہنے سے پہلے اس کی بیوی بول پڑی۔ "ایسا لگتا ہے کہ بیوہ بڑھیا بندے اور نکلس پہننا چاہتی ہے۔ وہ اپنی دی ہوئی چیزیں واپس لے کر اپنا بناؤ سنگار کرے۔" "بس بس"۔ شوہر نے بیوی کو جھڑکا۔ پھر وہ ماں سے مخاطب ہوا۔ "ماں میں ان جھگڑوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ اگر تم وہ زیور واپس لینا چاہتی ہو جو تم نے میری بیوی کو دئے ہیں تو تم لے سکتی ہو۔"

"دیکھو امّیا۔ اسے چاہئے تھا کہ اپنی بیوی کو منع کرتا کہ وہ پڑوسیوں سے میرے بارے میں نامناسب باتیں نہ کرے۔ اس کے برخلاف وہ مجھ سے زیور واپس کرنے کی بات کر کے نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ میں اپنی زندگی سے عاجز آ گئی ہوں۔"

مجھے اس کی حالت پر بڑا ترس آیا۔ وہ بوڑھی ہو چکی ہے اور وہی اس کا اکلوتا لڑکا ہے۔ یقیناً اس کی بیوی اپنی ساس کے ساتھ زیادہ بہتر سلوک کر سکتی تھی اور یہ تمام باتیں صرف اس وجہ سے ہوئی ہیں کہ اس بے چاری نے صرف یہی کہا کہ بچے کو نہ مارو۔ کچھ لوگ سمجھداری سے کام نہیں لیتے؟ لیکن عام طور سے جھگڑے اس طرح بڑھتے ہیں۔ اگر دو آدمی ایک دوسرے کو پسند نہ کرتے ہوں تو کوئی معمولی سی بات بھی لڑائی کا بہانہ بن جاتی ہے اور پھر سب لوگوں کو بے انتہا تکلیف اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس کے کچھ دنوں بعد منگمّا میرے پاس ایک درخواست لے کر آئی۔ "امیّا تم لوگ اچھے آدمی ہو اور میں تم لوگوں پر ہی بھروسہ کر سکتی ہوں۔ میرے پاس کچھ روپے جمع ہیں۔ کیا اسے وہاں رکھ سکتی ہوں جسے بینک کہا جاتا ہے۔ اس پر اب لوگوں کی نظریں پڑنے لگی ہیں۔"

"کیسا ہوا؟"

"میرے گاؤں میں ایک آدمی ہے انگیا۔ بانکا بنا پھرتا ہے اور جوا بھی کھیلتا ہے۔ کل جب میں دہی لے کر آ رہی تھی تو وہ میرے ساتھ ہو لیا اور بولا۔ "سب ٹھیک ٹھاک ہے نا منگمّا۔"

"ٹھیک ہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "تم تو جانتے ہو کہ مجھ پر کیا بیتی ہے؟"

"ہاں، منگمّا میں جانتا ہوں۔ تم ٹھیک راستے پر ہو۔ جب لوگوں کا سلوک ایسا ہو تو کوئی کیسے خوش رہ سکتا ہے۔ جوان اپنی زبانوں کو قابو میں نہیں رکھ سکتے اور ہم بوڑھے لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ وہ ایسی باتیں بھی کر گزرتے ہیں۔ لیکن منگما دنیا اس طرح چلتی رہتی ہے۔"

"آج وہ پھر مل گیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کہنے لگا منگمّا مجھے روپیوں کی سخت ضرورت ہے، کیا تم مجھے کچھ روپے ادھار دے سکتی ہو۔ فصل کی کٹائی کے وقت راگی بیچ کر تمہارا سب روپیہ چکا دوں ....." "روپیہ میرے پاس کہاں سے آیا۔" میں نے کہا۔

"ارے ہم سب جانتے ہیں، روپے کو زمین میں گاڑ کر رکھنے کا کیا فائدہ؟ منگمّا! تم میری مدد بھی کر سکتی ہو اور کچھ سود بھی کما سکتی ہو۔" کچھ دیر کے بعد وہ پھر بولا۔ "میں تم سے روپے نہ مانگتا اگر تم بہو اور بیٹے کے ساتھ رہ رہی ہوتیں۔ ظاہر ہے کہ تم ان لوگوں کو کچھ نہ کچھ دیتی رہتی تھیں لیکن اب تم ان سے الگ رہتی ہو۔"

"دیکھو امّیا جب کوئی عورت الگ رہتی ہے تو اس پر لوگوں کی نگاہیں پڑنے لگتی ہیں۔"

میں نے کہا کہ میں اس بارے میں اپنے شوہر سے بات کروں گی

دوسرے دن دہی تولنے کے بعد اس نے کہا۔ "چلو اندر چلیں تاکہ آپ کو روپے گن دوں۔"

"میں نے ابھی اپنے شوہر سے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا ہے منگما، پھر کسی دن روپے دے دینا۔"

"لیکن امیا مجھے ڈر لگ رہا ہے، انگیا نے درختوں کے جھنڈ کے پاس آج صبح مجھے پھر گھیر لیا۔ بیٹھ جاؤ منگما، تمہیں جلدی تو نہیں ہے۔ میں بیٹھ گئی کہ وہ کہیں زور زبردستی پر نہ اتر آئے۔ اس نے ادھر ادھر کی بہت سی باتیں کیں اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "تم کتنی اچھی لگتی ہو منگما۔" میا جب میں جوان تھی میرے شوہر نے بھی کبھی میرا ہاتھ نہیں پکڑا تھا لیکن آج یہ بات ہو گئی۔ میں فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور بڑی سختی سے بولی "بہت بے ہودہ ہو تم، انگیا تم میرے پتی نہیں ہو اور تمہیں اس سے کیا واسطہ کہ میں کیسی لگتی ہوں۔" کل وہ مجھ سے روپے مانگ رہا تھا اور آج میری عزت کے پیچھے پڑ گیا۔ شادی کے دن جو آدمی میرے پاس بیٹھا تھا اس پر متبرک چاول نچھاور کئے گئے تھے۔ اس نے مجھے اپنی بیوی بنایا تھا مگر وہ مجھے اپنی جوانی میں چھوڑ کر چلا گیا۔ کوئی دوسری عورت ہوتی تو بہک جاتی لیکن میں نے اپنی عزت پر حرف نہ آنے دیا۔ آج اس بدمعاش کی اتنی ہمّت ہو گئی کہ وہ میرا ہاتھ پکڑ لے۔"

منگما کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ "دیکھو منگما تم کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔ تم اپنے بیٹے کو سب کچھ بتا دو کیوں نہیں پچھلی باتوں کو بھول جاتیں اور مل جل کر رہنے لگتی ہو۔"

"اور اس طرح میں اپنی بہو کو اپنے بارے میں افواہیں پھیلانے کا موقع دے دوں تاکہ لوگ مجھے برادری سے نکال دیں۔ خیر اب دیر ہو رہی ہے۔ مہربانی کر کے اپنے پتی سے پوچھ لینا اور مجھے کل بتا دینا۔" ایک گھنٹے کے بعد وہ پھر واپس آ گئی۔ "میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔" وہ کہنے لگی۔

"کیوں، کیا ہوا؟"

"میں نے بچّے کے لئے کچھ مٹھائی خریدی۔"

میں سمجھی نہیں۔ اس نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ اس کے پوتے کو اس کے پاس آنے کی اجازت نہیں ہے۔

"کون سا بچّہ؟"

"ارے میرا پوتا اور کون سا بچّہ۔"

"لیکن تم نے تو کہا تھا کہ اسے تمہارے پاس آنے نہیں دیا جاتا؟"

"یہ ٹھیک ہے کہ اس کی ماں اسے روکتی ہے۔ کیا وہ مجھ سے الگ رہ سکتا ہے؟ جب اس کی ماں نہیں دیکھتی تو وہ میرے پاس بھاگ آتا ہے، دودھ پیتا ہے، دہی مانگتا ہے اور جب میں دودھ دہی دیتی ہوں تو خوشی سے ناچنے لگتا ہے۔ جب شرارتیں کرتا ہے تو میں کہتی ہوں کہ تیری ماں آکر لے جائے گی تو وہ چپ چاپ بیٹھ جاتا ہے۔ بچوں کی شرارتیں بڑی اچھی لگتی ہیں۔ اَمّیا۔ اس لئے میں نے آج اس کے لئے کچھ مٹھائی خریدی اور اپنی ٹوکری میں رکھ لی۔ شنکر پور کے نزدیک کوّا درخت سے اُترا اور مٹھائی لے کر چلتا بنا۔"

"تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ تم اور مٹھائی خرید سکتی ہو۔"

"ہاں، ہاں، مٹھائی تو میں خرید لوں گی۔ لیکن لوگ کہتے ہیں کہ کوّے کا چھو لینا بُرا شگون ہے۔"

"اگر کوا کسی کو چھو لے تو کیا ہوتا ہے؟"

"لوگ کہتے ہیں اس کا مطلب موت ہے۔ اس وجہ سے میں پریشان ہوں۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنے کو سمجھا لیا۔ میری زندگی کی کسی کو کیا پرواہ ہے۔ جتنی جلدی میں بھگوان کے چرنوں میں پہونچ جاؤں، اتنا ہی اچھا ہے۔"

"تو آج یہ واقعہ ہوا۔"

"بے وقوف نہ بنو اَمّیا۔ تو نے مٹھائی کا دونا ایسی جگہ رکھا تھا کہ کوئی بھی سمجھدار کوّا اسے لے بھاگتا۔ اور جب مٹھائی کوّا لے کر اڑ گیا ہے تو تم کہتی ہو بُرا شگون ہے۔ موت کی علامت ہے۔ گھر جاؤ زیادہ حماقت میں نہ پڑو۔"

"تو تم سمجھتی ہو کہ اس کا کوئی بُرا نتیجہ نہیں نکلے گا۔"

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو، گھر جاؤ۔"

اس عورت کی کیسی سمجھ ہے۔ وہ اپنے بیٹے، بہو اور پوتے کو چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ گھر کے سرپرست کی حیثیت سے اس کی عزت کی جائے۔ یہ خواہش بالکل فطری ہے۔ لیکن جب اسے یہ چیزیں نہیں ملتیں تو وہ زندگی سے بیزار ہو جاتی ہے۔ مرنا چاہتی ہے۔ پھر موت سے خائف بھی ہے۔ وہ اپنے اس ڈر کو چھپانا بھی چاہتی ہے۔ ہم لوگ کہتے ہیں کہ دیہات کے لوگ بڑے سیدھے سادے اور گنوار ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا ذہن اور اس کے خیالات کتنے پیچیدہ اور تہ در تہ ہیں۔ جسے ہم زندگی کہتے ہیں وہ کتنا انوکھا کھیل ہے۔

منگمّا جب دوسری مرتبہ آئی تو اس نے نئے حالات سے آگاہ کیا۔ اس کا پوتا اب اس کے پاس رہنے لگا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ "اس لڑکے کی ہمّت دیکھو۔" وہ کہنے لگی "ابھی وہ اتنا سا ہے، لیکن وہ اپنی ماں کو چھوڑ کر میرے پاس چلا آتا ہے پہلے وہ چھپ کر آتا تھا لیکن آج جب وہ آیا تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی ماں کے پاس واپس نہیں جائے گا۔ وہ آئی اور اس نے اسے مارنے کی دھمکی دی اور ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ لیکن وہ میرا گھٹنا پکڑ کر بیٹھ گیا اور وہیں جم گیا۔ ان دس دنوں میں مجھے اس مکان میں رہتے ہوئے اکیلا پن عجیب سا لگتا تھا۔ لیکن اس چھوٹے سے بچے کی موجودگی سے میری ہمّت بندھ گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی مرد میری حفاظت کے لئے موجود ہے۔ میرے جوان بیٹے نے مجھے الگ کر دیا لیکن میرا پوتا کہتا ہے کہ وہ کبھی مجھ سے الگ نہیں ہوگا۔ بھگوان نے ہی یہ بات اس کے دل میں ڈالی ہے۔ میری بہو ساری رات بگڑتی اور بک بک کرتی رہی مگر اس کا اس لڑکے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ صبح کو میں نے سوچا کہ میں اسے گھر میں اکیلا چھوڑ کر دہی بیچنے نہ جاؤں۔ میں اسے اس کی ماں کے کمرے کے دروازے تک پہونچا آئی اور وہ اندر چلا گیا۔"

"لیکن اگر اس نے اسے پیٹا تو؟"

"نہیں، وہ نہیں مارے گی۔ بعض اوقات وہ اس لئے مارتی ہے کہ ہر وقت اس کے پاس کیوں گھسا رہتا ہے۔ لیکن وہ خوش ہوگی کہ کم سے کم وہ آدھے دن تو اس کے پاس رہے گا۔ دیکھو اَمّیا جب ہم لوگ ساتھ رہتے تھے میں نے یہ کبھی محسوس نہیں کیا تھا کہ میری بہو کتنی خوب صورت ہے۔ جب وہ غصّہ

کرتی ہے تو البتہ اس کا چہرہ بگڑ جاتا ہے۔ وہ سُندر ہے اور اسی وجہ سے میرا لڑکا اس کا غلام بنا ہوا ہے۔ میں نے اپنے لڑکے کی طرف بھی کوئی خاص دھیان نہیں دیا تھا۔ اب میں اپنے مکان کے دروازے پر بیٹھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ وہ اتنی دیر سے گھر کیوں واپس آتا ہے یا اتنے سویرے کیوں چلا جاتا ہے۔ اسے بھی اپنے لڑکے کے بارے میں ایسا ہی محسوس کرنا چاہیئے۔ اگر وہ اسے مارے گی تو دوسرے دن میرے ساتھ شہر چلا جائے گا۔ کیا وہ چاہے گی کہ جس بیٹے کو اس نے جنم دیا ہے وہ اس کے ہاتھوں سے نکل جائے۔"

"سمجھدار عورت ہے۔" میں نے اپنے دل میں کہا اور مجھے محسوس ہوا کہ اب ان کے اختلافات جلد ہی ختم ہو جائیں گے۔

اور یہی ہوا بھی۔ بچہ دو دن تو ماں باپ کے ساتھ رہا مگر تیسرے دن اس نے ضد شروع کر دی کہ وہ دادی کے ساتھ شہر جائے گا۔ بھلا یہ بوڑھی عورت سر پر ٹوکری میں دہی کے برتن رکھے اور بچے کو گود میں لئے ہوئے شہر جا سکتی تھی؟ اس طرح ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اس کا بیٹا اور بہو اس کے پاس آئے اور بولے۔ "ماں ہم لوگ غلطی پر تھے۔ کیا تم اس رنجش کو اپنے دل میں رکھے رہوگی؟" پڑوسیوں نے بھی ان کی سفارش کی اور منگما ان لوگوں کے ساتھ رہنے لگی۔ وہ یہی چاہتی بھی تھی۔ اس طرح اس کی آن پر بھی کوئی حرف نہ آیا۔ لیکن بچے کو لے کر شہر جانا اب بھی مشکل تھا۔ لہٰذا ان لوگوں نے آپس میں ایک بات طے کر لی۔ منگما نے دودھ اور دہی کا بیوپار اب تک اپنے ہاتھوں میں رکھا تھا۔ ظاہری وجہ یہ تھی کہ بہو کو چوکا برتن کرنا پڑتا تھا مگر اصل وجہ یہ تھی کہ منگما روپیہ پیسہ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی تھی۔ اب چونکہ پوتا اس کے ساتھ شہر جانے کے لئے ضد کر رہا تھا اس لئے اب اپنے طریقے کو بدلنا ضروری تھا۔ بہو نے کہا۔ "اس بڑھاپے میں تمہیں ہر روز اتنی سخت دھوپ میں باہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اب وقت آ گیا ہے کہ تم کام چھوڑ کر آرام کرو۔ تم گھر کی بڑی بوڑھی ہو۔ لہٰذا تمہارے لئے یہی مناسب ہے کہ تم گھر پر رہو اور دیکھو کہ سب کام ٹھیک ہو رہا ہے کہ نہیں میں دہی بیچ آیا کروں گی۔ منگما راضی ہو گئی۔ "ٹھیک ہے۔ تم جایا کرنا۔ ہفتے میں ایک دو دن جب میرا جی چاہے گا میں بھی چلی جایا کروں گی۔"

ایک دن منگما اور اس کی بہو دونوں ساتھ آئیں۔ ان میں سے ایک کی گود میں بچہ تھا اور دوسری کے سر پر دہی کی ٹوکری تھی۔ "اُمیا یہ میری بہو ہے۔" منگما نے کہا۔ "یہ نہیں چاہتی ہے کہ اس کی بوڑھی ساس اب کام کرے۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا ہے۔ یہ کہتی ہے کہ اس عمر میں مجھے اتنی دھوپ میں دُور نہیں جانا چاہیئے۔ اب یہ تمہارے لئے دہی لایا کرے گی۔"

اس طرح منگما نے ہمیں اپنی بہو کا گاہک بنا دیا۔ میں ان سے کچھ دیر باتیں کرتی رہی اور سمجھاتی رہی کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ پھر پان سپاری سے تواضع کر کے انہیں رخصت کر دیا۔

اب تک اس جھگڑے کے بارے میں مجھے صرف منگما کی یعنی ایک فریق کی رائے معلوم ہوئی تھی اور میں دوسرے فریق کی رائے جاننے کی خواہش مند تھی۔ "تم تو اچھی اور سمجھدار عورت معلوم ہوتی ہو نیما' تم نے اپنی ساس کو نکال کیوں دیا تھا؟"

"میں ایسا کبھی نہ کرتی اُمیا۔ میں راکھشسنی تو نہیں ہوں۔ لیکن وہ ہر معاملے میں اپنی ٹانگ اڑاتی تھی اور من مانی کرتی تھی۔ میرے شوہر کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی۔ اگر گھر کے مرد کی طرح اس کی عزت نہیں کی جائے گی تو پھر وہ کس طرح کا مرد بنے گا اور پھر میری حیثیت کیا رہ جاتی اور میں کس طرح اس گھر پر حکومت کر سکتی تھی۔ میں نے کچھ دنوں تک ان باتوں کو برداشت کیا کیونکہ بہرحال وہ ان کی ماں تھی اور انہیں پالا پوسا تھا۔ لیکن جب اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ میں بچے کو نہ ماروں تو میں نے سمجھ لیا کہ اب چپ رہنے کا وقت نہیں رہا۔ مجھے اس کے خلاف آواز اُٹھانی چاہیئے کیا ماں کے ناتے مجھے کوئی حق حاصل نہیں ہے؟"

میں مسکرانے لگی۔ "تو تمہارے نزدیک ماں کی حیثیت سے اپنا حق جتانے کا مطلب یہ ہے کہ بچے کو پیٹا جائے۔"

"میں مارتی ہوں تو پیار بھی کرتی ہوں۔ اس لئے جو آدمی

باقی صفحہ [illegible] پر

اختر محی الدین

گونج

۱۹۴۷ء میں جب کشمیر میں ادبی تحریک ایک ہنگامہ خیز دور میں داخل ہوئی تو کچھ اہم تاریخی تقاضے کشمیری ادیبوں کے سامنے آئے۔ روایت سے بغاوت کا سلسلہ دراصل تحریک آزادی کے ساتھ ہی شروع ہوا تھا لیکن ۱۹۴۷ء کے ہنگامے نے ضبط و توازن، ہمواری اور میانہ روی کی اصلاحی قدروں کو انقلابی تصورات میں بدل دیا۔ کشمیری ادیبوں کے سامنے اہم ترین تاریخی تقاضا یہ تھا کہ اپنی زبان کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کرکے اپنی آواز زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیں۔ ایک کلچرل فرنٹ قائم ہوا اور ڈرامے، رقص و موسیقی اور شعر و شاعری کا گویا ایک طوفان امڈ آیا۔

کشمیری ادب کی تاریخ میں یہ دور انتہائی زرخیز ثابت ہوا۔ اسی دور میں کشمیری نثر ترقی کی منزلوں سے دوچار ہوئی۔ نئے نئے ادبی تجربے کئے گئے اور افسانہ نگاروں کی ایک نئی پود سامنے آئی جن کی تخلیقات نے کشمیری افسانہ کو نئے نئے افق عطا کئے۔

اختر محی الدین کے بعض افسانے اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اختر کے علاوہ دوسرے فنکار بھی افسانے کی دنیا میں مشہور و مقبول ہوئے۔ سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون، دینا ناتھ نادم، امین کامل، مہیش کول اور نور محمد روشن نے اچھی اچھی کہانیاں لکھیں۔

چونکہ کشمیری افسانے نے ہنگامی دور میں جنم لیا اسی لئے اس میں زندگی کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ ان افسانوں میں کشمیری معاشرے کی تصویریں رقصاں نظر آتی ہیں اور عام زندگی کے نشیب و فراز، سیاسی کش مکش اور معاشی مسائل اُجاگر ہوتے ہیں۔ اگرچہ کشمیری زبان میں افسانوی ادب کا سرمایہ بہت مختصر ہے لیکن اس کمیت میں کیفیت کا پلّہ بھاری ہے۔

گھنے بادلوں کی وجہ سے اندھیرا سا چھایا ہوا تھا اور سردی بھی بہت تھی۔ ہمارے تانگے کے پیچھے ایک اور تانگہ دوڑ رہا تھا۔ میری نگاہیں اس تانگے میں جتے ہوئے گھوڑے پر جمی ہوئی تھیں۔ پیتل کی چمکیلی کنپٹیاں، ماتھے پر رنگین رومال بندھا ہوا اور کانوں کے درمیان سر پر رنگین پروں کی کلغی لگائے ہوئے یہ گھوڑا بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ میں غور سے اس گھوڑے کو دیکھ رہا تھا اس کی اگلی ٹانگوں کے بیچ میں چھاتی کے سامنے کے پٹھے ایسے پھڑک رہے تھے جیسے ان کے اندر کوئی طوفانی طاقت بھری پڑی ہو۔ اس کی گردن کا جھکاؤ ارجن کی کمان جیسا تھا اور پتھریلی سڑک پر اس کے کھروں کی ٹاپ میں مجھے کسی بہت بڑی فولادی مشین کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایسی آواز جو بہت زبردست بھی تھی اور موسیقی کی حامل بھی۔ دوڑتے دوڑتے گھوڑا سر کو بار بار یوں جھٹک رہا تھا جیسے وہ تانگے سے نکل کر بھاگ جانا چاہتا ہے جیسے وہ آزاد ہو کر کہیں دور آسمان میں اڑنا اور تاروں کو روند ڈالنا چاہتا ہو۔ لیکن یہ چمکیلی کنپٹیاں، یہ ماتھے کا رنگین رومال، اور سر پر رنگین پروں کی کلغی چمڑے کے تسمہ سے تانگے کے ڈنڈوں

یں بندھی ہوئی تھی۔ ایک ہی آدمی کے ہاتھ میں تھی۔ جس کے دوسرے ہاتھ میں ایک چابک بھی تھا۔ لگام کے ایک سرے کو وہ آدمی پکڑے ہوئے تھا اور دوسرا سرا گھوڑے کے منہ میں تھا۔ گھوڑا اس لگام کے لوہے کو چبا رہا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ اور نتھنوں سے بھاپ نکل رہی تھی۔

اس گھوڑے کی آنکھیں کبھی بڑی خوبصورت ہوں گی۔ لیکن اب ان آنکھوں سے سفید پانی بہہ رہا تھا۔ اس کڑاکے کی سردی میں یہ گھوڑا دائیں بائیں دیکھے بغیر بے پروائی سے دوڑ رہا تھا۔ اُسے کیا معلوم کہ کس طرف کو جا رہا ہے؟ اُسے کیا معلوم کہ کس آدمی نے اس کی لگام پکڑ رکھی ہے؟ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ لگام پکڑنے والے کے جی میں کیا آئے اور وہ کس سمت میں دوڑنے کا اشارہ کر دے! اور وہ آدمی جس کے ہاتھ میں لگام تھی، نہ جانے کیوں خوش تھا اور لہک لہک کر گا رہا تھا۔

گھوڑے نے ایک بار اور اپنا سر جھٹک دیا۔ تانگے والے نے ایک چابک مارا اور گھوڑے کے منہ سے ایک چیخ سی نکل گئی۔ وہ دو ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ انسان کی طرح اُس کے بھورے بال اس کی گردن پر بکھر گئے، اور اور اس نے ہاتھوں سے تانگے کے دونوں بم پکڑ لئے اور رستی ہوئی آنکھوں سے دائیں بائیں گھورنے لگا، جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈ رہا ہو۔!!

اور میں کانپ اُٹھا۔ میں نے ان آنکھوں میں جو لاکھوں دیکھی ہیں اس انسان نما جانور کو جانتا تھا۔ اس کا چوڑا چکلا سینہ، لوہے کے بازو اور رانیں مجھے اب تک یاد تھیں۔ اس کا کچھ نام بھی تھا۔ لیکن نام میں کیا رکھا ہے۔ افریقہ میں اسے گرفتار کیا جاتا تھا اور لوہے کے پنجرے میں بند کر کے یورپ بھیج دیا جاتا تھا۔

یورپ کے عظیم محلات میں بہت بڑے احاطے ہوتے تھے اور ان میں چاروں طرف کرسیوں پر لوگ بیٹھتے تھے اور کھڑکیوں میں پھول جیسی نازک شہزادیاں کندھوں پر بال بکھیرے بیٹھی ہوتی تھیں۔ اور پھر ایک تماشہ ہوتا۔ پنجروں کے دروازے کھول دئے جاتے اور دیو ہیکل انسان نما جانور اکھاڑے میں دھکیل دئے جاتے۔ ان کے منہ میں زبان نہیں تھی، اور نہ کانوں سے کچھ سنتے تھے۔ چابک، اور کوڑے سے ان کو حکم دیا جاتا تھا کہ ایک دوسرے پر جھپٹے اور بھالے سے مسل کریں۔ جو ہارے گا وہ زندگی سے نجات پائے گا اور جو جیتے گا اُسے آزاد کر دیا جائے گا۔ یہ لوگ طوفان اور سمندر کی طرح بپھر کر ایک دوسرے پر حملہ کرتے، اگر کوئی بھاگنے کی کوشش کرتا تو اس کو چابکوں اور کوڑوں سے پھر اکھاڑے کی طرف دھکیل دیا جاتا۔ تب تک ان میں غصہ کی آگ بھڑک اُٹھتی۔ ان کی آنکھوں میں بجلیاں چمکنے لگتیں۔ اور ان میں سے کوئی ایک دوسرے کی چھاتی میں چھرا گھونپ کر اس کو زندگی سے نجات دلا دیتا۔ اور دوسرا؟ کھڑکی میں بیٹھی ہوئی کوئی حسینہ بال بکھیرے، سب کے دلوں کو اپنے پیروں سے روندتی ہوئی اکھاڑے کے درمیان میں اس فاتح کے پاس پہونچ جاتی اور تب اس شخص کو یعنی سمندر یا طوفان کو رسیوں سے باندھ کر لٹا دیا جاتا اور یہ حسینہ اپنے ہاتھوں سے اس کی چھاتی میں کٹار اُتار دیتی اور پھر اپنے نازک ہاتھوں میں خون کی مہندی لگا کر اُنھیں تماشائیوں کو دکھاتی۔

ان لال اور نازک ہاتھوں کو دیکھ کر لوگ خوش ہو جاتے تھے وہ زور زور سے ہنستے اور تالیاں بجاتے اور پھر تماشہ ختم ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد برسر اقتدار طبقہ کے لوگ اور مفکر خوش خوش اپنے گھروں کو لوٹتے اور کونوں میں دبک کر انگیٹھی کے پاس بیٹھتے اور فلسفہ اور آزادی کے موضوعات پر موٹی موٹی کتابیں تصنیف کرتے۔

کسی بھاری بھرکم فولادی مشین کی آواز ہمیشہ کانوں میں گونجتی رہی ہے۔ یہ آواز بھاری بھی تھی اور ترنم ریز بھی۔ اس کے نام بھی ہوا کرتے تھے ۔۔۔ امت، رعایا، پرولتاری ۔ لیکن یہ نام تو اس بھاری آواز کے نہیں، یہ کسی ادیبی خول کے نام ہو گئے۔ یہ نام تو بے جان ہیں۔ ان میں آگ نہیں بھری رہتی۔ ان سے خون نہیں رستا۔ لیکن میں شاید بہک رہا ہوں۔ مجھے بہکنا نہیں چاہئے۔ مجھے ایک کہانی یاد آ رہی ہے ۔۔۔ بھلا کیا تھی وہ کہانی ۔۔۔!

روس کی ایک شہزادی کا شوہر اسے پیار کر کے کبھی کبھی کہتا

"اب تمھیں اپنے اس پاگل عاشق کے کسی خط کا تو جواب دینا چاہیئے۔" اور یہ کہہ کر وہ خوب ہنستا تھا لیکن شہزادی ناک بھوں چڑھا کر غصہ میں جواب دیتی —— "کاش! مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ جنگلی کتا کہاں رہتا ہے۔ میں اسے گولی سے اڑا دوں۔"

شہزادی اپنے شوہر کو بہت چاہتی تھی۔ لیکن ایک دن ایک تجربہ کار عقل مند شخص نے شہزادی کے چہرے پر نظر ڈال کر کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ اس دنیا میں ایک شخص موجود ہے جس کو آپ سے سچی محبت ہو گی اور وہ آپ کے لئے اپنی جان دے دے گا۔"

شہزادی یہ بات سنتے ہی اس شخص کی تلاش کرنے لگی۔ وہ اکثر خواب میں ایک نوجوان کو دیکھتی جس کی صورت فرشتوں جیسی تھی اور جو فوجی وردی پہنے ہوئے تھا۔ وہ نوجوان دور سے ہی شہزادی کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتا۔ پیار سے مسکراتا اور غائب ہو جاتا۔ انہی دنوں شہزادی نے شہزادہ الوسوف کو دیکھا جو بہت ہی خوبصورت تھا اور جب ہی شہزادی کو کسی شخص کا ایک عجیب و غریب خط ملا جس میں اس سے اظہارِ محبت کیا گیا تھا۔ خط بھیجنے والے نے اپنا نام 'ساز' لکھا تھا۔ نام پڑھتے ہی نہ جانے کیوں شہزادی کو گھوڑے کا ساز یاد آیا۔ وہ خوب ہنسی کہ یہ کون بے وقوف ہے جس کا نام 'ساز' ہو سکتا ہے۔

وقت گزرتا گیا۔ ساز خط بھیجتا رہا۔ اس نے اسے ایک خط میں لکھا تھا کہ وہ شہزادی کی رعایا ہے، وہ بہت ہی معمولی اور غریب آدمی ہے، لیکن اس کو شہزادی سے عشق ہے۔ عشق جس میں اتنی ہی قوت ہے جتنی بھوک یا نیند میں ہوتی ہے۔

ایسے عاشق کو بھول ہی جانا چاہیئے تھا اور شہزادی اس کو بھول گئی۔ وہ آرام و آسائش کی زندگی گزار رہی تھی اور پھر اس کو کسی کا پیار بھی حاصل تھا۔ شہزادہ الوسوف میں وہ سبھی خوبیاں تھیں جو شہزادیوں کے عاشقوں میں ہونی چاہئیں۔ شہزادہ الوسوف سے شہزادی کی شادی طے ہو گئی۔

شہزادی کے لئے اتنے زیورات بنائے گئے جتنے شہزادیوں کے لئے عام طور سے بنائے جاتے تھے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں ساز بھی اس ذخیرے میں اپنا ایک تحفہ شامل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شہزادی کے لئے ایک انگوٹھی بھیجی۔ انگوٹھی کے ساتھ اس کا ایک خط بھی تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ یہ انگوٹھی اس کی ماں نے مرتے وقت دی تھی اور کہا تھا کہ جب تک ساز زندہ ہے وہ یہ انگوٹھی خود پہنے اور جب مرنے لگے تو کسی ایسے شخص کو دے جس سے اُسے محبت ہو اور اگر ساز کے کوئی اولاد ہو تو انگوٹھی اسے ہی دی جائے۔

شہزادی کو یہ انگوٹھی بدشگونی کی علامت معلوم ہوئی۔ اس کو بہت غصہ آیا۔ اس نے انگوٹھی پھینک دی، انگوٹھی بھیجنے والے کو وہ گولی سے اڑا دیتی۔ مگر وہ جانتی ہی نہ تھی کہ دراصل وہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔

شادی کے بعد شہزادی نے ایک دن شہزادہ الوسوف کو سارا واقعہ کہہ سنایا۔ شہزادہ سن کر خوب ہنسا اور ہنستے ہنستے اس نے کہا "مجھے اس پر رحم آتا ہے۔ اب تمھیں اس کے خط کا جواب دینا چاہیئے۔" یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگا۔

ساری بات اسی طرح ہنسی میں ختم ہو جاتی اور دھیرے دھیرے دونوں اسے سچ مچ بھول گئے ہوتے اور شہزادی اور شہزادہ الوسوف کی سچی محبت پھولتی پھلتی رہتی، اگر ایک دن شہزادی کی سالگرہ پر اچانک ایک پارسل نہ پہونچتا۔ اس پارسل میں شہزادی کے لئے سونے کا ایک معمولی ہار تھا اور ساتھ ہی ایک خط بھی، جس میں لکھا تھا:۔

"شہزادی! اگر میں تمھیں صرف ایک بار یہ ہار پہنے ہوئے دیکھ لوں تو سمجھوں گا کہ میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا، میرے سارے ارمان پورے ہو گئے اور مجھے ایسا سکون ملے گا جو کبھی برباد نہیں ہو سکے گا۔"

یہ ہار، یہ خط اور یہ عاشق —— شہزادی کو لگا جیسے کسی نے سب کے سامنے اس کی بے عزتی کر دی ہو۔ غصہ میں اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور اپنے شوہر سے کہا کہ اگر اس شخص کا فوراً پتہ نہ لگایا گیا اور اسے مناسب سزا نہ

دی گئی تو میں زہر کھا کر اپنی جان دے دوں گی۔

شہزادہ الوسوف اس بار بھی اس معاملے کو اسی طرح ہنس کر ٹالنے کی کوشش کرتا، جیسے وہ ہمیشہ کرتا تھا۔ مگر اس نے سوچا کہ اس معاملے میں کوئی کارروائی نہ کی گئی تو ساز سمجھے گا کہ شہزادی نے ہار قبول کر لیا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے سامنے ڈینگیں مارے گا کہ شہزادی اس کے تحفے قبول کر لیتی ہے۔

یہ سوچ کر اس نے جاسوسوں سے ساز کا پتہ لگانے کو کہا اور پتہ معلوم ہو جانے پر خود ہی اس کے گھر پہونچ گیا۔

دُبلا پتلا، لمبے قد کا، سرمئی آنکھوں اور خوبصورت بالوں والا ساز دیکھنے میں مہذب آدمی لگتا تھا، شہزادہ الوسوف اسے ڈانٹنے، پھٹکارنے اور سزا دینے کی نیت سے آیا تھا، لیکن اسے دیکھ کر شہزادے کا غصّہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ پھر بھی وہ سخت لہجے میں بولا —" تم شہزادی کے اصطبل کے گھوڑے کی طرح ہو۔ تمھیں یہ ہمّت کیسے ہوئی کہ شہزادی کو خط لکھتے رہو۔ میں چاہوں تو ابھی تمھیں ختم کرا سکتا ہوں۔"

ساز نے جواب دیا —" یہ سچ ہے کہ میں اس کے سامنے اصطبل کا گھوڑا ہوں۔ مجھے خود تعجب ہے کہ اس کو خط لکھنے کی جرأت مجھے کیسے ہوئی۔ لیکن سچ جانیئے کہ میں واقعی مجبور ہوں۔ میرے لئے وہی سب کچھ ہے۔ میں اسے دیوی سمجھتا ہوں اور اس کی پوجا کرتا ہوں۔ میں جیسے اسی کے لئے زندہ ہوں۔ میرے دل میں وہی بستی ہے۔ مگر ذرا ٹھہریئے۔ آپ دس منٹ ٹھہریں۔ میں ابھی لوٹ کر آپ کو اپنا قطعی اور آخری جواب دوں گا۔"

یہ کہہ کر ساز کمرے میں چلا گیا۔ شہزادہ الوسوف غصّہ سے کانپ رہا تھا۔ وہ فیصلہ بھی نہ کر سکتا تھا کہ اس گستاخی پر اس لڑکے کو کیا سزا دے۔ آخر میں وہ اس نتیجے پہ پہونچا کہ کوئی بہانہ نکال کر اسے موت کی سزا دلوائے گا یا کسی غنڈے سے کہہ کر اسے مروا ڈالے گا۔

شہزادہ ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ساز واپس آگیا اس کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ خوش تھا اور خوشی کی ترنگیں اس کی سرمئی آنکھوں میں چمک رہی تھیں۔ اس نے شہزادہ الوسوف سے کہا " میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ آج سے آپ میرا نام بھی نہ سُن پائیں گے۔ میں نے شہزادی سے ٹیلی فون پر بات کی ہے۔ وہ بولی کہ میں تمھارا نام بھی سننا نہیں چاہتی اور نہ یہ چاہتی ہوں کہ تم جیسا کوئی آدمی اس دنیا میں رہے۔ اس کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں آج ہی اپنا بندوبست کر لوں گا — اچھا اب آپ جا سکتے ہیں۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ آج میں نے شہزادی کی آواز اپنے کانوں سے سنی ہے۔"

شہزادہ الوسوف ساز کو چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ اس کو اطمینان ہوا کہ اس پاگل نے خود ہی یہ فیصلہ کر لیا اور اسے زیادہ سر نہیں کھپانا پڑا۔

اسی شام کو شہزادہ الوسوف اور شہزادی نے اخبار میں ایک خبر پڑھی — خبر یہ تھی — کہ شہر کے کسی محلّے میں ایک شخص نے خودکشی کر لی ہے۔ خودکشی کی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ پتہ چلا ہے کہ اس شخص نے کچھ دن پہلے اپنی ساری جائیداد بیچ دی تھی جس سے اُسے ۵۰۰ روبل ملے تھے۔ ان روبلوں سے اس نے سونے کا ایک ہار بنوایا تھا۔ اس نے اپنے وصیت نامہ میں لکھا ہے کہ یہ ہار دیوی کے گلے میں ڈال دیا جائے۔ اس شخص کا نام ساز بتایا جاتا ہے۔ —

یہ خبر پڑھتے ہی شہزادی کے ہاتھ سے اخبار گر پڑا۔ یکایک اس کو وہ تجربہ کار بوڑھا یاد آگیا جس نے اس کے ماتھے پر نگاہیں ڈال کر کہا تھا —" مجھے لگتا ہے کہ اس دنیا میں ایک شخص موجود ہے جس سے آپ کو سچّی اور بے لاگ محبت ہے۔"

شہزادی بے چین ہو اٹھی۔ اس کی زبان خشک ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ جب رات گزر گئی تو سویرے بھیس بدل کر وہ اپنے محل سے نکلی اور اس محلّے میں پہونچی۔ ایک جھونپڑی میں لاش پڑی ہوئی تھی۔ شہزادی جھونپڑی کے اندر چلی گئی۔ اور اس نے دیکھا، اس نے پہچانا۔ اس نے اس شخص کو اپنے خوابوں میں نہ جانے کتنی بار دیکھا تھا۔ وہ اس شخص کو اپنے خاندان میں ڈھونڈتی رہی تھی۔ مگر وہ وہاں کہاں تھا۔ وہ تصویر تو اب یہاں

(بقیہ صفحہ ۶۰ پر)

میل رنر

جدید ملیالم افسانہ کی عمر کوئی پچیس تیس سال کی ہے۔ دوسری زبانوں کی طرح ملیالم افسانے نے بھی مغربی اثرات کو قبول کیا اور ترقی پائی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے پہلے ملیالم زبان میں افسانوی ادب تھا ہی نہیں۔ بلاشبہ بڑے بڑے افسانہ نگار موجود تھے جنھوں نے بہت کچھ کتھا سری ساگر کے طرز پر افسانے لکھے۔ ان پر مغربی ادب کا کوئی اثر نہ تھا۔ بال کرشن پلّے نے نئے افسانہ نگاروں کو موپاساں، چیخوف اور دوسرے غیر ملکی ادیبوں سے روشناس کرایا۔ انھوں نے خود بھی بہت سے افسانے ملیالم میں ترجمہ کئے جس نے ملیالم افسانہ کو بہت فائدہ پہنچایا اور اس کے اثرات دُور رس ثابت ہوئے۔ تاکازی شیوشنکر پلّے، پی۔ کیشو دیو، ایس۔ کے۔ پوٹے کاٹ اور وائیکم محمد بشیر جدید افسانہ نگاروں کے پیش رو ہیں۔ ان لوگوں نے نہ صرف افسانے کی تکنیک بلکہ اس کے مواد میں بھی انقلاب پیدا کیا۔ انھوں نے سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل کا اضافہ کیا، اور اس طرح افسانے میں ایک نئی جان ڈال دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ افسانہ ملیالم ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل کر چکا ہے اور اس کی مقبولیت کہیں سے کہیں پہونچ گئی ہے۔

ملیالم افسانہ کی ترقّی کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ مختصر افسانہ کے کل ہند مقابلے میں ملیالم افسانہ اوّل رہا۔

نئی گرام سدھار اسکیم عمل میں آئی تو شمالی بے ناٹ کے کنتو جرگاؤں کا برانچ پوسٹ آفس، سب پوسٹ آفس بنا دیا گیا اور گاؤں کی طرف ایک لاری رینگتی کراہتی آئی جس پر انگریزی میں 'میل' لکھا ہوا ایک لال تختہ لٹکا دیا گیا تھا۔

روزانہ کی طرح اس دن سویرے ڈاک کی تھیلی لے جانے کے لئے جب میل رنر اذکّن حاضر ہوا تو ڈاک بابو نے اس سے کہا۔ تمھیں نوکری سے برخاست کر دیا گیا ہے تم ایک مہینہ کی تنخواہ لے کر آج ہی گھر جا سکتے ہو۔ ہیڈ آفس سے اطلاع آئی ہے۔

اذکّن ایک آدمی باسی ہریجن تھا۔ ڈاک بابو نے جو کچھ کہا اس کا مطلب وہ سمجھ نہیں سکا۔ وہ منھ کھولے ڈاک بابو کی طرف دیکھتا رہ گیا جیسے گلے میں کوئی جونک چپک گئی ہو۔

"اب میل رنر کی ضرورت نہیں" ڈاک بابو مہر کی تاریخ بدلتے ہوئے بولا۔ "ڈاک کی تھیلی لے جانے کے لئے میل بس آ گئی ہے۔"

"ہوں" اذکّن کچھ اس طرح بولا جیسے کوئی بلّی کا بچہ رو رہا ہو۔ کمرے کے ایک کونے میں منگل سوتر پہنے دُلھن جیسی گُم سُم بڑی ڈاک کی تھیلی کی طرف پیار سے اس نے دیکھا اور وہیں کھڑا

رہتا۔

ڈاک بابو نے اُسے ایک پیلا کاغذ پکڑا دیا۔ یہ تھا ہیڈ آفس کا پروانہ! پھر ایک بڑی بہی کھول کر سامنے رکھی، اونگن کے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا پکڑ کر بہی کے ایک کونے میں نشان لگوایا۔ اس کے بعد دس روپے کے دو نئے نوٹ سامنے رکھ کر ڈاک بابو اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ اونگن اب بھی نہیں گیا۔ اسے اور کچھ کرنا دھرنا نہیں تھا۔ اس نے اپنے انگوٹھے کی طرف گھور کر دیکھا پھر سیاہی لگے انگوٹھے کو ماتھے پر رکھ کر ایک تلک بنایا۔ پیلا کاغذ اپنے کپڑوں میں چھپایا اور ان نئے نوٹوں کو اُٹھا کر سونگھا۔ ان میں سے خوشبو نکل رہی تھی، نئے بانس کے دانوں کی سی خوشبو! ان نوٹوں کو بھی پلّو میں باندھ کر وہ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے چاہا کہ انھیں ہوا میں اڑا دے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ خاکی قمیض کی جیب میں رکھ لیا۔

"اونگن! ابھی گیا نہیں —" ڈاک بابو کی روکھی آواز گونجی۔ وہ چونک پڑا، جیسے کسی شیر کی دہاڑ سنی ہو۔ اس نے بابو کی طرف ٹیڑھی نگاہ سے دیکھا۔ پھر کونے میں پڑی ہوئی دولھن کی طرف آخری بار دیکھ کر دھیرے سے باہر چلا گیا۔

وہ جائے کہاں؟ کوئی جگہ نہیں جہاں وہ جا سکے۔ ایک بھوت کی طرح وہ اندھیرے میں چکر کاٹتا رہا۔ پھر راستہ پہ آگیا اور وہاں سورپہ کانت کے پیڑ کی باہر نکلی ہوئی موٹی موٹی جڑوں پر اس نے دھرنا دینے کی تیاری کی۔ اپنے بچپن اور ڈاک کے محکمہ سے متعلق اپنی لمبی زندگی کی خواب جیسی تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگیں۔

چودہ سال کی عمر میں اپنے باپ کے ساتھ میسور کھیدے پر جانا، چھ مہینے تک وہاں بھیلوں کے ساتھ 'کاکن کوٹ' کے جنگلوں میں ہاتھی پکڑنے کی تیاری میں رہنا اور کھیدا شروع ہونے پر ہاتھی کے شکاریوں کے ساتھ ہلا گلا مچاتے ہوئے سارے جنگل میں گھومنا وغیرہ۔ یہ سب باتیں اس نے یاد کیں، واہ! کیسے رنگین اور دل چسپ تھے وہ دن!

پھر اس کا باپ پیٹ کے درد میں مبتلا ہو کر چل بسا۔ وہ اپنے گاؤں واپس آگیا۔ کچھ سال جنگل میں پیڑ کاٹنے کے لئے آنے والوں اور ہاتھی کا شکار کرنے والوں کی مدد کرتے ہوئے کسی طرح بتائے۔ اسی دوران میں شادی بھی کر لی۔ ابھی شادی کو دو ہی سال ہوئے تھے کہ اس کی بیوی کسی دوسرے بھیل کے ساتھ میسور بھاگ گئی۔ پھر سے شادی کرنے کا اس نے کبھی خیال ہی نہ کیا۔ اس کا سب سے بڑا ارمان تھا مہاوت بننا۔ جو کبھی پورا نہیں ہوا۔

اسی دوران میں 'کن توجر' کے چائے کے باغات کے پاس ایک ڈاک خانہ کھلا۔ ڈاک کے محکمہ والوں کو وہاں ایک 'میل رنر' کی ضرورت تھی۔ لیکن کوئی بھی درخواست نہ آئی۔ وجہ یہ تھی کہ برانچ آفس سے سب آفس پانچ میل دور تھا اور بھیانک جنگل سے ہو کر راستہ طے کرنا پڑتا تھا، وہاں خونخوار ہاتھی پائے جاتے تھے — اور تنخواہ صرف دس روپے۔

کسی نے اونگن کو اکسایا اور نوکری اس کو مل گئی۔ اونگن کا تقرر کرتے ہوئے پہلے ڈاک بابو ہچکچا رہا تھا، جنگلوں میں بھٹکنے والے بھیل کو کوئی ذمہ داری کا کام سونپنا کہاں تک ٹھیک ہوگا، ڈاک کی تھیلی میں چائے کے باغات کے گوروں کے نام آنے والے خطوں کے علاوہ طرح طرح کی قیمتی چیزیں بھی رہتی ہیں۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ڈاک بابو کا اندیشہ دور ہوگیا۔ اُسے یقین ہوگیا کہ اس کام کے لئے خوش قسمتی سے ہی اونگن جیسا آدمی ملا ہے۔ ڈاک کی تھیلی کندھے پر رکھے ہاتھی کی تازہ لید پر، جس میں سے بھاپ نکل رہی ہو، پیر رکھتے ہوئے بانس کے جنگلوں میں سے بھاگنے میں اسے بڑا مزہ آتا تھا۔

سرکار کی طرف سے اپنی حفاظت کے لئے اور اختیار کی نشانی کے طور پر اونگن کو ایک بھالا دیا گیا تھا۔ بانس کا بھالا جس کے ایک سرے پر گھنگھرو لگا ہوا تھا۔ وہ جنگلی جانوروں کو ڈرانے اور اپنی آمد کی اطلاع دوسروں کو دینے کے ارادے سے گھنگھرو کو زور سے ہلاتے ہوئے بھاگتا۔ ہمیشہ دوڑتے رہنے کی ضرورت نہ ہونے پر بھی اونگن نے سمجھ رکھا تھا کہ سرکار کا حکم ہے کہ دوڑتے

ہی رہنا چاہیئے۔ اس نے لوگوں سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر گھنگرو کی آواز سننے پر بھی کوئی راستے سے ہٹ نہیں جاتا تو اسے جان سے مار دینے کا اختیار بھی سرکار کی طرف سے اُسے ملا ہوا ہے لیکن کبھی اس اختیار کو کام میں لانے کی نوبت نہیں آئی۔

وہ روزانہ دس میل چلتا۔ جنگلی جانوروں کے گھومنے پھرنے کی جگہ یعنی بانس کے بنوں کے پاس پہونچ کر وہ بہت خوش ہوتا۔ ہفتہ میں دو چار بار وہ ہاتھیوں سے ملاقات ضرور کرتا۔ اس وقت بھاگنے کی بجائے ان کے پاس جاکر طرح طرح کی بولیاں بولتا ہوا ناچتا، کودتا اور ان کو تنگ کرتا۔ ہاتھی کی ساری عادتوں اور رنگ ڈھنگ سے وہ واقف تھا۔ ان کی پکڑ سے چھوٹ جانے اور پیچھا کرنے پر نکل بھاگنے کے سارے پینترے اُسے آتے تھے۔ ہاتھیوں کو تنگ کر کے انھیں بھڑکا دینا اس کا بڑا خطرناک کھیل تھا۔ وہ ڈینگ مارتا۔ اب تک کوئی ہاتھی اُسے چھو تک نہیں پایا ہے۔

اسی سوریہ کانت، کے بیڑ کی جڑ پر بیٹھ کر اس نے کئی ہاتھیوں کی کہانیاں یاد کیں۔ اس جنگل کا ایک ہاتھی ایک بار ریل گاڑی کو چکنا چور کر کے اس کی لالٹین سونڈ سے اٹھا کر لے جا رہا تھا۔ سوداگر کو ننگا کر کے ایک ہاتھی نے اُسے سارے جنگل میں خوب بھگایا تھا۔ ان سبھی ہاتھیوں سے اوگن کھیلا تھا اور کوئی اسے سونگھ تک نہ سکا۔ طرح طرح کے واقعات سے رنگین ۲۲ سال اس نے ان جنگلوں میں ادھر اُدھر دوڑ کر گزارے ہیں۔ آج وہی سیدھی سادی اور پُرہمت زندگی اس سے چھینی جا چکی ہے۔ وہ اس پر یقین نہ کر سکا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

بھوں ...... بھوں ...... بھوں ...!

بس کے ہارن سے وہ چونک پڑا۔ بس سرکتی، کھسکتی ڈاک خانے کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کا رنگ سا کالا تھا جو اس ناریل کی پیٹی کی طرح تھا جس پر چکتے لگے ہوں۔ اندر کچھ مسافر بیٹھے تھے۔

ڈاک بابو نے اسی میل بیگ کو یعنی منگل سوتر پہنے ہوئے اسی دولھن کی برات کو باہر لاکر کنڈکٹر کو پکڑا دیا ـــ بھوں ...... بھوں ...... کی آواز کے ساتھ گاڑی چلی اور چند ہی منٹوں میں آنکھوں سے اوجھل ہو گئی، جیسے اوگن کی جان بھی اپنے ساتھ لے گئی ہو۔

اوگن سوچنے لگا ـــ تھوڑی ہی دیر میں بس ہاتھی والے جنگلوں میں گھس جائے گی۔ بانس کے بنوں، چٹانوں اور سال کے درختوں سے بھرے اس جنگلی راستہ سے ہو کر جب بس رینگنے لگے گی تو کیا ہاتھی چپ چاپ دیکھتے رہیں گے؟ جب ہاتھی چنگھاڑتے ہوئے حملہ کر دیں گے تو بانس کے بنوں میں وہ ناریل کی پیٹی اپنے کو چھپا سکے گی؟ اُسے یاد آیا۔ ایک آوارہ ہاتھی کو جس کے دائیں کان پر ایک سفید داغ ہے ایک مہینے سے وہ روز دیکھتا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے میل رنر کے آنے کا وقت ٹھیک ٹھیک وہ جانتا ہے۔ ٹھیک وقت پر اس کی آمد کے انتظار میں وہ ہاتھی وہیں کہیں چھپا کھڑا رہتا ہے۔ مگر اوگن ہوشیار تھا۔ وہ سونگھ کر ہاتھی کا پتہ لگا لیتا اور پیچھے سے تنگ کرنے کا راستہ نکال لیتا۔ دو تین بار اس کم بخت ہاتھی کے پیچھے سے اس کی آڑو نما پونچھ پکڑ کر اس نے کھینچ لی تھی اور بھاگ گیا تھا۔ کئی بار دونوں میں دوڑ بھی ہوئی اور معاملہ کچھ سنگین ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ بات یہ ہوئی کہ اوگن ہاتھی کے اتنے نزدیک پہونچ گیا کہ ایسا لگا اب پکڑا کہ اب پکڑا۔ کسی طرح جان لے کر وہ بانسوں کے بیچ چھپ گیا۔ بانس کے بنوں میں ٹیڑھے میڑھے راستوں سے ہاتھی آسانی سے پیچھا نہیں کر سکتا۔ دونوں کی آنکھ مچولی ایک گھنٹہ تک چلی۔ آخر ڈاک خانہ پہنچنے کا وقت ہو گیا تو وہ کھیل بند کر کے چھپ چھپا کر بھاگ گیا۔ اس نے دور سے دیکھ لیا تھا کہ یہ سمجھ کر کہ وہ کہیں چھپا بیٹھا ہے، ہاتھی سونڈ اُٹھا کر ہوا میں سونگھتا ہوا اس کا پتہ لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔

ہاتھی آج بھی اس کے انتظار میں وہاں ضرور آیا ہوگا۔ وہ وہاں سے اُٹھا اور چلنے لگا۔ کندھے پر تھیلی نہیں، ہاتھ میں بھالا نہیں اس لئے چال ٹھیک نہیں۔ پھر بھی انجانے میں لمبے ڈگ بھرتے ہوئے تال کے ساتھ چلنے کی پرانی عادت سے مجبور

وہ بھاگنے لگا۔ وہ بانس کے بن کے پاس پہنچا، وہاں بڑی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بانس کا بن ہوا میں ہل رہا تھا۔ ایک بانس کے پیڑ پر بیٹھی مینا جھولا جھول رہی تھی۔ نیچے زمین پر پہیوں کے نشان صاف نظر آرہے تھے۔

اچانک اُسے لگا کہ ان درختوں کے پیچھے ایک چٹان ہل رہی ہے۔ سفید داغ والا کان دھیرے دھیرے جھول رہا ہے۔

ہاتھی!

وہ نہ ہلا۔ جب ہاتھی نزدیک پہونچا تو اونکن کے پیر اٹھے۔ اس نے بھاگنا چاہا لیکن قدم آگے بڑھتے نہیں، جیسے تیرنا نہ جاننے والا تیز دھار میں پھنس گیا ہو۔ اس نے بہتیرا زور لگایا، سب فضول! معلوم نہیں کتنی دیر تک وہ اس طرح بے کار کوشش کرتا رہا۔ ربڑ کی نلی کی طرح کسی چیز نے اُسے چھولیا۔ وہ ایک ربڑ کی پتلی کی طرح جھکا کھڑا رہا۔

ہاتھی کی سونڈ کو اپنی کمر پر لپٹتے دیکھ کر بھی وہ نہ ہلا اور نہ مڑا۔ اس کی موجودگی کا پتہ لگانے کے لئے اس نے اسے ایک بار چھوا بھی۔

وہ ہوا میں اڑ رہا تھا۔ ہوا میں بارہ فٹ کی اونچائی پر اُسے پھیلے ہوئے جنگل کا منظر ایک بار اچھی طرح دکھائی دیا۔ اگلے لمحہ وہ زور سے زمین پر پٹکا جانے والا تھا۔

ذرا سی دیر کے لئے اس جنگل اور اس کی زندگی کا سارا نقشہ اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ جیب میں رکھے ہوئے دس روپے کے نوٹ بانس کے چھلکے کی طرح ہوا میں اڑ رہے تھے، جنھیں اس نے صاف صاف دیکھا۔

اب وہ نیچے کی طرف آرہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں مگر یہ اُتار دھیما تھا۔ اس میں تیزی نہ تھی۔ اُسے لگا۔ ہاتھی نے اس کو دھم سے نیچے رکھ دیا ہے۔

جب وہ نیچے آیا اور اس کے پیروں نے زمین کو چھولیا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ فرش پر چت پڑا تھا۔ ہاتھی سونڈ کو پھن کی طرح پھیلائے، سامنے والی بائیں ٹانگ کو تھوڑا اٹھائے نچاتا ہوا، بڑے بڑے کان نکالے اور سیپ جیسی آنکھیں چمکاتا ہوا پاس کھڑا ہے۔

وہ ٹکٹکی باندھے ہاتھی کی طرف دیکھتا رہا۔

ہاتھی نے پیر ٹیک کر ایک چنگھاڑ لگائی جس سے سارا جنگل سہم گیا۔ پھر ایک فتحیاب کی طرح جھومتا ہوا جنگل کی طرف چل دیا۔

اونکن وہیں پڑا رہا۔ وہ کس دنیا میں ہے! تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ اپنے کو بے جان سمجھنے لگا۔ اس کو لگا کہ اس کے اپنے دماغ سے بھاپ اور دھواں اڑ رہا ہے، جیسے ہاتھی کی تازہ لید سے اٹھتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ وہ بانس کی جھاڑی کے پیچھے راستہ کے پاس ہی ایک میل بیگ کی طرح تھکا بیٹھا ہے۔ معلوم نہیں کتنی دیر تک وہ اس طرح بیٹھا رہا۔

بھوں .... بھوں .... بھوں! بس کے ہارن نے اُسے ہوشیار کر دیا۔ بس میل بیگ لے کر کن تو جر واپس جارہی تھی۔

لال تلک والی میل بس سی۔سی کرتی ہوئی آرہی تھی۔ یہی اس کا دشمن ہے جس نے اس کی زندگی کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اس لاچاری کے عالم میں مایوسی اور جلن میں اس نے اُسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ بس اس طرف چیختی چلاتی آرہی تھی، جہاں وہ بیٹھا تھا۔

ڈرائیور ایک دم گاڑی روک کر باہر کو دپڑا اور اس نے سامنے کے پہیوں کی طرف دیکھا۔ ایک انسانی جسم پہیے کے نیچے دبا پڑا تھا۔ لنگی اور خاکی قمیض کو دیکھا تو ڈرائیور کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ میل رنر اونکن ہے۔

دھار

مراٹھی افسانہ کی عمر کوئی پچاس ساٹھ سال ہے۔ ابتدائی دور میں جو افسانے لکھے گئے، وہ روایتی انداز میں کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق سکھاتے تھے، ان میں سماجی برائیوں اور غلط رسم و رواج پر تنقید ہوتی تھی۔ ان افسانوں کے کردار حقیقت کی دنیا سے دور تھے۔ ان کی حیثیت عام طور سے مثالی ہوتی تھی مگر یورپی ادب کے زیر اثر مراٹھی افسانہ کا انداز بدلا۔ اس میں دھیرے دھیرے حقیقت پسندی کا عنصر غالب ہوتا گیا اور افسانہ کی تکنیک میں بھی انقلاب آیا۔

مراٹھی افسانہ کی اصل ترقی کا دور ۱۹۲۵ء میں شروع ہوا۔ اس سے پہلے دی۔ ایس گرجہ اور دیگر ادیبوں نے افسانوی ادب کی بڑی خدمت انجام دی۔ اس کے علاوہ بعض ماہانہ رسالوں نے بھی اس صنف ادب کو مقبول بنانے میں ہاتھ بٹایا۔

۱۹۲۵ء تک مراٹھی افسانہ میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ دمن کرشن جو رگھڑے اور پی۔ بی بھاوے جیسے افسانہ نگاروں نے مراٹھی افسانہ کو نئی راہ پر ڈالا۔ ۱۹۴۰ء تک بہت سے لوگوں نے نئے نئے تجربے کئے اور حقیقت پسندی کو زبردست اہمیت حاصل ہوئی۔ نئے لکھنے والوں کی صف میں اروند گوکھلے اور گنگا دھر گیڈگل کو اہم مقام حاصل ہوا۔ ان کے علاوہ ماڈگولکر، مہادیو شاستری جوشی، پی۔ اے کلکرنی ایک نیا مطمح نظر لے کر میدان میں آئے۔ نئی زندگی، مشینی دور کے مسائل اور انسانی ذہن کی الجھنوں کی جدید افسانہ میں عکاسی ہونے لگی۔ آج مراٹھی افسانہ ہر طرح کے موضوعات سے بھرپور ہے۔ جدید افسانے میں مواد سے زیادہ ہیئت پر غیر معمولی زور دیا جاتا ہے۔

ادھ بُنا نیلا سوئیٹر ایک طرف رکھی ہوئی تپائی پہ پڑا تھا۔ آرام کرسی کے نئے کپڑے کا رنگ لال تھا اور اس پہ گہرے نیلے رنگ کی دھاریاں پڑی تھیں۔ گوری شالنی نے سفید وائل کی ساڑی اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔ خوبصورت پیروں کو ایک پر ایک دھرے اور ہاتھ سینے پر رکھ کر کھلے ہوئے دروازے میں سے وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔ اپریل کی گرم ہوا کے جھونکے اندر آ رہے تھے۔ شالنی کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ اس

پیروں کے پاس ٹائمس رکھا تھا سامنے کی میز پہ گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی اور الکسائی ہوئی شالنی آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بُننے اور پڑھنے میں جی نہیں لگ رہا تھا نیند نہیں آ رہی تھی اور خالی بیٹھا بھی نہیں جاتا تھا۔ بس کچھ جی اچاٹ تھا۔

پھول دان کے پاس بیٹھی وہ پھول سی دکھائی دے رہی تھی۔ کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں جم گئی تھیں۔ دوپہر کے ڈھائی تین بجے

تھے۔ سامنے کا کھلا باغیچہ اور اس پار کی ٹیکری دھوپ میں چلچلا رہی تھی۔
دروازے کے سامنے جو راستہ جاتا تھا اس پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آس پاس سے کسی طرح کی آواز نہ آتی تھی۔ پڑوسی بھی چپ تھے۔ حال ہی میں شری بھڑے تبدیل ہو کر پونا آئے تھے اور بہت کوشش کے بعد انھیں یہ گھر ملا تھا۔ دکن جیم خانہ کے بالکل ایک طرف کا یہ بلاک بھی شالنی کو بڑا لگتا تھا۔ کیونکہ گھر میں کوئی تیسرا نہ تھا۔ پڑوسیوں سے بھی کوئی میل ملاپ نہ تھا۔ شری بھڑے صبح ساڑھے نو بجے سائیکل پر جاتے تو شام کو چھ بجے کے بعد ہی لوٹتے تھے۔ ایسی حالت میں نوجوان شالنی گھر میں کیا کرے! کتنا بنے! کہاں تک پڑھے اور کب تک سوئے!

بیاہ ہوئے دو برس ہو چکے تھے۔ ویسے شری بھڑے مزاج کے بڑے اچھے تھے لیکن شالنی جیسا چاہتی تھی، ویسے نہ تھے۔ وہ بڑی بولنے والی اور چنچل طبیعت کی تھی۔ ہنسنا، بولنا، ادھر ادھر جانا گھومنا پھرنا چاہتی تھی اور بھڑے شروع سے ہی خاموش طبع، بُردبار اور بزرگوں جیسا برتاؤ کرنے والے تھے۔ وہ بہت کم بولتے اور ہنستے تھے۔ یہ طبیعت تھی ان کی ـــ شالنی کی چنچل طبیعت انھیں اچھی نہ لگتی۔ شالنی کا جب دیکھو تب زرق برق کپڑے پہن کر گھومنے جانا۔ تھیئٹر سینما دیکھنا اور فلمی ستاروں کے بارے میں باتیں کرنا، ہوٹل میں کھانا کھانا وغیرہ، یہ باتیں انھیں پسند نہ تھیں اور شالنی کا انہی باتوں میں جی لگتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ دفتر سے آتے ہی اس کا شوہر اس کی پسند کا سوٹ پہنے اور بڑے شوق سے اُسے اپنے ساتھ گھمانے لے جایا کرے۔ کہیں تنہائی میں ہریالی پر بیٹھ کر دونوں میٹھی میٹھی باتیں کریں۔ کافی ہاؤس میں جا کر مٹھائی اور نمکین کھائیں۔ کبھی 'جیون' یا 'دکی' میں جا کر کھانا کھائیں۔ اور بچارے بھڑے دن بھر کے تھکے ماندے گھر لوٹتے تو ان کی یہ خواہش ہوتی کہ موزے جوتے اتار کر پیروں کو آرام دیں، ٹائی اتاریں پجامہ اور ڈھیلا کرتہ پہن کر آرام کرسی پر اطمینان سے پڑے رہیں چپ چاپ۔ اپنی جوان بیوی سے بھی زیادہ باتیں کرنے کو ان کا دل نہ چاہتا تھا۔ جیسے وہ پہونچتے شالنی کی بک بک شروع ہو جاتی ـــ

"چائے بناؤں یا کافی؟"

بھڑے کو لگتا، روز روز یہ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ معلوم ہے کہ میں چائے پیا کرتا ہوں۔ چپ چاپ چائے بنا دینی چاہیئے۔ منہ سے صرف 'ہوں' کہہ کر وہ چپ چاپ بیٹھے رہتے۔ پھر رسوئی سے مٹکتی ہوئی آ کر شالنی پوچھتی ـــ

"اگر کافی بنالوں تو کیا ہرج ہے! میں چائے پیتے پیتے اُکتا گئی ہوں۔ کوئی ہرج ہے کیا!"

وہ پُرسکون انداز میں ہنس کر جواب دیتے ـ

"کافی ہی بنا لو۔ کیا ہرج ہے؟"

پھر وہ یکایک ان کو پیار کر لیتی اور شرارت آمیز ہنسی ہنستی ہوئی اندر چلی جاتی۔ کوئی فلمی گیت گنگناتی ہوئی اسٹوو میں ہوا بھرتی۔

چائے کافی ختم ہوئی، کہ فوراً ہی وہ گھومنے کے لئے تیار ہو جاتی۔ تب پھر۔

"کیوں جی آج ساڑی کون سی پہنوں! نیلی چلے گی کیا؟"

"پہن لو نا۔"

"اور بلاؤز؟"

"پہن لو کوئی بھی۔"

"میں پہنتی ہوں، وہ آپ کو پسند نہیں آتا۔ پھر راستے بھر بڑبڑاتے رہتے ہو۔"

"میں کچھ نہیں کہتا۔ کوئی بھی پہن لو۔"

"اچھا اب آپ کپڑے پہنئے، میں تیار ہوں۔"

بے چارے بھڑے۔ ان کا اٹھنے کو جی نہ چاہتا۔ پھر بھی وہ اُٹھتے۔ اطمینان سے کپڑے پہنتے۔ سب کچھ وہ بادل ناخواستہ ہی کرتے۔ شالنی سے بھی یہ بات چھپی نہ تھی۔

فوراً وہ کہہ دیتی ـــ

"آپ کا جی گھومنے پھرنے کو نہیں چاہتا! ہاں میں زور زبردستی نہیں کرنا چاہتی۔"

"مگر کون کہتا ہے ایسا؟"

"کہنے کی کیا ضرورت ہے! چہرے سے ہی نظر آ رہا ہے۔"

"کیا!"

"ماتمی صورت بنا کر چلنے کی ضرورت نہیں! آپ نہ چلیں، میں اکیلی جا کر بازار سے سبزی خرید لاؤں گی۔"

اتنا ہو جاتا، پھر بھی نرم مزاج بھرٹے ناراض نہ ہوتے تھے۔ دھیمی آواز میں بیوی کو سمجھا بجھا کر گھومنے کے لئے لے جاتے۔ جو باتیں ان کا خود کرنے کو جی نہ چاہتا مگر وہ شالنی کو پسند ہوتیں، وہ کیا کرتے ان کی مرضی کے خلاف بھی اگر کچھ ہو جاتا، پھر بھی غصہ نہ کرتے، اور اس طرح انھوں نے دوسرے کی باتوں کا سیدھا مطلب نکالنے کی عادت ڈال لی تھی۔ شالنی ذرا چنچل ہے، زیادہ باتونی۔ شوہر کے سوا گھر میں بات کرنے والا اور کوئی نہیں۔ دن بھر اُسے اکیلا ہی رہنا پڑتا ہے۔ اس لئے جب میں گھر آتا ہوں تو اس کا خوشی سے ناچ اٹھنا ٹھیک ہی تو ہے، اس میں اس کی کوئی غلطی نہیں۔ ایک دو بچوں کی ماں بننے پر یہ بات آپ ہی آپ کم ہو جائے گی۔ یہ سب باتیں سوچ کر وہ زیادہ ناراض نہ ہوتے تھے، پھر بھی ان کے چہرے پر ناخوشی کے اثرات جھلک ہی آتے تھے، کچھ دن سے تو دفتر سے گھر لوٹنے پر کپڑے اُتارے بغیر ہی بیٹھ جاتے، اور شالنی کے تیار ہوتے ہی گھومنے کے لئے چل پڑتے، کبھی کبھی آتے ہی پوچھتے —

"جوتے اتاروں یا گھومنے چلنا ہے!"

اور ان کا اس طرح پوچھنا شالنی کو بُرا لگتا۔ وہ بہت ناراض ہوتی۔ اسے لگتا کہ شری بھرٹے کو اس کے ساتھ گھومنا اچھا نہیں لگتا۔ شادی کے بعد اس کی زندگی ایک دکھ بھری کہانی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے شوہر سے اس کی نہیں بنتی ہے، انھیں اس سے محبت نہیں۔ وہ بڑی بدقسمت ہے کہ اُسے شوقین مزے اڑانے والا، رنگین مزاج ہوشیار اور کھلاڑی شوہر نہیں ملا اور اب زندگی بھر یہ بڑی ترڑائی نہ جا سکے گی، اس طرح کے خیالات اس کے دل میں پیدا ہوتے، اور اُسے خود اپنے اوپر ترس آنے لگتا۔ پھر اداس ہو کر وہ آرام کرسی پر چپ چاپ بیٹھی رہتی اور اس وقت اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو آ جاتے . . . . .

بہت کچھ سوچ کر اب شالنی نے روز گھومنے جانے پر اصرار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ پچھلے چار دن سے اس نے شری بھرٹے کو، جیسا وہ چاہتے تھے، باہر چلنے کو نہیں کہا۔ ان کی خوشی کے لئے اس نے ایسا رویہ اختیار کیا اور وہ بھی بغیر کسی ناراضگی کے۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح شری بھرٹے کو اطمینان وسکون حاصل ہوتا ہے۔

اس دن دوپہر کو شالنی اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ اپریل کی دھوپ کی وجہ سے سارا ماحول تھکا تھکا سا ہو رہا تھا۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ اچانک ایک آواز گونجی —

"دھار — چاقو قینچی کو دھرا لو — دھار۔"

اس آواز نے خاموشی کو توڑ دیا اور بے کار بیٹھی ہوئی شالنی کا جسم لرز سا گیا۔

چلانے والے کی آواز اچھی کمائی ہوئی تھی — صاف، زوردار اور پتلی۔

بھری دوپہر میں یہ پاگل شخص کیوں گھوم رہا ہے! اس وقت کوئی گھر کے باہر بھی نہ نکلے گا۔ اسے کام دے گا کون! کون اُٹھے گا اور اسے چاقو چھری دے گا!

پھر بالکل پاس سے آواز آئی —

"دھار — چاقو چھری پہ دھار دھرا لو — دھار۔

شالنی کی آنکھیں سامنے سڑک پر جم گئیں اور وہ ادھر اس کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

اور وہ آیا — پیٹھ پر دھار لگانے کی مشین۔ بدن پر صرف ایک بنیان اور نیلے رنگ کا ہاف پینٹ۔ پیروں میں پرانے سامان کی دوکان سے خریدا ہوا موٹا فوجی جوتا۔ پیٹھ پر لدے ہوئے بوجھ کے نیچے دبا ہوا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ شالنی کے گھر پر آ کر رک گیا۔ کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا اور پوچھا

"کچھ ہے، بائی صاحب، چاقو۔ چھری۔ قینچی؟"

شالنی نے گردن ہلا کر منع کر دیا۔ پھر بھی وہ وہیں کھڑا رہا، ذرا آگے بڑھ کر وہ کھمبے سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔

شالنی نے محسوس کیا: میں نے صرف گردن ہلا کر اشارہ

کیا۔ اس لئے شاید وہ میری بات نہ سمجھا ہو۔ وہ اونچی آواز سے بولی۔

"نہیں۔ کچھ نہیں۔"

اس دوران میں وہ کھلے ہوئے پھاٹک سے اندر آگیا۔ دروازے کے سامنے آیا۔ باقاعدگی کے ساتھ اس نے پیٹھ پر لدی ہوئی مشین اتار کر نیچے رکھ دی اور سر کا منڈاسا کھول کر اس سے منہ پونچھتے ہوئے بولا:۔

"اا! کیسا دھوپ کا طمانچہ پڑ رہا ہے!"

باہر دھوپ تیز تھی ہی۔ کمپاونڈ کے اندر آیا تو اسے ذرا سکون ملا تب پھر اس نے بڑے ادب سے پوچھا

"کچھ ہے کیا بائی صاحب۔ ہنسیا چھری؟"

"نہیں رے بھائی۔"

"دیکھئے کتنی اچھی بنا دیتا ہوں دھار آپ نے آج تک دوسروں کے کام دیکھے ہوں گے اور اب میرا بھی کام دیکھئے۔"

دوسرے پھیری والوں کی طرح چمڑا پن اس میں تھا مگر وہ انسان کو چڑانے والا نہیں۔ اس کے بولنے کا ڈھنگ، چہرے مہرے سے جھلکتی ہوئی تہذیب، اس کی وجہ سے شالنی پر ایک طرح کا اخلاقی دباؤ پڑا۔ یہ بےچارہ بھری دوپہر میں اتنا بوجھ لے کر گھوم رہا ہے۔ اسے اپنے دروازے سے خالی ہاتھ کیسے لوٹاؤں!

دکھی آواز میں اس نے کہا

"پر نہیں ہے نا کچھ۔"

"تو رہنے دیجئے، لیکن اب دوبارہ آؤں گا تو آپ کے یہاں کام ضرور ملنا چاہیئے بائی صاحب۔ ہاں کام کی تعریف ہوگی۔ ایسا ہی گھر ہے۔"

وہ نوجوان تھا۔ لمبا اور گٹھیلا سخت محنت کرنے سے اس کے ہاتھ اور پنڈلیاں سڈول ہو گئی تھیں اور اس کا لمبا صاف چہرا دھوپ اور ہوا کی مار سے جھلسا ہوا تھا۔ بہت روکھا سوکھا چہرہ تھا۔

اپنے پتلے ہونٹوں پر اس نے زبان پھرائی۔ منڈاسا پھر سر پر رکھا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"پانی کا نل ہے کیا بائی صاحب، بنگلے میں!"

"حوض ہے، مگر اس کا پانی اچھا نہیں ہے۔ پیاس لگی ہے کیا؟"

"جی ہاں۔ حوض کدھر ہے! پانی خراب ہے تو ہوا کرے کدھر ہے؟"

"ٹھہرو، تھوڑا۔"

اتنا کہہ کر وہ اندر گئی اور صاف ٹھنڈا پانی ایک لوٹے میں بھر کر لے آئی۔ اس نے اپنا منہ برتن کے سامنے کر دیا۔ اس ٹھنڈے پانی کو غٹ غٹ پیتے ہوئے اس کے گلے کی گھانٹی ہل رہی تھی۔ وہ بڑے غور سے دیکھتی رہی۔ بالآخر شالنی نے محسوس کیا کہ اسے کچھ کام دینا چاہیئے۔

اور وہ اندر گئی۔ آلو پیاز کاٹنے کی چھری لے کر باہر آئی۔

"لو۔ اس کی دھار بنا ہی دو۔"

جیسے کوئی کانچ کی چیز ہاتھ میں لیتے ہیں، اس طرح اس نے وہ چھری احتیاط سے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولا —

"آہا! بڑی اچھی چھری ہے، بائی صاحب! راجرس ہے؟ دیکھئے نا پڑھ کر — میں پڑھا لکھا نہیں ہوں پھر بھی مال ہاتھ میں لیتے ہی پہچان لیتا ہوں۔ دس بارہ روپیہ سے کم میں یہ مال نہ ملے گا۔"

اس کی بات ٹھیک ہی تھی۔ قیمت اور میکر دونوں باتیں اس نے ٹھیک ہی بتائی تھیں۔ شالنی کو تعجب ہوا۔ چوکھٹ پر ہاتھ رکھے ہوئے وہ کھڑی رہی۔

"— مگر دھار بنانے کا کیا لوگے؟"

اس کے چہرے کی طرف نہ دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا

"کام دیکھ کر جو ٹھیک سمجھیں، دے دیں بائی صاحب! میں اپنا کام صاف کرتا ہوں اور دام واجبی لیتا ہوں۔"

"واجبی یعنی کتنے؟"

"یہ کیا آپ کو بتانے کی ضرورت ہے! کیا آپ نے کبھی دھار نہیں رکھائی ہوگی!"

اور وہ خود ہی خوش ہو کر ہنس پڑا۔ چاک گر گر گھومنے لگا۔

گردن ٹیڑھی کر کے گھومتی سان پر وہ چھری کی دھار ٹکانے لگا ——
چر چر۔ کھر کھر — آواز ہونے لگی اور چنگاریاں اڑنے لگیں۔ چھری کی دھار چمکنے لگی۔

شالنی ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ اس کے کھلے ہاتھ جیسے جیسے چل رہے تھے ویسے ویسے اس کے ڈنڈ کی مچھلیاں پھول رہی تھیں۔ پتھر پر فولاد کی رگڑ سے پیدا ہونے والی آواز کی وجہ سے کبھی کبھی شالنی کے جسم میں پھریری سی آجاتی — کبھی کبھی وہ آنکھیں بند کر لیتی۔ دھار والا چھری کو ایک بار اس طرف سے اور ایک بار اس طرف سے پتھر پر ٹکار رہا تھا — دھار چمکتی جا رہی تھی۔

اسی درمیان میں اس نے ایک بار دھار پر اپنی انگلی کو پھیر کر دیکھا۔ شالنی کا دل دھک سے ہو گیا۔ لیکن اس کی انگلیوں سے خون کی دھار نہیں بہی۔

گھومتی ہوئی سان پر چھری کو رکھتا ہوا وہ بولا ——

" اتنا ہی گھسنا چاہیئے جتنا کہ دھار کے لئے ضرورت ہو۔ سان کی گھسائی کا پتہ نہیں چلنا چاہیئے — ہاں۔ بائی صاحب! اسی میں سچی کاریگری ہے اور دھار ٹوٹنا نہیں چاہیئے۔ آپ جیسے بڑے لوگوں کے گھر اگر کام کرنا ہے تو ہاتھ میں صفائی اوّل درجے کی چاہیئے۔ بائی صاحب! صرف پیسہ لوٹنے کے لئے روزگار کرنا ٹھیک نہیں!"

وہ کہہ رہا تھا۔ پھر بھی اس کی گردن نیچے جھکی ہوئی تھی۔ آنکھیں چھری پر تھیں۔ آخر میں چلتی دھوپ میں چھری کی دھار آنکھوں کو چکا چوند کرنے لگی۔

شالنی نے پوچھا ——

" کیوں جی، تمہارا نام کیا ہے؟

" حسین۔ بائی صاحب۔"

" کہاں کے ہو تم؟ یہیں کے ہو گیا!"

" جی نہیں۔ حیدرآباد میں ایک گاؤں ہے، وہاں کا ہوں۔"

" پھر اتنی دور کیسے چلے آئے؟"

" پیٹ کے لئے آنا پڑتا ہے بائی۔ یہ تو اچھا ہے کہ ابھی میرے پیچھے بیوی بچوں کا کوئی جھنجھٹ نہیں ہے، اکیلا ہوں بس....."

اب چھری پر دھار لگ گئی تھی۔ چھری کو کپڑے سے پونچھ کر اس نے سیڑھی پر رکھ دیا۔ پھر بولا ——

لیجئے بائی، اب آپ بھلے ہی کاغذ سے بھی پتلی چکتی اس سے کاٹیے۔ ایک دم تیز ہو گئی ہے۔"

شالنی خوشی سے ناچتی ہوئی اندر گئی۔ چھ آنے لا کر اس نے حسین کو دے دئے اور کہا۔

" ٹھیک ہے!"

وہ بس ہنسا — ایک خوب صورت ہنسی۔ پھر شالنی نے دو آنے اور اس کے ہاتھ پر رکھ دئے۔

سلام کر کے وہ کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے وہ بھاری بھر کم مشین اپنی پیٹھ پر اٹھائی اور اس بھری دوپہر میں لمبے لمبے قدم بڑھاتا ہوا وہ دھار بنانے والا نوجوان غائب ہو گیا۔

دور سے آواز سنائی دی۔

" دھار — چاقو، قینچی، چھری کو دھار دھرالو۔ دھار —"

شام کو شری بھرڑے تھکے ماندے گھر آئے اور کرسی پر بیٹھ کر بوٹ کے فیتے کھولنے لگے۔

کھلا دروازہ دھڑ سے بند کر کے شالنی ان سے آکر چمٹ گئی اور بڑے محبت بھرے انداز میں بولی:-

" کب سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں آج —"

انسان اور حیوان

البیئن اور جولی بچپن ہی سے دوست تھے اور ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ البیئن انگریزی نسل کا گرے ہاؤنڈ (کتا) تھا اور اسی وجہ سے اس کا یہ نام تھا۔ جولی ایک ہرنی تھی جو اڑیسہ کے جنگلوں سے لائی گئی تھی۔ البیئن گوشت خور تھا اور جولی گھاس پات پر گزارہ کرتی تھی۔

ایک بار جولی بیمار پڑ گئی۔ البیئن دن رات اس کے پاس رہتا حتیٰ کہ اُسے کھانا بھی وہیں دیا جانے لگا ایک مرتبہ البیئن کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ جولی اس کی بے پناہ طاقت سے واقف تھی۔ اس لئے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ اتنے دنوں سے پڑا ہوا کیوں ہے۔ اس کی بیماری میں وہ بڑی محبت اور دلجوئی سے پیش آئی۔ پھر جب البیئن تندرست ہو گیا تو ایسا لگا کہ اس کی تندرستی جولی کی تیمارداری کی رہینِ منت ہے۔ اب وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا تھا۔ لیکن جب موسم بہار اپنے دامن میں پھولوں کی دولت لئے ہوئے آیا تو دونوں دوست خوب کھیلنے اور پاگلوں کی طرح اُچھل کود کرنے لگے۔ ایسا لگتا کہ وہ دوڑتے ہوئے اس منبع کے تلاش میں جاتے ہیں جہاں سے لطف و انبساط کا سرچشمہ پھوٹتا ہے۔ البیئن دوڑتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زمین پر دھاگے کو تان دیا گیا ہو۔ اس کے اعضاء اس کے جسم سے بمشکل ہی الگ نظر آتے تھے لیکن جولی کی دوڑ تو بالکل پیرس کا رقص تھی۔ اس کے پیر سطح زمین پر تیرتے تھے وہ تو ہوا میں رقص کرتی تھی۔

زمیندار کو اپنے ان دونوں پالتو جانوروں سے بہت پیار

فقیر موہن سیناپتی، اڑیہ افسانہ کے باوا آدم کہلائے جاتے ہیں، وہ اس علاقہ کے پہلے شخص تھے جنھوں نے باقاعدہ انگریزی تعلیم پائی۔ انھوں نے اندرونی اور بیرونی اثرات قبول کر کے اڑیہ زبان کے افسانوی ادب کو نئی بنیادوں پر استوار کیا اور نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی۔ یہ پہلی جنگ عظیم سے پہلے کا زمانہ تھا جنگ کے بعد اڑیہ ادب میں ایک انقلاب آیا اور نئے خیالات گھر کر گئے۔ بنگالی ادب نے بھی اسے بہت زیادہ متاثر کیا۔ قومی تحریکات اور جدوجہد آزادی نے بھی اڑیہ افسانے کو نئی راہوں سے روشناس کرایا۔ غیر ملکی حکمرانوں کے جور و ظلم کی حکایتوں نے افسانہ کی صورت اختیار کی۔

جدید افسانہ نگاروں میں راج کشور روے، گوپی ناتھ مہنتی، راج کشور پٹنایک اور کالندی چرن پانی گراہی کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے نئی تکنیک اور نیا اسلوب اختیار کیا۔ ان کے افسانوں میں مزدوروں، کسانوں اور زندگی کے عام مسائل کا ذکر ملتا ہے۔ پانی گراہی نے نہ صرف انسانی محبت بلکہ جانوروں کی باہمی محبت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور ایک ہمہ گیر انسانیت کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

دن بھر کے کام کاج سے تھک کر جب وہ اپنے آفس کے سامنے کے لمبے چوڑے لان میں ٹہلنے آتے تو یہ دونوں اپنی دل چسپ حرکتوں سے ان کا جی بہلاتے۔ جولی اپنی لمبی گردن اپنے مالک کے پیروں سے رگڑتی اور اس کا ہاتھ چاٹتی۔ البیٹن پیچھے رہ جاتا تو وہ تیزی سے دوڑ کر آگے آجاتا اور اپنی دم ہلا ہلا کر مالک کے قدموں میں لیٹ جاتا۔ کبھی کبھی تو وہ مالک کے پیروں سے اس طرح لپٹ جاتا کہ اس کو چلنا مشکل ہو جاتا۔

اگر دوسرے کتے جولی پر لالچ بھری نظریں ڈالتے ہوئے آجاتے تو جولی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ جاتی اور اپنے مالک کی پناہ میں آجاتی۔ پھر البیٹن اپنے ہم جنسوں سے لڑنے کے لئے آگے بڑھتا اور دوسرے کتے اسے دیکھتے ہی دم دبا کر بھاگ جاتے۔ وہ اس کی بے پناہ طاقت سے واقف تھے۔ اپنے ہم جنسوں میں اس کا وقار بھی تھا کیونکہ وہ بھاگتے ہوئے کتے کا پیچھا نہیں کرتا تھا۔

جولی اور البیٹن کی زمیندار کی پیاری بچی سے بھی دوستی تھی۔ وہ اپنا زیادہ وقت ان جانوروں کے ساتھ گزارتی تھی۔ ایک آیا بچی کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ بچی باغ کے میدان میں نرم نرم گھاس توڑتی اور جولی دھیرے دھیرے آکر اپنا منھ آگے بڑھا دیتی۔ البیٹن بھی اپنے ساتھی کے پیچھے پیچھے آتا اور طرح طرح کی حرکتوں سے اپنی چھوٹی مالکن کو خوش کرتا۔

زمیندار برآمدہ میں آرام کرسی پر نیم دراز تھے اور ان کا متفکر دل اپنے پالتو جانوروں کی دل چسپ حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ وہ نئے خیال کے آدمی تھے اور خلیق و خوش اخلاق بھی تھے۔ وہ موقع کے مطابق لباس پہنتے تھے۔ اپنے ہم وطنوں کے سامنے وہ سودیشی کرتہ اور چادر اوڑھتے۔ ہاں غیر ملکیوں کے سامنے عمدہ قسم کا سوٹ پہن کر جاتے۔ اعلیٰ عہدوں پر فائز یورپین افسر تعطیلات میں ان کی ریاست کے جنگل میں شکار کھیلنے آتے۔ ان کے لئے ان کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے۔ اس مقصد کے لئے خاص طور سے ایک مہمان خانہ تعمیر کر دیا گیا تھا جس میں ضرورت اور آرام کی سبھی چیزیں مہیا کی گئی تھیں۔ وہ اپنی تعلیم یافتہ اور معزز رعیت سے بھی اسی خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ اس کے باوجود ریاست کے عام لوگوں کی رائے ان کے بارے میں کچھ اچھی نہ تھی۔ کٹر عقائد کے لوگ انھیں گھٹیا اور مذہب سے بے بہرہ سمجھتے، دوسرے لوگ انھیں رعیت کے دکھ درد سے بے پروا اور اپنے آرام و آسائش کے لئے بے دردی سے روپے لٹانے والا ظالم زمیندار کہتے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یورپینوں سے گہرے تعلق اور ان کے طور طریقوں کو اپنا لینے کی وجہ سے ان کی بہت سی خوبیاں لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ دراصل خوراک اور لباس کے معاملے میں وہ انگریزی معاشرت کے بڑے دلدادہ تھے اور لوگوں کا خیال تھا کہ اس معاملے میں جس اعتدال کی ضرورت تھی اس کا وہ خیال نہ رکھتے تھے۔

ان کے ایک پرانے دوست پولیس کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل تھے۔ انھوں نے اطلاع دی تھی کہ وہ کرسمس کی تعطیلات میں اپنی بیوی اور لڑکیوں کے ساتھ تفریح و شکار کے لئے آئیں گے۔ مہمان خانے کو آراستہ کر دیا گیا تھا اور ان کی آمد سے چار دن پہلے جنگل میں خیمے لگا دئے گئے تھے۔ ضروری چیزوں کی خریداری کے لئے آدمی کٹک بھیجے گئے۔ ریاست کے افسروں کو دم لینے کی مہلت نہ تھی اور سبھی زمیندار کے پیٹھ پیچھے انھیں خوب برا بھلا کہہ رہے تھے۔

زمیندار موٹر میں سوار ہو کر اپنے معزز مہمانوں کی پیشوائی کو گئے صاحب وقت پر آگئے اور میزبان نے مہمان، ان کی بیوی اور لڑکیوں سے مل کر بے حد خوشی کا اظہار کیا۔ پروگرام طے کر لیا گیا۔ مہمانوں نے رات مہمان خانے میں گزاری اور صبح کو ناشتے کے بعد جنگل کو روانگی کی صلاح ٹھہری۔

شکارگاہ زمیندار کے مکان سے ۲۰ میل دور تھی۔ اس کے آس پاس دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی۔ خانساماں اور دوسرے ملازم کھانے پینے کی چیزیں اور دوسری ضروری اشیاء لے کر پہلے ہی جا چکے تھے۔ مہمان، زمیندار، ڈی۔ آئی۔ جی کے دو شکاری کتے اور زمیندار کے دونوں چہیتے جانور البیٹن اور جولی کار میں گئے۔ جولی کو لے جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ چونکہ البیٹن شکار میں بہت کام کرتا تھا اور جولی کی موجودگی کی وجہ سے وہ چاق چوبند اور خوش رہتا تھا اسی لئے جولی کو لے جانا پڑا۔ جب

بھی البیئن کو موقع ملتا وہ جولی کے پاس بھاگ آنے کی کوشش کرتا۔ ان دونوں کو لے جانے کے لئے رسماً چھوٹی مالکن کی منظوری بھی حاصل کرلی گئی تھی اور اس نے اپنے باپ سے سختی سے اصرار کیا تھا کہ اس کے یہ ساتھی تین دن سے زیادہ باہر نہ رہیں۔

بہرحال کرسمس کی پُرمسرت تقریب کی خوشیوں میں پانچ دن بڑی جلدی کٹ گئے۔ سنسان جنگل میں مہمانوں کو اتنا آرام اور سکون ملا کہ شہر کے ہنگاموں اور بکھیڑوں کے مقابلے میں انھیں یہ تنہائی بڑی خوش گوار معلوم ہوئی۔ پانچویں دن کھانے کے بعد زمیندار اور ڈی۔ آئی جی شکار کو نکلے۔ چار دن تک روزانہ شام کو ناچ گانے کا پروگرام رہا، جس سے خواتین اتنی تھک چکی تھیں کہ مردوں کے ساتھ شکار کو جانے کی ان میں ہمت نہ تھی۔ ملازمین بھی کام کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ پھر بھی دو تین آدمیوں کو شکاریوں کے ساتھ جانا ہی پڑا۔

ایک دو بار شکاریوں کا نشانہ خطا ہوگیا۔ گولی کی آواز سُن کر ساری چڑیاں خوف زدہ ہوکر اُڑ گئیں۔ لہٰذا جب تک چڑیاں واپس نہیں آجاتیں شکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس خیال سے وہ لوگ پاس کے جنگل میں سے گزر گئے اور اِدھر اُدھر شکار کی تلاش کرتے رہے۔ مگر کوئی شکار ہاتھ نہ آیا۔ شکار کی تلاش میں نوکروں کو اِدھر اُدھر دوڑایا گیا۔ مگر کسی نے کچھ نہ بتایا۔ کون جانتا ہے وہ گئے یا بیٹھ کر گپیں ہانکتے، جھرٹ پیتے یا سرتی کھاتے رہے۔ دونوں دوست بڑی ہوشیاری اور خاموشی کے ساتھ ہر جھاڑی کو جھانکتے ہوئے جا رہے تھے۔ اور وہ بالکل بھول گئے کہ چلتے چلتے وہ کیمپ سے چار میل آگے نکل آئے ہیں۔

دن ختم ہو رہا تھا۔ سورج نے پاس کی پہاڑی کے پیچھے اپنے آپ کو چھپا لیا تھا اور اس کی قرمزی شعاعیں مغربی آسمان پر بکھری ہوئی تھیں۔ شکاریوں کو اس کا احساس نہیں تھا کہ دن ختم ہو رہا ہے کیونکہ وہ بڑے حریصانہ انداز میں کسی جاندار کے گوشت کی تلاش میں کھوئے ہوئے تھے۔ افق مشرق سے سیاہ بادل اُبھر رہے تھے۔ شکاریوں کی آنکھیں تو زمین پر گڑی تھیں انھیں آسمان کی کچھ خبر نہ تھی۔ نوکروں نے آنے والے خطرے کو بھانپ لیا اور اپنے مالکوں کی تلاش میں نکلے۔ مگر اس گھنے جنگل میں ان لوگوں کو دن کی روشنی میں بھی تلاش کرنا مشکل تھا۔

دونوں دوست اندھیرے میں بھٹک گئے۔ وہ اس وقت واپس لوٹے جب بارش کی آمد کا پتہ دینے والی ٹھنڈی ہوا اتنی تیز ہوگئی کہ اسے نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا۔ بادل گہرے اور سیاہ ہوتے جا رہے تھے۔ بارش کی آمد سے پہلے ۴ میل چل کر کیمپ واپس پہونچنا ناممکن تھا۔ مجبوراً رائفل انھیں اپنے کندھوں پر رکھ کر ڈبل مارچ کرنا پڑا۔ لیکن اس بھاگم بھاگ میں سارا مزہ کرکرا ہوگیا۔ طوفان اپنے پورے غیظ و غضب کے ساتھ آپہونچا تھا۔ جنگل میں ہر طرف اندھیرا چھا گیا، آندھی کی آواز بڑی بھیانک اور ڈراونی تھی۔ راستہ ڈھونڈنے میں بڑی مشکل درپیش تھی۔ پانی سے شرابور اور ہانپتے کانپتے وہ لوگ بالآخر رات کے آٹھ بجے کیمپ واپس پہنچے۔

کھانے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ کیونکہ ان لوگوں کا خیال تھا کہ شکار مل جائے گا۔ مگر ایک چڑیا بھی نہیں ملی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے ہوگیا تھا کہ وہ لوگ صبح روانہ ہو جائیں گے۔ زمیندار کا گھر کیمپ سے ۴ میل دُور تھا۔ اس زوردار اور موسلادھار بارش میں اتنی دُور سے کھانا منگوانا ممکن نہ تھا۔ موٹر کا راستہ بارش کی وجہ سے بالکل خراب ہوگیا تھا۔ آس پاس کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں سے زمیندار اور صاحب کے کھانے کے لائق کوئی چیز مل سکتی۔ ہر شخص پریشان تھا کہ کیا کیا جائے۔ شکار کو جانے سے پہلے زمیندار نے گوشت کا کوئی انتظام کرنا چاہا تھا مگر صاحب نے انھیں منع کر دیا اور یقین دلایا تھا کہ کچھ نہ کچھ شکار ضرور مل جائے گا۔ اب کیا کیا جائے؟ نوکر بیچارے بلاوجہ زمیندار کے غصے کا نشانہ بن رہے تھے۔

اچانک صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کھانے کا بندوبست کرنے کے لئے کیا میں کچھ کروں؟''

''ضرور۔ ضرور۔'' میزبان نے زبردستی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟'' صاحب نے پوچھا۔

اُس کے گوشت سے شان دار دعوت کا انتظام ہو جائے گا۔ اور آپ اس جانور کو دوبارہ بڑی آسانی سے پال سکتے ہیں۔ آپ کو میری تجویز پسند آئی؟"

پہلے پہل تو زمیندار کی سمجھ میں نہیں آیا کہ صاحب کے دماغ میں کیا ہے۔ لیکن جب صاحب نے اپنی بات ختم کی تو وہ کانپ اُٹھے اور بمشکل اتنا کہہ سکے۔ "ہاں، ہاں، بڑا اچھا خیال ہے۔" وہ اپنے معزز دوست اور مہمان کی رائے سے اختلاف نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جولی کا نام سن کر ان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

جولی کی کہانی بڑی دردناک تھی اور اس وجہ سے زمیندار کو اس سے بہت لگاؤ تھا۔ جولی زمیندار کے پاس اس وقت آئی جب وہ اپنے ایک یوروپین دوست کے سامنے اپنی نشانہ بازی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس وقت یہ اپنی ماں کا دودھ پیتی تھی۔ ماں زمیندار کی گولی کھا کر گر پڑی اور وہ بالکل ساکت و صامت اس کے پاس کھڑی رہی۔ جب زمیندار کے آدمی اس کے پاس پہونچے تب بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس کی ماں اس کے پاس ہے۔ اس کی معصوم نظریں زمیندار کے دل میں اُتر گئیں اور ان کو اس بچے سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ انھوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب وہ اسے اپنی خوراک بنانے کے لئے اس کو ذبح کر ڈالیں گے۔ لیکن کیا ایسے معزز مہمان کی بات ٹالی جا سکتی ہے؟

میزبان کی منظوری حاصل ہو جانے کے بعد صاحب بہت خوش ہوئے اور اس کو خود اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنے کے خیال سے پھولے نہ سماتے تھے۔ صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ خون کے پیاسے ہیں اور ان کی اس خوبی نے گزشتہ جنگِ عظیم میں انھیں ممتاز بھی کیا تھا۔ اگر کوئی شکار نہ ملتا تو اپنے گھر کی مرغیوں کو ہی ذبح کر ڈالتے تھے۔ میم صاحب دل ہی دل میں صاحب کی اس خوبی پر فخر کرتی تھیں۔ لیکن چھیڑنے کی خاطر کہتیں کہ ایک بار یہ اپنا گلا کاٹنے کو تیار ہو گئے تھے، کیونکہ انھیں گردن مارنے کو کوئی اور نہیں ملا تھا۔

البئین اور جولی ایک دوسرے کی طرف منہ کئے ساتھ ساتھ سو رہے تھے۔ کسی نئے آدمی کے لئے البئین کے نزدیک جانا آسان نہ تھا خصوصاً اس وقت جب وہ جولی کے ساتھ ہو۔ ایسی حالت میں ایک نوکر مادھیا کے علاوہ کسی کو اس کے پاس جانے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ مادھیا کو اپنے مالک کے حکم کے مطابق جولی کو لانا تھا۔ البئین جاگ اُٹھا اور قدموں کی چاپ سُن کر بھونکنے لگا۔ مگر مادھیا کی آواز نے اسے مطمئن کر دیا۔ لیکن جب وہ جولی کو کھینچ کر لانے لگا تو البئین خاموش نہ رہ سکا اور غصے میں آکر اُچھلنے کودنے اور جولی کے پیچھے پیچھے آنے کی کوشش کرنے لگا۔ مادھیا کو مجبوراً زنجیر پکڑ کر اسے بھی لانا پڑا۔

اگرچہ البئین بے حد چالاک تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ناوقت مادھیا جولی کو الگ کیوں لئے جا رہا ہے۔ مادھیا البئین کو پکڑے رہا اور جولی کو خانساماں کے حوالے کر دیا۔ اس سے البئین کے دل میں شک پیدا ہوا۔ مگر وہ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلا۔ صاحب اپنے وحشیانہ جذبے کو تسکین دینے کے لئے تیار ہو گئے لیمپ کی روشنی میں ان کا چاقو چمک رہا تھا۔ ایک گولی ضائع کرنے کی بجائے وہ جانور کو زندہ ذبح کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔

خانساماں نے جولی کے پیر باندھ دئے اور اسے مضبوطی سے پکڑ لیا تاکہ ذبح کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ جولی کو کیا ڈر تھا۔ اس سے محبت کرنے والا مالک اور اس کا سرپرست زمیندار اور مصیبت میں کام آنے والا دوست البئین دونوں اس کے پاس تھے۔ چونکہ اس کے پیر مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے اس لئے کبھی وہ اپنے پیارے ساتھی اور کبھی اپنے مالک پر نظر ڈالتی تھی۔ زمیندار نے اپنے آپ کو اپنے دوست کی بیوی اور لڑکیوں سے بات چیت میں مصروف رکھنے کی کوشش کی، لیکن ان کے اندر سے کوئی چیز یہ مطالبہ کر رہی تھی کہ وہ جولی کو ایک نظر دیکھ لیں۔ وہ ہنسی مذاق اور خوش گپیوں میں مصروف جولی سے قطعی بے خبر نظر آتے تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ اگر ان کی آنکھیں جولی کی آنکھوں سے ذرا بھی مل گئیں تو وہ ان کے دل کا راز افشا کر دیں گی اور

انسانوں کی زبانیں انھیں موردِ الزام ٹھہرائیں گی۔

صاحب کے ہاتھوں میں چاقو دیکھ کر البیٹن کا شبہ اور بڑھ گیا۔ ڈی۔آئی۔جی نے چاقو صاف کیا اور اپنی جگہ سے اٹھے۔ نادانستہ طور پر زمیندار کی نگاہیں جولی پر پڑ گئیں اور انھیں ایسا محسوس ہوا کہ جولی ان سے رحم کی درخواست کر رہی ہے۔ فکرمند اور رحم کی بھیک مانگتی ہوئی نگاہوں کی وہ تاب نہ لا سکے اور کسی بہانے خیمے کے اندر چلے گئے۔ لیکن البیٹن جولی کی نگاہوں کو سمجھ رہا تھا۔ جب اس نے اپنے مالک سے مایوس ہو کر البیٹن پر نگاہیں ڈالیں تو وہ تلملا اٹھا۔ صاحب چاقو ہاتھ میں لے کر آگے بڑھے تو ایک لمحے میں ہی ان کا ارادہ بھانپ لیا اس نے اس جگہ بہت سے ہرنوں اور بکریوں کی گردنوں کو کٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور اب اس کے عزیز ترین ساتھی کا بھی یہی حشر ہونے والا تھا۔ اس نے زنجیر کو زور سے جھٹکا دیا اور پلک جھپکتے ہی مادھیا کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ وہ ایک دم مادھیا پر جھپٹا۔ صاحب اور نوکر بدحواس ہو کر خیمے کی طرف بھاگے۔ زمیندار خالی الذہن خیمے میں بیٹھے تھے۔ انھوں نے فوراً اٹھ کر مہمانوں سے معذرت کی اور مادھیا پر بُری طرح برس پڑے۔ لیکن ان کے الفاظ غصہ کی بجائے صاف طور سے ان کے ذہنی کرب کے غماز تھے۔

مادھیا نے البیٹن کو مضبوطی سے ایک درخت سے باندھ دیا۔ ڈی۔آئی۔جی ہاتھ میں چاقو لئے اور مسکراتے ہوئے پھر آئے۔ انھوں نے چاقو البیٹن کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر اسے چڑایا اور جولی کی طرف بڑھے۔ زمیندار نے جولی پر پھر ایک دزدیدہ نظر ڈالی اور دیکھا کہ وہ ملتجیانہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے مہمان سے کچھ کہنا ہی چاہتے تھے لیکن انھوں نے اپنے آپ کو روکا —— افسوس —— انھوں نے دل میں کہا —— کیا میں پاگل ہوں؟ وہ پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ وہ چاہتے تھے وہاں سے بھاگ جائیں لیکن کہیں ان کی غیر موجودگی صاحب کو ناگوار نہ گزرے اس لئے وہ پہلے کی طرح چپ چاپ بیٹھ گئے۔ انھوں نے اپنا چہرہ رومال سے ڈھانپ لیا تاکہ جولی کے خون پر ان کی نظر نہ پڑے۔ البیٹن کی دل کو برمانے والی چیخیں ان کے کانوں میں گھستی جا رہی تھیں۔ اس کی چیخ کے ساتھ ساتھ ایک گھٹی گھٹی درد ناک کراہ بھی سنائی دے رہی تھی۔ یہ جولی کی آواز تھی جو ان کے دل میں اترتی چلی گئی۔ انھوں نے چہرے سے رومال ہٹایا اور اب دیکھا تو سارا معاملہ ختم ہو چکا تھا۔

کھانے کی میز پر ان کی روح نے پکارا۔ جولی کا گوشت نہ کھاؤ۔ انھیں دوستوں کی ہنسی مذاق اور تفریح میں حصہ لینے کی خاطر صبر کرنا پڑا۔ بڑی مشکل سے انھوں نے گوشت کا ایک ٹکڑا اپنے حلق سے نیچے اتارا۔ خیالوں میں گم وہ سونے والے کمرے میں آئے مگر سو نہ سکے۔ وہ خود کو مارا مارا پھرتا ہوا دیکھ رہے تھے، پھر طوفان آیا اور اندھیرا چھا گیا اور پھر اس یادگار دوپہر کی یاد تازہ ہو گئی۔ ماں گولی کھا کر گر پڑی ہے اور اس کا معصوم بچہ بُت بنا کھڑا ہے۔ وہ ذرا بھی ہراساں نہ تھا۔ پھر دوبارہ سخت اندھیرا چھا گیا اور دونوں دوست رائفل کندھوں پر لئے کیمپ واپس آ گئے۔ صاحب کا شیطانی قہقہہ۔ ہاتھ میں چاقو اور جولی کی زندگی کے لئے بھیک۔

صبح کو وہ اپنے گھر واپس آ گئے۔ مہمان خاطر مدارات سے بہت خوش تھے اور اسی دن ان سے اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ مادھیا ہانپتا کانپتا پہونچا اور بتایا کہ وہ سارا راستہ کتے کو گھسیٹتا ہوا لایا ہے۔ وہ کسی طرح وہاں سے ہلنے کے لئے تیار نہ تھا۔ مالک بڑے اداس بیٹھے ہوئے تھے۔ مادھیا اور کچھ کہے بغیر چپ چاپ چلا گیا۔ زمیندار اپنی حرکت پر بے حد نادم تھے۔ .. اب تک وہ اپنی قوتِ ارادی کے سہارے اپنے آپ کو روکے ہوئے تھے۔ ورنہ وہ پاگلوں جیسی حرکت کرنے لگتے۔ کوئی طاقت اندر سے یہ مطالبہ کر رہی تھی کہ وہ اس معمولی کتے کے پیروں پر گر جائیں اور اس سے معافی مانگیں۔ انھیں محسوس ہوا کہ وہ البیٹن سے بھی زیادہ ذلیل ہیں۔ "افسوس، کیا میں ایسا خونی اور ذلیل ہوں۔ کیا میں اس گوشت خور جانور سے بھی زیادہ وحشی اور خونخوار ہوں۔ لعنت ہے مجھ پر۔ کیا طاقت ور کمزوروں کو اپنے بس میں رکھنا اور اپنی زندگی کے لئے ان کو مار ڈالنا چاہتے ہیں؟ کیا کسی ایک کی

زندگی کے لئے دوسرے کو مار ڈالا جائے!"

پیچھے سے ایک آواز آئی۔ "جولی کہاں ہے؟" انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا ان کی چار سالہ بچی کھڑی تھی۔ وہ جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور بچی کو سینے سے لگاتے ہوئے بولے۔" جولی وہاں ہے، میری بچی وہ وہیں ہے۔" لیکن بچی ان کا جواب سننے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس نے منہ پھیر لیا اور غصہ میں اپنے ہونٹ دباتے ہوئے کہا۔ " آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ مادھیا کہتا ہے کہ صاحب نے اسے مار ڈالا ہے۔ میں صاحب کو مار ڈالوں گی۔"

باپ سے اپنی ننھی سی بچی کے غم و غصہ کو دیکھ کر رہا نہ گیا۔ اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ بستر پر گر گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ لیکن جولی کہاں ہے؟ برابر ان کے دماغ میں یہ سوال گونجتا رہا۔ انھوں نے یہ سوال اپنے آپ سے کیا اور پھر اپنے جسم کو دیکھا۔ جولی کے گوشت کے ٹکڑے سے جو انھوں نے نگلا تھا، ایک دردناک کراہ نکل رہی تھی جو ان کے سارے جسم کو چھیدے ڈال رہی تھی۔ وہ دو ہفتے تک بخار میں پھنکتے رہے اور ان کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ لیکن وہ صحت یاب ہو گئے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مر کر دوبارہ زندہ ہوئے۔

انگریز افسروں کے لئے بنوایا گیا مہمان خانہ بیماروں اور معذوروں کی پناہ گاہ بن گیا۔ زمیندار کے گھر میں جانوروں کا گوشت پکنا بالکل بند ہو گیا اور حکم دے دیا گیا کہ ریاست کے حدود میں کہیں بھی ہرن کا شکار نہ کیا جائے۔

جنگل سے واپس آکر البیٹن نے کچھ نہ کھایا۔ وہ سارا دن بھوکا رہا۔ اور جب زمیندار بیمار پڑے تو اس کو موقع مل گیا اور وہ نکل بھاگا۔ مادھیا اس کی تلاش میں گیا اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے شکارگاہ تک جا پہونچا۔ اس نے دیکھا کہ البیٹن وہاں بیٹھا ہے جہاں جولی کو ہلاک کیا گیا تھا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں اس کا سب سے پیارا ساتھی ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا تھا۔ اسے واپس لایا گیا اور پوری طرح اس کی نگرانی رکھی گئی مگر بے سود۔ ایک بار موقع پاکر وہ بھاگ گیا اور کہیں ڈھونڈے سے نہ ملا۔

کچھ لوگ یہ کہتے تھے کہ وہ اس طرف گیا ہے جہاں خیمے لگائے گئے تھے۔ لیکن لکڑی کاٹنے والوں کا کہنا تھا کہ جنگل میں درخت گراتے ہوئے وہ کسی جانور کے رونے کی آوازیں سنتے ہیں --- یہ آواز کس کی ہو سکتی ہے؟ --- البیٹن کی یا جولی کی۔ کون کہہ سکتا ہے!!

"گونج" (صفحہ ۳۲ سے آگے)

پڑی تھی --- مردہ اور بے جان۔

شہزادی نے اپنی نازک انگلیاں ساز کے بالوں میں ڈالیں۔ اس کی سرمئی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دئے۔ پھر اس کے رُوشن ماتھے پر نظر ڈالی۔ ساز کے ماتھے پر ایک معمولی سا گھاؤ تھا --- شاید اس نے مرتے وقت تکلیف سے اپنے سر کو جھٹک جھٹک دیا تھا اور کسی چیز سے اس کا سر ٹکرا گیا ہوگا۔ اس کے ماتھے پر یہ گھاؤ اس وجہ سے آیا تھا۔ شہزادی نے نہ جانے کس جذبہ سے متاثر ہو کر جیب سے رومال نکالا اور اپنے آنسوؤں سے اُسے بھگویا اور بڑے پیار سے ساز کے ماتھے پر باندھ دیا۔

ماتھے پر رنگین رومال باندھے گھوڑا دائیں بائیں دیکھے بغیر بے پروائی سے اب بھی دوڑ رہا تھا۔ اس کی اگلی ٹانگوں کے اوپر چھاتی کے پٹھے اس طرح پھڑک رہے تھے جیسے ان میں کوئی طوفانی طاقت بھری پڑی ہو اور پتھریلی سڑک پر اس کے کھروں کی ٹاپ میں کسی عظیم فولادی مشین کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

چاندنی رات کا ایک ستم

کوئی نہیں کہتا تھا مالنی اور منّی ماں بیٹی ہیں۔ جہاں سے گزرتیں لوگ یہی سمجھتے کہ وہ بہنیں ہیں۔ منّی بالشت بھر اونچی تھی اپنی ماں سے۔ "اری مالنی، اٹوٹ جوانی اتری ہے تیری بیٹی پر!" اڑوسنوں پڑوسنوں کی اس کو دیکھ دیکھ کر بھوک نہ مٹتی۔ اور لڑکی جیسے سچا موتی ہو۔ جتنی حسین اتنی ہی سگھڑ۔ مالنی اپنی بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھتی اور اُسے لگتا جیسے وہ خود ہی ہو۔ ابھی کل کی بات تھی وہ خود ویسی کی ویسی تھی اور وہ سوچتی، اب بھی اس کا کیا بگڑا تھا! اب بھی.....

اب بھی کوئی پہاڑ تراش کر اس کے لئے نہر نکالنے کو بے تاب تھا... اب بھی کوئی سات سمندر پار کر کے اس تک پہنچنے کو بے قرار تھا۔ یہ کون اُسے آج یاد آ رہا تھا؟ موتیوں کا سوداگر۔ یہ کیوں اس کی پلکیں آج بھیگی جا رہی تھیں اس کی بیٹی جوان ہو گئی تھی۔ اب اسے یہ کچھ زیب نہیں دیتا تھا۔ ساری عمر سنبھل سنبھل کر چلی آج یہ کیسے خیالوں میں کھوئی چلی جا رہی تھی؟ نہیں.... نہیں.....! اگلے مہینے منّی — اپنی بیٹی کا اُسے بیاہ رچانا تھا۔ نہیں..... نہیں..... نہیں......

> پنجابی افسانہ دیگر اصناف ادب کے مقابلے میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ جدید پنجابی ادب کو بھائی ویر سنگھ، لالہ دھنی رام چاترک، پروفیسر پورن سنگھ اور پروفیسر موہن سنگھ جیسے شاعروں پر بجا فخر ہے۔ افسانہ کے میدان میں اس کی ترقی کہیں زیادہ اطمینان بخش کہلائی جا سکتی ہے۔ جدید پنجابی افسانہ دیگر ہندوستانی زبانوں کے افسانوں کے ہم پلّہ ہے۔ بلکہ مغرب میں بھی بارہا اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جا چکا ہے۔ جرمنی میں شائع شدہ عظیم افسانوں کے ایک حالیہ انتخاب میں ہندوستان کی نمائندگی بنگالی اور پنجابی افسانہ نے کی تھی۔
>
> اگرچہ ناول نگار نانک سنگھ نے بھی افسانے لکھے ہیں مگر آج پروفیسر سنت سنگھ سیکھوں کو ہی جدید پنجابی افسانہ کا رہنما تسلیم کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے ہی نفسیاتی تجزیہ سے کام لے کر اچھوتے اور دلچسپ افسانے لکھے۔ پروفیسر سیکھوں نے نہ صرف خود اچھے اچھے افسانے لکھے ہیں بلکہ انھوں نے نوجوان افسانہ نگاروں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔ ان لوگوں کی بڑی تعداد ان کے زیر اثر پھولی پھلی۔ جس میں پروفیسر سجان سنگھ، کرتار سنگھ دُگل، کلونت سنگھ ورک خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ممتاز صاحب طرز نثر نگار سردار گوربخش سنگھ نے بھی بعض اعلیٰ درجہ کے افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں میں محبت اور تشنہ کام روحوں کی حسرتوں کا ذکر ہوتا ہے۔ ان کے کردار سچی مسرت کو ترستے ہیں۔ مشہور شاعر گیانی گورمکھ سنگھ مسافر نے بھی پنجابی کے افسانوی ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ ان کے افسانوں میں آزادی کی جدوجہد کا تجزیہ اور آزادی کے بعد ملک کو درپیش مختلف مسائل کا بیان ملتا ہے۔ پنجابی کے نوخیز افسانہ نگاروں میں نوتیج سنگھ، مہندر سنگھ سرنا، گلزار سنگھ اور بوٹا سنگھ کا نام لیا جا سکتا ہے۔

"پاس میری پریم پیاری، ایک پل نہ ......!"

کل اس نے چٹھی لکھی تھی ہر بار وہ آتا۔ یہ اُسے ویسے کا ویسا لوٹا دیتی۔ آنکھیں بھینچ کر اپنا دروازہ بند کر لیتی۔ لیکن وہ تھا کہ ایک پل بھی اسے فراموش نہیں کیا تھا۔ مالنی اس کی جان تھی۔ اسے ایک لمحہ بھی اس کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ اور ساری عمر کاٹ دی تھی کسی کے انتظار میں ـــ رو رو کر، سسک سسک کر، تڑپ تڑپ کر، ساری عمر، اور اب پرچھائیاں ڈھل رہی تھیں۔ نہ جانے کب پنچھی اڑ جائے۔

مالنی سوچتی، آج رات وہ ضرور آئے گا۔ اسے شرد پونم کی وہ رات یاد آنے لگی جب نیم کے تلے ناچتے ہوئے اس کی چنری اس کی باہنوں کے ساتھ لپٹ گئی تھی۔ اور سر سے ننگی وہ اس کے سامنے دہری ہو گئی تھی۔ اور پھر اس نے اس کی چنری اس کے شانے پر ڈال دی تھی۔

! بالکل ویسے ہی اپنا دوپٹہ آج اس نے اپنے شانے پہ ڈال رکھا تھا ـــ مالنی سر سے پاؤں تک لرز گئی۔

سامنے گلی میں منّی آ رہی تھی، جیسے سرو کا پیڑ ہو ـــ اونچی، لمبی اور گوری، ہاتھ لگانے سے میلی ہو گی۔ منہ سر لپیٹے آنکھیں نیچی کئے، مجال ہے کسی نے اس کا اونچا بول بھی کبھی سنا ہو۔ مندر سے لوٹ رہی تھی ـــ بھگوان کے آگے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کی کہ اس کے من کی مراد پوری ہو۔ بھگوان سب کے من کی مراد پوری کرے! اور مالنی آپ ہی آپ مسکرانے لگی، جیسے کسی کے گدگدی ہو رہی ہو۔ اس کے من کی کیا مراد تھی؟

"ماں" باپو آج نہیں آئے؟" منّی ماں سے پوچھ رہی تھی۔

"تیرے باپو آج نہیں آئیں گے۔ وہ تو کہیں کل تک آ جائیں تو شکر ہے۔ بہت سا کپڑا اور بہت سا اناج اُنھیں خریدنا ہے! بیاہ شادی میں چیز بچ جائے تو اچھا، کم پڑ جائے تو بڑا جھنجھٹ ہوتا ہے۔" مالنی بیٹی کو سمجھا رہی تھی۔ منّی چولھے چوکے میں لگنے سے پہلے دھیرے سے آئی اور اپنی مقیش کی چنری ماں کے کندھے پر رکھ کر اس کا دوپٹہ اتار کر لے گئی ـــ کہیں اس کی ریشمی چنری میلی نہ ہو جائے۔

چنری پر کتنی مہین مُقیش ٹانکی تھی اس نے، دھندلکا ہو رہا تھا۔ اکیلی آنگن میں بیٹھی مالنی تصوّرات میں کھو گئی تھی بعض چکیاں بڑا مہین آٹا پیستی ہیں۔ مالنی سوچتی، وہ بھی تو ایک چکّی کی طرح تھی جو ساری عمر اپنے محور پہ گھومتی رہی۔ کبھی بھی اس کی چال نہیں ڈگمگائی تھی۔ اپنے آپ کو اس نے بلیدہ کر لیا تھا، روک روک کر، بھینچ بھینچ کر ختم کر دیا تھا اپنے آپ کو۔

پورے چاند کی چاندنی نیم میں سے چھن چھن کر اس کے اوپر پڑ رہی تھی۔ یہ کیسے خیالوں میں وہ بہی جا رہی تھی آج! مالنی کو لگتا جیسے ایک نشہ سا اس پر چڑھ رہا ہو۔ پورے چاند کی چاندنی ہمیشہ اس پر ایک جادو سا کر دیا کرتی تھی ـــ

چار دن اور، اور پھر اس آنگن میں گیت گائے جائیں گے۔ مالنی سوچ رہی تھی ـــ اور پھر مہندی، اور پھر منّی دلھن بنے گی ـــ سر سے پاؤں تک گہنوں میں لدی ہوئی۔ لال جوڑے میں کیسی حسین لگے گی منّی! اور پھر کوئی گھوڑے پر چڑھ کر آئے گا اور ڈولے میں بٹھا کر اسے لے جائے گا اپنے گھر، اپنی اٹاری میں۔ اور اس کی ہتھیلیوں کو چوم چوم کر اس کی مہندی کا سارا رنگ پی لے گا۔

مالنی سوچتی، ابھی تو کل کی بات تھی، اس نے بھی مہندی لگائی تھی، پر منّی کے پتا نے تو ایک بار بھی اس کی ہتھیلیوں کو اُٹھا کر اپنے ہونٹوں سے نہیں لگایا تھا۔ ایک بار بھی اس نے کبھی اس کے ہاتھوں کو اٹھا کر اپنی آنکھوں سے نہیں لگایا تھا۔ وہ تھکا ہارا کام سے لوٹتا، کھانا کھاتا اور کھا کر سو جاتا۔ ایک بیٹے کی تمنا میں کبھی کبھی آدھی رات کو اس کی آنکھ کھل جاتی، پھر بڑی مشکل سے کہیں تارے گن گن کر مالنی کو نیند آتی ـــ اور پھر ایک سال، ہر دوسرے سال ان کے ایک نہ ایک بیٹی آ جاتی ـــ بن بلائی لڑکیاں ـــ آپ ہی آپ آتیں، آپ ہی آپ جاتی رہیں۔ بس ایک منّی بچی تھی ـــ اکلوتی، موٹی موٹی کالی کالی آنکھیں، مالنی کی آنکھیں۔ گورے گورے گالوں کے نیچے تل، مالنی کا تل۔ گز گز بھر لمبے بال۔ مالنی کے سے بال۔ مالنی سوچتی، جیسے اس زندگی کی ساری بھوک نے اس کی

بیٹی میں دوبارہ جنم لے لیا ہو ـــ اپنی تکمیل کے لئے مالنی سوچتی، اس کا حسن جیسے پھر جاگ اُٹھا تھا اپنی کوکھ جنمی میں اپنی قیمت چکا لے کے لئے، مالنی کو ہمیشہ محسوس ہوتا جیسے اس کے انگ انگ، اور رؤئیں رؤئیں میں ایک پیاس رچی ہوئی ہو۔ اس پیاس سے اس کے ہونٹ بے قرار ہو رہے تھے۔

پورے چاند کی رات مالنی سے کچھ کھایا نہیں جاتا تھا اور منی کب کی چولھا چوکا سنبھال، سامنے ڈیوڑھی کے دروازے کی کنڈی لگا کر اندر کمرے میں سو گئی تھی۔

کافی رات جا چکی تھی۔ چاند جیسے سارے کا سارا اس کے آنگن میں اُتر آیا ہو۔ رات ٹھنڈی تھی۔ ابھی ٹھنڈ کہاں، یونہی ہلکی ہلکی گلابی سردی تھی۔ پورے چاند کی رات۔ اکیلا آنگن۔ مالنی سوچتی وہ کیوں ایسے بیٹھی ہے...... کس کے انتظار میں! منی اندر سو چکی تھی۔ منی کے باپو کو آج ہی کیوں باہر جانا تھا۔ پونم کی رات تو وہ اپنے آپ کو باندھ کر رکھتی تھی۔ اور مالنی نے منی کی منقش والی چُنری سے اپنا منہ سر لپیٹ لیا۔ چاند کی چاندنی میں دمکتے رہے تھے منقش کے دانے۔ اُسے لگا جیسے آسمان کے تارے اس کے بالوں میں اتر آئے ہوں۔ سامنے نیم پر پھر کوئی پپیہا بول رہا تھا۔ پک..... پک..... پک! ساری رات پکارتا رہے گا، پونم کی ساری رات۔ ساری عمر یونہی پکارتا رہا تھا اور جسے آنا تھا وہ نہیں آیا

لیکن خیالوں میں وہ آج بھی جا رہی تھی؟ مالنی سوچتی ـــ شاید اس لئے کہ وہ اکیلی تھی۔ اکیلی کیوں تھی؟ اندر منی ـــ اس کی جوان جہان بیٹی سوئی تھی۔ اگلے ہفتے جس کا اسے بیاہ رچانا تھا۔ سات دن اور، پھر وہ چلی جائے گی، اور پھر مالنی اکیلی رہ جائے گی۔ اتنا بڑا آنگن اور وہ اکیلی، اس خیال سے مالنی لرز اٹھی۔ یہ آنگن اسے کھانے کو دوڑا کرے گا۔ منی کیوں اس کے یہاں آئے گی؟ وہ تو اپنا گھر بسائے گی۔ گاؤں کے چودھری کی بہو..... وہ تو اپنے حسن کا سنگار بنے گی۔ اور مالنی سوچتی، وہ اکیلی رہ جائے گی..... بالکل اکیلی... بالکل اکیلی۔ منی کے باپو کی تو ساری عمر بھاگ دوڑ میں کٹ گئی تھی۔ ایک نہ ختم ہونے والی دوڑ۔ گھر کا مرد شام کو ہر روز ہار کر جیسے وہ آتا تھا اور نڈھال اپنی چارپائی پر ڈھیر ہو جاتا تھا۔ کئی بار اس سے یہ کہتی آخر اتنے جھمیلے کس لئے؟ کاہے کو اس نے اتنے جھنجھٹ پال لئے؟ لیکن کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

مالنی لمحے بھر کے لئے اندر کوٹھے میں گئی۔ منی سچ مچ سو گئی تھی۔ الھڑ جوانی کی نیند، بے سُدھ سوئی پڑی تھی۔ سرخ چوڑیوں کو اتار سرہانے رکھ کر سو گئی تھی۔ کہاں چوڑیاں رکھی تھیں اس نے! جوں ہی کروٹ لے گی، چٹ چٹ ٹوٹ جائیں گی اور مالنی نے سوچا، وہ اٹھا کر چوڑیوں کو سامنے طاق میں رکھ دے۔ لیکن اس نے تو چوڑیاں پہن لی تھیں۔ طاق میں سنبھال کر رکھنے کی بجائے اس نے تو چوڑیاں اپنی کلائیوں میں سجالی تھیں ـــ چھ ایک میں چھ، دوسری میں۔ چمک دمک والی چوڑیاں، ابھی کل ہی تو منی نے گلی میں بیٹھ کر چوڑی والے سے پہنی تھیں۔

اور مالنی باہر آنگن میں لوٹ آئی۔ سر پر ریشمی منقش والی چُنری، ہاتھوں میں لال لال چوڑیاں، پورے چاند کی رات مالنی کو ایسے لگا کر جیسے ایک اینٹھن سی اس کے انگ انگ میں پھیلتی جا رہی ہے۔ اور پھر اس کی ڈیوڑھی کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا رہی تھا...... وہی..... دھیرے سے...... سہما ہوا..... جھجکتا ہوا وہی تھا، جیسا اس نے چٹھی میں لکھا تھا، اپنے وقت پر آن پہنچا تھا۔ "شرد پورنیما کی رات میں تمہارے کواڑ کھٹکھٹاؤں گا۔ تمہاری مرضی ہو کھول دینا، تمہاری مرضی ہو نہ کھولنا۔ تمہارے کواڑ کھٹکھٹانے کا میرا حق ویسے کا ویسا قائم ہے"..... ٹھک..... ٹھک..... ٹھک..... بڑا کومل، بڑا مدھر.... پیاری سی یہ دستک اسی کی تھی۔ وہی تھا۔ چاندنی رات کا چور۔ اور اچانک چاند گھنے بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اندھیرا اندھیرا چھا گیا چاروں طرف، جیسے کسی نے اچانک روشنی گل کر دی ہو۔ گھنے سیاہ بادلوں کا پہاڑ سا چاند کے سامنے آگیا تھا۔ بادلوں پر بادل چڑھے چلے آ رہے تھے۔

اور رات کے اس اندھیرے میں مالنی کے قدم ڈیوڑھی

کی جانب اُٹھ گئے۔ اندھیرا اندھیرا، چکّر چکّر، سرد سرد، پسینہ پسینہ، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دھیرے سے اس نے کنڈی کھولی اور اپنے آپ کو تڑپتی رہوئی باہنوں میں ڈال دیا۔ اور پھر ہونٹوں پہ ہونٹ، دانتوں میں دانت، بیس سال کا رکا ہوا سیلاب جیسے ٹوٹ پڑا ہو۔ جیسے کوئی پھول کی پتّی کسی طوفان کی زد میں آ گئی ہو۔

مالنی کو پتہ نہیں تھا کہ کب وہ چلتے چلتے گاؤں کے باہر برگد کے نیچے جا کھڑے ہوئے، کتنی دیر وہاں کھڑے رہے۔ مالنی کو پتہ نہیں تھا کہ کب وہ کھیت میں جا بیٹھے، کتنی دیر وہاں چھپے بیٹھے رہے۔ صبح منہ اندھیرے ہی گاڑی دُور سڑک کے پار چیختی چلّاتی گزر رہی تھی کہ اس کی آنکھ کھلی اور مالنی دھیرے سے اس کی باہنوں میں سے نکل کر منہ سر لپیٹ تیز تیز قدموں سے اپنے گھر لوٹ آئی۔

چوڑیاں اتار کر اس نے دیسی کی دیسی منّی کے سرہانے رکھ دیں، اس کی ریشمی چُنری اس کی چارپائی پر رکھی اور اپنا دوپٹہ لے کر سامنے بستر پر جا لیٹی۔ اور اس کی آنکھ لگ گئی۔ یوں تو اسے کبھی نیند نہیں آتی تھی جیسے ساری عمر کوئی جاگتا رہا ہو۔

دھوپ نکل آئی تھی اور تب کہیں اس کی آنکھ کھلی۔

"کیسے الھڑ لڑکیوں کی طرح تو سوئی ہے آج ماں!" منّی نے اسے چھیڑا۔

جوان جہان لڑکی۔ اس نے گھر کی جھاڑ پونچھ کر لی تھی، چولھا چوکا ختم کر لیا تھا اور نہا دھو کر اب مندر جا رہی تھی۔ موتیا کی کلیاں اپنی چُنری کے پلو میں باندھے، اپنے بھگوان کی نذر کرنے۔

منّی آنکھوں سے اوجھل ہوئی اور مالنی کسمساتی ہوئی لاکھ سپنے اپنی پلکوں میں سجائے سامنے آنگن میں جا بیٹھی۔ میٹھی میٹھی پروا چل رہی تھی، ہلکی ہلکی دھوپ سامنے منڈیر پر سے نیچے اتر آئی تھی۔ ایک خمار سا تھا آس پاس۔ مالنی کو لگا جیسے وہ دودھ سے لبریز کٹوری ہو۔ دودھ اور اس پر تیرتی ہوئی چمیلی کی کلیاں۔ ایک عجیب سرور میں اس کی پلکیں جھک جھک پڑتیں، کھل کھل پڑتیں۔

"اری مالنی، کہاں ہے تمھاری وہ کائیاں بیٹی؟"

جیسے مالنی کو کسی نے آکر چانٹا مارا ہو۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔

"ایسا کبھی کسی نے نہیں سُنا! چار دن اس کے ڈولے کو رہ گئے ہیں اور یہ لڑکی یوں چل نکلی ہے!" لاجو پڑوسن ہتھیلیاں ملتی ہوئی مالنی کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا ہے میری بیٹی کو؟ وہ گائے ہے، بالکل گائے۔" مالنی غصّے کے مارے بپھر اُٹھی۔

"تیری گائے ساری رات منہ کالا کرواتی رہی ہے۔"

مالنی نے سُنا اور جیسے اس کے سوتے سوکھ گئے۔ کاٹو تو خون نہیں۔ نیلی پیلی ...... اس کا انگ انگ جیسے اینٹھ رہا ہو۔

"ادھر رات ہوئی ادھر یہ کسی غنڈے کے ساتھ باہر نکل گئی۔ ساری رات تیری ڈیوڑھی کھلی رہی ہے۔ میں نے خود ان آنکھوں سے دیکھا، ڈیوڑھی کے باہر کسی کی باہنوں میں ڈھیر ہوئی پڑی تھی۔ میں ذرا باہر نکلی تھی اور میں نے ویسے کا ویسا کواڑ بھیڑ دیا۔ اور پھر یہ ہوئے ہوئے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باہر کھیتوں کی طرف نکل گئے۔ ساری رات میری تو آنکھ نہیں لگی۔ بیٹیاں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ یوں پہلے کبھی کسی نے اپنے ماں باپ کا منہ کالا نہیں کیا۔ یوں کبھی کسی نے اپنے بڑے بوڑھے کی عزّت نہیں اُتاری۔ ہم تو کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔" اور لاجو چھل چھل آنسو بہا رہی تھی۔ روتی جاتی اور ہتھیلیوں کو ملے جاتی تھی۔

مالنی جیسے پتھر کا بُت ہو! اُسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

اور پھر لاجو بلکتی بلکتی چلی گئی۔

لاجو ابھی گئی ہی تھی کہ گاؤں کا چوکیدار جُما پچھواڑے کی طرف سے اتر کر آیا۔

"کیا ہے جُما؟" جیسے کنوئیں میں سے آواز نکلی ہو۔ مالنی چوکیدار کو آنگن میں کھڑا دیکھ کر سنبھلی۔

"بھابی! بات کرنے لائق تو نہیں، پر کل رات بڑا ظلم ہوا ہے اس گاؤں میں، میرے تو بال سفید ہو گئے چوکیداری کرتے۔ ایسا اندھیر میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ تیری بیٹی کسی کے ساتھ برگد کے

تلے...... رات چاندنی تھی لیکن آکاش بادلوں سے اٹا ہوا تھا۔ دوبار میں دس قدم کی دوری پر ان کے پاس سے گزرا۔ ہونٹوں پر ہونٹ جمائے ایک دوسرے سے چمٹے جیسے ان کو کچھ پتہ ہی نہیں لگا۔ برگد کے تلے کھڑے کھڑے تھک گئے اور پھر کھیت میں جا چھپے۔ میں تو ساری رات تیرے گھر کی رکھوالی کرتا رہا ہوں۔ کھلی ڈیوڑھی.....

چار دن اس کے بیاہ کو رہ گئے ہیں۔ بیاہ والا گھر گہنوں کپڑوں سے بھرا ہوتا ہے۔ سویرا ہوا تو میں یہاں سے ہلا۔ پتہ نہیں کب یہ جھک مار کر لوٹی! کم ذات، میں نے تو اسے گود کھلا کھلا کر پالا ہے۔ میری بیٹی ہوتی تو میں اس کا گلا گھونٹ دیتا! میں تو پچھلی دیوار پھاند کر آیا ہوں میں نے سوچا، کوئی پوچھے گا کہ تم صبح صبح کدھر چل دئے تو میں کیا جواب دوں گا!"

مالنی کے منہ میں زبان نہیں تھی۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑے چوکیدار کو تکے جا رہی تھی۔

اور جُما جس طرح آیا تھا، اسی راہ دیوار کود کر لوٹ گیا۔

جُما گیا اور سامنے گلی میں رتنا زمیندار دہاڑتا، پھنکارتا سر سے اونچا لٹھ اٹھائے اس کے آنگن میں آ دھمکا۔ وہ غصّے سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"کہاں ہے تمہاری لڑکی؟" ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی وہ گرجا۔ "کہاں ہے وہ بدذات؟ میرا ہی کھیت رہ گیا تھا اُسے خراب کرنے کے لئے.....!" رتنا اُبلا پڑ رہا تھا۔ من من بھر کی گالیاں دے دے کر سارا محلہ اس نے اکٹھا کر لیا۔ اڑوسی پڑوسی منڈیر پر آ کر کھڑے ہوئے۔

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ منہ اندھیرے میں کنوئیں کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا پہلے یہ نکلی میرے کھیتوں میں سے منّی والی چُنری اوڑھے ہوئے۔ میں نے سوچا لڑکی شاید باہر بیٹھنے آئی ہے اور پھر ایک لمحہ گزرا اس کا کوئی یار دوسری طرف سے نیچے اُتر گیا۔"

"کیوں جھوٹ بولتے ہو چاچا!" بجلی کی طرح کڑک کر بھیڑ کو ہٹاتی ہوئی منّی آگے بڑھی۔ ابھی ابھی وہ مندر سے لوٹی تھی اور ہجوم کے پیچھے کھڑی ہوئی سب کچھ سن رہی تھی۔

"میں جھوٹ بولتا ہوں بدذات، میں جھوٹ بولتا ہوں؟ یہ لال چوڑی کس کی ٹوٹی پڑی تھی میرے کھیت میں؟" اور اپنی چادر کے پلّو میں بندھی لال چوڑی اس نے منّی کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ ایک آنکھ جھپکنے میں منّی نے اپنی کلائیوں کی چوڑیاں گنیں۔ گیارہ تھیں اور وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

اور پھر محلّے والیاں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کہنے لگیں، انھوں نے خود منّی کو چوڑیاں چڑھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ دس اوپر دو چوڑیاں۔ لال رنگ چُن کر اس نے نکلوائی تھیں۔

لوگوں سے آنگن بھر گیا تھا اور پھر مالتی کا سمدھی آیا بھیڑ کو چیرتا ہوا۔ اس کے پیچھے منّی کی ہونے والی ساس تھی۔ اور انھوں نے وہ سارے تھال، سارے کپڑے، سارے نوٹ، سب وہ انگوٹھیاں مالنی کے سامنے لا کر پٹک دیں۔ لوگ ہکّا بکّا ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عورتیں بار بار کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھیں جوان جہان لڑکیاں منہ میں انگلیاں لئے کاٹ رہی تھیں۔

اور پھر دھڑام سے پڑوس کے کنوئیں میں کسی کے گرنے کی آواز آئی۔ سب کی اوپر کی سانس اوپر، نیچے کی نیچے رہ گئی۔ لوگوں نے آگے پیچھے دیکھا۔ مالنی کی گائے جیسی بے زبان لڑکی کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ بیٹی جس کا اونچا بول کبھی کسی نے نہیں سنا تھا۔ سچّا موتی، جو صبح شام بھگوان کے سامنے ہاتھ جوڑے نہیں تھکتی تھی۔ اور لوگ ایک دم کنوئیں کی طرف دوڑ پڑے۔

مالنی تخنہ کا تخنہ، ویسی کی ویسی پڑی تھی۔ اس کا آنگن بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اڑوسی پڑوسی محلے والے سارے کنوئیں کی طرف دوڑ گئے تھے کہ کسی طرح لڑکی کو بچا لیں۔

ٹی۔ جانکی رامن

(تامل افسانہ)

قسم

دیگر ہندوستانی زبانوں کی طرح جدید تامل افسانہ بھی مغربی اثرات کا مرہونِ منت ہے۔ ابتداء میں یورپی افسانوں کے تراجم ہوئے اور ان کی بنیاد پر افسانے لکھے گئے اور ۱۹۳۰ء تک معیاری اور طبع زاد افسانوں کی خاصی تعداد ہو گئی۔ اس زمانے میں جبکہ پوری قوم ایک ہیجان سے دوچار تھی، نوجوان افسانہ نگار بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے بڑی دلیری کے ساتھ نئے نئے موضوعات پر قلم اٹھایا اور ہئیت اور موضوع میں نت نئے تجربات کئے۔

درحقیقت انھیں لوگوں نے جدید تامل افسانہ کی بنیاد رکھی جو اپنے آپ کو نشاۃ ثانیہ کے ادیب کہتے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے لوگ تھے جن کے ہاتھ میں مقبول عام رسالوں کی ادارت تھی، انھوں نے ہلکے پھلکے دلچسپ مغربی افسانوں کے تراجم شائع کئے۔

پھر تامل ادب میں ماضی پرستی کی تحریک نے زور مارا۔ ان کے موضوعات، کردار اور ماحول سب کچھ قدیم ماضی کی یادگار تھا۔ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا مکتب خیال وجود میں آیا جس کے تحت اخلاقی افسانے لکھے گئے۔

ان رجحانات کے متوازی نشاۃ ثانیہ کا ادبی گروہ بھی مقبول ہوتا جا رہا ہے اور رسالوں میں ان کی تخلیقات زیادہ سے زیادہ جگہ پا رہی ہیں۔ افسانہ نگار خواتین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے، جن کے افسانے عام طور سے گھریلو زندگی تک محدود ہوتے ہیں قومی زندگی کے انقلابات مختلف قسم کے ہندوستانی اور غیر ملکی ادب سے روز افزوں تعلق کی بنا پر تامل افسانہ میں صحت مند رجحانات ترقی پا رہے ہیں۔

"یہ کیلنڈر کہاں سے ملا اسے رمن تجھکو!"

"میں ہی مانگ لایا۔ بھما چنو اٹھی کا تیل جو بیچتے ہیں نا ہمارے نائک جی انھیں سے۔"

"بڑا خوبصورت ہے یہ تو، کتنے پیسوں میں ملا!"

"یہ دام سے تھوڑی ملتا ہے۔ صرف جاننے پہچاننے والوں کو مفت دیا جاتا ہے، سمجھے۔"

"کیا تیرے باپ کے وہ دوست ہیں"

"دوست ہوتے تو یہ کیلنڈر جنوری کے مہینے میں ہی مل جاتا! روزانہ میں پاگلوں کی طرح اس کی دوکان کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھتا رہتا۔ وہ کشن جی مسکراتے ہوئے بنسی بجاتے رہتے ہیں نا! پاس میں گائے کا بچھڑا کان کھڑے کرکے گانا سن رہا ہے، واہ کتنا خوبصورت ہے روزانہ اسکول سے آتے جاتے وہاں تھوڑی دیر ٹھہر کر اس کو کھڑا دیکھتا رہتا وہاں ایک منیم جی رہتے ہیں، تجھ کو پتہ ہے! دبلے پتلے منہ لٹکائے جو بیٹھے رہتے ہیں۔ جون کے مہینے میں اسکول کھلتے ہی فوراً جا کر میں نے ان سے کہا۔ "چاچا جی! چاچا جی! وہ کیلنڈر مجھ کو دیں گے!" کان میں پنسل اٹکائے ناک کی نوک پر

چشمہ رکھے، انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولے — "وہ کیلنڈر دس روپے کا ہے رے، سمجھا۔" میں نے کہا۔ "ایک روپیہ دوں گا چاچاجی!" اس مکھی چوس نے 'نہیں نہیں' کہہ کر سر ہلا دیا۔ میں کہاں چھوڑتا انھیں! روز مانگتا رہا۔ لیکن وہ کہہ دیتے "نہیں یہ دینے کا نہیں، کمپنی سے ایک ہی ملا ہے۔" اس کے بعد میں نے مانگا ہی نہیں۔ لیکن روزانہ دیر تک اسے کھڑا دیکھتا رہتا۔

"تجھے پتہ ہے کہ کل کیا ہوا! دوکان کے مالک ہیں نا، نایک جی، ان کے چہرے پر چیچک کے داغ ہیں، دیکھا نہیں، جو ہمیشہ پان بناتے رہتے ہیں اور بڑا سا تلک لگاتے ہیں۔ کانوں میں ہیرے کے کنڈل پہنتے ہیں، چمکتے ہیرے کے!"

"ہاں ہاں، گول گول ہیں نا رمن!"

"کل شام کو کیا ہوا کہ وہ ہی خود وہاں بیٹھے تھے، میں اس کیلنڈر کو کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں چنّو! انھوں نے کیا کہا، تجھ کو پتہ ہے؟ "بیٹا، ادھر آجا۔" یہ کہہ کر مجھے بلایا، تو میں ان کے پاس گیا، پوچھا کہ تو کون ہے! میں نے کہا۔ "سب رجسٹرار سندر جی کا بیٹا ہوں۔" انھوں نے پوچھا۔ "یہاں روز دیر تک کیوں کھڑا رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "سنا ہے کہ آپ کی کمپنی سے ایک ہی کیلنڈر یہاں آیا تھا۔ سچ ہے چاچاجی؟" انھوں نے پوچھا "ارے! کس نے کہا تھا تجھ سے یہ سب؟" میں بولا — "وہ منیم جی ہیں نا، چاچاجی انھوں نے کہا تھا۔" انھوں نے فوراً 'منیم جی' کہہ کر پکارا۔ "اجی آیا" کہہ کر ناک کی نوک پر چشمہ ٹکائے وہ آگئے اور آنکھیں اوپر کیے دیکھنے لگے۔

"ایک کارڈ لکھیے، ان کی کمپنی والوں کو کہ یہ کیلنڈر ایک اور بھیج دیں۔ کیونکہ یہ دوسروں کو دینا پڑ رہا ہے۔ ابھی لکھ دیں، سمجھے۔" نایک جی نے یوں کہا — بس بے چارے منیم جی نے لاچار ہو کر 'جی ہاں' کہہ دیا۔ پھر نایک جی نے کہا۔ "اس کیلنڈر کو لائیے ادھر۔" منیم جی نے اسے لا کر ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ کیلنڈر مجھے دیتے ہوئے نایک جی بولے۔ "بیٹا، لے لے تیرے لئے یہ اسپیشل چٹھی لکھ رہا ہوں، دیکھا۔ لے جا یہ کیلنڈر، کہیں پھاڑ نہ ڈالنا۔ سمجھا؟" "ٹھیک ہے چاچاجی۔" یہ کہہ کر میں کیلنڈر لے آیا۔ اور کوئی ہوتا تو ایسا کرتا؟ کہہ دیا کہ اپنے لئے دوسرا کیلنڈر منگوا لوں گا۔

"اگر نہیں آیا تو کیا ہو گا رمن؟"

"کیوں نہیں آئے گا۔ آئے گا نہیں تو وہ دیتے کیوں! کتنا خوب صورت ہے، دیکھا نا! یہ کمرہ کتنا اچھا لگتا ہے اب۔ دیکھ کشن جی کو دیکھ۔ جگمگا رہا ان کا بدن۔ سر پر مور پنکھ ہے۔ ارے دیکھ رمن۔ نو بج رہے ہیں۔ کاپی رائیٹنگ کب کرے گا؟ کیا کرنا ہی نہیں۔"

"ہاں ہاں، باپ رے باپ! بھول ہی گیا چنّو، جھٹ پٹ لکھ ڈالیں گے۔"

"آج لکھائی اچھی نہیں ہوئی ہے، دیکھ۔ جلد بازی میں لکھنے لگیں تو ایسا ہی ہو گا — تو تو کیلنڈر کے پیچھے ہی پڑ گیا، رمن....! اب میں گھر چلوں!"

"ٹھیک ہے چل!"

"گھر جا کے نہانے کا بھی وقت نہیں ہے۔"

"ہاں، ہاں، جلدی بھاگ چل!"

"ارے رمن!"

"کیا!"

"میں ایک بات بتاؤں، میرا کہا کرے گا؟"

"کیا ہے؟"

"تو کرے گا بھی، یہ بتا؟"

"کیا ہے، کہہ دے، کہہ بھی دے نا؟"

"تو کہہ دے کہ ضرور کروں گا!"

"بات کیا ہے؟ بتا دے، تبھی تو میں کروں گا۔"

"تو کرے گا کہ نہیں یہ بتا دے، تبھی۔"

"چل رے چنّو، بیکار کی باتیں کرتا ہے۔"

"تب تو لے، میں جا رہا ہوں۔"

"واہ چنّو! ابھی سے تجھے غصہ آگیا۔ بتاتا کیوں نہیں کہ

کیا کرنا ہے۔"

"تو وعدہ کر کہ ضرور کروں گا۔"

"اچھا ہے، کروں گا، اب بتا۔"

"کہہ کہ ضرور کروں گا۔"

"ہاں ضرور کروں گا۔"

"قسم کھا رمن، تبھی مانوں گا۔"

"اچھا بابا! قسم کھاتا ہوں، کہہ دے اب۔"

"میری ہتھیلی پر تین دفعہ ہاتھ مار کے قسم کھا۔ تبھی کہوں گا۔"

"کشن جی کی قسم، قسم، قسم۔ تو جو کچھ کہے گا، وہ کروں گا۔"

"یہ کافی ہے نا۔"

"بعد میں کہنا نہیں کہ نہیں کروں گا۔"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"کہہ دے نا۔"

"وہ کیلنڈر مجھ کو دے دے رمن"

"اسے؟ اس کیلنڈر کو!"

"ہاں، ہاں۔"

"کل رات ہی تو لایا ہوں۔ چنو دوسرا کیلنڈر دے دوں گا۔ اس سے بھی اچھا۔"

"نہیں، مجھ کو تو یہی چاہیئے۔"

"چنو، تو بھی کیسا ہے رے!"

"قسم کھانے لگا تو تین بار اور وہ بھی کشن جی کے نام پر! اور اب ـــ یہ خوب رہی۔"

"اس کے معنی یہی کہ میں اپنے کشن جی کو ہی دے دوں!"

"قسم کھائی تو جو بھی مانگا جائے، وہ دینا پڑتا ہے۔ اور پھر تو نے تو کشن جی کی قسم کھائی ہے۔"

"اچھا! دئے دیتا ہوں۔"

"لاؤ۔"

"لے۔ لے۔ جا، لے جا۔"

"ٹھیک، اب میں گھر چلا۔"

× × × × × ×

"ارے، دوڑو! دوڑو!! اُسے بلاؤ نا۔ اس کی چالاکی دیکھی پکڑ لاؤ، اس چھوکرے کو۔"

"کس کو؟"

"سامنے والے گھر کا وہ چھوکرا ہے نا! اس کو۔ ارے چنو! تو ادھر آئے گا کہ نہیں۔ دیکھا کیسے اڑا جا رہا ہے نظروں سے۔"

"کیوں واپس آ گئے! بات کیا ہے!"

"تب تک وہ اندر گھس گیا۔ دغاباز کہیں کا۔"

"کیوں بات کیا ہے؟ بولیئے نا۔"

"تمہارا بیٹا ہے نا 'جڑ بھرت'! اسے دغا دے کر چلا گیا وہ چھوکرا چنو کیلنڈر لے کر۔"

"کیا ہے!"

"کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ 'قسم کھاؤ، قسم کھاؤ' کہہ کر وہ بدمعاش اس سے کچھ پوچھتا رہا۔ یہ بدھو بھی 'ضرور کروں گا' کہہ کر قسم کھا بیٹھا اس کیلنڈر کو دے گیا۔"

"کون سا؟ کل جو لے آیا تھا وہی؟"

"ہاں۔ وہی۔"

"ہائے رے بدنصیب! کیوں دیا رے اس کو! دے کر اب پھوٹ پھوٹ کے رو رہا ہے۔"

"رومت، پھر دیا ہی کیوں تھا!"

"وہ پوچھ رہا تھا۔ ایک بات بتاؤں، تو کرے گا کہ نہیں۔ کرے گا کہ نہیں ـ یہ بھی کہا تھا کہ قسم کھاؤ کہ کروں گا ضرور ـ! پھر کہہ دیا کہ مجھے وہی کیلنڈر چاہیئے۔"

"کیوں نہیں کہہ دیا کہ نہیں دوں گا۔"

"جب قسم کھا چکا تب کیسے 'نہیں' کہہ دیتا۔"

"جانے کیسے اس دنیا میں تو گزارا کرے گا۔ کتنا خوبصورت تھا وہ کیلنڈر، اسے کھو دیا۔ یہ کہہ کیوں نہیں دیا کہ پتا جی سے بغیر کہے دے نہیں سکتا۔"

"چپ!"

"اب کیوں سٹپٹایا کھڑا ہے۔"

"آپ کی بات نہیں سمجھا۔ وہی مانگ کے لایا تھا نا! پورا حق ہے اُسے، دے گا بھی یہی ہے نا رے!

"دے دیا ہے نا! اب جا کونے میں بیٹھ کر رو۔"

"یہ کیا کرتا؟ اس چھوکرے نے اس کو قسم دے کر خرید لیا ہے۔ اس دنیا کے لئے چنّو جیسا بیٹا ہی لائق ہے۔ اس نے کہا تھا "ارے میں کہ دوں گا ایک بات، تو کرے گا کیا! پوچھتا رہا یہ۔ کیا ہے کیا ہے؟ وہ کہنے لگا کہ 'نہیں'۔ بعد میں غصہ دکھانے لگا۔ اس نے اُسے پچکارا۔ اس نے اسے قسم کھانے کو کہا اور اس بدّھو نے ویسے ہی کیا۔ بس اس پر اپنا رعب اس نے جما لیا۔ اس کیلنڈر کو لینے کے لئے اس نے جو تمہید باندھی وہ کمال کی تھی۔ یہ بدھو بھی ایک ہی ہے جو دینے کے بعد رو رہا ہے۔"

"کیوں رمن، کہا کیوں نہیں تھا کہ نہیں دوں گا۔ اتنا بھی منھ سے نہیں پھوٹا۔"

"تین بار قسم کھا چکا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ کیلنڈر ہی مانگے گا۔"

"دان میں دینے کے لئے اتنی تپسیا کر کے مانگ لایا تھا، گیا۔"

"اس لڑکے میں ایسی چالاکی کہاں سے آئی! باپ رے باپ! باپ ماں بیٹا، سب ایک سے بڑھ کر ایک لیٹرے۔ اوروں کی چیزوں پر ایسا دانت! بالکل باپ کی ہی دوسری صورت ہے اس کی!"

"میں چنّو چنّو کہہ کر چلّا رہا تھا کہ صاف پل بھر میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ بڑا چالاک ہے۔"

"اب مال ہاتھ سے نکل گیا۔ باتیں کرنے سے کیا فائدہ!"

"ارے رمن! کسی بھی طرح سے اُسے واپس لانا ہے بس!"

"چپ!"

"کیوں گونگے کی طرح کھڑا ہے۔ اسی کی چال سے کام لے، سمجھا! اُسے بھی قسم کھانے کو کہہ! پھر کیلنڈر مانگ لینا۔ ٹھیک ہے؟"

چپ!

"بولتا کیوں نہیں رے؟"

"کیسے مانگوں پتا جی!"

"جیسے اس نے مانگا ویسے ہی۔ ایک بات ضرور کرے گا، کہہ کر اسے بھی قسم کھانے پر مجبور کر۔ پھر مانگ اپنا کیلنڈر ہی۔ نہیں لایا تو اس گھر میں تجھے کھانا نہیں ملے گا۔ ہاں!"

× × × × ×

"بیٹا چنّو! کیلنڈر کو کہاں لگایا ہے، اس طرف ہی نا؟"

"ہاں، مگر اسی طرح رہے تو بڑا اچھا لگے گا، ہے نا پتا جی!"

"بالکل ٹھیک!"

"کیوں ماں! رمن ہی نے دیا تھا۔ اس نے خود ہی دیا تھا ماں!"

"ارے رمن! تو نے ہی دیا تھا کیا۔ سچ بول۔"

"ہاں چاچی جی! میں نے ہی دیا تھا۔"

"تب تو ٹھیک ہے بیٹا چنّو، کہیں پھٹ نہ جائے۔ بڑی حفاظت سے رکھنا۔"

"ہاں، ایسا ہی کروں گا، ارے رمن! چل باہر چل کے کھیلیں۔

"ارے رمن دیکھ! یہ بچھڑا دیکھ! اس کے کانوں کو دیکھ! کیسے اوپر کھڑے کر رکھے ہیں۔"

"ہاں۔"

"کیسا چکنا چکنا ہے۔"

"ہاں، اب چلیں نا۔"

"صبر تو کر ذرا! جلدی کیا ہے۔"

"پھر دیر ہو جائے گی چنّو! رات اندھیری ہو جائے گی۔"

ارے کھیلنا ہے تو ابھی کھیلنے جاؤ۔ جلدی گھر لوٹنا ہے، سمجھے رات کے آٹھ بجے آئے گا تو اندر نہیں گھس پائے گا، سمجھ میں آیا۔"

"ٹھیک ہے ماں! دیکھا رمن جھٹ پٹ چلیں، دیر سے لوٹیں گے تو میری ماں مجھے مارے گی۔"

"اچھا۔"

"کون سا کھیل کھیلیں رمن!"

"جو چاہو۔"

"مطلب ؟"
"جو بھی کھیل کہو کھیلیں گے۔"
"رمن! کیا تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"
"نہیں تو!"
"پھر کیوں ایسا کھویا کھویا سا ہے۔"
"کچھ نہیں! آج ہم نہیں کھیلیں گے!"
"کیوں؟"
"ایسے ہی!"
"نہیں کھیلیں گے تو کریں گے کیا؟"
"میں ایک بات بتاؤں، تو مانے گا چنّو؟"
"کیا ہے!"
"میں ایک چیز مانگوں گا، تو دے گا؟"
"کیا ہے وہ؟"
"کہہ کر دوں گا!"
"کیا ہے، بتا بھی!"
"تو "دوں گا" کہہ، تب بتاؤں گا۔"
"ہو سکا، تو دوں گا۔"
"مطلب!"
"میں دے سکا تو دوں گا۔"
"تو دے سکیگا؟"
"بتا کیا ہے، دیکھوں ذرا"
"کہہ دے کہ ضرور دوں گا۔"
"ہو سکا تو ضرور دوں گا۔"
"قسم!"
"ہو سکا تو قسم! دوں گا، ضرور دوں گا۔"
"سُن لے چنّو، تیرے پاس ایک ربڑ ہے نا۔ سیاہی پنسل، سب کی لکھی ہوئی چیز کو جو مٹا دیتی ہے، وہ ربڑ مجھے دے گا؟"
"اُف! بڑی چیز مانگنے آیا ہے۔ میں گھبرا گیا کہ کچھ کا کچھ نہ مانگ بیٹھے!"
"کیا وہ ربڑ دے گا مجھ کو؟"
"ابھی چاہیئے کیا؟"
"ابھی نہیں، کھیلنے کے بعد تیرے گھر جا کے لے لوں گا۔"
ابھی ہے نا میری جیب میں، لے لے، دیکھ رمن! کہیں کچھ اور نہ مانگنا، سمجھا!"
"نہیں مانگوں گا۔"

× × × × ×

"ارے رمن! کیلنڈر کہاں ہے؟"
"پتا جی! دیکھا چنّو سے یہ ربڑ مانگ کے لایا ہوں۔ بڑی اچھّی ربڑ ہے پتا جی! دام زیادہ ہیں۔ سیاہی کا لکھا بھی یہ مٹا دیتی ہے۔"
"میں پوچھ رہا ہوں، کیلنڈر کا کیا ہوا، مانگا کہ نہیں؟"
"نہیں۔"
"کیوں نہیں؟"
"کیسے مانگتا پتا جی۔"
"ویسے ہی جیسے وہ مانگ کے لے گیا تھا۔"
"نہیں چاہیئے پتا جی!"
"کیا نہیں چاہیئے۔"
"مجھے ڈر لگتا ہے پتا جی۔"
"کس بات سے؟"
"مانگنے سے۔"
"کیا مانگنے سے!"
"وہی پتا جی، اسی کیلنڈر کے مانگنے سے!"
"کیوں!"
"جو چیز دے چکا اُسے کیسے مانگوں پتا جی!"
"کیا بکتا رہا ہے؟"
"یہ ربڑ کافی اچھی ہے۔ آج کل یہ دوکانوں میں ملتی بھی نہیں۔"
"اس لیئے یہی مانگ لی ہے کیا؟"
"جی پتا جی۔"

"ایسے تو نے مانگا ہی نہیں تب!"

"وہ مجھے نہیں چاہیئے پتاجی۔ مجھے وہ پسند نہیں ہے۔"

"کیوں رے رمن! تجھ کو اور وہ پسند نہ آئے! کیوں کیا بات ہے"

"معلوم نہیں! کیوں مجھے پسند نہیں۔"

"واہ رے واہ ۔ شیر بچہ! چل جا جا۔"

× × × × × × ×

"ارے کہاں ہو، آؤ نہ ذرا۔"

"کیا ہے! کیوں بلا رہے ہو؟"

"ہمارا رمن کہاں چلا گیا۔ ابھی یہیں تو تھا۔"

"کھانے کے لئے بلایا تھا۔ ہاتھ منہ دھونے گیا ہے۔"

"دیکھی اپنے شیر کی شان! وہ چنتو سے یہ ربڑ مانگ کے لایا ہے اس پر بھی اپنی ہوشیاری کو بڑھ چڑھ کر جتا رہا ہے۔"

"کیوں یہ ربڑ کیوں لایا ہے؟"

"کہتا ہے یہ کہیں بکتی نہیں۔ سیاہی کے لکھے کو بھی مٹا دیتی ہے۔ کافی دام کی ہے۔ یہی ہے وہ چیز جو میں کیلنڈر کے بدلے میں لایا ہوں۔"

"کیلنڈر کے پیچھے آپ اس کی جان کیوں کھا رہے ہیں؟"

"نہیں، ایسے دیوتا کیوں اس دنیا میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ دنیا تو چال بازوں کی ہے۔"

"خوب رہی بچوں کی سی آپ کی نادانی! آنسو پونچھئے، چلئے، دیر ہو رہی ہے، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ بڑا ہونے پر ہمارا رمن آپ ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ عقل مند بن جائے گا۔"

"دہی والی" (صفحہ ۲۸ سے آگے)

بچے کو مارنے پر اعتراض کرتا ہے وہ بچے کو پیار کرنے کو بھی منع کر سکتا ہے۔ میں جو کچھ کروں اس کے لئے وہ مجھے ذمہ دار ٹھہرا سکتی ہے لیکن میرا بیٹا میرا ہے، میرا شوہر میرا ہے۔ مگر مجھے اپنے شوہر سے کچھ کہنے اور بچہ غلط کام کرے تو اسے تھپڑ لگانے کا حق نہ ہو تو پھر میری زندگی کیا ہوگی؟"

اگر منگما نے سمجھ داری کی باتیں کی تھیں تو اس کی بہو بھی کم سمجھ دار نہیں تھی۔

"اب تم نے اپنا حق حاصل کر لیا ہے۔"

حالات بہتر نظر آتے ہیں۔ بہر حال یہ آپس کے میل ملاپ کی بات ہے۔ اگر میں بات کو اس حد تک بڑھا دوں کہ تعلقات بالکل ٹوٹ جائیں تو کوئی چالاک آدمی حلیہ دے کر اس سے سارے روپے لے لے گا۔ گاؤں میں انگیا نام کا ایک آدمی ہے۔ جب میری ساس ہم سے الگ رہتی تھی تو اس نے اس سے روپیہ قرض مانگا تھا اور میں نے سنا کہ وہ قرض دینے کے لئے راضی بھی تھی۔ انگیا نے یہی کہا تھا۔ پھر میں نے اپنے بیٹے سے کہا "دادی کے پاس جا وہ تمہیں مٹھائی دیں گی۔ اس وقت تک واپس نہ آنا جب تک کہ میں نہ کہوں۔ میں جھگڑا ختم کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے یہ طریقہ سوچا۔"

"تو تمہارا لڑکا اپنی مرضی سے نہیں گیا۔"

"نہیں وہ اپنی مرضی سے گیا لیکن سمجھاؤ میرا تھا۔"

"کیا تم ساری باتیں اپنے شوہر کو بتاتی تھیں؟"

"نہیں، میں نے ایسا نہیں کیا۔ مرد ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔"

سمجھ داری میں نجما منگما سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اس گھر میں یہ کشمکش جاری ہے۔ اس عورت کا بیٹا اور اس عورت کا شوہر۔ اس کے لئے یہ جنگ لڑی جاتی ہے۔ ماں چاہتی ہے کہ بیٹا کسی طرح ہاتھ سے نہ نکلے اور بیوی اس کوشش میں رہتی ہے کہ اسے اپنے بس میں کرلے۔ اس قسم کے معاملے میں ہار جیت کی بات کرنا بہت مشکل ہے۔ بہو اس مگرمچھ کی طرح ہے جو پانی کے اندر محفوظ ہے اور شوہر کی ٹانگوں کو پکڑے ہوئے ہے۔ ماں کنارے پر کھڑی ہے اور لڑکے کے ہاتھوں کو پکڑ کر کھینچ رہی ہے تاکہ باہر نکال لے۔ مرد بے چارا جس عذاب میں گرفتار ہے وہ صاف ظاہر ہے۔ یہ کشمکش اور لڑائی دہی بیچنے والی منگما اور شہر کی دہی خریدنے والی تھنگما کے گھر میں بھی ہو رہی ہے۔ اس ڈرامے کا ڈراپ سین شاید کبھی نہ ہوگا۔

پالگمی پدماراجو

مقابلہ

گوداوری میں سیلاب آرہا ہے۔ امنڈ امنڈ کر آنے والے اور پیڑوں کے سہارے دریا میں اتر پڑتے ہیں۔ شام ہوتے ہوتے

دھوئیں کی طرح بہنے والے اس گاڑھے پانی کو دیکھ کر کس کا دل نہیں کانپ اٹھتا۔ ہاں دھوبی لوگ اس پانی کے بہاؤ میں بے خوف ہو کر گھس پڑتے ہیں اور دریا کے بہاؤ میں بہہ کر آنے والی لکڑیوں اور درختوں کو کنارے پر پہنچاتے ہیں۔ روز صبح ہوتے ہی دھوبی لوگ چھوٹے چھوٹے

کناروں پر لکڑیوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ مرد دریا میں کود پڑتے ہیں اور عورتیں کنارے پر کھڑی ہو کر بانس کے بیچ ڈنڈوں میں انکڑی لگا کر چھوٹی چھوٹی لکڑیوں اور ڈالیوں کو کنارے پر کھینچتی رہتی ہیں۔ سیلاب کے دنوں میں گوداوری بہت

بلاشبہ تیلگو افسانے نے مغربی اثرات کو قبول کیا ہے، مگر اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ان اثرات کو اس طرح جذب کر لیا گیا ہے کہ کسی بدیشی رنگ کا شبہ تک نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے جدید تیلگو افسانہ مشرق اور مغرب کی فنی خوبیوں کا ایک حسین امتزاج پیش کرتا ہے جس نے تیلگو ادب میں اس کو امتیازی حیثیت بخشی ہے۔ تیلگو ادب میں جدید افسانہ نسبتاً نئی چیز ہے، اس نے تقریباً اس صدی کے شروع میں جنم لیا۔

یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ مہاکوی گرزادا اپاراؤ جنھوں نے تیلگو ادب کو نئی راہوں سے روشناس کرایا، افسانہ کے میدان میں بھی پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سوامی شوشنکر شاستری نے نوجوان ادیبوں کی ہمت افزائی کر کے فن افسانہ نگاری کو غیر معمولی تقویت پہونچائی۔ انھیں کے زیر اثر چنتا دیکشی تولو، مُنی مانکم، آڈیوی باپی راجو اور نوری نرسمہا شاستری نے تیلگو ادب کو افسانوں سے مالا مال کر دیا۔

کوی سمراٹ وشوناتھ ستیہ نارائن جنھیں اس سال ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا ہے، ایک ممتاز افسانہ نگار بھی ہیں، اور ان کی بعض کہانیاں شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

کوڈی پاٹی وینکٹا چلم نے تیکھے انداز میں بہت سے افسانے لکھے ہیں وہ جنسی مسائل سے متعلق ہیں اور ان کے انقلابی نظریہ کے حامل۔

دیلوری شیورام شاستری اور آنجہانی نری پاہ سبرامنیا شاستری دونوں صاحب طرز افسانہ نگار ہیں۔ ان کی تخلیقات عالمگیر حقائق کی ترجمان ہیں اور اس سے ان کی تازگی میں کمی نہیں آنے پائی۔

بعد کے افسانہ نگاروں میں کُچی بالو، کمٹبا راؤ اور گوپی چند کے نام قابل ذکر ہیں کمٹبا راؤ نے متوسط طبقہ کے حالات اور غریبوں کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ گوپی چند کے یہاں موضوع اور ہئیت کا خوب صورت توازن ملتا ہے۔ انھیں انسانی ذہن کی کار فرمائی کا پورا ادراک ہے۔ پالگمی پدماراجو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں اور حقیقت نگاری ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

شور مچاتی ہے۔ وہ اپنے زبردست بہاؤ میں جنگل کے درختوں کی جڑیں تک اُکھاڑ لاتی ہے اور ان درختوں اور ڈالیوں کو کنارے لاکر انسان قدرت پر اپنی فتح کا ڈنکا بجاتا ہے۔

بہہ کر آنے والی ان لکڑیوں کو چننے میں کافی ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف طاقت سے ہی کام نہیں چلتا۔ منجدھار میں کسی درخت کے ہاتھ لگنے پر بہاؤ کی رفتار کو سمجھ کر تھوڑی دیر اس کے ساتھ بہہ کر اسے کنارے لگانا پڑتا ہے۔ اس کام میں بھی ایک طرح کی دوڑ لگی رہتی ہے۔ دھوبیوں کی کاریگری کی یہ ایک کسوٹی مانی جاتی ہے۔ صرف لکڑیوں کا لالچ ہی نہیں۔ اس دوڑ میں جیتنے کی خواہش بھی دھوبیوں کو منجدھار میں جاتے پر اکساتی ہے۔ اس دوڑ میں جیت کر بہادر کہلانے کے لئے وہ جان کی بازی تک لگا دیتے ہیں۔

اس گاؤں میں رامی بڑی ضدی لڑکی مانی جاتی ہے۔ بات بات پر ہر کسی سے لڑنا جیسے اس کی عادت ہے۔ وہ صبح سویرے ہی لگی ہاتھ میں لے کر اپنے گھر کے پاس والے گھاٹ پر جا کھڑی ہوتی ہے بس اب اس گھاٹ پر کوئی اور نہیں آسکتا۔ اگر کوئی ہمّت کرے بھی تو وہ ایسے برس پڑتی ہے کہ آدمی کو بھاگ جانے کے سوا اور کوئی چارا ہی نہیں رہتا۔ رامی کی زبان بڑی سخت ہے۔ پولیس والے بھی اس پر اپنا رعب نہیں جما سکے۔ انصاف کی بات کون جانے، اس کی زبان سے ڈر کر کوئی عورت اس گھاٹ پر نہیں آتی۔

دیکیا بڑا تیز مزاج نوجوان ہے۔ چھیڑ چھاڑ کر کے جھگڑا مول لینے میں وہ سب سے آگے رہتا ہے۔ دھوبیوں کے محلے میں ہر سیانی لڑکی کی نظر اس پر رہتی ہے۔ ان کی نظروں میں وہ ایک بہادر آدمی ہے۔ دیکیا کے باپ اور رامی کے باپ میں ایک مدّت سے جھگڑا چلا آرہا تھا۔ دیکیا کے باپ نے ایک مرتبہ رامی کی جھونپڑی میں آگ لگادی تھی۔ دیکیا یا اس کا باپ سامنے دکھائی پڑتے تو رامی گالیاں بکنا شروع کر دیتی۔ دیکیا یہ سوچ کر خاموش رہ جاتا کہ عورت سے کیا منہ لگے۔ اس محلے کی سبھی لڑکیاں رامی سے نفرت کرتی تھیں اور اسے مردانی سمجھتی تھیں۔

جب دیکیا کو یہ معلوم ہوا کہ گھاٹ پر آنے والی سبھی عورتوں کو رامی بھگا دیتی ہے تو اصل بات کا پتہ لگانے کے لئے وہ خود گھاٹ پر آیا۔ رامی لکڑیاں چن رہی ہے۔ کنارے پر کھڑی دو تین عورتیں خشمگیں نگاہوں سے رامی کو دیکھ رہی ہیں۔ دیکیا نے ایک لگی ہاتھ میں اٹھائی۔

"ارے دیکھو تو نگوڑا عورتوں سے بازی لگانے آیا ہے۔"

رامی بول اٹھی۔

"تو تو عورت ذات ہے۔ ہمیں کیا معلوم..... سیدھی طرح بات کر، نہیں تو تو اور تیری لگی دھار میں بہہ جائے گی۔"

"میں پہلے اس گھاٹ پہ آئی ہوں، پھر تم کیوں آگئے۔ تم کو شرم نہیں آتی!"

"یہ گھاٹ کیا تمھارے باپ کی جائیداد ہے!"

"میں یہاں پہلے آئی۔"

"ہم بعد میں آئے ہیں۔"

"ڈھیٹ کہیں کا۔ عورتوں کی برابری.....!"

"تم انصاف سے سیدھی طرح کہو تو میں چلا جاؤں۔"

"سدھ بے سدھ کیا بکے جا رہے ہو۔ یہاں سب لکڑیاں ہم ہی چن لیں گے۔"

"اچھا جن کو تم نہیں چن سکو گی ان کو ہم دیکھ لیں گے۔"

"جس کو میں نہیں چن سکتی اس کو تو بہہ جانا چاہیئے!"

اب اگر دیکیا گھاٹ چھوڑ کر چلا جائے تو پھر اس نے اپنی ہار مان لی۔ اس نے اپنے بیڑے کو کنارے ڈال دیا اور لگی کی مدد سے ہی لکڑیاں چننے لگا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ رامی کو کیسے نیچا دکھائے۔ اس کی عمر کی لڑکیاں تو دیکیا کی ایک نظر سے پگھل جاتی تھیں۔ یہ رامی تو ان سب سے بازی لے گئی۔ رامی کی یہ گستاخی! اس کا یہ سلوک صرف میرے ساتھ نہیں سبھی کے ساتھ ہے۔ ہوں، اسے کسی نہ کسی طرح نیچا دکھانا ہی چاہیئے۔

پانی کے کنارے کھڑے ہو کر لکڑیاں چننے میں رامی دیکیا سے بازی لے گئی۔ اس کے ہاتھوں کی مہارت، لکڑیوں کو باہر کھینچ نکالنے میں اس کی ہوشیاری دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اس کی

لگّی سے لگ کر بھی کئی لکڑیاں پھسل گئیں۔ مگر رامی کی لگّی سے لگتے ہی ہر لکڑی کنارے پر آکر ہی رہی۔ اس نے بہت کوشش کی مگر کوئی خاص فائدہ نہیں رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیسے کنارے پر رہ کر بھی اتنی لکڑیاں اکٹھی کی جاسکتی ہیں۔ وہ منہ کھولے دیکھتا ہی رہ گیا۔

اس دن گوداوری خوفناک انداز میں بہہ رہی تھی۔ چاروں طرف سے بادل امنڈ رہے تھے۔ ہلکی سی پھوار پڑ رہی تھی۔ ہوا بھی زوروں سے چل رہی تھی۔ بہت سے دھوبی مارے ڈر کے دریا میں اترنے نہیں آئے۔ مگر دیکیا بڑا انجام کر اتر پڑا۔ ایک ناچیز لڑکی کے ساتھ بازی لگاکر کنارے پر بیٹھے رہنا اسے اچھا نہیں لگا۔ کسی کو پانی میں اترنے کی ہمّت نہیں تھی۔ بالآخر اس نے ہمّت کر ڈالی۔ اس کے پیچھے کچھ اور نوجوان بھی کود پڑے۔ وہ لکڑیاں چن چن کر رامی کے گھاٹ پر پہونچانے لگا۔ رامی کنارے بیٹھی بڑے دھیان سے لکڑیاں چن رہی تھی۔ دوپہر ہوگئی تھی۔ دوسرے دھوبی کام چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ دیکیا خوب تھک گیا تھا مگر اس نے فیصلہ کیا کہ رامی سے پہلے گھر نہیں جاؤں گا۔

پھر شام ہونے آئی۔ چھینٹوں اور ہوا کی رفتار اور تیز ہو رہی تھی۔

"تم ابھی کب تک رہوگی؟"

"تم ابھی کب تک رہوگے؟"

دیکیا دوبارہ پانی میں جا رہا تھا۔ رامی اپنی دُھن میں تھی۔

"ہوشیار کہیں پھسل نہ جاؤ۔"

"ارے تم اپنی فکر کرو۔ گر جاؤں تو تم مت نکالنا۔"

"بڑی بڑی باتیں کر رہی ہو اگر جاؤگی تو ہمیں نکالنا پڑے گا۔"

دُور سے ایک بڑا درخت بہتا آرہا تھا۔ دیکیا تیرتا ہوا اس کی طرف چلا۔ درخت بھاری تھا اور پھر وہ تھک بھی خوب چکا تھا۔ رامی کے سامنے ہار ماننا اسے اچھا نہیں لگا۔ ورنہ اتنا تھک جانے کے بعد وہ کبھی یہ ہمّت نہ کرتا۔ درخت کو سنبھال لیا اور آہستہ آہستہ کنارے کی طرف آنے لگا۔ آنکھ اُٹھاکر دیکھا۔ کنارا نظر نہیں آیا پھر بھی وہ ناک کی سیدھ میں تیرتا چلا گیا۔ پھر دیکھا رامی کمر تک پانی میں کھڑی ہوئی ایک بڑی ڈالی کو لگّی میں پھنسانے کی کوشش کر رہی ہے۔

"کنارے پر کھڑی رہو۔ گر جاؤگی۔ اس کو چھوڑ دو۔"

"تم اپنے پیڑ کی طرف دیکھو۔"

"اس کا کچھ بھی ہو۔ مجھے کیا! ضدی کہیں کی — اسے کیا اپنی بات معلوم نہیں۔ مرے تو مرے!" مگر دیکیا کی نظریں کنارے کی طرف ہی لگی ہوئی تھیں۔ ایک بار رامی پھسلتے پھسلتے بچی۔ دیکیا پکارنے لگا مگر اپنے آپ کو روک لیا۔ وہ سر جھکا کر تیرنے لگا۔

اتنے میں پھسل کر گرنے کی آواز آئی! جیسے دیکیا کے دل کی دھڑکن رک گئی۔ ہاتھوں سے درخت چھوٹ گیا۔ سر اُٹھاکر دیکھا تو رامی نہیں دکھائی دی۔ وہ بڑی تیزی سے تیرتا ہوا گیا۔ بہاؤ میں بہتا ہوا رامی کا سر دکھائی پڑا۔ دیکیا نے ایک ہاتھ سے رامی کو اوپر اٹھا لیا۔ رامی نے دونوں ہاتھوں سے دیکیا کے گلے کو پکڑ لیا۔ دونوں ڈوب گئے۔ بڑی مشکل سے اپنے گلے کو چھڑا کر اوپر اُٹھ کر دیکیا نے سانس لی۔ رامی بے ہوش ہوگئی تھی۔ آہستہ سے اُسے اپنی کمر پر لئے دیکیا نے پانی پر اپنے آپ کو سنبھالا — اتنے میں بہاؤ نے انھیں بیچ میں دھکیل دیا۔ دیکیا کو ڈر لگا۔ ہاتھ پیر بالکل تھک گئے تھے پھر بھی بھگوان پر بھروسہ رکھا۔ آنکھیں بند کرکے دونوں جسموں کو کنارے کی طرف کھینچنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ایک زمانہ گزر گیا ہو۔ کنارہ ہاتھ لگا۔ وہاں بہاؤ سے زمین کٹ گئی تھی، ہاتھ پڑتے ہی وہ ٹوٹ کر نیچے آگری۔ پھر دونوں ڈوب گئے۔ دیکیا کو لگا کہ ہوش جا رہا ہے۔ آخر میں ادھ مری حالت میں وہ رامی کے ساتھ کنارے آکر لگا۔ رامی کو نیچے لٹا کر اس نے ذرا سانس لی۔ رامی کے جسم کو حرکت ہوئی۔ وہ کراہ اٹھی۔ دیکیا نے اُسے ہلایا۔ نیم بے ہوشی میں رامی نے دیکیا کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ اس حرکت سے دیکیا کو لگا کہ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اس سے سب کچھ کہے بغیر ہی دیکیا سمجھ گیا۔

رامی کو کندھے پر اٹھاکر وہ اپنے محلے کی طرف چل پڑا۔

— ارے کتنی عجیب بات ہوئی۔ رامی کو معلوم ہوگیا کہ اسے میں نے ہی بچایا ہے۔ کہا تھا نا، تم ڈوب جاؤگی تو مجھے ہی نکالنا

بڑے گا ——۔ آخر میں ہوا بھی ایسا ہی —— اس کے ساتھ بازی لگائی گئی تھی۔ یہ بازی لگی ہی کیوں۔ اس کو اتنے دنوں سے نفرت کیوں ہو گئی۔ وہ ضدی ہے، گستاخ ہے تو مجھے کیا! سوچا تھا اسے کسی نہ کسی طرح نیچا دکھاؤں مگر کچھ نہ کر سکا۔ اس لئے شاید اسے اتنی چڑ ہو گئی تھی۔ اس کے برابر کوئی اور لڑکی لکڑی چن نہیں سکتی۔ اس کی برابری تو محلے کی کوئی لڑکی نہیں کر سکتی۔ وہ اصلی لڑکی ہے مگر کچھ ضدی طبیعت کی ہے۔ کیا میں خود ضدی نہیں؟!

رامی کا پھسل کر پانی میں بہہ جانا، اس کا باہر نکالنا، دیکیا سوچنے لگا کہ اتنا بڑا کام کبھی نہیں کیا اب کے وہ ہار گئی۔ بڑی محنت سے اس کو بچایا۔ اس لئے وہ اخلاقی اعتبار سے اس کی ہو گئی۔ دیکیا نے خیال کیا کہ اس نے اسے جیت لیا ہے۔ اسے لگا کہ دنیا کی کوئی لڑکی ایسی خوب صورت اور تندرست نہ ہوگی۔

جب رامی کو کچھ ہوش آیا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ کو دبایا ——۔ پانی سے نکالنے کے لئے اس کی التجا، اپنی شکست کا اقبال ان سب باتوں کا اس کو احساس ہو رہا تھا۔

دیکیا نے دھیرے سے رامی کو نیچے اتار کر رکھا اور پھر رامی کے ماں باپ کو پکارا۔ بھیڑ لگ گئی۔ رامی کی ماں چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ اس کا باپ ہکا بکا رہ گیا۔

لوگوں نے طرح طرح کی ترکیبیں کیں۔ پیٹ کو دبا کر پانی نکالا۔ — آگ سلگا کر جسم کو گرم کیا۔

رامی کی ماں زور زور سے رو رہی تھی۔ "ارے اس نگوڑے نے میری بٹیا کو مار ڈالا۔"

دیکیا کو یہ سب کچھ سنائی نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ تکھی نظروں سے رامی کو ہی دیکھے جا رہا تھا۔

رامی کے جسم میں کچھ حرکت ہوئی۔ آنکھیں آدھی کھل گئیں۔ دیکیا اس کے پاس گیا۔ رامی نے اس کی طرف دیکھا۔ درد سے بے چین نظروں میں چھپے پیار کو دیکیا ہی سمجھ سکا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کہیں...

رامی کی ان نگاہوں کو دیکھ کر اس کی ماں کا شک اور بڑھ گیا وہ اور زور زور سے رونے لگی۔ "ہائے ہائے گھاٹ پہ کوئی تھا ہی نہیں۔ موقع دیکھ کر ڈبو دیا ہماری بٹیا کو۔"

دیکیا حیران رہ گیا۔ اس کی محنت کا یہ پھل!!

رامی کا دم نکلنے لگا۔ رامی کے باپ کو دیکیا کے باپ سے اپنی پرانی دشمنی یاد آئی —— دیکھیں گے تمہاری باتیں۔ ابھی پولیس کو بلا لائیں گے۔ یہ کہہ کر وہ لمبے قدم رکھتا ہوا چلا گیا۔

دیکیا اور تھک جاتا تو رامی کے ساتھ گوداوری میں بہہ گیا ہوتا۔ اتنی محنت سے اسے باہر نکالا۔ اس کی جان تو بچتی نہیں معلوم ہوتی اور پھر اس کے سر پہ جرم۔

دیکیا نے سوچا یہ دنیا ہی ایسی بُری ہے۔ وہ اور رامی غلطی سے اس دنیا میں پیدا ہوئے ہیں۔

گزارش

غیر طلبیدہ مضامین وغیرہ اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جبکہ ان کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ بھیجے جائیں۔

سب کو اپنی اپنی

روزِ حشر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں نفسی نفسی ہوگی۔ ہر ایک کو اپنے اپنے اعمال کی فکر ہوگی۔ نہ باپ بیٹے کے ساتھ مروت کرنے کے لئے تیار ہوگا، نہ ماں اپنے دودھ کے پالوں سے اظہارِ محبت کرے گی۔ نہ بھائی بھائی کو پہچانے گا، نہ عاشق معشوقوں پر فدا ہوں گے اور نہ بیویاں شوہروں کے بارے میں پتی ورتا دکھائیں گی۔ لیکن ایسے قیامت کے دن اسی دنیا میں آئے دن آتے رہتے ہیں اور ہمارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ایسا ہی ایک دن نومبر ۱۹۶۲ء میں بھی تھا۔ پانچ مقامات پر پانچ طرح کی گفتگوئیں تھیں، یادیں تھیں، خواب تھے، خواب کی تعبیریں تھیں اور شکستِ خواب کی تصویریں۔

کانپور میں جیارام سیٹھ کے بنگلے پر:۔

جیارام۔ تو جوگندر، یہ فوجی ٹھیکے کا کام تو کچھ اچھا نہ چلا۔

جوگندر۔ کیا کرتا پتاجی۔ اب نیفا ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔ تیزپور تک برابر خالی ہو رہا ہے۔

جیارام۔ اچھا ہی کیا جو چلے آئے، جان جوکھوں کا معاملہ ہے۔

جوگندر۔ ہاں، پتاجی، میری جان پر بنی تھی۔ اتنے دنوں بھی نہ ٹکتا۔ بس ذرا بزنس کو ٹھکانے سے لگانے کی فکر تھی۔

جیارام۔ تو کیا کر سکے ہو گے اس کا بند و بست؟ ایسے میں تو گھاٹا ہونا بدا ہی تھا۔

جوگندر۔ نہیں پتاجی۔ میں نے ایک سردار جی سے معاملہ کر لیا۔

جیارام۔ تو کیا اسے ڈر نہیں لگتا۔

جوگندر۔ نہیں پتاجی، ڈر تو یہ لوگ جانتے ہی نہیں۔ جنگ ہو یا بزنس یہ اپنی جگہ ڈٹے ہی رہتے ہیں۔

جیارام۔ تو تم نے اپنے دام کھرے کر لئے؟

جوگندر۔ ہاں بلکہ دس ہزار اوپر سے!

جیارام۔ چلو، مہینے بھر کے ہیر پھیر میں دس ہزار بُرے نہیں۔

اور ان کے سوکھے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

جوگندر۔ ہاں، یہی میں نے بھی سوچا۔ پھر یہاں نملا کے جیتنے کے لئے بھی تو میدان صاف ملے گا۔

جیارام۔ کیوں، وہ جو گوبند اور رام داس اس پہ دانت گڑائے بیٹھے ہیں، وہ کیا ہوئے؟

جوگندر۔ وہ بھی تو اپنی ہی برادری کے ہیں۔ وہ بھی اس لڑائی سے فائدہ اٹھانے، کمانے کھانے نکلے ہیں۔

جیارام۔ تو پھر میری اشیرباد لو۔ نملا مل جائے تو پھر اپنی چاندی ہی چاندی ہے۔

. . . .

اسی کان پور کی ایک دوسری شان دار کوٹھی میں:۔

سیٹھ مرلی مل۔ کیوں چلے آئے گوبند؟

گوبند۔ اب سری نگر ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔ منٹوں میں آدمی وہاں برف کی سل بن جاتا ہے۔

مرلی مل۔ تو جموں میں ٹکتے۔

گوبند۔ جموں میں! وہاں تو ہر وقت سڑکوں پہ فوجی ٹرک، توپخانہ اور ٹینک کی گھڑگھڑاہٹ سے پورا شہر لرزتا رہتا ہے۔ میرا تو ان سامانوں کے دیکھنے ہی سے دم نکلتا ہے!

مرلی مل۔ تو بزنس سب ستیاناس ہوا!

گوبند۔ نہیں پتاجی، وہاں ایک خان صاحب فوجی ٹھیکہ دار ہیں، انھیں کے ہاتھ اپنا دھندا بھی بیچ ڈالا۔

مرلی مل۔ تو اچھا خاصا گھاٹا اٹھانا پڑا ہوگا۔

گوبند۔ گھاٹا؟ پتاجی میں آپ ہی کا بیٹا ہوں۔ میں نے سُن رکھا تھا ان خاں صاحب کے پیچھے کوئی بڑی موٹی ٹھوس پارٹی ہے۔ میں نے دو چار رگڑے گھسے دئے اور صاف پندرہ ہزار نفع کے نکال لئے۔

مرلی مل۔ شاباش! پر اب یہاں آگئے ہو تو کوئی اور دھندا کرو۔ آج کل بلیک میں وارے نیارے ہو سکتے ہیں۔

گوبند۔ ضرور پتاجی! کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ پر سب سے پہلے اپنی سونے کی چڑیا پکڑنی ہے۔

مرلی مل۔ نملا کو کہتے ہو؟ وہ پنچھی پنجرے میں آجائے تو یہ گھر سونے کی اینٹوں کا بن جائے!

. . . .

اسی شہر کی ایک بہت بڑی صرافے کی دوکان پر رام داس اور اس کے باپ جگن داس باتیں کر رہے ہیں۔ سڑک پر ایک موٹر کھڑی ہے۔ خاک سے اٹی ہوئی اس کی صورت اس کی چغلی کھا رہی ہے کہ اس پر کوئی لمبا سفر کیا گیا ہے۔

جگن داس۔ تم نیفا اور لداخ دونوں جگہوں کا انتظام کر آئے؟

رام داس۔ جی ہاں پتاجی۔

جگن داس۔ سردار جی اور خاں صاحب ہی کے ذریعہ سے سارے معاملات ہو گئے نا؟

رام داس۔ جی ہاں۔

جگن داس۔ تمھارے دوستوں کو تو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔

رام داس مسکرا کر بولا۔ "وہ جان جاتے تو ایک کا دس مانگتے۔ یوں سستے ہی میں معاملہ ہو گیا۔ ان کو کیا معلوم کہ یہ لاکھوں لاکھ کے فائدے کے کام ہیں۔ وہ دس پانچ ہزار ہی پا کر خوش ہو گئے اور جلدی سے بھاگ آئے۔

جگن داس۔ ارے تو ان کے پاس سردار جی اور خاں صاحب جیسے نڈر بھروسے کے آدمی کہاں تھے؟ — اچھا تو اب کیا ارادے ہیں؟

رام داس۔ جی اب یہیں شہر میں رہ کر آپ کا ہاتھ بٹاؤں گا۔

جگن داس۔ پھر کیا خاک ہاتھ بٹاؤگے۔ دوکان میں نہ سونا ہے، نہ سونے کے زیور، نہ بنانے والے گھڑنے والے سنار جو پُرانے آدمی پتاجی کے سمے سے لگے تھے انھیں الگ نہیں کیا، وہ بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

رام داس۔ تو کیا آپ نے سارا سونا گورنمنٹ کو دے دیا؟

جگن داس۔ ہم ہہ! کل کا چھوکرا اور مجھے بزنس کے داؤ پیچ سکھانے چلا ہے۔ یہ باتیں تمھاری ماتا تک سے بھی بتانے کی نہیں۔

رام داس۔ پھر؟

جگن داس۔ ارے ایک بتایا چار چھپایا!

رام داس۔ مگر جب آپ اسے بیچ ہی نہیں سکتے تو چھپا کر رکھنے سے کیا فائدہ؟

جگن داس۔ ارے جیتی رہیں ہمارے دیش کی استریاں، وہ سونے پر سب کچھ قربان کر سکتی ہیں۔ بس اب دن کے اجیالے کی جگہ رات کے اندھیرے میں سودا ہوتا ہے۔ آج کل ایک سو ستر بہتر کا بھاؤ ہے!

رام داس۔ تو اب تو نملا کو اس گھر میں لانا اور بھی ضروری ہوا۔ منوں سونا اس کے ہاں بھی دبا پڑا ہوگا۔

جگن داس۔ ارے وہ آجائے اور اس کی تینوں ملیں مل جائیں تو میں اس صرافے کے کام کو چھوڑ کر ڈسٹلری کھولوں اب اس دھندے سے زیادہ نفع کسی چیز میں نہیں۔

. . . .

اور اسی شہر کے مضافات میں ایک بڑی شاندار کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں نملا اور اس کی چچی کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔ بڑی بی سمجھا رہی تھیں کہ اب جبکہ وہ ایم اے بھی کر چکی ہے اور اپنا کام بھی سنبھال چکی ہے، اسے اپنا سارا وقت قومی کاموں میں نہ صرف کرنا چاہیئے، نہ نرسنگ کی تعلیم حاصل کرنے کی اسے ضرورت، نہ اسپتالوں میں زخمی سپاہیوں کی دیکھ بھال

کی اسے حاجت اور نہ گھر گھر ڈیفنس فنڈ کے لیے چندہ جمع کرنے کے لئے جانا مناسب۔ اسے اب اپنا گھر بسانے کی فکر کرنا چاہیئے۔

پچی۔ میں کہتی ہوں یہ تینوں بُرے نہیں۔ جوگندر، گوبند، رام داس۔ اپنی ذات برادری کے ہیں۔

نملا۔ کیا اپنی ذات برادری کا ہونا ضروری ہے؟

پچی۔ ہے کیوں نہیں۔ منو جی نے کچھ سوچ سمجھ ہی کے تو چار ذاتیں کر دیں اور ان کے الگ الگ کام بانٹ دئے۔ ایسا نہ ہوتا تو یہ تینوں بھی کہیں وہ تمہارے گجادھر سنگھ کی طرح سرحد پر برف سے ڈھکی پہاڑیوں پر لیٹے دھائیں دھائیں کرتے ہوتے! اور سارا دھندا خاک میں مل جاتا۔

نملا کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اسے گجادھر سے اپنا وعدہ یاد آگیا — "میں انتظار کروں گی!"

. . . .

اور لفٹننٹ گجادھر چشول کے آگے والی چوکی پر اس کے عارضی اسپتال میں تھکا ماندہ زخمی لیٹا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ یہ اسپتال کیا تھا ۱۰×۱۲ فٹ کا ایک کمرہ تھا۔ دیواریں لکڑی کی، چھت ٹین کی۔ ایک سے ایک ملے ہوئے تین لوہے کے پلنگ تھے، ایک اسٹول تھا، ایک چھوٹی سی میز تھی۔ میز پر ہاتھ دھونے کا تسلا تھا اور فرسٹ ایڈ کا مختصر سا سامان۔ اس کمرے کی دیواروں اور چھت پر ریڈ کراس کا نشان بنا تھا۔ چاروں طرف ریڈ کراس کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ اندر پلنگوں پر گجادھر کے ساتھ اس کے وہ دو جوان تھے جنہیں وہ چوکی نمبر ۱۳ سے بچا کر اپنے ساتھ نکال لایا تھا۔ ۴۸ گھنٹے سے ان میں سے کسی کی پلک سے پلک نہ لگی تھی۔ چوبیس گھنٹے متواتر چوکی نمبر ۱۳ کے پچیس جوانوں نے کئی سو چینیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ آخر دشمن نے چھوٹی توپیں لگا دیں۔ جو کام رائفلوں اور مشین گنوں کی ہزاروں گولیاں نہ کر سکی تھیں وہ توپوں کے دس گولوں نے چند منٹوں میں تمام کیا۔ چوکی کی دیواریں مسمار ہوئیں، چھتیں ٹوٹیں اور بیس لوہے جیسے سورما پاش پاش ہو گئے۔ گجادھر صرف پانچ جوانوں کو بچا کر لڑتا ہوا پیچھے ہٹا۔ دشمن نے تعاقب کیا۔ تین اور ساتھی راستے میں دشمن کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ صرف گجادھر اور اس کے دو جوان اس چوکی تک سلامت پہنچ سکے تھے۔ یہاں کے کمانڈر میجر رام ناتھ نے چشول کے قریب ہونے سے دشمن کا گرم جوشی سے استقبال کرنے کا پورا سامان کر رکھا تھا۔ وہ پچھلی جنگ میں برما کے جنگلوں میں لڑ چکا تھا۔ اس نے کوریا میں چینیوں کے ہتکنڈے دیکھے تھے۔ اس کے پاس چھوٹی توپیں بھی تھیں، مشین گنیں بھی اور بچاؤ کے سامان بھی۔ اس نے گجادھر اور اس کے ساتھیوں کو چشول جانے کی اجازت دے دی تھی۔ مگر ان تینوں کے ہاں انتقام کی آگ ایسی بھڑک رہی تھی کہ وہ فضا کی ٹھنڈک بھی بھول گئے تھے اور زخموں کی ٹیک بھی۔ ان کا اصرار تھا کہ ہم چند گھنٹے کی جھپکی لے کر اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر دشمن سے پھر لڑیں گے اور اپنے جوانوں کے خون کا بدلہ لے کر ہی دم لیں گے۔

اسی لئے گجادھر پلنگ پر لیٹا سگریٹ پی رہا تھا اور تلخ و شیریں یادیں تھیں کہ پرا باندھے اس کی نظر کے سامنے ایک کے بعد ایک دھندلی دھندلی تصویروں کے ڈھنگ سے چلی آرہی تھیں۔ وہ کھیل کے میدان میں نملا سے پہلی ملاقات۔

صوبے بھر کی یونیورسٹیوں کے ہاکی ٹورنامنٹ کا فائنل تھا اس کی یونیورسٹی ایک گول سے ہاری ہوئی تھی۔ سبھی کے چہروں پر مایوسی چھائی تھی۔ ہر ایک اسے للکار رہا تھا، دھتکار رہا تھا کہ دفعتہً اسے موقع مل گیا اور اس نے پہلا گول کیا۔ ہر طرف تالیوں کا شور اُٹھا، اچھلتے، کودتے، ناچتے ساتھیوں کا ہنگامہ ہوا۔ پھر جو دل بڑھا تو اس نے لگاتار دو گول اور پانچ منٹ کے اندر کر ڈالے۔ ہر لڑکا چاہتا تھا کہ اسے کندھے پر بٹھا لے۔ ہر لڑکی چاہتی تھی اسے دل میں بٹھا لے اور اسی خوشی مجمع کو چیرتا ہوا جو گلدستہ آیا تھا اور اس نے کہا تھا۔ "آؤ! یونیورسٹی کے بادشاہ! تمھیں اس کی ملکہ سے ملا دیں۔"

اور اس کی پہلی دفعہ نملا سے ملاقات ہوئی تھی۔ اور یہ ملاقات دعوتوں کے ذریعہ پانچ دن برابر چلتی رہی تھی۔ اور نملا کیا تھی؟ جیجی پوی کی خاص چہیتی بیٹی — دیوی نے اُسے ہر طرح کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ دولتِ زر، دولتِ علم، دولتِ عقل اور دولتِ حُسن

تین طرح کی مالکہ - اقتصادیات کی ایم - اے، خود مختار، منس مکھ، ملنسار، ہوشیار، اپنے پورے بزنس پر حاوی - اور اس کے گرد اس کے تین اس کی ذات برادری کے پروانے - جوگندر، گوبند اور رام داس - جوگندر گورا چٹا ۵ فٹ ۸ - انچ کا گبرو جوان، ہر بات میں آگے بڑھنے والا - اپنے کو ایک کی جگہ دس دکھانے والا - گوبند لمبا، دُبلا، پتلا، لیکن بلا کا چال باز - ہر وقت نئے نئے داؤ پیچ کرنے والا، بڑے سیٹھ کا بیٹا - اور رام داس دیکھنے میں بھیگی بلی - چپ، سیدھا سادا، مگر شہر بھر میں مشہور تھا - اس کا گھر سونے کی کان ہے، اس کے باپ کو اس وقت کا میڈاز کہتے ہیں - وہ مٹی کو بھی چھو لیتا ہے تو وہ سونا ہو جاتی ہے! اب ان اشرفیوں کے تھیلوں کی موجودگی میں گجادھر سنگھ ایک چھوٹے سے کاشتکار کا لڑکا کس گنتی شمار میں تھا - اس لئے وہ جلدی سے فوجی مقابلے کے امتحان میں شریک ہوا اور اپنے کھیل کود، اپنی اُچک پھاند کی وجہ سے چن لیا گیا - نملا نے یہ خبر اس کی زبانی اسی طرح چمکتی آنکھوں اور گلاب جیسے لال گالوں سے سنی تھی جس طرح وہ اس سے پہلی دفعہ کھیل کے میدان میں ملی تھی - پھر ان کی ملاقات دو برس تک خطوں ہی تک محدود رہی - وہی رسمی دو ملاقاتیوں کے خطوط - کچھ دہرہ دون اسکول کی باتیں، کچھ کان پور کے حالات - مگر جب وہ وہاں سے کامیاب ہو کر نکلا تو بخت نے یاوری کی - وہ لکھنؤ کی ایک رجمنٹ میں لفٹننٹ مقرر ہوا - اب پھر تقریباً ہر ہفتے ملاقاتیں ہونے لگیں اور پھر وہ بھی رومان کی اسی فضا میں بے دست و پا تنکے کی طرح بہنے لگا تھا جو نملا کے گرد جوگندر، گوبند اور رام داس نے اپنی اپنی حرفتوں سے بنا رکھی تھی - نملا کی بارگاہ میں ہر ایک کی طرف سے شادی کی پیش کش ہو چکی تھی، مگر نملا کی آنکھیں جو کچھ ڈھونڈھتی تھیں وہ ان میں نہ ملتا تھا - پھر بھی وہ صاف صاف 'نہیں' کہہ کر کسی کا دل دُکھانا نہیں چاہتی تھی - اس لئے سب ہی زیر غور تھے ـــــ اس رومانی فضا میں دفعتہً چین نے ایک بم پھینکا - زرد زرد کنکھجورا ہزار پا ننگے پورے ہمالیہ پر رینگا - سفید، بے داغ، دیوتاؤں کا استھان بے گناہوں کے خون سے لالہ زار بن گیا - نملا نے دفاعی فنڈ جمع کرنے کا بیڑہ اُٹھایا - جوگندر، گوبند اور رام داس خدمتِ ملک و قوم کا نعرہ زبانوں سے بلند کرتے سرحدوں کی طرف چلے اور گجادھر سنگھ کو لداخ جانے کا حکم ملا -

سب سے دلآویز بھی گجادھر کے لئے یہ آخری تصویر نملا اسے رخصت کرنے اسٹیشن پر آئی تھی - اس نے گجادھر کو گاڑی میں بٹھاتے وقت عجیب انداز سے کہا تھا۔ "جاؤ بھگوان کو سونپا! پلٹ کر ضرور آنا! میں انتظار کروں گی!"

نملا کے اس انتظار کے وعدے نے گجادھر کو امر بنا دیا تھا - اس کو یقین تھا کہ چوکی نمبر ۱۳ سے اس کا بچ کر نکل آنا اس کا ثبوت ہے کہ بھگوان نے اس کی اور نملا کی دعا سُن لی - اور وہ سوچنے لگا کہ اب کے جب وہ لام سے واپس جائے گا تو نملا سے صاف صاف اپنا مدعا ظاہر کر دے گا - اس کا چہرہ ایک بکستی ہوئی کلی کی طرح خوشی سے کھل اُٹھا - وہ نملا سے مطلب کی بات کہنے کے لئے الفاظ تلاش کرنے لگا -

. . . .

اور اسی دن شام کو نو بجے کے قریب نملا کی کوٹھی میں :-

جوگندر، گوبند، رام داس اور نملا ڈرائینگ روم میں بیٹھے کافی پی رہے تھے - ابھی ابھی ان لوگوں نے ایک لذیذ ڈنر سے فراغت پائی تھی - نملا کے چچا اور چچی نوجوانوں کو بے تکلفی سے گفتگو کرنے کا موقع دینے کی غرض سے دوسرے کمرے میں اُٹھ کر چلے گئے تھے - جوگندر حسب معمول باتوں کا ایک لچھہ باندھے ہوئے تھا کہ دفعتہً کھلے ہوئے ریڈیو سے گانے کے بعد خبریں سنائی جانے لگیں - اناؤنسر نے پورے محاذ کا حال سنا کر چینیوں کے ایک نئے ظلم کی خبر سنائی - چشول سے قریب ترین چوکی پر حملہ کرتے ہوئے انھوں نے اس عارضی اسپتال پر بھی گولے برسائے جس پر ریڈ کراس کے جھنڈے چاروں طرف لہرا رہے تھے - اس وقت وہاں تین زخمی آرام کر رہے تھے، تینوں ہلاک ہو گئے -

نملا نے کہا - "ہے بھگوان! ہے بھگوان!"

جوگندر نے ایک موٹی سی گالی دے کر کہا "بڑے پاجی کمینے ہیں! بین الاقوامی قانون کی بھی پروا نہیں کرتے!

گوبند نے کہا "کھسیانی بلی کھمبا نوچے! اس چوکی کو فتح

(باقی صفحہ ۱۷۶ پر)

قیصر تمکین

آج کا اُردو افسانہ

اردو کا نیا افسانہ اکثر ابہام اور بیشتر رمزیت و اشاریت کا مترادف سمجھا جاتا ہے اور یہ بڑی حد تک ٹھیک بھی ہے کیونکہ آج کے متعدد افسانہ نگاروں نے حقیقت بیانی کی تلخی کو نسبتاً گوارا اور اس کی چبھن کو قابل انگیز بنانے کے لئے اکثر اشاریت کا سہارا لیا ہے۔

حقیقت نگاری کی اصل روایت تو اس صدی کے شروع ہی میں منشی پریم چند قائم کر چکے تھے مگر اس میں اضافے اور اس کو ادب کا بنیادی مقصد بنا دینے اور پھر اس کے ذریعے زندگی کے پیچ در پیچ مسائل اور اکثر ان کے حل کی طرف شعوری طور پر اشارہ کرنے کی تحریک ۱۹۳۶ء کے آس پاس شروع ہوئی۔ پریم چند کی حقیقت نگاری اور نئی حقیقت پسندی میں کئی باتیں مابہ الامتیاز ہیں مثلاً پریم چند جن مسائل کے بارے میں متفکر ہیں، ان کا سائنسی حل ان کے سامنے نہیں ہے جس کی بنا پر وہ بیشتر آدرش وادی یا اصلاح پسند بن جاتے ہیں۔ وہ کرداروں کو جس بلند درجے تک لے آتے ہیں وہاں سے جب کوئی سائنسی حل نہیں نظر آتا ہے تو قلب ماہیت کے قائل ہو جاتے ہیں ان کے اکثر کردار زندگی سے گریز کر کے ریاضت اور تیاگ کی جانب بھی مائل ہوتے ہیں مگر نئی حقیقت پسندی اپنے ساتھ تاریخ اور سماجی مسائل کی بصیرت کے ساتھ کچھ سائنسی اور قابل قبول حل لے کر بھی آئی۔ ممکن ہے کہ جن حلوں کی طرف اس نے اشارہ کیا ہو اپنی من وعن صورت میں قابل قبول نہ ہوں مگر یہ امر خود بہت ہی قابل توجہ ہے کہ نئے ادیب عصری الجھنوں کے سلجھانے کے لئے ایک واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ نئی حقیقت پسندی کسی بھی طرح کسی بھی مسئلے کو ناقابل بیان سمجھ کر آنکھیں چرانے کی کوشش نہیں کرتی ہے مثلاً جنس کا مسئلہ جو نئے ادب اور ترقی پسند ادب کی تحریک کے ساتھ پہلی بار واضح طور پر ادبی تخلیقات میں در آیا پہلے کبھی بھی موضوع ادب نہیں رہا تھا۔

نئے ادیبوں نے اپنے دور کے مسائل کا جو حل پیش کیا اس کے سلسلے میں اکثر تندی و شدت نے بڑھ کر انتہا پسندی کا روپ اختیار کر لیا اور پھر افسانوی دنیا میں اس دور کے خاتمے کے بعد ایک عجیب جمود یا تعطل پیدا ہو گیا۔

نئی حقیقت پسندیوں کے مبلغ اور نمائندے احمد علی، سجاد ظہیر اور ڈاکٹر رشید جہاں وغیرہ تھے جن کے بعد ان کی روایت کو آگے بڑھانے اور اس میں اصلاح کرنے والوں کی ایک پوری صف کی صف تیار ہو گئی۔ منٹو، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، سہیل عظیم آبادی اور اختر انصاری ان چند لوگوں میں ہیں جنھوں نے اگر افسانوی ادب میں اس تحریک کی ترجمانی نہ کی ہوتی تو شاید افسانہ آج بہت پس ماندہ ہوتا۔

ان میں سے بہت سے ادیبوں نے ایک خاص منزل پر پہونچ کر لکھنا چھوڑ دیا مگر اپنے پیچھے چلنے والوں کی بڑی حد تک رہنمائی کرنے کی بناء پر ان کے نام آج بھی بہت جانے پہچانے ہیں۔ یہ سب افسانہ نگار زندگی اور سماج کے اس جانے پہچانے آہنگ کے ترجمان

تھے جو مغرب میں موپاساں، چیخوف اور نبولا وفلابیر کی تخلیقات کی شکل میں حیات جاوید حاصل کر چکا تھا۔ نئے ادیبوں نے فنی اعتبار سے مغربی افسانے سے بہت کچھ لیا مگر ان کا مواد زیادہ تر ہندوستانی رہا۔ اس دور کے چند افسانہ نگاروں کا ذکر یہاں ناگزیر ہے کیونکہ ان لوگوں نے نئی تحریکات کو لبیک بھی کہا مگر تھوڑی ہی مدت کے بعد خاموش ہو گئے۔

ایسے ادیبوں میں پہلا نام غالباً اختر انصاری کا ہے ان کے افسانوی مجموعے 'خونی' اور دوسرے افسانے اپنے بڑی درخشاں توقعات کی نشان دہی کی تھی مگر وہ جس تیزی سے سامنے آئے اسی سرعت سے اوجھل بھی ہو گئے۔ حیات اللہ انصاری نے "آخری کوشش" لکھ کر حقیقت نگاری کی اس روایت کو آگے بڑھایا جو 'کفن' کی شکل میں بھرپور طریقے پر سامنے آچکی تھی۔ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے کچھ سوشل قسم کے افسانوں سے اپنی ابتدا کی مگر جب یہ دونوں خواتین زندگی آمیز منزلوں میں پہونچیں تو خاصی تھک چکی تھیں۔ عصمت کی کوششیں بھی ایک بڑی مدت تک تعطل اور جمود کے تودوں کے تلے دب گئیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد کا دور جس سیاسی کش مکش کا مظہر تھا وہ اردو افسانے میں پوری طرح غالباً جگہ نہ پا سکا۔ اس دور میں احمد ندیم قاسمی کی ایک کہانی 'ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد' اور اسی دور کے پس منظر کے ساتھ خدیجہ مستور کی کہانی "چلی پی کو ملن" غالباً نہایت قابل توجہ چیزیں ہیں۔

مگر ۱۹۴۷ء کے سیاسی ہنگامے نے ادیبوں کو مختلف طریقوں سے متاثر کیا۔ بہت سے ادیب اس افراتفری سے ذاتی طور پر متاثر ہوئے اور بہت سے ادیبوں نے بحیثیت ایک خاص مشاہد کے اس دور کے بارے میں لکھا۔

اس دور میں بحیثیت مجموعی چند ہی بلند پایہ افسانہ نگار ہیں جنھوں نے جذبات اور سیاسی داؤ پیچ کے اثرات سے قطع نظر ادب کو صحت مند ادبی روایات سے وابستہ رکھا۔ ان میں علی عباس حسینی، منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور عباس قابل ذکر ہیں۔

منٹو نے ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی بڑے عظیم افسانے لکھے تھے۔ 'نیا قانون' ایسا غیر فانی شاہکار اس دور کی پیداوار ہے مگر ملکی آزادی کے بعد انھوں نے جو کچھ دیکھا اس پر بڑی بے باکی سے قلم اٹھایا۔ اس سیاسی واقعے نے جتنا اس ادیبوں کو جو درد و گداز بخشا اس کو ادب میں صحت مند طریقے پر پیش کرنے میں سب سے پہلے منٹو کا ہی نام آتا ہے۔ ان کا فن کسی ایک مقام پر ٹھہر نہیں گیا بلکہ وہ واحد فن کار ہیں جو ہمیشہ بلند سے بلند فضاؤں کی طرف محو پرواز رہے۔ اس دور کی نمائندہ کہانیاں 'ٹھنڈا گوشت' 'موذیل' اور 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' منٹو ہی کی فن کاری کی مرہون منت ہیں۔

منٹو کے بیشتر افسانوں کا موضوع جنس ہے۔ اکثر اس کو برتنے کا طریقہ گراں بھی گزرتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ فن کار کی بیباکی جو ہمارے ادب میں گوہر نایاب کی حیثیت رکھتی ہے صرف منٹو ہی کے حصے میں آئی۔ انھوں نے غیر فانی کردار تراشے اور اپنے ہر کردار کو ایسی زندگی اور حرارت بخشی کہ ہم اس کو مشکل ہی سے بھول سکتے ہیں اس کے علاوہ مختصر افسانے کے فن کا جو تصور ہم کو فرانسیسی ادیبوں سے ملا اس کی قرار واقعی نمائندگی منٹو ہی کرتے ہیں۔

منٹو کے بعد راجندر سنگھ بیدی کا نام آتا ہے جو مختصر افسانے کے جملہ لوازم، اختصار، تاثر اور جستی وغیرہ سے بخوبی واقف ہیں۔ 'دانہ ودام' اور 'گرہن' میں اپنی فنی مہارت کے اچھے نمونے پیش کرنے کے بعد ایک طویل عرصے تک انھوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ مگر اس خاموشی کے بعد 'گرم کوٹ' کا مصنف جب افسانوی دنیا میں دوبارہ آیا تو تہی مایہ نہیں اور محض اپنی یاد تازہ کرانے نہیں بلکہ "ایک چادر میلی سی" ایسا بیش قیمت تحفہ لے کر آیا جس سے یہ امید پیدا ہوئی کہ اس کا فن اردو افسانے کو ابھی بہت کچھ دے سکتا ہے۔

عصمت چغتائی بھی ادیبوں کی ایک نسبتاً پرانی نسل سے تعلق رکھتی ہیں مگر ان کے یہاں بھی ٹھہراؤ نہیں ہے، گو کہ انھوں نے بہت دنوں تک کچھ نہیں لکھا لیکن جب اس کے بعد ان کو مہلت ملی تو انھوں نے افسانے لکھنے میں دوسرے ہم عصروں کی طرح اپنے قارئین کو مایوس نہیں کیا۔

کرشن چندر وہ واحد ادیب ہیں جو ہر دور میں اور ہر حالت میں لکھتے رہے۔ ان کے یہاں افسانہ بیان واقعہ نہیں بلکہ طنز، تبلیغ

سیاست، شاعری اور خطابت وغیرہ کی شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد انھوں نے 'ٹھنڈا گوشت' اور 'پشاور ایکسپریس' ایسی اچھی کہانیاں بھی لکھیں اور بعض نسبتاً کم درجے کے افسانے بھی لکھے مگر ان کے کردار منٹو کی طرح زندہ اور حقیقی کبھی نہیں بن پائے۔

اس زمانے میں فسادات کے پس منظر پر احمد عباس کی کہانی 'سردارجی' غالباً انتہائی اثر انگیز مانی جائے گی جس میں ادیب صحافی نہیں بلکہ زندگی کے حقیقی ترجمان کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ راما نند ساگر، آغا بابر، خدیجہ مستور اور ڈاکٹر صلاح الدین احمد نے بھی اس دور میں اچھی کہانیاں لکھیں مگر ۱۹۴۷ء کے زمانے ہی میں جو ادیب واضح طور پر ابھر کر آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے افسانوی ادب پر چھا گیا وہ "تانیا" کا خالق شوکت صدیقی تھا۔

ملکی تقسیم سے کیا ہوا۔ اس کے بارے میں منٹو، احمد عباس، کرشن چندر اور راما نند ساگر تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ ہماری تہذیبی قدروں اور ہماری معاشرتی زندگی کو اس تقسیم نے جس طرح متاثر کیا اس کی عکاسی شوکت صدیقی نے بڑی خوبی سے کی ہے۔

۱۹۵۰ء سے لے کر لگ بھگ سات آٹھ سال ایسے گزرے کہ اردو افسانے کی ترقی کی رفتار سست ہو گئی اس کی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ زیادہ تر ادیب ایک سیاسی تحریک سے وابستہ تھے جب یہ تحریک غلط ثابت ہوئی تو بہت سے لوگوں نے لکھنا چھوڑ دیا مگر اس جمود کے زمانے ہی میں ادیب کچھ دھیرے دھیرے آگے بڑھتے رہے اور انھوں نے خلوص اور لگن کے ساتھ افسانوی ادب کی خدمت جاری رکھی، ان لوگوں میں رام لعل کا نام سرِ فہرست ہے۔

رام لعل اور ان کے ساتھ ہی نئے لکھنے والوں کی ایک پوری ٹیم آگے بڑھی، اس کی کوششیں اس لئے قابلِ توجہ ہیں کہ جمود اور تحلّل کے نعروں، اچھے رسائل اور ذرائع نشر و اشاعت کی کمی کے باوجود اور ستائش و صلے کے فقدان کے باوصف انھوں نے لکھنا جاری رکھا ۱۹۵۵ء یا اس کے آس پاس کے زمانے میں جو نسل افسانوی ادب کی روایت کو سنبھالنے اور اس میں حتی المقدور اضافے کے لئے آگے بڑھی اس میں رام لعل، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، عابد سہیل، سنتیش بترا، بشیشور پردیپ، اقبال متین، آمنہ ابوالحسن، ریاض رُفی م۔م۔ راجندر اور عزیز اثری کے نام قابلِ ذکر ہیں[1]

رام لعل نے بڑی محنت اور لگن سے افسانوی دنیا میں اپنی مساعی جاری رکھیں اور آج جب کہ ان کے افسانوں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور وہ اپنے لئے ایک طرزِ ادا اور خاص اندازِ فن اختیار کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں یہ کہنا نسبتاً آسان ہے کہ اس نسل کے لکھنے والوں میں ان کا نام سرِ فہرست ہے۔

رام لعل کے افسانوں میں زندگی کی ایک بے ساختہ عکاسی ہوتی ہے۔ ان کا کوئی افسانہ غیر ضروری طور پر طویل یا غیر ضروری طور پر مختصر نہیں ہوتا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جو دیکھا اور جتنا بیان کرنے کی ضرورت سمجھی وہ لکھ دیا۔ ان کے ایسے متعدد افسانے ہیں جن میں افسانہ نگار نہیں بلکہ واقعہ یا واقعے کا ڈرامائی اختتام ایک شدید تاثر چھوڑتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا انتہائی کامیاب افسانہ جو اردو میں فنی اعتبار سے گنے چنے افسانوں میں شامل کیا جائے گا۔ 'ادس' ہے۔

جیلانی بانو کے افسانے ایک مخصوص مسلم سماج کے مسائل کے گرد گھومتے ہیں اور ان مسائل کی عکاسی کرنے میں ان کے پاس شعور کی دولت بھی ہے جو افسانے کی کامیابی کا پہلا راز ہے۔

واجدہ تبسم کے افسانے کسی مخصوص رجحان سے وابستہ نہیں کئے جا سکتے۔ وہ اکثر اچھی کہانیاں لکھ جاتی ہیں، مگر بیشتر افسانے مختلف رجحانات کا گورکھ دھندا ہوتے ہیں۔ ان کی سب سے ناکام کوشش منٹو کی نقالی ہے۔

عابد سہیل کا شمار ان لوگوں میں سے ہے جن کے پاس اگر کوئی نئی بات کہنے کو نہ ہو تو وہ نہیں لکھیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کہانیاں نسبتاً کم لکھیں، لیکن جو بھی لکھیں ان میں انھوں نے

---

[1] خود میرے افسانوں کا مجموعہ 'جگ ہنسائی' اس دور میں لکھے ہوئے افسانوں پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔

اپنے دَور کی بھرپور عکاسی کرنے کے علاوہ ہمیشہ انتہائی خفیف طریقے پر ایک امید افزا اشارہ بھی کیا ہے۔ ان کی کوئی کہانی محض کہانی کی صنف میں نہیں آتی ہے بلکہ اس کے بین السطور میں ہمیشہ ان کا واضح شعور جھلکتا رہتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی کہانی 'نیا سفر' غالباً ہماری اچھی کہانیوں میں گنی جائے گی۔

ستیش بترا پُرانے لکھنے والوں میں ہیں لیکن ان کی نئی کہانیاں انھیں نئی نسل سے وابستہ کرانے پر مُصر ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'ویران بہاریں' زیادہ تر ان کہانیوں پر مشتمل ہے جو انھوں نے پچھلے 'چار سال' میں لکھی ہیں۔

اس سلسلے میں کچھ بالکل ہی نئے لکھنے والوں کا ذکر ضروری ہے جنھوں نے افسانوی ادب کے عظیم ماضی سے بہت کچھ لیا ہے اور اب ان کے سامنے تجربوں اور کوششوں کا بڑا میدان پڑا ہوا ہے۔ ان لوگوں میں بلراج منرا، عبداللہ حسین، جوگندر پال، شرون کمار ورما، رتن سنگھ اور آفتاب اختر کے ناموں سے نئے پڑھنے والے اچھی طرح آشنا ہو چکے ہیں۔

بلراج منرا کا نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے جنھوں نے افسانے میں رمزیت کے بعض بڑے کامیاب تجربے کئے ہیں۔ ان کے افسانوں 'بیزاری'، 'کوئی روشنی، کوئی روشنی' وغیرہ نے بہت جلد اہلِ ادب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے۔

جوگندر پال کے افسانے زیادہ تر کینیا اور وہاں کے سفید فام آقاؤں کی بربریت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان سب میں افریقی عوام کی تحریکوں سے وہ ہمدردی ملتی ہے جو ایک گہرے شعور کی غماز ہے۔

میں نے اپنے افسانوں کے ذریعے کئی تجربوں کی کوشش کی۔ ایک کوشش۔ چھوٹے چھوٹے واقعات کو ملا کر ایک مجموعی تاثر پیدا کرنا جس کو Mosaic سے مشابہت دی جا سکتی ہے کسی حد تک کامیاب بھی ہوئی۔ اس طرح کے افسانوں میں 'امیر محل کی کہانی' اور 'اللہ کے بندے' کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

نئے افسانے کے تجربوں میں کرشن چندر کا نام بھی شامل ہے جنھوں نے 'چوراہے کا کنواں' لکھ کر بڑی حد تک نئی کوششوں میں مدد کی ہے۔ عباس کا سلسلہ 'سمندر' بھی اسی ضمن میں لایا جا سکتا ہے مگر اس میں ابہام یا اشاریت سے زیادہ واقعہ نگاری ہے اور پھر یہ کہ فنی اعتبار سے مختصر افسانہ ہونے کے باوجود یہ سلسلہ ایک ناول کے لئے ہے۔ اس لئے اس فہرست میں یہ مشکل ہی سے آ سکے گا۔

حال ہی میں چینی جارحیت نے بھی اردو افسانوں پر خاصا اثر ڈالا ہے۔ ادیبوں کا ایک بڑا طبقہ جو نئے چین سے متاثر ہوا تھا اب اس کی توسیع پسندی کی پالیسی کی وجہ سے سخت برگشتہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان پر اس کے جارحانہ حملے نے زندگی کے ہر شعبے میں ایک نئی بیداری کی لہر دوڑا دی ہے۔ غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ آزادی کے بعد ملک کے ہر کونے کے رہنے والے تمام فروعی اختلافات بھلا کر ایک آواز ہو گئے ہیں۔ اس اتحاد اور یکسانیت کا اثر افسانوی ادب پر نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں پُرانے لکھنے والوں میں کرشن چندر اور نئے لکھنے والوں میں رام لعل نے بڑی خوبصورتی سے ملک کے نئے جذبۂ اتحاد کی نمائندگی کی ہے۔ چینی جارحیت کے بارے میں اب بھی بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ اس میں سے ممکن ہے کچھ حصہ وقتی ثابت ہو مگر وہ حصہ جو ملک کے بنیادی اتحاد اور جذبۂ آزادی کا عکاس ہے یقیناً تاریخِ ادب میں ممتاز جگہ حاصل کرے گا۔

اس وقت اردو افسانہ مختلف مسائل سے دوچار ہے مگر ان مسائل کے حل کی کوششیں بجائے خود اچھے افسانوں کی محرک بن سکتی ہیں۔ ہمارے دَور میں بعض پُرانے لکھنے والے دوبارہ لکھ رہے ہیں مثلاً حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی، مہندر ناتھ اور علی عباس حسینی نے برسوں کی خاموشی کے بعد اس طرف پھر توجہ کی ہے۔ ان میں سے کئی ادیب نئے رجحانات سے بے خبر نہیں ہیں۔ عصمت چغتائی کا فن خاص طور پر کسی ایک دَور کی پیداوار ہو کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ وہ آج کے تقاضوں کو بھی اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ ان کے متعدد نئے افسانے مثلاً 'دو ہاتھ' بڑے بلیغ اشارے کرتے ہیں۔ علی عباس حسینی نے آج کے مسائل سے متعلق بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ حیات اللہ انصاری کے نئے افسانے بھی ہمارے زمانے کے ساتھ ہیں۔ کرشن چندر اپنی نئی تخلیقات سے اپنے قارئین کو مایوس کر رہے ہیں لیکن بیدی میں

ان کی آب و تاب باقی ہے۔

نئے افسانہ نگاروں کے یہاں فکری الجھنوں یا Confusion کا اثر غالب ہے۔ یہ لوگ رمزیت کے اثر کے بعض اوقات ضرورت سے زیادہ قائل نظر آتے ہیں۔ تاہم جو لوگ افسانے کو نام کمانے کی خاطر نہیں بلکہ ایک فن کی حیثیت سے ترقی دینے میں کوشاں ہیں۔ ان کے یہاں نئی حقیقتوں کے اشارے اور نئے زمان و مکان کی جستجو اور خواہش بھی ملتی ہے۔ اکثر فن کاروں کے یہاں اس وجودیت کی پرچھائیں بھی ملتی ہے جو سارتر اور کامو کے ذریعے آہستہ آہستہ ہمارے ادب میں بھی چور دروازوں سے آئی ہے۔ لمحوں کے وجود و دوام کی وہ کشمکش اپنے مثبت اثرات کے ساتھ ہمارے افسانوں میں ہے جو ڈالی اور اس کے مخصوص دبستانِ فکر کی نظر میں مغربی ادب کے امکانات کی پرچھائیاں بھی ہیں۔ یہاں دورِ حاضر کی مصلحت بینیوں اور معاملہ پسندیوں کا گزر نہ ہو اور جہاں مشترکہ خاندان کی شکست و ریخت کے باوصف ماضی کی مرثیہ خوانی نہ ہو۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل کے تذبذب اور ناستواری اور عصرِ حاضر کی راس نہ آنے والی فضا سے ایک غیر یقینی کیفیت اور تشکیک کبھی کبھی چور دروازوں سے سر نکالتی ہے مگر اس میں احیا پسندی ماضی کی عظمتوں میں کھو جاتے اور تانترک سادھوؤں کے مٹھوں میں گھومنے کی وہ آرزو نہیں ملتی ہے جس کے عدم وجود پر ایک نقاد نے تشویش ظاہر کی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آج کے افسانہ نگار کے لئے ذاتی دکھ موضوعِ فن نہیں ہے بلکہ اس دکھ سے ہم آہنگ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دکھ درد کی آئینہ داری اس کا مقصدِ فن ہے۔ ان لوگوں کے یہاں طول طویل بیانیے، اکتا دینے والی تفصیلات اور چونکا دینے والے ڈرامے نہیں ہیں بلکہ ٹھوس اور رنگین حقیقتیں ہیں۔ نیا افسانہ اس سلسلے میں نقاشی Painting نہیں بلکہ فوٹو گرافی یا Snapshot کے مماثل ہے۔ یہاں تبلیغ یا ترغیب ہے ہی نہیں بلکہ بیانِ واقعہ مرکزِ فن ہے۔ آج کے دور کی ضرورت اختصار اور ایجاز ہے اور ہمارے تمام نئے افسانہ نگار اس کے قائل ہیں۔

ایک آخری بات اور سب سے ضروری یہ ہے کہ آج کا اردو افسانہ بنیادی طور پر ہندوستانی ہے۔ اس کے معنی محدود قوم پرستی نہیں بلکہ ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی عالمگیر تقاضوں سے وابستہ رہنا ہے۔

۱؎ تقریباً ان تمام افسانہ نگاروں کے یہاں جو ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک کی درمیانی مدت میں آگے بڑھے ہیں۔

"سب کو اپنی اپنی" (صفحہ ۶۶ سے آگے)

نہ کرسکے تو بے چارے زخمیوں ہی پر غصہ اتارا۔"

رام داس نے کہا: "یہ ہمارا جوان اب بھی ڈٹا ہے!"

نملا نے آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "نہ جانے کس کا سہاگ لٹا، کس کی کوکھ جلی، کس کی مانگ اجڑی، کون بن باپ کا ہوا، کون بے منگیتر کا بنا!"

گوبند شرارت سے مسکرا کر بولا۔ "ارے اپنا گجادھر بھی تو وہیں کسی چوکی پر ہے!"

زہر میں بجھا ہوا یہ تیر نملا کے سینے پر لگا ہی تھا کہ ریڈیائی مخبر نے چلتے چلاتے ایک اور بان مارا۔ عارضی اسپتال کے جان ہاڑوں کے نام سنادئے۔ سپاہی موہن سنگھ، سپاہی محمد ایاز اور افسر لفٹنٹ گجادھر سنگھ!

نملا ایک بار گھومی، پھر وہ کرسی سے پھسل کر فرش پر بے ہوش گر پڑی

رام داس "کیا ہوا دیوی جی؟ کیا بات ہے نملا؟" کہتا ہوا اس پر جھکا، جوگندر نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے نملا کو اس نئے روپ میں دیکھا۔ پھر وہ پتلون کی جیب میں دونوں ہاتھ ڈالے ٹہلتا ہوا فرش پر ڈھیر مجموعۂ حسن کے پاس آکر بولا:- "اچھا ہوا۔ یہی تو راہ کا روڑا تھا!"

گوبند اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ وہ اپنے سوکھے ہاتھ مل کر ہنستا ہوا بولا "وہ روڑا ہوگا کہ کانٹا۔ اب تو راستہ صاف ہے! جگ جگ جیئیں یہ چینی بھائی! ہمارا تو ہر طرح فائدہ ہی فائدہ کر رہے ہیں۔" جوگندر نے پہلے اس پر تعجب کی نظر ڈالی، پھر وہ بھی ہنس پڑا۔ رام داس نے ان دونوں کو بڑے غصے اور حقارت سے دیکھا، پھر وہ بھی گردن جھکا کر مونچھوں ہی مونچھوں میں مسکرانے لگا!



مقابلہ نہ کیجیے

ہمارا مقابلہ پڑوسیوں سے کیا جائے، ہم میں سے بیشتر اس بات کو پسند نہیں کرتے یہی بات میٹرک باٹوں کے سلسلے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

میٹرک باٹوں کی خوبیوں کو پہچانیئے۔ ان کا استعمال ان کی موجودہ شکلوں ہی میں کیجیے، جیسے ۱۰ گرام، ۲۰۰ گرام، ۵۰۰ گرام اور ۱ کیلوگرام وغیرہ۔ جبھی آپ میٹرک نظام کا پورا پورا فائدہ اٹھا پائیں گے۔

میٹرک اوزان کا جوڑ توڑ کر کے من سیر کا حساب نہ لگایئے۔
اس میں آپ کا وقت ضائع ہوگا اور لین دین میں اکثر نقصان رہے گا۔

سہولت اور واجبی لین دین کے لئے

مکمل اکائیوں میں

میٹرک باٹوں

کا استعمال کیجیے

DA 61/70

ترتیب

سرورق :- دیہات کے خوش باش

رسالے کی پشت پر :- سری نگر میں دریائے جہلم پر صبح کا منظر

جلد ۲۲- نمبر ۲

بھدرا شک سمت ۱۸۸۵

ستمبر ۱۹۶۳ء

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۶

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل دہلی

سالانہ چندہ :-	ہندوستان میں :- سات روپے
	پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے :-	۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر
	ہندوستان میں :- ۶۰ نئے پیسے
قیمت فی پرچہ :-	پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے :-	۱ شلنگ یا ۶ پنس

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

:: پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

آزادی کی سولھویں سال گرہ کے موقع پر حسب دستور وزیراعظم پنڈت نہرو نے لال قلعہ پر قومی پرچم لہرانے کے بعد قوم سے خطاب کیا، انھوں نے پُرجوش الفاظ میں عوام سے اپیل کی کہ ملک کے دفاع کو مضبوط بنانے کے لئے صف بستہ ہو کر ان تھک محنت کریں۔ ظاہر ہے کہ آج جبکہ ہماری سرحدوں پر خطرہ موجود ہے ہمیں ہر طرح سے مستعد اور چوکنا رہنا چاہیئے اور پوری ذمہ داری اور یک جہتی کے ساتھ اپنی آزادی کی حفاظت کرنا چاہیئے۔ اس وقت ذرا سا بھی تساہل خودکشی کے مترادف ہے۔ ملک کی آزادی سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں۔ ہمیں ہر قیمت پر ملک کی سالمیت کو برقرار رکھنا ہے، اور یہی ہمارے ہر قول و فعل کی کسوٹی ہونا چاہیئے۔ ہم ایک آزاد ملک کے باشندے ہیں۔ ہم آزاد اور سربلند رہنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جھکا نہیں سکتی۔

چین کی جنگ پسندی دنیا بھر میں بدنام ہو چکی ہے، ہر جگہ اس کی بدنیتی کی مذمت کی جا رہی ہے یہاں تک کہ کمیونسٹ ملک بھی اس کی امن دشمنی پر کھلے لفظوں میں لعن طعن کر رہے ہیں۔ روس نے چین کے جنگ باز حکمرانوں کو لتاڑا ہے۔ چین اب تک سرحدی جھگڑے کے بارے میں جو دعوے کرتا رہا ہے، اس کی حقیقت سب پر آشکارا ہو چکی ہے اور خود کمیونسٹ ملکوں نے یہ مان لیا ہے کہ چین نے بلا کسی اشتعال کے امن پسند ہندوستان پر حملہ کر کے اپنی جنگ پسندانہ ذہنیت کا ثبوت دیا۔ حال ہی میں روس کی کمیونسٹ پارٹی کے اخبار 'پراودا' نے لکھا ہے کہ چین نے ہندوستان کی سرحدوں پر فوج جمع کر کے پھر کھچاؤ کی صورت پیدا کی ہے، اور یہ کہ پچھلے سال کیوبا کے بحران سے فائدہ اُٹھا کر اس نے ہندوستان پر حملہ کیا اور اس طرح پُرامن بقائے باہم کے اصول کو توڑا۔ اخبار نے ہندوستان کی ناطرفداری اور اس کے امن پسند عزائم کی داد دی ہے۔

حال ہی میں امریکہ، برطانیہ اور روس کے مابین ایٹمی تجربات کے جزوی امتناع کے معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ یہ ایک تاریخی معاہدہ ہے اور دنیا کے امن و سلامتی اور بقائے باہم کے لئے نیک فال۔ یہ ان تمام ملکوں کے لئے ایک زبردست کامیابی ہے جو ایٹمی جنگ کے خلاف جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ یقین ہے کہ اس مبارک اقدام کے بعد عالم انسانیت کی فلاح و بہبود اور قیام امن کے لئے اور بھی قدم اُٹھائے جائیں گے۔ ہندوستان نے اس معاہدے پر سب سے پہلے دستخط کئے کیونکہ وہ ہمیشہ دنیا کی امن و سلامتی کا داعی رہا ہے۔ ہمارے وزیراعظم نے سب سے پہلے ۱۹۵۴ء میں ایٹمی تجربات پر پابندی کا مطالبہ کیا تھا۔ اور ہم اپنی آزادی کی ابتداء سے ہی امن اور تخفیف اسلحہ کے حامی رہے ہیں۔

اختر انصاری

ایک تاثّر

"آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا
کہ مرے دل پہ پڑا تھا کوئی غم کا سایہ"
جب اس ساحرۂ سحر نوا نے گایا

خواہشِ کیف و طرب جھوم گئی بل کھا کے
ناچ اُٹھی عشرتِ احساس کمر لچکا کے
رہ گئی سوزِ تمنّا کی فضا لہرا کے

ہائے وہ نغمہ کہ ہے جانِ جہانِ نغمہ!
نفسِ نغمہ، لبِ نغمہ، زبانِ نغمہ!
بلکہ سچ پوچھئے تو روحِ روانِ نغمہ!

اُف رے وہ لحن جسے کہئے نوا کا جھونکا!
کسی تپتے ہوئے صحرا میں صبا کا جھونکا!
لہلہاتی ہوئی گُل ریز ہوا کا جھونکا!

جس کی گونجوں سے فضا زمزمہ پرداز رہے،
جس پہ فردوس کے نغمات کو بھی ناز رہے
زہرۂ چرخِ بریں گوش بر آواز رہے

یا رب ایسی بھی نوا دہر کے اس ساز میں تھی!
یہ حلاوت بھی نہاں گیت کے انداز میں تھی!
ذوقِ آواز کی قسمت میں یہ آواز بھی تھی!

کلاسیکی نظم

(نظمِ عالیہ، نظمِ جاوداں)

'جمالیات' ایک کثیر المعانی اور وسیع المفہوم لفظ ہے جس پر کوئی مبسوط مقالہ لکھنا یہاں مقصود نہیں ہے۔ بلحاظ موضوع اسی قبیل کا ہم پلہ لفظ 'فنونِ لطیفہ' ہے جو اور بھی وسعتِ معانی رکھتا ہے جس میں فن کے فعل و عمل کی نوعیت کے اعتبار سے اور صفاتِ مختص کے لحاظ سے مختلف اصناف داخل ہیں۔ لیکن ان میں مشمولہ ہر ذیلی صنف کا بالذات لطیف، جاذبِ نظر اور پُر کشش ہونا ضروری ہے۔ فنونِ لطیفہ کے کچھ اصناف ایسے ہیں جن میں تسوید و تحریر کے بجائے دستِ انسانی کی چابک دستی اور قلم کاری کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ سنگ تراشی' بُت تراشی، دل کش و بوقلموں تعمیرات اور مصوری ایسے اصناف ہیں جن میں مختلف قسم کے کارنامے اور شاہ کار بذریعہ مادی عوامل و آلات' انسانی ہاتھ بشکلِ مظاہراتِ نظری پیش کرتا ہے۔ ان اصناف کا تعلق تمام تر کیفِ حسِ باصرہ سے ہے۔ لیکن موسیقی و غنا وہ صنفِ لطیف ہے کہ جس کا تعلق بالراست ہماری قوتِ سامعہ سے ہے۔ رقص فنِ موسیقی کی صفتِ ملزوم ہے یعنی رقص و موسیقی لازم و ملزوم اصناف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صنفِ رقص وہ مرکب فن دل کش و دل پذیر ہے کہ جس سے ہماری قوتِ سامعہ و باصرہ دونوں لطف اندوز ہوتی ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر ہمارے حواسِ خمسہ میں سے دو حسیات کی تسکین رقص و سرود سے ہوجاتی ہے۔ حسنِ پیکرِ انسانی بھی ظاہری حیثیت سے حسِ باصرہ کے لئے باعثِ کیف و نشاط ہوسکتا ہے۔ اسی طرح اس کا صوری تعلق بھی بدیہی اور نظری آرٹ سے ہوتا ہے۔ انسانی حسیاتِ خمسہ میں سے حسِ لامسہ اور قوتِ شامہ اور ایسے ہی حسِ ذائقہ ایسے محسوسات ہیں جن کی تکمیل یہ بدیہی (نظری) اور سمع نواز آرٹ نہ کرسکا۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دانایانِ فرنگ یعنی عصرِ حاضر کے مغربی ماہرینِ نفسیات نے پانچ مذکورہ حواس کو تو تسلیم کیا جو حواسِ خمسۂ ظاہریہ کہلاتے ہیں لیکن حواسِ خمسۂ باطنیہ میں سے چار حواس کا ذکر ان کے یہاں مفقود ہے۔ افادہ سے خالی نہ ہوگا اگر یہاں حواسِ خمسۂ باطنیہ کا مختصر اظہار کردیا جائے کیونکہ سخن گوئی اور سخن سنجی کو ان حواس سے گہرا تعلق بلکہ ناگزیر ربط ہے۔ پانچ حواسِ باطنی حسبِ ذیل ہیں: (۱) حاسۂ مشترک (۲) حاسۂ متصرفہ (۳) حاسۂ واہمہ (۴) حاسۂ خیال (۵) حاسۂ حافظہ۔ مؤخر الذکر حسِ حافظہ کو مغربی ماہرین نے تسلیم کیا ہے اور چوتھے حس یعنی حاسۂ خیال کو تسلیم تو کیا ہے لیکن حس کی حیثیت سے نہیں اور اوّل الذکر ہر سہ حسیات پر ان کی کتابیں خاموش ہیں۔ یعنی ان تین حواس کو وہ بطورِ حسیات تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ شاعری اور سخن گوئی کا تمام تر دار و مدار ان ہی تین حواس پر ہے۔ ہر سہ حسیات کی توضیح مختصر یہ ہے کہ حاسۂ مشترک کے ذریعہ محسوسات کی تمام صورتیں جو حواسِ خمسہ کے ذریعہ محسوس ہوں منقش ہوتی ہیں اور جوفِ پیشانی میں مستقر ہوجاتی ہیں۔ حاسۂ متصرفہ کے ذریعہ ہم مذکورہ محسوسات کے معانی جزئیہ میں ترکیب و تفصیل کے ساتھ تصرّف کرتے ہیں اور حاسۂ واہمہ کے ذریعہ ہم مرئیات و

غیر مرئیات اور بیچ اور جھوٹے سب طرح کے نقش اور صورتیں دیکھتے اور معلوم کرتے ہیں، خواہ وہ چیزیں عالمِ صورت میں ہوں یا نہ ہوں۔

الغرض فنونِ لطیفہ کی کوئی صنف ہو اگر وہ مذکورہ بالا تمام حیاتِ ظاہریہ کے لئے کیف آگیں، نشاط پرور اور وجہ تسکینِ معنوی نہ ہو تو وہ مکمل آرٹ نہیں کہلا سکتی۔ ہماری قوتِ متدرکہ نے کیف و نشاط اور تسکینِ خاطر کی اس تشنگئ تکمیل کو محسوس کیا اور یہ معرضِ غور و خوض میں رہا کہ جمالیات اور آرٹ اور اس کے مکمل کیف و نشاط اور تسکینِ معنوی کو کیسے پایۂ تکمیل کو پہونچایا جا سکتا ہے؟ نتیجتاً تصوّرات کی تخلیق پر انسانی دل و دماغ مرکوز ہو کر رہ گیا اور انسانی درک و حسّیات نے تسلیم کر لیا کہ ہماری حسِ لامسہ اور قوتِ ذائقہ و شامہ انھیں تصوّرات کی آغوش میں آکر نفس الامری طور پر جذبات و کیفیات اور حسّیاتِ معنوی کو تسکین بخش سکتی ہیں۔

قوتِ لامسہ کے لئے حسین پیکرِ انسانی کی ضرورت ہے۔ قوتِ شامہ کے لئے شمائم اور عطر بیزی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ قوتِ ذائقہ کے لئے لطیف و محرک اکل و شرب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ فنونِ لطیفہ نامکمل رہتے اگر ان میں اس معتد بہ تشنگی کو پایۂ تکمیل کو نہ پہنچایا جاتا۔ اب اہلِ دل، اہلِ خرد اور اہلِ نظر کے سامنے یہ سوال لازماً پیدا ہوا کہ اس تشنگی کو کیسے سیراب کیا جا سکتا ہے؟ انسان گوشت پوست کا مجسّمہ نہ بنا سکتا تھا، انسان شمائم و گل ہائے عطر فشاں کو ہر وقت اور ہر جگہ قوتِ شامہ کے سامنے نہ پیش کر سکتا تھا اور اسی طرح انسان بہترین اور مہیّج اکل و شرب کو بہر مکان و زماں قوتِ ذائقہ کے لیے مہیّا نہ کر سکتا تھا۔

یہ اہم کام صرف تصوّرات نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ انسان نے تصوراتی دنیا میں حسین ترین پیکرِ انسانی پیدا کئے اور مشامِ دماغ کو تصوّری خوشبویات و عطریات سے لذّتِ شامہ بخشی۔ معنوی طور پر لطیف ترین محرکاتِ اکل و شرب پیدا کئے جو انسانی دماغ کے تصوّرات میں سکر و خمر اور موجبِ کیف و نشاط بنے۔ یعنی اس نے حاسۂ متصرفہ اور حاسۂ واہمہ سے کام لیا۔

عقل و خرد نے ان تصوّرات کو محیط کرنا چاہا، محدود کرنا چاہا، متشکل کرنا چاہا اور کر لیا۔ مگر صرف حروف و الفاظ کے جامہ میں! انھیں حروف اور الفاظ میں اس کو پیکرِ انسانی نظر آنے لگا اور انھیں میں حسِ شامہ کے لئے مسکنِ کیفِ مشام محسوس ہونے لگا۔ انھیں تصوراتی مظاہر کی تسوید و تحریر سے سکر و خمر پیدا ہونے لگا اور اسی اساسِ تصوّر و تاثر پر ادب میں خمریات کے باب کا اضافہ ہوا۔ احساس و ادراک سے ماورا جذبۂ روحانیت جس کو حسِ ششم باطنیہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا، کی تسکین کے لئے تصوّف کا باب معرضِ وجود میں آیا۔

محسوسات اور جذباتِ انسانی نے تصوّرات کی دنیا میں نشو و نما پا کر تحریر و تسوید میں تشکیل پائی اور ان کے مختلف النوع اظہار میں انسانی دماغ نے اپنی ذہانت و ذکاوت کے جوہر دکھائے اور یوں انسان نے دستارِ فضیلت پہن کر مخلوقات میں اپنے اشرف و افضل ہونے کا ثبوت فراہم فرمایا۔ وضاحت کے لئے بطور اعادہ ہم یوں کہیں گے کہ حسین مجسّمے، دل کش تعمیر، جمیل تصاویر اور بیرونی حسنِ پیکرِ انسانی ایسے مظاہرات ہیں جن سے بالذات اکتسابِ کیف ہوتا ہے اور یہ علیحدہ علیحدہ فن (آرٹ) کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہم حسنِ پیکرِ انسانی کے علاوہ شاذ و نادر ان کو معرضِ تحریر میں لاتے ہیں۔ یہی کیفیت رقص کی ہے جس سے بالراست کیف محسوس ہوتا ہے اور یہ بھی جداگانہ ایک فن (آرٹ) کی حیثیت رکھتا ہے اور ہم اس کو بھی شاذ ہی ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں۔ لیکن جب ان ہر دو فنون کو ہم الفاظ و تحریر کا جامہ پہناتے ہیں تو ان کی فنی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے اور یہ لٹریچر یعنی ادب میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس طرح شعر و ادب کو "اُمّ الفنون" ہونے کا درجہ حاصل ہے۔

موسیقی و غناء ایسا آرٹ (فن) ہے جو ادب پہلے ہے اور بعد میں جداگانہ فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم پہلے نغموں کو منظوم کرتے ہیں۔ ہم پہلے گیت لکھتے ہیں بعد میں مغنّی نغمہ سرا و نوا ساز ہوتے ہیں۔ حسنِ فطرت اور حسنِ انسانی ایسے مظاہر و محرکات ہیں کہ جن سے نظری طور پر انسان بالراست کیف اندوز تو ہوتا ہے لیکن اپنے ذوقِ معنوی کی تسکین کے ارتقائی نقطہ کو نہیں پہنچ پاتا اور وہ اس کیف و انبساط میں اپنی طبعی اور معنوی ذوقی کیفیت کے مدِّ نظر لامتناہی اضافہ چاہتا

ہے۔ ان دونوں اقسام کے حسن کو معرضِ تسوید و تحریر میں لاتا ہے اور وہ وہ گلکاریاں کرتا ہے کہ اس حسن اور اس کے کیف میں ہزار گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ لامحدود فراوانی، بیکراں افزونیت اور منتہائے تسکینِ ذوقِ معنوی کا سرچشمہ جاری و ساری!

اسی اظہارِ حسنِ خیال و تصوّر اور اس سے اکتسابِ کیف کا نام سخن گوئی اور سخن سنجی ہے۔ یہ تمام جمالیات کی آئینہ دار اور شعر و ادب کی تعبیر و تفسیر ہوتی ہے۔ ضیائے قلب و دماغ، منبعِ سرور و انبساط، ایک سرچشمۂ شیریں جس سے تشنگانِ ادب سیراب ہوتے ہیں۔ ایک بحرِ ذخار جس میں غواصیانِ معانی دُرہائے شہوار رولتے ہیں، ایک خمستانِ سخن جس میں سے کشانِ بلانوش سرشاری و سرمستی حاصل کرتے ہیں، ایک گلستانِ ادب جس سے گل چینانِ باذوق گل ہائے شگفتہ اور غنچہ ہائے نودمیدہ سے دامن بھرتے ہیں۔

انسانی تصوّرات کے نفسیاتی تجزیہ کے لئے یہ مختصر وضاحت ضروری ہے کہ سنگ تراشی کے نمونوں، مجسموں، تصاویرِ دل پذیر، عماراتِ جاذبِ نظر، مناظرِ حسنِ فطرت، اہتزازِ شاخ و برگ، ابتہاجِ سبزہ و سنبلستان، گلستان و بوستاں اور رقصِ خاموشی کا تمام تر حُسن ہماری چشم و نظر کے ذوقِ کیف کو تسکین دے سکا۔ ایسے ہی پیکرِ انسانی کا حسنِ ظاہر باصرہ افروز ہوا اور یہاں ہماری حسِ باصرہ کو بمقابلۂ دیگر بے جان حسین اشیاء کے زیادہ تسکینِ ذوقِ نظر نصیب ہوئی۔ موسیقی و غناء نے قوتِ سامعہ کو نوازا لیکن چونکہ حسیاتِ لامسہ و ذائقہ اور قوتِ شامہ (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) تشنہ رہیں ان کو ادبی نقطۂ نظر سے تصوّرات کا سہارا لینا پڑا حتیٰ کہ مظاہراتِ باصرہ پرور اور عوامل سامعہ نواز کو بھی شاعری کی دنیا میں تصوّرات کے آغوش میں آنا پڑا۔ حسین یادیں بھی تصوّرات ہی کی زینتِ آغوش بنیں۔ گزرے ہوئے حسین واقعات کو اور حسن افزا حقائقِ حیات کو بھی تصوّرات کی دنیا میں جلوہ گر ہونا پڑا۔ اسی طرح تصوّرات کی حسین تخلیق حسنِ نظر و فکر کی آغوش میں ہوئی اور ذوقِ تخیل میں نشو و نما پا کر یہ حسین تصوّرات دنیائے شاعری پر چھا گئے، آسمانِ ادب پر چمکے، فضائے شعر و سخن میں جلوہ پاش ہوئے اسی ضوفشانی اور ضیاباریٔ تصورات پر غزل گوئی اور نظم گوئی کا تمام تر انحصار ہے اور ان ہی تصورات کے اظہارِ لطیف، پرتوِ حسین، انعکاسِ جمیل کا نام شعر و سخن ہے۔

مجملاً بسلسلۂ تفصیل ماسبق یہ کہ فنونِ لطیفہ اور حسیاتِ خمسہ کے تعلقِ معنوی سے مکمل تخلیق جو انسانی قلب و دماغ کر سکا وہ تصورات و مرئیات کو معرضِ تحریر و تسوید میں لانا تھا اور یہ تمثیلہ کا خارجی پہلو ہے۔ ابھی اس میں داخلی پہلو کے شامل کرنے کی سخت ضرورت تھی۔ انسان اپنی ذات سے تمام بیرونی ماحول اور تصوراتِ خارجی کو حیطۂ تحریر میں لا سکا لیکن دماغی و قلبی کیفیات اور معنوی محسوسات کو سپردِ تحریر کرنا بھی ضروری تھا۔ اسی لئے دماغی و ذہنی جذبات و احساسات کو بھی اپنی تمام تر لطافت و نزہت کے ساتھ عبارت و اشارت میں لایا گیا ان جذبات میں سے محبّت و مدحتِ حسن کا جذبہ ہمہ گیر تھا دیگر جذبات پر مستولی و غالب، وہی شاعری و نظم گوئی میں غالب رہا اور ہمیشہ غالب اور کارفرما رہے گا۔ دیگر جذباتِ انسانی دیگر جزئیاتِ شاعری میں داخل ہوئے اور داخل رہیں گے۔ اس طرح انسان نے خارجی تصوّرات و تخیلات اور داخلی جذبات و احساسات کو حسنِ بیان کے ساتھ لفظی جامہ پہنایا۔ اسی حسین لطیف اور موزوں عبارت آرائی کو جو دماغی و قلبی، داخلی و خارجی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے حسنِ بیان اور صوتیاتی توازن رکھتی ہے ہم شعریت کہیں گے اور اسی کا لبِ تسوید سے شاعری تعبیر ہے۔

شاعری (نظم گوئی) میں تمام انسانی احساسات اور جذبات کی ترجمانی اور ان کی تسکین کی تکمیل ہوتی ہے اور چونکہ یہ تکمیل تصوّرات کی رہینِ منّت ہے اور تصوّرات کی وسعت بے پایاں تسلیم ہے اس لئے یہ اظہارِ تصوّرات اصل حقیقت سے مضاعف ہو گیا اور اس طرح تصوّر و اظہار میں علو داخل ہوا اور اسی علوئے تصوّر و تخیل کے ساتھ غلو کارفرما ہونے لگا اور حسنِ بیان میں آگے چل کر اغلاق بھی پیدا ہوتا گیا۔ تدقیق و نکتہ رسی بھی داخل ہو گئی۔ علوئے خیال و غلو، تصوّرات و تخیلات کے اظہارِ حسین کو حسین تر بلکہ حسین ترین بنانے میں کامیاب ہوا اسی کا نام زورِ حسنِ بیان اور جوششِ حسنِ اظہار

ہے جو شعریت کی جان ہے اور شاعری و نظم گوئی کی روحِ رواں۔ ہم کسی پیکرِ انسانی کو طبعی نظر میں اتنا حسین نہیں پاتے جتنا کہ ہمارے حسین تصوّر میں وہ حسین نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تصوّری حسن میں اضافہ در اضافہ کے لئے ہم تشبیہات اور استعارات سے کام لیتے ہیں۔ اور یہ شعریت کا ارتقاء اور منتہائے وسعتِ تخیّل ہے جو اصل حقیقت کو بلند ترین معیار پر پہنچا کر حسین ترین اور لطیف ترین، دل کش و دل آویز بنا دیتا ہے اور چونکہ یہ تصوراتی دنیا ہے جو لا متناہی ہے۔ ہم اصل حقیقت کے بغیر بھی ایسے حسن کا تصوّر کر سکتے ہیں جو ماورا اور مافوق ہوتا ہے اور مبالغۂ حسنِ ماوراء کا اظہار کیف پرور ہمارے حسین ترین اور لطیف ترین احساسات و جذبات کو بدرجۂ اتم تسکین پہنچاتا ہے۔ حسنِ طبعی کو زوال لازم ہے مگر اس حسنِ تصوراتی میں زوال کا گزر نہیں بلکہ اس کو ابدیت اور دوام حاصل ہے اور بریں بناء حسنِ شعریت حسنِ حقیقت پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہ مدّ نظر ہے کہ ضبطِ تسوید و تحریر میں تصوّرات کو قید و بند کرنے کے ساتھ ساتھ رقص و سرود نے ترنّم کا التزام پیدا کیا اور ہماری شاعری کے لئے مترنم ہونا ضروری ہو گیا۔ اسی ترنّم کی موشگافیوں نے ارکان و بحور پیدا کئے اور بحور کے غنائی لوازمات نے قافیہ و ردیف کو جنم دیا۔ تسوید و تحریر میں ترنّم و جوشِ نغمگی، صوتیاتی موزونیت، حسنِ تصوّر و تخیّل اور حسنِ بیان کا امتزاج مکمل شعریت قرار پایا۔ بعد ازیں غزل و نظم کی ہیئتِ ترکیبی یعنی تعدّد مصاریع اور ان کا ربط و تعلّق اور ان سے پیدا شدہ اصنافِ سخن معرضِ وجود میں آئیں۔ اس نظم گوئی کی تشکیلِ ہیئت نے شاعری کے حسن میں چار چاند لگا دیئے اور مخصوص موضوعِ شعری کو بلحاظِ مناسبت طرزِ ادا، مخصوص اشکالِ نظم گوئی نے تسہیل بہم پہنچائی۔ اسی طرح ارکان و بحور اور ان کے مختص ترنّم نے غنائی موضوعات کے منظوم کرنے میں نغمگی و حسنِ بیان عطا فرمایا۔

فنی ہیئتِ ترکیبی اور اس کے ارتقائی نقطۂ نظر سے یوں کہیئے کہ پیکرِ انسانی اور فطرت کے مظاہر و مناظر کے مشاہدہ کے لئے "حسنِ نظر" کی ضرورت لاحق ہوئی جس سے حسنِ تصوّر و تخیّل پیدا ہوا پھر حسنِ اظہار و بیان سامنے آیا۔ حسنِ بیان کے لئے حسنِ عبارت اور اس کے ضمن میں تشبیہات و استعارات کی صناعی عمل میں آئی۔ ترکیبِ لفظی کا حسن معرضِ تعریف میں لایا گیا۔ اسی طرح قوافی میں حسنِ توازن و ترنّم پیدا ہوا بعد ازیں ارکان و بحور کا صوتیاتی توازن اور بھی رنگ لایا، وہ سمع نواز بنا اور کیف آگیں ہوا۔ اس طرح حسن در حسن، جمال در تجمل کے متوازن تسلسل اور اس کے امتزاج کا نام سخن گوئی، حسنِ خیال تصوّر اور حسنِ بیان، اظہارِ حقائقِ حیات، زندگی کی مخلصانہ و مفکرانہ تفسیر و تشریح، توضیحی عبارات و اشارات سے مراد شاعری اور نظم گوئی ہے۔

یہ شاعری کی مختصر تعریف و توضیح ہے، مذکورہ صفات و لوازماتِ حسن در حسن اور حسنِ طرزِ ادا، حسنِ اظہارِ حقائق و علائقِ ہستی اور تعبیرِ ملحقات و مضمراتِ زندگی کی بدولت شاعری و نظم کو دیگر فنونِ لطیفہ پر فوقیت و سبقت، فضیلت و مرتبت حاصل ہے اور یہ امتیاز نہایت اہم اور گراں مایہ حیثیت رکھتا ہے۔ بدیں وجوہ شاعری و نظم گوئی اپنی مندرجہ بالا تفاصیل و توضیحات اور صفاتِ عالیہ کی بنا پر علم و فضل، تربیتِ اخلاق، معاشرتی اصلاحات، سماجی انقلابات، منقلب سیاسی میلانات، ذہنی و قلبی واردات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مذہبی تلقینات، اسالیبِ حیات، نزہتِ جذبات، لطیف احساسات، تسکینِ دل و دماغ، ارتقاء کی محرکات سے مملو قلبی ارتسامات کا حسین انعکاس پیش کرتی ہے۔ شعری اصطلاح میں کہئے کہ شاعری شرابِ حیات کا سر چشمۂ شیریں ہے جو ترنّم کی زمینوں میں سبک روی کے ساتھ خراماں رواں اور دواں ہے۔ جس کا نشہ انسان کو انسانیت بخشتا ہے اور ذہنی و دماغی قلبی اور روحانی تسکین بدرجۂ اتم بہم پہنچاتا ہے۔

اب ہم اس مخلوقِ شعریت کے خالق کی تخلیق اور کیفیاتِ نفسی پر غور کریں تو یہ اور نیا اور وسیع التفصیل موضوع ہو گا جس سے گریز ناگزیر ہے مگر تفصیل سے گریزاں رہ کر اختصار پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تخیلات کی عکّاسی، مفہومِ تخیّل کا تحریر و تسوید میں، اظہار نثر میں بھی ضروری ہے بعض نثری عبارات مسجّع اور مرصّع بھی ہو سکتی ہیں۔ ان میں غیر مربوط ترنّم اور توازن بھی قوافی کی ہم آہنگی سے پیدا کیا جا سکتا ہے اور اس طرح کی مترنم اور موزوں مقفیٰ نثر کو کسی حد تک شعریت کا درجہ دیا جا سکتا ہے (جس کی بین مثال عباراتِ قرآنی ہیں)

مگر اصطلاحات ضمنی کے اعتبار سے یہ متناقص شعریت ہے۔ مکمل شعریت صرف وہ ہے جو حسنِ خیال اور حسنِ بیان کے ساتھ مکمل طور پر موزونیت تامہ رکھتی ہو۔ ترنم اور صوتی توازن کی میزان! بحور و ارکان کی سمع نواز یکسانیت میں سرِ مو فرق نہ ہو اور یہی خصوصیت نثر و نظم میں مابہ الامتیاز معیار ہے۔ موزونیتِ طبع، ذہنی صلاحیت انعام فطرت ہے جو قابلِ اکتساب کم ہے بلکہ ہے ہی نہیں۔

مختصراً یہ کہ خالق شعریت یعنی شاعر کی ذہنی و نفسیاتی صلاحیت کے لئے طبع کی موزونیت اولین وصف اور شعریت کا جزو لاینفک ہے۔ علم و فضل اور فنی صلاحیت کو ثانوی درجہ حاصل ہے لیکن طبعِ موزوں کے ساتھ ساتھ شاعر کا جذباتِ صحیحہ سے معمور اور تاثرات و کیفیات سے بھرپور ہونا بھی ضروری اور ناگزیر ہے اور حسنِ اظہار و بیان میں ترصیع و تزئینِ عبارت کی صلاحیت کا حاصل ہونا شاعر کی اعلیٰ صفات میں سے ہے۔ یہ خصوصیات اگر شاعر میں بدرجہ اتم موجود نہ ہوں تو وہ مکمل شاعر نہیں ہو سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ تک بندی کرتا رہے اور اپنا کوئی مقام پیدا نہ کر سکے۔ تخیل و تصور ذہنی و دماغی فضل کی پیداوار ہے جو فاعلانہ حیثیت رکھتی ہے لیکن تاثر یعنی اثر پذیری محرکات و عوامل بیرونی کا نتیجہ ہے جو مفعولانہ حیثیت رکھتا ہے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ شاعر کو عصری ماحول سے متاثر ہونا چاہیئے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اسی کا ہو رہے۔

حسن و عشق کا شائبہ اس میں نہیں پایا جاتا اور دیگر اہم جذبات بھی مفقود ہوتے ہیں لیکن اثر انگیزی، ولولہ خیزی، جذبات کی برانگیختگی بلا کی ہوتی ہے۔ نصب العین کے حصول کے بعد یہ جوش و خروش اور جذبات کا ہیجان بہت سرعت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے یا سرد پڑ جاتا ہے۔ غرضیکہ یہ ایسا تاثر ہے جس کی ایک مدت معین ہوتی ہے۔ مدت معینہ گزرنے کے بعد اس پر مشتمل ادب بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اب اس کی جگہ کوئی نئی تحریک جنم لے لیتی ہے۔ اس قسم کی شاعری یا نظم گوئی کے لئے شاعر میں ماحول کی ہنگامی تحریکات کے تاثرات قبول کرنے کی مخصوص صلاحیت اور جوشِ عنفوان کا ہونا ضروری ہے۔ زود حسی کی شدت کی شرط ہے۔ یہاں یہ لکھنا بے جا نہ ہوگا کہ کلاسیکی نظم گو شاعر ایسی جزئیات سے متاثر تو ہوتا ہے مگر بہت کم۔ وہ اس موضوع پر لکھتا تو ہے مگر خال خال! وہ اس قسم کی شاعری کو اپنی نظم و شعر گوئی کا نصب العین قرار نہیں دیتا۔ اس کو شعریت کا عشر عشیر سمجھتا ہے کیونکہ اس میں دوام نہیں ہوتا۔ ان کی آفاقیت ہمہ گیری تک نہیں پائی جاتی یعنی عمومیتِ جذبات ہمہ جہتی تخیلات کی ترجمان نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم اساتذہ کے یہاں اس کا فقدان پایا جاتا ہے۔

دورِ حاضر میں بھی کلاسیکی نظم گو شعراء و اساتذہ اس ہنگامی و میثاقی تحریک سے کم متاثر ہیں۔ اگر کچھ کہتے ہیں تو اس کی حیثیت جزئیات شاعری کی ہوتی ہے۔ ایسی تحریکات مخصوص رجحانات رکھنے والے شعراء کو متاثر کرتی ہیں اور وہی اس پر بہت کچھ کہتے ہیں یہاں تک کہ اور کچھ نہیں کہہ پاتے۔ بالفاظ دیگر ہم یہ کہیں گے کہ شاعری میں اس قسم کی پیداوار خواہ وہ سیاسی ہو یا معاشرتی اپنی تحریکات کے زور و شور کے ساتھ شد و مد اختیار کرتی ہے اور محرکات کے زور کے انحطاط کے ساتھ زوال پذیر ہو جاتی ہے یعنی اس قسم کی شاعری میں زور اور تاثر تو بہت ہوتا ہے مگر دوام و استحکام کم۔ حسنِ بیان و حسنِ معانی کا کم و بیش فقدان ہوتا ہے۔ ہنگامی جوش و خروش کے ساتھ یہ کلام انحطاط پذیر ہوتے ہوئے معدوم ہو جاتا ہے۔ صرف اپنے ہلکے سے نقوش قرطاسِ ادب پر چھوڑ جاتا ہے۔ اس سے زیادہ قابلِ توجہ اور نہایت وزنی اور زندہ مثال ہمارے سامنے غزل گوئی (یہاں قدیم اور محدود رنگِ تغزل سے مراد ہے) کی ہے۔ حالانکہ غزل کے محرکات سب سے قوی اور اہم جذبات و محسوسات ہیں۔ لیکن چونکہ اس کا طرز بیان محدود رہا، موضوعات یکسر یکساں رہے، اسلوب بیان میں قدما کا اتباع رہا، جذبات کی ہمہ گیری نہ تھی، اسالیب متنوع نہ تھے، ہیئت ترکیبی صرف ایک ہی تھی یعنی دو مصرعوں میں ایک شعر! اس لئے وہ شدہ شدہ انحطاط پذیر ہوئی اور زوال کے قریب پہنچ گئی۔ لیکن غزل میں چونکہ زندگی کے اہم ترین جذبات و تاثرات منظوم ہوتے ہیں اور بہ اعتبار تخیل صرف ایک شعر میں مکمل خیال ابہام و اشارات کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے اس لئے

یہ تغزل فنا تو نہ ہو سکے گا لیکن زوال پذیر ضرور ہے۔ اردو ادب میں اپنی سابقہ مقبولیتِ عامہ کو کھوتا جا رہا ہے۔ اب اس کی جگہ نظم گوئی کی آفاق گیری لیتی جا رہی ہے۔ یہ آفاق گیری ہی کلاسیکی نظم گوئی کی معنوی اساس مستحکم ہے اور یہی اس کا نصب العین اور اسی اہم ترین خصوصیت سے اس میں دوام پیدا ہوتا ہے۔ ادب کو حیاتِ جاوداں نصیب ہوتی ہے۔

ہنگامی تحریکات پر مبنی اقسام کی شاعری جزوِ شاعری ضرور ہوتی ہے مگر ہمہ گیر شاعری نہیں ہوتی یعنی اس کو کلاسیکی نظم گوئی نہیں کہہ سکتے۔ موجودہ سیاسی تحریکات پر مشتمل ادب عشرِ عشیر کی مناسبت رکھتا ہے البتہ غزل گوئی کا تناسب کافی وقیع اور اتنا اہم ہے کہ وہ کم تر نصف کی حیثیت ضرور رکھتی ہے یعنی غزل کلاسیکی نظم کا ایک عظیم جزو ہے اور وہ اس جزو کی حیثیت سے ہمیشہ قائم رہے گی۔ کلاسیکی تغزل اور نظم گوئی کو دوام اس لئے حاصل ہے کہ وہ وسعتِ بے پناہ کی حامل ہوتی ہے۔ مختلف اسالیبِ بیان رکھتی ہے۔ متنوع اصنافِ سخن (ہئیتِ ترکیبی کے اشکالِ مختلفہ) Forms of Poetry رکھتی ہے۔ اس میں زندگی کے تمام پہلوؤں، انسانی جذبات اور حسین تصورات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ہر رُخِ حیات پر خلوص و صداقت کے ساتھ تنقید و تبصرہ پیش کیا جاتا ہے جس کی روحِ رواں معنیٰ آفرینی، حسنِ بیان، اثر پذیری اور کشش و گیرائی ہوتی ہے۔

جاوداں شاعری (نظمِ عالیہ یا کلاسیکی نظم) وہ کلامِ موزوں ہے، جس میں محمود عمومیت، صداقت اور خلوص ہو، ملاومت ہو، کلام مستمرہ ہو جو حقائقِ حیات سے قریب تر ہو، جو ہمہ گیر جذباتِ انسانی کی آئینہ دار ہو۔ یعنی وہ کلام جس میں عمومیتِ جذبات و تصورات عمومیت، تاثرات و تخیلات کے مظہرات و مضمرات، قلبی واردات و احساسات حسنِ بیان کے ساتھ پائے جائیں۔ نظمِ جاوداں وہ کلام ہے جس میں زندگی و زندگانی کے تمام پہلوؤں پر داخلی و خارجی شعبہ ہائے حیات پر روشنی ڈالی گئی ہو مخلصانہ تنقید پیش کی گئی ہو جس میں محسوسات و جذبات کی وہ تصاویر پائی جاتی ہوں جن کا ہر لطیف رُخ حسنِ بیان کے ساتھ اُجاگر کیا گیا ہو اور عبارات و اشارات میں حسین ترین ترصیع اور تزئین پائی جائے۔

تصورات کی تخلیق اور ان کے اظہار و بیان میں نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے یہ وضاحت و تشریح ضروری ہے کہ مادی اور مرئیات کے اجسام خواہ پیکرِ انسانی ہو یا بے جان مجسمہ ہو یا پیکرِ انسانی ہو یا بے جان مجسمہ ہو یا پیکرِ نباتاتی ہو حسین و کریہہ ہر دو رُخ رکھتے ہیں۔ متصور شاعر صرف حسین رُخ کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ کریہہ پہلوؤں اور تکدر آمیز رُخ کو نظر انداز کرتا ہے اور اس حسین رُخ کے تصور میں وہ اپنے جمالیاتی ذوقِ نظر سے اضافہ کرتا ہے، اور اپنے تصورات کو حسین ترین بنا کر پیش کرتا ہے اور شاعر کا یہی جذبۂ اضافیت وازدیادِ حسنِ بیانِ تصورات کے انعکاس و اظہار میں بھی حسنِ الفاظ، حسنِ ترکیب اور معنوی صنائع و بدائع کے التزامات کے ساتھ کارفرما رہتا ہے۔ دراصل تصورات کے موضوع میں اتنی دل کشی اور حسن آمیزی نہیں ہوتی جتنی کہ شاعر کا حسنِ نظر ان میں پیدا کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جتنی زیادہ حسنِ نظر شاعر میں ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ حسن آفرینی، دل کشی، دل آویزی، کششِ قلبی و جاذبیت اس کے تصورات اور ان کے مظاہر میں ہوگی۔ شاعر کا حسنِ نظر ہی شعریت کی جان اور شاعری کی روحِ رواں ہے۔

زندگی کے غیر اہم اور غیر معروف پہلوؤں کو نظر انداز کیا جائے تو مضائقہ نہیں۔ فروعاتِ حیات کو چھوڑ دیا گیا تو کوئی ہرج نہیں، نفرت انگیز، کراہت، تکدر اور انقباض پیدا کرنے والے جذبات و تصورات اور ان کے اظہار سے احتراز لازم ہے۔ حسن کی منفیات اور جمالیات کے منافیٔ مظاہر سے گریز ضروری ہے مگر کلام میں مستحسن و محمود عمومیت کا التزام بنیادی طور پر بے حد ضروری ہے۔ یہ نہ ہو کہ صرف زندگی کے ایک رُخ یا محدودے چند رُخوں پر روشنی ڈالنے پر اکتفا کیا گیا ہو۔ وہ شاعری تو ہوگی مگر جزوِ شاعری اور اگر موضوعات کمزور جذبات اور ہنگامی تحریکات پر مبنی ہوں تو اس قسم کی شاعری میں (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) مرورِ ایام کے ساتھ تحریکِ میثاقی کے اختتام پر زوال پذیری ناگزیر ہے۔

طالبانِ ادب اور دورِ حاضر کے شعراء و ادباء اور دل دادگانِ تحقیق و تفحص کے لئے افادہ سے خالی نہ ہوگا اگر آخر میں اجتماعیتِ تفسیر و تشریح کے مدِ نظر نظمِ جاوداں (کلاسیکی نظم) کے مضمرات بطورِ اعادہ بیان کر دئے جائیں۔ کلاسیکی نظم وہ کلام ہے جس میں نفسیاتی مسلمہ عمومیتِ جذبات و تخیلات اور مسلمہ تاثرات و واردات، مظاہر

جذبات وحسیات، حقائق حیات کی اجتماعیت پائی جائے جس میں حسن بیان، وحسن معانی میں ندرت وجدت، الفاظ وتراکیب میں حلاوت ہو جو مرصع ومزین عبارت ایما وکنایہ واشارت پر مشتمل ہو جس میں فصاحت و بلاغت، روزمرہ وسلاست، دل کشی واثر آفرینی پائی جائے۔ محرکات کامرانی وفرح سامانی، کیوف قلبی کی فراوانی موجود ہو۔ اسرار ورموز حیات ذہنی ودماغی کیفیات، داخلی وخارجی نفوذ ومحسوسات اجاگر ہو جائیں حسن مناظر کے مظاہر حسین ودل کش انعکاس تصورات میں تشبیہات و استعارات معانی آفرینی وتسہیل وایجاز پایا جائے۔ سکون خاطر اور طمانیت قلبی کے محرکات عزم راسخ اور عمل وسعی پیہم کے مجوزات (تحریکات) اعتماد نفسی اور ہستی کے اعتبارات پیش کیے گئے ہوں۔ نشو ونمائے زیست اور ارتقائے حیات کے مظاہر ورجحانات پائے جائیں اور تمام اصناف منظومات پر جمالیات وحسن معانی کا پرتو ضوفگن رہے۔ ترصیع وتزئین کی موشگافیاں اور گل کاریاں بدرجۂ اتم موجود ہوں یعنی وہ گلستان ادب جہاں خزاں کا گزر نہ ہو وہ بوستان سخن جہاں مشام دماغ ہمیشہ معطر رہتا ہو وہ چمنستان شعر وسخن جو صد رشک جناں ہو وہ کاخ بلند جس کو بادباراں سے گزند نہ ہو۔ وہ کلام جس میں پذیرائی وگیرائی کے ساتھ انسانی زندگی کے اقدار، علمی مشاہدات کے فطری مظاہر، کیفیت معنوی وانبساط روحانی کیفیات نشاط موجود ہوں بایں ہمہ اوصاف کلاسکی نظم وہ کلام ہے جو دماغی وقلبی کیوف کے ساتھ ساتھ افادۂ علمی کا سرچشمہ، معانی ونکات کا خزینہ، رموز واسرار حیات کا گنجینہ، ہوش وآگہی کا پیمانہ، سرشاری وبےخودی کا میخانہ، حسن کائنات اور جمالیات جہان ماورا کا آئینہ ہو۔

یعقوب عثمانی

غزل

یہ شگفت دل ہے شکست دل، مری خوش دلی سے نہ کھیلیئے
مری زندگی میں ہیں تلخیاں، مری زندگی سے نہ کھیلیئے

ابھی مجھ پہ وقت کا ہے کرم، ابھی صبح وشام کچھ اور ہیں
ابھی دل جلاکے نہ دیکھئے، ابھی روشنی سے نہ کھیلیئے

مری سطح دل پہ نہ جم سکے کسی بدظنی کے قدم کبھی
ہیں وفا سرشت ہوں آج بھی مری دوستی سے نہ کھیلیئے

کبھی دیکھئے تو سہی مجھے مری خود شناس نگاہ سے
مجھ خبط خودنگری نہیں، مری آگہی سے نہ کھیلیئے

مرے ظرف سے ہیں بلندتر یہ سحاب لطف کی بارشیں
میں اداشناس کرم نہیں، مری تشنگی سے نہ کھیلیئے

مرے تجربوں کا نچوڑ ہے، یہ سکوت ضبط فزا مرا
مری ہر نظر میں ہے داستاں مری خامشی سے نہ کھیلیئے

کبھی بھول کر نہ جھکا سکی، مجھے احتیاج کی سرکشی
مری وضع غم پہ نہ جائیے، مری بےدلی سے نہ کھیلیئے

میں ترانہ سنج حیات ہوں مجھے اپنے کام سے کام ہے
مجھے فکر داد سخن نہیں، مری شاعری سے نہ کھیلیئے

کوثر چاند پوری

اکبر الہ آبادی کے طنزیہ اور مزاحیہ اشارات

اکبر الہ آبادی کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کا آغاز ۱۸۷۷ء سے ہوتا ہے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب سجاد حسین نے لکھنؤ سے اودھ پنچ جاری کیا اور سرسید کی اصلاحی تحریک نیز وقت کے دوسرے سیاسی و سماجی مسائل پر نکتہ چینی کی فضا تیار ہوئی۔ اکبر نہایت ذہین اور حساس انسان تھے اور طنز و مزاح کی فطری صلاحیت رکھتے تھے۔ اب تک یہ چنگاری حالات اور احتیاط پسندی کی تہوں میں دبی ہوئی تھی، اب ماحول نے ہوا دے کر اس کجلائے ہوئے انگارے کو بھڑکا دیا، وہ بھڑک کر شعلہ تو نہیں بن سکا، مگر اتنا گرم اور روشن ضرور ہو گیا کہ اکبر نے سنجیدگی کی قبا اُتار کر طنز و مزاح کا شوخ لباس پہن لیا۔ انھوں نے اپنی غزل کو نئے موضوعات سے آشنا کیا۔ جنگِ آزادی کی آگ ٹھنڈی ہو چکی تھی اور امن و امان کی خنکیوں میں زندگی کی بانہیں عروسِ ارتقاء کی جانب اُٹھ رہی تھیں۔ نئے اور پرانے کی کشمکش پیدا ہو چکی تھی۔ انگریزی تمدن اور تعلیم سے گرویدگی بڑھ رہی تھی، تقلید کے جذبات ابھر رہے تھے مذہب اور مشرقی تہذیب و ثقافت کے نقوش مدھم ہونے لگے تھے۔ سرسید اور حالی نے قومی تحریکات کا پرچم لہرا دیا تھا۔ نذیر احمد اور شبلی تحقیق و تنقید اور شعری و ادبی سرگرمیوں میں حصہ لے رہے تھے، اکبر اس وقت تک زلف و گیسو اور لب و رخسار کی پرستش میں مصروف تھے لیکن سیاست اور حالات کی ان تبدیلیوں نے انھیں طنز و ظرافت کے سہارے میدان میں آنے پر مجبور کیا۔ اس میں شک نہیں کہ نظم میں یہ صنف بہت پہلے عالمِ وجود میں آ چکی تھی۔ نثر میں بھی خطوطِ غالب کا نمونہ موجود تھا، البتہ اس کا باقاعدہ آغاز ۱۸۷۷ء ہی سے ہوا۔ اکبر مذہب اور پرانی تہذیب کے دل دادہ تھے۔ وہ مغربی تقلید کے خلاف تھے، مذہب کو انھوں نے وراثت کے طور پر قبول کیا تھا۔ وہ روایات میں بھی کسی ترمیم کے لئے آمادہ نہ تھے۔ سویوں کی جگہ کیک کی قائمقامی بھی انھیں پسند نہ تھی؛ حالانکہ گلی سڑی روایات وقت کے ساتھ آپ ہی زندگی کے جسم سے جدا ہونے لگتی ہیں۔ اکبر سرسید کی تحریک کو برداشت نہ کر سکے جو یورپ کی تعلیمی ترقیوں میں حصہ لینے اور مذہبی اصلاح کی غرض سے شروع کی گئی تھی۔ یہ ان کی تنگ نظری تھی۔ غالب نے پہلے ہی ایک ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے "آئینِ اکبری" کی تقریظ میں اپنا نقطۂ نگاہ واضح کر دیا تھا۔ سرسید بھی حقیقت پسندانہ نظر رکھتے تھے۔ ان کی پوری توجہ مستقبل پر مرکوز تھی۔ وہ جانتے تھے کہ آنے والے زمانہ میں سربلندی انھیں کو ملے گی جو انگریزی تعلیم سے بہرہ مند ہوں گے۔ ان کے نزدیک مسلمان پستی کی طرف جا رہے تھے وہ انھیں نئے علوم سے آراستہ کر کے ترقی پسند سماج میں شریک ہونے کی دعوت دے رہے تھے، سرسید مذہب دشمن نہ تھے البتہ مذہب کے غلط تصورات کے حامی نہ تھے۔ وہ مذہب میں ترمیم کرنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے۔ مذہب کے جوش میں پاسبانِ عقل کے اشاروں سے روگردانی کو ضرور ناجائز سمجھتے تھے۔ وہ اپنے مقصد میں بڑے نیک نیت، دیانت دار اور مخلص تھے۔ اس کے باوجود قدامت پرستوں نے مخالفت کا طوفان اور ہنگامہ بپا کر دیا۔ اودھ پنچ نے قدیم و جدید کی اس جنگ میں نمایاں حصہ لیا۔ اکبر نے اس سے نہایت

نہایت سرگرم تعاون کیا۔ انھوں نے نہ صرف سرسید اور ان کے علمی مرکز علی گڑھ ہی پر طنز کئے بلکہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان بھی عام طور پر ان کے طنز کا نشانہ بن گئے۔ اودھ پنچ نے بھی اس دور کے اکثر ممتاز اربابِ شعروادب مثلاً حالی، سرشار اور شرر کو طنز کا موضوع بنا لیا۔ اس طرح اودھ پنچ کی رہنمائی میں ایک ایسا محاذ بن گیا جس پر بہت سے فنکاروں نے اپنے دست و بازو کی قوتیں صرف کیں۔ اکبر نے اپنی شعرگوئی کا رُخ ہی تبدیل کر دیا اور طنزیہ اسلوب اختیار کرکے عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل کرلی۔ ان کا مزاحیہ کلام معنویت سے لبریز ہوتا تھا۔ قوافی کی جدّت اور تراکیب کی ندرت سے وہ شعر کو بہت لطیف اور مؤثر بنا دیا کرتے تھے۔ الفاظ اور حروف کی مناسبتوں پر بہت غور کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کا ذہن بڑی گلکاریاں کرتا تھا، انھوں نے تھوڑے ہی دنوں میں ظرافت کا رجحان بدل دیا اور مزاحیہ اشعار سے حالات پر بڑے پُرلطف طریقہ سے تبصرے کرنے لگے۔ ان کی ظرافت میں غالب کی سی انفرادیت، تازگی اور شگفتگی ہے۔ اکبر کا تغزل اس وقت زیرِ بحث نہیں ہے، پھر بھی یہ ضرور کہوں گا کہ ان کی شہرت اور مقبولیت کی بنیاد تغزل نہیں، ظرافت ہے۔ وہ غزل کے بہت بڑے شاعر نہیں تھے لیکن طنز اور ظرافت کو غزل میں سمو کر انھوں نے غزل کے موضوعات میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا کر دی۔ اگرچہ اکبر تصوف اور معرفت کے شیدائی تھے۔ یہی رنگ ان پر غالب تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے شوخی اور زندہ دلی سے کام لیا اور طنز و ظرافت کے میدان میں وہ اپنے دور کے تمام شاعروں سے آگے ہی رہے، بلکہ اب تک اس میدان میں ان کا کوئی ہمسر اور حریف پیدا نہیں ہوا۔ اکبر نے سیاسی طنز بھی کئے ہیں اور سماجی و معاشرتی بھی، ان کا سیاسی شعور زیادہ بلند نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سیاسی طنز حقیقت پسندانہ نہیں ہیں ان میں سطحیت جھلک آتی ہے۔ سماجی اور معاشرتی طنز کا البتہ جواب نہیں، اس میں مٹھاس بھی ہوتی ہے، تلخی اور زہرناکی بھی۔ یوں بھی ان کی ظرافت، کا خمیر مختلف عناصر سے تیار ہوا ہے اس میں تمسخر، طنز، مزاح اور پھبتی کے اجزاء شامل ہیں۔ احتیاط سے تجزیہ کرنے پر یہ سب چیزیں الگ الگ کرکے دیکھی جا سکتی ہیں۔

سیاسی طنز میں وہ بڑی احتیاط سے کام لیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شروع میں وہ سرکاری ملازمت میں رہے۔ خان بہادر بھی ہوئے اور زندگی کے آخری لمحات تک برٹش گورنمنٹ سے پنشن پاتے رہے۔ ان حالات نے انھیں بہت زیادہ مصلحت اندیش بنا دیا تھا۔ ان کے ذہن و شعور میں مصلحتوں کے تانے بانے پڑے ہوئے تھے۔ وہ کوئی ایسی بات زبان سے نہیں نکالتے تھے جو ان کے لئے نقصان کا باعث ہو۔ جنگِ عظیم اور فسادِ کانپور کے زمانہ میں حکومت نے انھیں کلام کی اشاعت میں محتاط رہنے کا حکم بھی دیا تھا۔ اپنی افتادِ مزاج کے اعتبار سے بھی اکبر اظہارِ خیال میں جری نہ تھے، بلکہ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی

"بعض اوقات اخفائے خیال میں اس قدر زائد اہتمام کرتے تھے جو ان کے مرتبۂ اخلاق سے بہت ہی فروتر تھا۔"

اس احتیاط اور دوربینی بلکہ مصلحت اندیشی پر بھی وہ اعتراضات سے نہیں بچ سکے چنانچہ ۱۱ستمبر ۱۹۱۲ء کو مہاراجہ سرکشن پرشاد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"ایڈیٹروں سے ناک میں دم ہے بلقانیوں کے ظلم کے خیال سے کہیں میری زبان سے نکل گیا تھا،

بحمد اللہ اب خونِ شہیداں رنگ لایا ہے

یہ اس وقت کہا تھا جب سرویا اور آسٹریا کی بحث تھی۔

دوسرا شعر صاف تھا

بہت کیں سختیاں بلقانیوں نے بے گناہوں پر
بالآخر چرخ ان کے سر کو زیرِ سنگ لایا ہے

ایڈیٹر نے یہ اشعار اس وقت چھاپے جب اعلانِ جنگ منجانب برٹش ہو گیا۔ ان پر اعتراض ہوا۔"

غرض یہی زنجیریں تھیں جن میں ان کے زبان و قلم جکڑے ہوئے تھے اور یہی برہنہ تلواریں تھیں جو ہر وقت سر پر لٹکی نظر آتی تھیں اور اکبر کھل کر دل کی بات نہ کر سکتے تھے۔ چہرے پر ظرافت کی نقاب ڈالنے سے بھی کام نہ چلا تو انھوں نے مخصوص اصطلاحوں، استعاروں اور اشاروں کے ذریعہ اظہارِ مطلب کرنا شروع کیا۔ ان اشارات کی مدد سے وہ سیاست سے لے کر انگریز، ہندوستانی، رند، پارسا، شیخ و سید اور

علی گڑھ تک کو ہدفِ طنز بناتے تھے۔ انھیں جہاں اور جس وقت نشتر زنی کی ضرورت پیش آتی تھی وہ انھیں اشاروں اور اصطلاحوں کے سہارے یہ کام کرلیا کرتے تھے۔ ان کے یہاں بہت سے اشارات ملتے ہیں جو انسانوں اور ڈراموں کے زندہ کرداروں کے مانند سماجی ماحول اور افراد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں بعض اشارات حقیقی ہیں جیسے گھورن جو اکبر کے یہاں باورچی تھا یا بدھو عورتوں میں رحیمن اور زبیدہ ۔ ان سب کے نام ان کے یہاں منظوم ہوئے ہیں، کہیں واقعات کی صورت میں اور کہیں اشارات کی حیثیت سے۔

آپ سے ملنے جو میں اے مہرباں آیا نہیں
یہ سبب ہے گھر سے اب تک کوچواں آیا نہیں
گو بگھی مجھ کو لے جاتا ہے بدھو ایک وقت
لیکن اس کو ہانک لینا بے تکان آیا نہیں

کیا خوب یہ کہہ گئے ہیں بھائی گھورن دنیا روٹی ہے اور مذہب چورن
رحیمن پکاری کہ زبیدہ ہا بوا عجب جانور ہے یہ کالا کوا
بتاؤ ذرا عقل ہے میری گم کدھر اس کا سر ہے کدھر اس کی دم

جو لوگ اکبر کے اشارات سے واقف نہیں تھے وہ ان کی بات کو محض مذاق سمجھتے تھے لیکن واقفانِ رازِ کلام کے مغز تک پہونچ کر خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان اشارات نے ان کی ظرافت کا دائرہ بے حد وسیع کردیا تھا اس میں شخصیت اور مرتبت کی قید بالکل باقی نہ رہی تھی ان کے پاس طنز و مزاح کے اتنے موضوعات تھے جن کا شمار بھی مشکل ہے۔ ان تمام موضوعات پر وہ انھیں اشارات کی مدد سے اپنا مفہوم ظاہر کرتے تھے۔ انھوں نے جو اشارہ جس مقام پر استعمال کیا ہے وہ موضوع اور ماحول کے اعتبار سے نمائندگی کا بہترین فرض انجام دے رہا ہے۔ اکبر سماج اور زندگی کی تیزی سے بدلتی ہوئی تصویروں کو غور سے دیکھنے کے عادی تھے۔ یہ تصویریں ان کے ذہن پر چھپ جاتی تھیں اور پھر تاثر کا جامہ پہن کر غزل میں ظاہر ہوتی تھیں۔ اس سے غزل کی روایت ضرور مجروح ہوتی تھی۔ مگر ایک قسم کی جدت بھی پیدا ہو جاتی تھی، وہ ان تمام سیاسی، تہذیبی، اخلاقی، معاشرتی اور تعلیمی و معاشی مسائل پر غزل ہی میں اظہارِ خیال کرتے ہیں جن سے اس وقت کا سماج دوچار تھا۔ اس خارجیت کے باعث ان کی غزلیں گہرائی سے محروم ہو جاتی ہیں لیکن ان میں نیا پن نمایاں ہو جاتا ہے اور افادیت و مقصدیت کے لحاظ سے بھی ان کا درجہ بلند ہو جاتا ہے۔ یہ خارجیت، افادیت اور مقصدیت ان اشارات و اصطلاحات ہی سے وابستہ ہے جو بڑی ذہانت، برجستگی اور خوبصورتی سے نظم ہوتے ہیں اور سماج کے حقیقی افراد کی جگہ حاصل کر لیتے ہیں، اگرچہ بعض جگہ انھوں نے حقیقی ناموں ہی کو اشارات کا روپ دیا ہے، جیسا کہ ابھی ابھی لکھا جا چکا ہے کچھ اشارات اونچی سوسائٹی کے لئے مخصوص ہیں کچھ نچلے طبقات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے کلیات میں طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے جو اشارات ملتے ہیں وہ ہندو بھی ہیں، مسلمان بھی اور عیسائی بھی۔ ان میں جانور بھی ہیں اور بے جان چیزیں بھی، مثلاً مس، شیخ، سید صاحب، زہرہ، خورشید، جان بل، گھورن، بدھو، نبھو، حسو، کلو، میلو، گنگو، جمن، انور، وفاتی، اشراقی، کریمن، نعیمن، شیخ چھیدی، مرزا، ہرچرن داس، علی مراد، پیرو، ہربنس، بھوانی پرشاد، سید، مولانا، بت، دیر، کلیسا، مسجد، اونٹ، خر عیسیٰ، پنڈت، مہنت، لالہ، برہمن، کالج، لارڈ اور صاحب۔ ان تمام اشارات میں نیا پن جھلکتا ہے۔ پرانے الفاظ میں بھی انھوں نے نئی اشاریت پیدا کی ہے ان میں سے بعض اشارات کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ مس تہذیبِ مغربی کی دل کشی اور سحر آفرینی کے مفہوم کو ظاہر کرتی ہے۔ شیخ ایسا ظاہر پرست مسلمان ہے جو خول پر نظر رکھتا ہے اور مغز سے بے خبر ہے۔ سید صاحب سے کہیں تو خود سرسید مراد ہیں اور کہیں ان کے پیرو یعنی علی گڑھ کے حامی، اونٹ عرب کے مسلمانوں کی قدیم روایات کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ جہاں وہ حقیقی نام استعمال کرتے ہیں مثلاً سرسید اور مہدی وہاں ان کی مراد اس تحریک سے ہوتی ہے جس کی وہ نمایندگی کر رہے تھے۔ اکبر ذات سے کم اور صفات سے زیادہ گفتگو کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں۔

شیخ و سید سے تو خالی نہیں ذکرِ شاعر
ذات سے ان کی مخاطب نہیں فکرِ شاعر

لیکن یہ دعویٰ قطعی طور پر حقیقت کے مطابق نہیں۔ انھوں نے سرسید

کو ذاتی حیثیت سے بھی ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ یہ شعر اصل میں تلافیٔ مافات کی ایک شاعرانہ کوشش ہے اس کا تعلق اس زمانہ سے ہے جب وہ سرسید اور مولوی سمیع اللہ کی کوشش سے علی گڑھ تبدیل ہو گئے تھے، اور سرسید کو قریب سے دیکھنے کے باعث اکثر غلط فہمیاں دور ہو گئی تھیں۔ ۱۸۸۱ء سے پہلے وہ سرسید پر ذاتی نوعیت کے طنز بھی کرتے رہے ہیں۔ اس قسم کے طنزیات میں بلند نظری نہیں ملتی۔ بلکہ کم نگہی کا انداز جھلکتا ہے۔ ایک نظم کے چند اشعار دیکھئے،

سید سے آج حضرتِ واعظ نے یہ کہا
چرچا ہے جابجا ترے حالِ تباہ کا
سمجھا ہے تو نے نیچر و تدبیر کو خدا
دل میں ذرا اثر نہ رہا لا الٰہ کا
ہے تجھ سے ترکِ صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج
کچھ ڈر نہیں جناب رسالت پناہ کا
شیطان نے دکھا کے جمالِ عروسِ دہر
بندہ بنا دیا ہے تجھے حبِّ جاہ کا
اس نے دیا جواب کہ مذہب ہو یا رواج
راحت میں جو مخل ہو وہ کانٹا ہے راہ کا

سرسید پر اس قسم کے طنز حقائق سے بے خبر ہونے کی دلیل ہیں اور تنگیٔ نگاہ کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس قسم کے طنز اور بھی ہیں۔

یورپ نے دکھا کر رنگ اپنا سید کو مرید بنا ہی لیا
سب پیروں سے تو وہ بچ نکلے اس پیر کے آگے چل نہ سکی

سید کی روشنی کو اللہ رکھے قائم
بتی بہت ہے موٹی روغن بہت ہی کم ہے

دیکھ کاریگریٔ حضرتِ سید اے شیخ
دیکھئے لوچ وہ مذہب میں کمانی کی طرح

چھوڑ کر رنج اپنے مٹنے کا — منتظر ہوں اب ان کے پٹنے کا

کتا جیسے لپک کر جیفہ دوڑے — یوں دہر میں نیچری خلیفہ دوڑے
جب مر کے چلے ہیں سوئے جنت سید
لپٹے کے امام ابو حنیفہ دوڑے

مرکزِ علم و ادب علی گڑھ پر انھوں نے عام طور پر اس قسم کے طنز کئے ہیں جن میں وسیع النظری کا نام تک نہیں بلکہ تنگ نظری نمایاں ہے

ہے دل روشن مثالِ دیوبند — اور ندوہ ہے زبانِ ہوشمند
ہاں علی گڑھ کی بھی تم تشبیہ لو — اک معزز پیٹ بس اس کو کہو
پیٹ ہے سب پر مقدم اے عزیز — گو کہ فکرِ آخرت ہے اصل چیز

قومی چندے کو دھرسائیں — کالج نے لکھا کہ توند ہوں میں

ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

اکبر ۱۸۸۱ء میں علی گڑھ گئے۔ غلط فہمیاں دور ہوئیں اور نگاہوں سے پردے اٹھے تو انھوں نے اپنا غیر حقیقت پسندانہ رویہ یکسر تبدیل کر دیا۔ اور سرسید کی دل کھول کر تعریف کی، علی گڑھ کو بھی سراہا۔ سرسید کی تعلیمی کارگزاریوں کا اعتراف ان کی اس نظم میں ملتا ہے جو انھوں نے ۱۸۹۲ء میں سرسید کے سفرِ دکن اور اس کے کامیاب نتائج سے متاثر ہو کر کہی تھی۔

بے علم و بے ہنر ہے جو دنیا میں کوئی قوم
نیچر کا اقتضا ہے رہے بن کے وہ غلام
تعلیم اگر نہیں ہے زمانہ کے حسبِ حال
پھر کیا امیدِ دولت و آرام و احترام
سید کے دل میں نقش ہوا اس خیال کا
ڈالی بنائے مدرسہ لے کر خدا کا نام
صدمے اٹھائے رنج سہے گالیاں سنیں
لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام
دکھلا دیا زمانہ کو زورِ دماغ و دل
بتلا دیا کہ کرتے ہیں یوں کرنے والے کام
نیت جو تھی بخیر تو برکت خدا نے دی
کالج ہوا درست بصد شان و احترام

علی گڑھ کو مقدس پیٹ کہنے والے شاعر نے اپنی پہلی رائے کی یہ کہہ کر تردید کر دی

دین کو سیکھ کے دنیا کے کرشمے دیکھو — مذہبی درس الف بے ہو علیگڑھ تے ہو

واہ رے سیّد پاک باز کیا کہنا
یہ دماغ اور حکیمانہ نظر کیا کہنا
قوم کے عشق میں پرسوز جگر کیا کہنا
ایک ہی دھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا
ہر قدم اس کا شہیدِ لغزشِ مستانہ تھا
سر میں تھا سیّد کے قرآں زیرِ پا میخانہ تھا

اکبر کے دوسرے اشارات بھی زندہ کردار بن کر سامنے آئے ہیں، اور بہت جاندار ہیں۔ وہ سماج کی مختلف خرابیوں اور کمزوریوں پر کامیاب طنز کرتے ہیں اور اپنی سطح سے بلند ہو کر آواز اٹھاتے ہیں۔ جن ناموں میں ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کو ابتذال نظر آتا ہے وہ بھی اپنی سماجی طاقت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہتے۔ دراصل یہ ابتذال ناموں کا نہ تھا بلکہ اس سماج اور نظام کا تھا جس نے انھیں ملکیت سے محروم کر کے جاگیردارانہ طاقتوں کا آلۂ کار بنا دیا تھا۔ وہ کالے خاں کی جگہ کلو اور صلاح الدین کی جگہ صلو رہ گئے تھے۔ اس فہرست میں کچھ نام ایسے بھی ملیں گے جو خود ماں باپ ہی کے تجویز کردہ ہیں۔ ان کو اپنی بے علمی، جہالت اور طبقاتی پستی کے عالم میں یہی نام مل سکتے تھے۔ بڑے بڑے نام وہ رکھ بھی لیتے تو اونچے طبقے کے لوگ انھیں بگاڑ دیا کرتے تھے۔ جمن، ننھو، بدھو اور وفاتی ایسے نام ہیں جو ماں باپ ہی کے رکھے ہوتے ہیں۔ اس قسم کے نام اس سماج میں غریبوں اور محنت کشوں کے لئے مخصوص ہو چکے تھے۔ اکبر نے انھیں اپنے اشارات میں شامل کر کے بڑے کام لئے ہیں اور ان کے ساتھ ایک وسیع مفہوم وابستہ ہو گیا ہے، اسی سے وہ سماج کے فرسودہ حصوں پر ضرب لگاتے ہیں۔ اعلیٰ سوسائٹی کے چند کرداروں سے ملئے:

بحث میں آ ہی گیا فلسفۂ شرم و حجاب
زہرہ ممبر ہوئیں ووٹر تھے جناب خورشید
ممبر علی مراد ہیں یا سکھ ندھان ہیں
لیکن معائنہ کو وہی نا بدان ہیں
گو رہتے ہیں ممبر خانی پر شاد
لیکن نہیں اپنی ناتوانی پر شاد

کونسل میں بڑھا رہے ہیں طاقت اپنی
عاقل ہیں مکرمی، بھوانی پرشاد
حجاب تمکنت کو دور کرتا ہے زبیدہ سے
سوا اس کے جو باتیں ہیں فقط اک پردہ پوشی ہے
حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بے گانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی
پردہ کا کیا ہے اڑنگا پیدا
خود ہم نے کیا ہے ازار و انگا پیدا
کیا خوب کہا ہے مولوی مہدی نے
فطرت نے کیا ہے ہم کو ننگا پیدا
نصیحت میں نے پردہ کی لکھی ہے خوش مزاجی سے
وہ کیوں دلوا رہے ہیں مجھ کو گالی اپنی باجی سے

بدھو ادنی الطبقہ کا نمایندہ ہے اس کا شمار نئی روشنی کے گرویدہ ایسے نوجوانوں میں ہے جو کوئی درجہ نہیں رکھتے۔

اولڈ مرزا ہر طرف بدنام ہیں ینگ بدھو وارث اسلام ہیں

لیکن بدھو کوئی جامد قسم کا کردار نہیں وہ ایک ہی جست میں اونچے طبقہ کا نمایندہ بن جاتا ہے۔

مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردّی
بدھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

اپنے نام کے ساتھ معمولی اضافہ کر کے بدھو بعض مقامات پر بلند بھی ہو جاتا ہے۔ وفاتی غریب اور معمولی آدمی ہے پھر بھی مرزا اسے ایک معیار قرار دے کر خوش ہیں

کتنے ہی بے وقار ہوں مرزا کو غم نہیں
کافی ہے یہ شرف کہ وفاتی سے کم نہیں

اردو شاعری میں شیخ، برہمن اور دیر و کلیسا نیز مسجد کے الفاظ نئے نہیں ہیں، لیکن اکبر نے ان میں نئی اشاریت پیدا کی ہے اور کام بھی نئے معنے لئے ہیں۔

نہ مانا شیخ جی نے چکھ گئے دس یا پانچ یہ کہہ کر
اگر قابض ہیں یہ بسکٹ تو ہوں اللہ مالک ہے

شیخ جی مرگئے کمیٹی میں   غل ہوا خاتمہ بخیر ہوا
شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں

بیبیاں اسکول میں ہیں شیخ جی دربار میں

بھائی صاحب تو یہاں فکرِ مساوات میں ہیں   شیخ صاحب کو سنا ہے کہ حوالات میں ہیں

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے
ایک ہیں خفیہ پولس میں ایک پھانسی پاگئے

مرا ٹٹو زیادہ مشرقی ہے شیخ صاحب سے
کہ وہ موٹر پہ چڑھتے ہیں یہ موٹر سے بھڑکتا ہے

شانِ نماز اکبر شاہانہ ہو چلی ہے   مسجد الگ بنائیں اپنی میاں رفاقی

نماز روزہ غریبوں کے حصہ میں آگیا ہے۔ بڑے لوگوں کو کونسلوں اور پارلیمنٹ وغیرہ ہی سے فرصت نہیں

اسلام کی رونق کا کیا حال کہوں تم سے
کونسل میں بہت سیّد مسجد میں فقط جُمّن

کافی ہے بہر شغل کلیسائے فکرِ رزق   اب دل سے مسجد اور شوالے نکالئے

اس مس برق کلیسا کا ہے لکچر اکسیر   آج تو علم بھی مانگے گا مسلمان کی خیر

شیخ جی دیر میں بیٹھے ہوئے گاتے تھے بھجن
نگراں سوئے برہمن تھے بشوق بھوجن

اکبر کے اشارات طنز و مزاح کے لئے نشترِ تیز کا کام کرتے ہیں ان میں چبھن اور خلش بھی ہے حلاوت اور تاثیر بھی۔ اکبر اپنی خصوصیات میں تنہا ہیں، ان کی انفرادیت کا کوئی حریف نہیں۔ ان کے بلیغ اشارات سے لطف اٹھانے کے لئے کافی وقت درکار ہے۔ کچھ مثالیں اور دیکھئے

خلل نہ شغل میں بدھو کے ہے نہ حسّو کے
کہ شیخ سدّو بھی ہیں اور قدم رسول بھی ہے

بولے جاڑوں میں لالہ گنگا دین   دھوپ سے مجھ کو ہوتی ہے تسکین

پوچھتے کیا ہو کہ تو بیرو ہے یا ہر بنس ہے
بندہ جو کچھ ہو بہرحالت بلالیسنس ہے

کیوں نہ اپنے دل کو ہو ان سے ملاپ
لاٹ صاحب ہیں ہمارے مائی باپ

نہ اِف کیجئے اور نہ بُٹ کیجئے
جو صاحب کہیں بس وہ جھٹ کیجئے

کہاں کا حلال اور کیسا حرام
جو صاحب کھلائیں وہ چٹ کیجئے

کیا خوب پڑھ رہے تھے مصرعہ مہنت صاحب
بھنڈار تو ہے خالی بھاری مگر بھرم ہے

اکبر نے ان تمام اشارات کو بڑی احتیاط اور سنجیدگی سے برتا ہے لیکن طنز و مزاح کا فن نہایت نازک ہے۔ یہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ اکبر اپنے مسلک، اخلاق اور مزاج کے اعتبار سے تہذیب و متانت کے خوگر تھے۔ انھوں نے طنز و مزاح میں اپنے بھرم کو قائم رکھنے کی بہت کوشش کی ہے پھر بھی کہیں کہیں وہ فنی حدود سے باہر ہوگئے ہیں اور سوقیت بلکہ پھکڑپن سے دامن آلودہ ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کا یہ ارشاد کہ

"اکبر کا کوئی خیال، کوئی لفظ ایسا نہیں ہوتا جو عمدہ سے عمدہ صحبت کے لئے موزوں نہ ہو۔"

بہت زیادہ محلِّ نظر ہے۔ کلیاتِ اکبر میں ایسے اشعار موجود ہیں جن کو سن کر تہذیب و شائستگی سرنگوں ہو جاتی ہے۔ ان میں ایسے اشارات اور استعارات استعمال ہوئے ہیں جو یکسر متانت اور سنجیدگی کا خون کر دیتے ہیں۔ سرسری مطالعہ سے بارہ تیرہ اشعار اس قسم کے سامنے آگئے ہیں جن کو زبانِ قلم سے کسی طرح ادا نہیں کیا جا سکتا۔ خود طالب الہ آبادی کی رائے بھی ان کے متعلق ایسی ہی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب 'اکبر الہ آبادی' میں ان کو درج تو کر دیا ہے لیکن ان اشعار کے متعلق ان کی رائے اچھی نہیں ہے۔ اکبر کے یہاں اس قسم کے اشعار تعداد کے لحاظ سے زیادہ نہیں ہیں پھر بھی جائز حصّہ ضرور ہے اور قطعیت کے ساتھ یہ کہہ دینا کہ اکبر کا کوئی خیال، کوئی لفظ ایسا نہیں ہوتا جو عمدہ سے عمدہ صحبت کے لئے موزوں نہ ہو کسی طرح درست نہیں۔

اندرجیت لال

آرٹ کی قومی نمائش

سال رواں کے فروری۔مارچ میں للت کلا اکادمی کے زیر اہتمام ہندوستانی آرٹ کی ایک نمائش کا انتظام کیا گیا جس میں ہندوستان کے بلند پایہ مصوّروں و سنگ تراشوں کے شاہکار نمونے نمائش کی زینت بنے۔ایسی نمائش کئی برسوں سے منعقد کی جا رہی ہے جس میں فنونِ لطیفہ کے ماہرین کے فیصلہ کے مطابق ہر سال مصوّروں اور سنگ تراشوں کو سرکاری انعام دئے جاتے ہیں۔اس سال نمائش کے لئے لگ بھگ ایک ہزار مرقعے اور دیگر فنی شاہکار موصول ہوئے جن میں سے ایک سو اننتالیس تصاویر، چونتیس سنگ تراشی کے نمونوں اور تیرہ گرافک فنوں کو نمائش کے لئے منتخب کیا گیا اور ان پندرہ آرٹسٹوں کو انعامات تقسیم کئے گئے۔

ایسی نمائشیں جہاں عوام کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا باعث ہوتی ہیں وہاں ان سے مصوّروں کی ہمّت افزائی بھی ہوتی ہے۔ہر مصوّر اور سنگ تراش اپنی ریاضت اور استعداد کے مطابق اپنا اپنا شاہکار پیش کرتا ہے اور ہمیں یہ موقع نصیب ہوتا ہے کہ ہم مجموعی اور انفرادی طور پر فن کی ارتقائی کیفیت کا اندازہ لگا سکیں اور مصوّری کی نئی تکنیک اور دیگر خوبیوں سے واقف ہو سکیں۔

اس نمائش کو دیکھ کر ہم ایک نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ آج کا ہندوستانی آرٹسٹ کسی روایت یا مخصوص تکنیک کا پابند نہیں۔وہ ہر طرح کے فنی رجحان سے تاثر قبول کرتا ہے۔چناں چہ بعض تصاویر میں ایک ملا جلا تاثر غالب نظر آتا ہے۔اس ملے جلے تاثر سے آرٹسٹ کی انفرادیت پسندی بھی بخوبی واضح ہوتی ہے۔چناں چہ بیش تر تصاویر آرٹسٹ کے ایک لاشعوری جذبہ کی عکاس ہیں اور بعض تصاویر میں انتہائی حد تک یہ جذبہ پایا جاتا ہے۔اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ منظر یا مرقع کچھ غیر مانوس سا دکھائی پڑتا ہے۔اگر مرقع میں علامتی عنصر بھی ہو تو یہ غیر مانوسیت بہت کچھ زیادہ بڑھ جاتی ہے اور تصویر 'ایبسٹریکٹ' بن کے رہ جاتی ہے۔چناں چہ بہت سی تصویریں ایبسٹریکٹ آرٹ کی نمائندہ ہیں ان میں ایک خاص ایبسٹریکٹ Expressionism کا عکس ملتا ہے۔جو یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ تصویر ایک اجتماعی حقیقت کی بجائے کسی ذاتی فلسفہ یا ذہنی کیفیت کی مظہر ہے۔

انعام یافتہ دس تصویریں مختلف اسالیب فن کی حامل ہیں۔ ہیراجی ساگرا کی تصویر 'خاموش کھڑکیاں' ایک جدید روغنی تصویر ہے۔اس تصویر کا تجزیہ جیومیٹری کی طرح ہو سکتا ہے تصویر کی بناوٹ تعمیری طرز کی ہے۔ایک خاموش جوڑا جو تصویر کے داہنی طرف دکھایا گیا ہے اس کا موضوع سے کوئی خاص ربط نہیں، ہاں تصویر کو مکمل کرنے میں یہ ضرور معاون ثابت ہوا ہے اور آرٹسٹ نے تصویر کے اس حصّے کو جس طرح سے پیش کیا ہے اس سے تصویر کی خوب صورتی میں کوئی کمی نہیں آتی۔تصویر میں توازن ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔کے۔ایس کلکرنی کی تصویر 'نغمے کی موت' بھی قابلِ داد ہے۔یہ بھی جدید فن کا نمونہ ہے جس میں موضوع سے زیادہ رنگوں اور خطوں کو اہمیت دی گئی ہے۔بھینسا نما شکل ملک الموت

کی علامتی شکل ہے جو اظہاریہ طرز پر بنائی گئی ہے۔ تصویر ایک گہرے غور وفکر کا نتیجہ ہے اور کلکرنی نے اس میں اپنے پرانے سجاوٹی ڈھنگ کو چھوڑ کر ایک نئے طرز کو اپنانے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔

لکشمن پائی کی تصویر 'گرہن' ایک سجاوٹی روغنی مرقع ہے جس میں نیلگوں اور زمردیں پس منظر میں ایک لڑکی دکھائی گئی ہے۔ یہ مصور کا ایک اچھوتا انداز ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں رنگوں اور لائنوں پر کیسی قدرت حاصل ہے۔ خصوصاً رنگوں کا انتخاب اور ان کی آمیزش قابلِ تعریف ہے۔ لڑکی کے اڑتے ہوئے بالوں کو قدرتی منظر سے ایک خوبصورت مطابقت دی گئی ہے اور اس کے سر پر چمکتا ہوا سورج گرہن کی زد میں آتا دکھایا گیا ہے۔ اس تصویر میں پائی نے ایک روایتی کہانی کو بعض علامتوں میں پیش کیا ہے۔

گوتم وگیلا کی تصویر 'شبنم' ایک سجاوٹی ڈھنگ کا نمونہ ہے۔ آرٹسٹ ایک مشہور ٹکسٹائل ڈیزائنر ہیں۔ اور اس تصویر میں انھوں نے ہندوستان کے برسوں پرانے اسٹائل کو ایک نئی طرز میں پیش کیا ہے۔ تصویر نہایت خوبصورت ہے۔ خاص کر رنگوں سے آرٹسٹ نے جھلملاتی شبنم کا جو منظر پیش کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ تصویر کا اثر اس کی تشریح سے زیادہ اس کی روانی میں ہے۔ تصویر آبی رنگوں میں ہے۔

سومناتھ ہور کی کھدی ہوئی تصویر 'خواب' اظہاریہ طرز کا نمونہ ہے اور علامتی بھی۔ پانچ چھ ٹکڑے جن میں آپس میں نہ کوئی تال میل ہے اور نہ اُن کی کوئی واضح شکل وصورت، اس بات کو بخوبی واضح کرتے ہیں کہ خواب کا کوئی منظر صفحۂ قرطاس پر لایا نہیں جاسکتا۔ آرٹسٹ نے بعض ڈراؤنی شکلوں کی مدد سے خواب کو پیش کیا ہے۔ تصویر میں سطح اور لائنوں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

جیوتش بھٹاچارجی کی روغنی تصویر 'چاند' ایک تدریجی عمل کا شاہکار ہے جو غالباً اس کی بہترین تصاویر میں سے نہیں۔ تصویر کی سطح مستطیل ہے اور چاند گول ہے۔ ان دونوں میں یگانگت پیدا کرنا ایک مسئلہ سے کم نہیں۔ بہرحال موضوع اور جدید فن کے اعتبار سے یہ مرقع بھی انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

انعام حاصل کرنے والوں میں مصوری کے علاوہ دوسرے نمونے بھی شامل ہیں۔ ان میں راگھو کنیریا کی تخلیق 'Form' قابلِ ذکر ہے۔ لوہے کے چھوٹے چھوٹے پتروں کو جوڑ جوڑ کر ایک عمودی کھلونا سا بنا دیا گیا ہے۔ ہر پتّر انفرادی طور پر شاید خاص اہمیت کا حامل نہ ہو لیکن مجموعی طور پر ان سے ایک شکل سی نظر آتی ہے اور اس شکل نے اس کھلونے کو اہمیت دی ہے۔

کنیریا پر مشہور فن کار Pebsner کا اثر پڑا ہے۔ اس فن کار نے یورپ میں ایک تحریک کو جنم دیا جسے "تعمیریت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ جب کچھ چیزوں کو آپس میں جمع کر دیا جائے تو اسے ہم فن کا نام دے سکتے ہیں۔ اس فن میں مصوری کی سب خصوصیات ملتی ہیں۔ یہ فن ماڈلنگ کے بالکل برعکس ہے۔ ماڈلنگ میں ایک بڑے جوڑ سے ٹکڑے کو تراش کر کوئی صورت بنائی جاتی ہے اور اس فن میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ملا کر اُسے کوئی صورت دی جاتی ہے۔ راگھو کے شاہکار کو غور سے دیکھیں تو اس میں ملی جلی صرف ایک ہی صورت پیدا نہیں ہوئی بلکہ نیچے سے اوپر تک کئی مُرِیج نما شکلیں بن گئی ہیں جو ہندوستان کے آرٹ کی غمازی بھی کرتی ہیں۔ یاد رہے کہ ہندوستان ایسے فن میں بھی پیش پیش رہا ہے جس میں معمولی ٹکڑوں کے جوڑنے سے بھی ایک آرٹ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس تحریک سے متاثر ایک اور شاہکار جے رام پٹیل کی تخلیق ہے Study in silence III جس کو انامل رنگوں اور Collage سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس آرٹسٹ کا بھی ایک اچھوتا انداز ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز رکھتا ہے۔ اس میں پٹیل نے کیل اور ٹین کے ٹکڑوں کا بھی استعمال کیا ہے جو تصویر کو تیسری گولائی دینے میں معاون ثابت ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ مصوری میں صرف دو گولائیاں پیش کی جاسکتی ہیں اور تیسری گولائی محض ایسی چیزوں کے استعمال ہی سے ظاہر کی جاسکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ آج کی دنیا Texture کی دنیا ہے اس لئے مصوّر کو اپنے فن کے علاوہ ادھر اُدھر سے بھی بہت کچھ مستعار لینا پڑتا ہے تب جا کر وہ کچھ پیش کر سکتا ہے۔

جیوتی بھٹ کا شاہکار نمائش کے بہترین نمونوں میں سے ہے یہ بھی کالج پینٹنگ ہے جس میں ننھے ننھے کنکر، ماچس کی تیلیاں، تنکے،

شیشے کے ٹکڑے، روغن، کھُردری لکڑی ان سب چیزوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر اس تصویر کی دو سطحیں ہیں جس میں ہلکی اور بھاری دھوپ چھاؤں ظاہر ہے اور اسی وجہ سے اس کا عنوان Dark Landscape تجویز کیا گیا ہے۔ یوں جان پڑتا ہے کہ ہلکے رنگ کے چوکور یا مستطیل خانے بھاری خانوں میں سے ابھر کر آ رہے ہیں۔ خوبصورتی کے لحاظ سے اس کے مقابلے میں ہرکشن لال کی تصویر Shack رکھی جا سکتی ہے جس کا تاثر بڑا گہرا ہے۔ رنگوں کا استعمال جس خوبی سے کیا گیا ہے وہ کسی اور تصویر میں نظر نہیں آتا۔ مصور کا پختہ شعور اور اس کی فنی صلاحیت اس مرقع سے ظاہر ہوتی ہے۔

ایک اور قابل تعریف فنی شاہکار بیروسن کی لاجواب تصویر "میں تنہا ہوں" ہے۔ اس میں محض جذباتیت ہی نہیں بلکہ ایک گہری سنجیدگی ہے جو انسانی زندگی کے ایک اہم پہلو کو پیش کرتی ہے۔ ستیش گجرال نے شروع شروع میں میکسیکو کے فن کے زیر اثر کچھ ایسی ہی تصویریں پیش کی تھیں۔ لیکن یہ دور بہت دنوں قائم نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس نمائش میں شریک ان کی دونوں تصویریں Vigil اور Out Post ایک نئے اسلوب کی حامل ہیں۔

کچھ اور اچھی تصاویر ڈنکر کوشک کی "سمندر کا نوجوان" کے۔ جی سبرامنیم کی Studio Still Life اور ایم۔ ایف حسین کی "گھوڑا" ہیں۔ حسین کے لئے گھوڑا ہمیشہ ایک دلچسپ موضوع رہا ہے اور ان کی بیشتر تصاویر اسی عنوان سے بہت پہلے منظر عام پر آ چکی ہیں۔ موجودہ تصویر پہلی تصاویر سے مختلف ہے۔ ڈونگرے کی تصویر "سفید گھوڑا" اور پروسل کی تصویر "مدراس کی گلی" میں پرانے وقتوں کے ماحول کی عکاسی کی گئی ہے اور خوب صورت خطوط کے ذریعہ حقیقت پسندی کا اظہار کیا گیا ہے۔

این۔ ایس بیندرے کی تصویر "مٹیالا اور نیلا" اور "گہرائی" نہایت دلچسپ نمونے ہیں۔ بیرن ڈے ایک مشہور مصور ہیں۔ ان کی دونوں تصاویر "تصویر نمبر ۱" اور "تصویر نمبر ۲" فن کے تدریجی ارتقاء کی نشاندہی کرتی ہیں اور ڈے کے فن کی ترجمانی بھی۔ پدمسی کی تصویر "سر" ایک خواب آور مرقع ہے۔ سلطان علی کی دونوں تصاویر "جھونپڑیاں" اور "کشتیاں اور مکان" میں بے شمار رنگوں کے استعمال کی وجہ سے نقاشی کا تاثر پیدا ہو گیا ہے۔ ان تصاویر میں دلکشی ضرور ہے لیکن موضوع کی گہرائی کم ہے۔ غلام رسول سنتوش کی تصویر "ایک افریقی سنگ تراش کی یاد" اچھی تصویر ہے جس میں فن کار کا انفرادی تاثر غالب ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ تصویر دوسری کئی تصاویر سے مختلف ہے۔ متو سوامی کی تصویر Symphony in gold میں رنگوں کی آمیزش سے ایک خوش نما منظر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں روایتی طرز کے بجائے جدید طرز سے کام لیا گیا ہے۔ نارائن کنز لیکر کا مرقع "خاموش زندگی" بھی خوب صورت ہے۔

گرافک تصویروں میں سو مناتھ ہور کی انعام یافتہ تصویر اوشا بسربہ کی تصویریں "خواب" اور "کارواں" اور کرشنا ریڈی کی تصویریں "مکڑی کا جال" اور "موج" قابل ذکر ہیں۔ یہ چاروں تصویریں کھدائی کے فن کی ترجمان ہیں جن میں رنگوں کا موزوں استعمال بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ خصوصاً ریڈی کی دونوں تصاویر نے بہت داد حاصل کی ہے۔ کچھ مہمان آرٹسٹوں کے شاہکار بھی نمائش کی زینت بنے۔ ان میں ٹھاکر سنگھ کی تصویر "موسم برشگال میں غروب آفتاب" ستیش سنہا کی "ماں اور بچہ" اور ہیبر کی 'Nemesis' قابل توجہ تصاویر ہیں۔

سیمنٹ، پتھر، پلاسٹر، لکڑی، سنگ مرمر، لوہے اور دھات کے گھڑے ہوئے شاہکار بھی اس نمائش میں رکھے گئے تھے۔ ایس ایس دومرا کے شاہکار "بنسی بجا" کو انعام دیا گیا۔ اس میں انسانی جسم کی بناوٹ کو کنکر و سیمنٹ کی آمیزش سے پیش کیا گیا ہے۔ دائیں طرف ایک کھوکھلا پن سا دکھائی دیتا ہے جس سے موضوع میں ایک لطافت پیدا ہو گئی ہے۔ ویسے بناوٹ کے اعتبار سے یہ تراشا ہوا نمونہ بھی نیم تدریجی طرز کا حامل ہے۔ اس کی بناوٹ عمودی ہے لیکن بنسی کی ایک سیدھی لائن نے موضوع میں معنویت پیدا کر دی ہے اور یہی معنویت اس شاہکار کی جان ہے۔ اتنی سادگی میں اتنی معنویت بھر دینا آرٹسٹ کے لئے باعث امتیاز ہے۔

اس سلسلے کے دوسرے شاہکاروں میں دھن راج بھگت کا 'Cosmic Man' ایک لاجواب چیز ہے۔ اسے پلاسٹر اور لوہے سے بنایا گیا ہے۔ موضوع نہایت جدید اور علامتی ہے جس میں بھگت کی

برسوں کی محنت کو بڑا دخل ہے۔ یہ شاہکار طبعی طرز کا ہے اور نمائش کے دوسرے شاہکاروں سے ممتاز ہے۔ اسی طرح ڈیوبری والا کی 'Standing Figure' لوہے کی مدد سے بنائی گئی ہے۔ سادگی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ مصوری کی طرح کھدائی کے ان نمونوں میں مختلف موضوعات نہیں پائے جاتے۔ اسی لئے بہت سے شاہکار کم و بیش ایک جیسے موضوع کے حامل ہیں۔

نمائش کا ایک مجموعی تاثر یہ ہے کہ تدریجی آرٹ دیگر آرٹ پر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ دوسرے آج کل Figure ڈرائینگ کو مصوری میں ایک دوسرا درجہ دیا جا رہا ہے۔ اس سے ایک نقصان کا احتمال بھی ہے کہ اس طرح سے اگر فگر ڈرائنگ کو نصاب تعلیم ہی تک محدود رکھا گیا اور اسے فن مصوری کی بنیاد نہ تصور کیا گیا تو کم درجے کی تصویریں اعلیٰ فنی نمونوں کی ہمسری کرنے لگیں گی۔ اور یہ بات کچھ خوش آیند نہ ہوگی۔ خطوں اور لائنوں کی مہارت مصوری میں تکنیک سے زیادہ بلند درجہ رکھتی ہے اور یہ اس کا حق ہے۔

افقر موہانی

آزمائش

چمن افسردہ ہے، اہلِ چمن کی آزمائش ہے
وہ وقت آیا کہ اب حُبِّ وطن کی آزمائش ہے

بہاریں، پھول، کلیاں سب پریشاں کہئے کس کس کو
فقط گُل ہی نہیں، سارے چمن کی آزمائش ہے

نہ پوچھیں حالتِ گلشن، یہ دیکھیں دیکھنے والے
کہ میدانِ وغا میں جان و تن کی آزمائش ہے

بھرم کھل جائے گا اب حق و باطل کا زمانے پر
پرستارِ خداؤ اہرمن کی آزمائش ہے

ضرورت ہے کہ ایسے وقت سب اہلِ وطن مل کر
بڑھیں آگے وفا رِ انجمن کی آزمائش ہے

نفاقِ کُفر و دیں کیسا، تضادِ قوم و ملّت کیا
کہ یکساں آج شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

وطن ہے ایک، ہم تم ایک، جذبہ ایک، مقصد ایک
یہاں تو غیرتِ حُبِّ وطن کی آزمائش ہے

متاعِ جان و دل صدقے، تصدق مال و زر کر دیں
وطن والوں سے معیارِ وطن کی آزمائش ہے

ہٹا دیں چینیوں کو سرحدِ ہندوستاں سے ہم
ہمارے پنجۂ آہن شکن کی آزمائش ہے

مٹا دیں دشمنوں کے ہر مقامِ نقشِ باطل کو
دکھا دیں ہمّتِ مرداں، یہ رَن کی آزمائش ہے

دکھائیں جوہرِ تیغِ سخن اب ہند کے شاعر
سرِ بزمِ سخن اہلِ سخن کی آزمائش ہے

یہ مصرع حضرتِ غالب کا حسبِ حال ہے افقر
'جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے'

چین، پاکستان اور ہم

(وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی ایک تقریر کا ملخص)

آپ جانتے ہیں کہ یکایک دو جگہ چین کا حملہ ہوا۔ ایک تو نیفا کی طرف پورب میں اور دوسرا لداخ میں۔ اکثر پوچھا جاتا ہے کہ چین نے ہندوستان پر حملہ کیوں کیا! اس کا جواب دینا مشکل نہیں۔ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ تھوڑی سی زمین لینے کے لئے چین نے حملہ کیا۔ یہ بات نہیں۔ دراصل ان کو ناگوار تھا کہ ہندوستان دوسرے راستے پر کیوں چل رہا ہے، اور ان کی سرپرستی کیوں نہیں منظور کر لیتا اور ان کے خیال میں اس سے ایشیا کے دوسرے ملکوں پر بُرا اثر پڑ رہا تھا۔ لمبائی چوڑائی میں چین ہندوستان سے دُگنا بلکہ شاید ڈھائی گنا ہے اور آبادی کے لحاظ سے بھی کوئی ڈیڑھ گنا۔ چین کو یہ بھی ناگوار گزرا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ جب جب چین بڑھا اور طاقت ور ہوا۔ اس نے پھیلنے آس پاس کے ملکوں کو دبانے اور انھیں اپنے دائرے میں لانے کی کوشش کی۔ ہندوستان ذرا بڑا ملک تھا اور دنیا میں، ایشیا اور افریقہ میں کچھ اثر بھی رکھتا تھا۔ اسی لئے شاید انھوں نے سوچا کہ اس کانٹے کو ہٹانا چاہیئے، اس کے اثر کو ختم کر دینا چاہیئے۔ اور اسی لئے وہ کوئی ایسی بات کرنا چاہتے تھے جس سے دوسرے ملک یہ سمجھ جائیں کہ ایشیا میں چین کے سوا کوئی دوسرا ملک حاوی نہیں ہو سکتا۔ ہماری کوئی خواہش نہ تھی کہ ہم ایشیا پہ حاوی ہوں۔ ہم اپنے ملک میں اپنا کام کرنا چاہتے ہیں اور جس طرح مناسب سمجھیں ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں ہم دخل دینا نہیں چاہتے، ہاں سب سے دوستی رکھنا چاہتے ہیں۔

ایک اور بات بھی ہے جو انھیں بہت ناگوار گزر رہی تھی، وہ یہ کہ روس ہندوستان کی مدد کیوں کر رہا ہے! مدد سے مطلب ہے، ہندوستان کی اقتصادی مدد!! چین والے چاہتے تھے کہ روس کی ساری امداد اسی کے حصہ میں آئے۔ روس نے چین کی بہت مدد کی، سینکڑوں ہزاروں بڑے بڑے کارخانے اس کی مدد سے وہاں قائم ہوئے۔ پچھلے کوئی تین برس سے روس اور چین میں اصولی نااتفاقی ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس سے جو امداد اسے مل رہی تھی وہ زیادہ تر بند ہو گئی۔ اس سے ان کا نقصان ہوا۔ یہ بات بھی چین کو ناگوار گزری کہ روس ہماری تو مدد نہیں کرتا اور ہندوستان کی مدد جاری ہے۔ حالانکہ یہ امداد ان کے مقابلے میں کم ہے۔ لیکن پھر بھی وہ روس پر دباؤ ڈالنا چاہتے تھے کہ ان کی یہ پالیسی غلط ہے یعنی ہندوستان جیسے بڑے ملک کی مدد کرنا، جو اُن کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ ہم تو کسی گروہ میں شریک نہیں — ہماری دوستی روس سے بھی ہے اور امریکہ سے بھی۔ یہ اصولی بات ہے۔ چین کی رائے میں پورے طور سے دنیا میں امن اس وقت قائم ہو سکتا ہے جبکہ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی جیت ہو جائے۔ روس والے کہتے ہیں کہ دنیا میں، مختلف ملک ہیں، ہمیں ان سے نبھانا ہے اور رائے

کے اختلاف کے باوجود آپس میں دوستی رہنی چاہیئے۔

چین سمجھتا تھا کہ اس حملے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان ڈر جائے گا، گھبرا جائے گا لیکن ہندوستان پر اس کا اچھا اثر پڑا۔ ہمارے آپس کے جھگڑے بالکل ختم ہو گئے۔ ایک بڑا خطرہ ملک کے سامنے آیا تو سب لوگوں نے اس کو محسوس کیا۔ مدراس سے لے کر لدّاخ تک لوگوں میں جوش و خروش پھیل گیا۔ انھوں نے طے کیا کہ چین کا مقابلہ کرنا ہے اپنے ملک کو بچانا ہے۔

واقعات نے ظاہر کر دیا کہ چینی حملہ کوئی ایک حملہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا خطرہ ہے جو ہر وقت لگا رہے گا، کیونکہ چین کے تبت سے ہماری سرحدیں ڈھائی ہزار میل تک ملتی ہیں، ہمیں اس کا مقابلہ کرنا ہے، ہمیں اس کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ جو ملک پوری طرح سے اپنی آزادی کی حفاظت نہیں کر سکتا اس کی آزادی بہت دن قائم نہیں رہ سکتی۔

ایشیا اور افریقہ کے کچھ ملک بیچ بچاؤ کے لئے میدان میں آئے، ہم نے کہا کہ ہمیں لڑائی پسند نہیں لیکن، عارضی سمجھوتہ بھی تب ہی ہو سکتا ہے جبکہ وہ ہماری سرزمین سے ہٹ جائیں۔ کولمبو ملکوں نے جو باتیں کیں، کافی غور و خوض کے بعد ہم نے انھیں منظور کر لیا۔ چین نے پورے طور سے ان کی سفارشیں قبول نہیں کیں۔

یاد رکھئے کہ پاکستان چین کا بڑا مخالف تھا، وہ اس گروہ میں شامل تھا جو چین کے بالکل خلاف ہے۔ چین کمیونسٹ ملک سمجھا جاتا ہے اور پاکستان سے سمجھوتہ کیا تھا امریکہ وغیرہ نے۔ یکایک پاکستان کو چین سے عجیب محبّت ہو گئی، اس سے ایک سمجھوتہ کیا اور جمّوں و کشمیر کا ایک بڑا مقبوضہ حصہ ان کی نذر کر دیا۔ پھر یہی نہیں ہر طرح سے چین سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ساری دنیا کو اس پر حیرت ہوئی۔ انھوں نے سوچا اس وقت ہندوستان پر چین حملہ کر رہا ہے، ہندوستان ذرا پریشان ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے کا اچھا موقع ہے۔ خاص طور سے کشمیر کے معاملے میں وہ سمجھتے تھے کہ ایسا موقع شاید پھر ہاتھ نہ آئے۔

ہم ہزار بار کہہ چکے ہیں کہ آپ ناحق گھبراتے ہیں، ہم آپ کا بھلا چاہتے ہیں۔ آپ ترقّی کریں، یہ ہمارے لئے بھی اچھا ہے۔ ہمارا آپ کا ہزاروں سال کا رشتہ ہے۔ ہمارا ملک ایک تھا جس کے دو ٹکڑے ہو گئے ہیں، ہم نے اس کو مان لیا، ہم اس میں کوئی خلل نہیں ڈالنا چاہتے، مگر آپس میں رشتے تو ہونے چاہئیں۔

ہم نے بار بار ان سے کہا کہ ہم آپ یہ طے کر لیں کہ کسی بھی صورت سے ہم میں فوجی لڑائی نہیں ہوگی۔ لیکن انھوں نے منظور نہیں کیا۔ میں ان سے تقریباً دس برس سے یہی کہہ رہا ہوں مگر وہ نہیں مانتے اور یہی کہے جاتے ہیں کہ ہندوستان ہم پر حملہ کرے گا۔ یہ بھی عجیب بات ہے۔

چین کے حملہ کی وجہ سے ہندوستان پریشان ہے، اس لئے اس وقت کشمیر کا سوال پھر سے اٹھانے کا خاص موقعہ ہے۔ خیر انھوں نے حملہ تو نہیں کیا مگر اور طرح سے اس سوال کو اٹھایا۔ اس موقع پر امریکہ اور ولایت کے لوگوں نے دوڑ دھوپ کی اور کہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنا چاہیئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم صرف کشمیر پر بات چیت کریں گے۔ آخر میں بحث کے بعد یہ طے ہوا کہ کشمیر کے علاوہ اور باتوں پر بھی بات چیت ہوگی۔ چنانچہ بات چیت ہوئی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ہاں ایک فائدہ یہ ہوا کہ کشمیر کے معاملے کے ہر پہلو پر بحث ہوئی اور ہم نے ان کو اپنی رائے بتائی، انھوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ان کی طرف سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ سمجھتے ہیں کہ قسمت سے انھیں خاص موقعہ ملا ہے۔ وہ اس غلط فہمی میں تھے کہ ہندوستان اب کمزور ملک ہے، ان کی دھمکی میں آ جائے گا۔ چین بڑا اور طاقت ور ملک ہے۔ ہم اس کی دھمکی میں نہیں آئے اگر پاکستان بھی ان کے ساتھ مل جائے تب بھی ہم ان کی دھمکیوں میں نہیں آئیں گے۔ ہاں، ہم دوستی کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان سے تو ہم اور بھی دوستی کے خواہاں ہیں اور یقیناً کبھی نہ کبھی دوستی ہو کر رہے گی۔

بات چیت میں ہم نے یہ صاف کر دیا تھا کہ کشمیر کی وادی کے ٹکڑے نہیں ہو سکتے اور کشمیر کو بین اقوامی نگرانی میں نہیں دیا جا سکتا۔ پاکستان جو باتیں کہتا ہے اور وہ بھی دھمکی کے ساتھ۔ ان باتوں پر عمل کرنا ناممکن ہے۔

ہم دنیا میں امن چاہتے ہیں اور اس بات کے کوشاں ہیں کہ دنیا میں ایٹم بم کی لڑائی نہ ہو۔ اس سے دنیا تباہ ہو جائے گی۔ ہم کسی سے لڑنا نہیں چاہتے لیکن اگر کوئی ہم پر حملہ کرے تو ہم چپ نہیں رہ سکتے۔

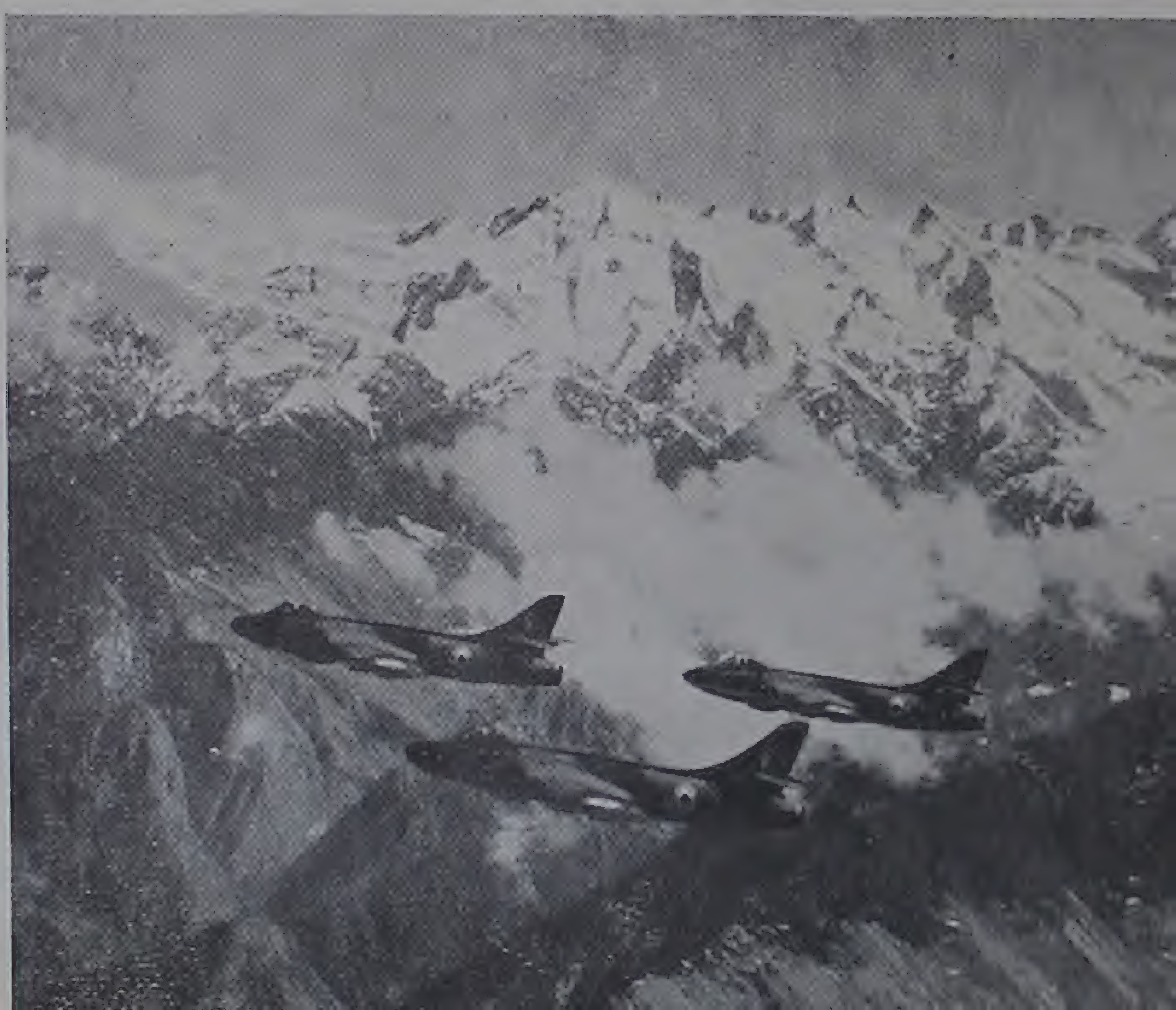


ہوائی فوج کا ہیلی کوپٹر لیہہ (لداخ) ہیں



ہوائی جہاز سے اُتر کر جوان مارچ کر رہے ہیں

ائیر فورس کے ہنٹر ہوائی جہاز ہمالیہ کی چوٹیوں پر پرواز کر رہے ہیں۔



آرٹ کی قومی نمائش

(متعلقہ مضمون صفحہ ۵ پر ملاحظہ فرمائیں)



"بنسی بجیا" (کنکریٹ)
ایس۔ ایس دوہرا



— (ایم ایف حسین)



مرقع عا — (بیرین ڈے)



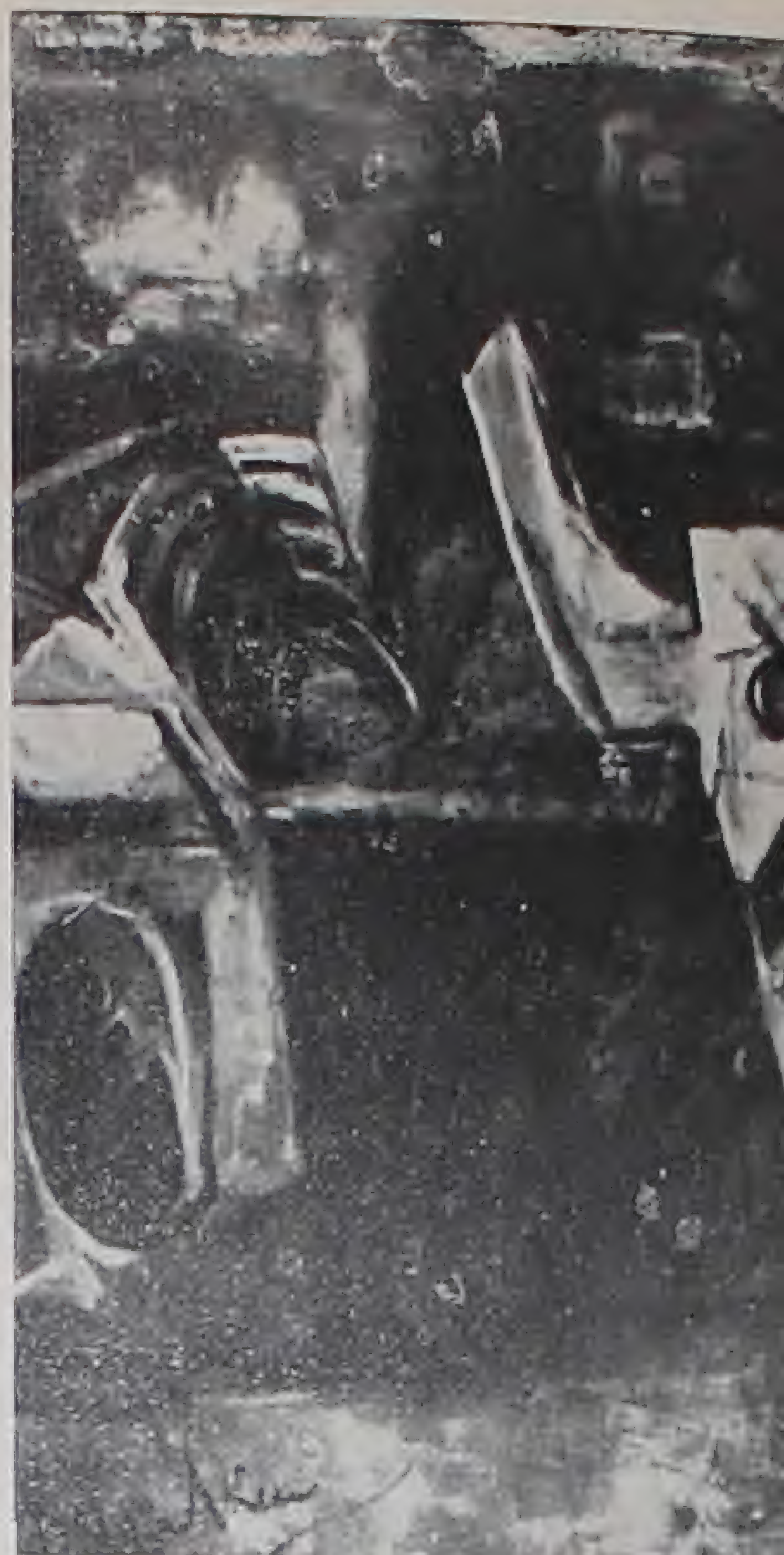


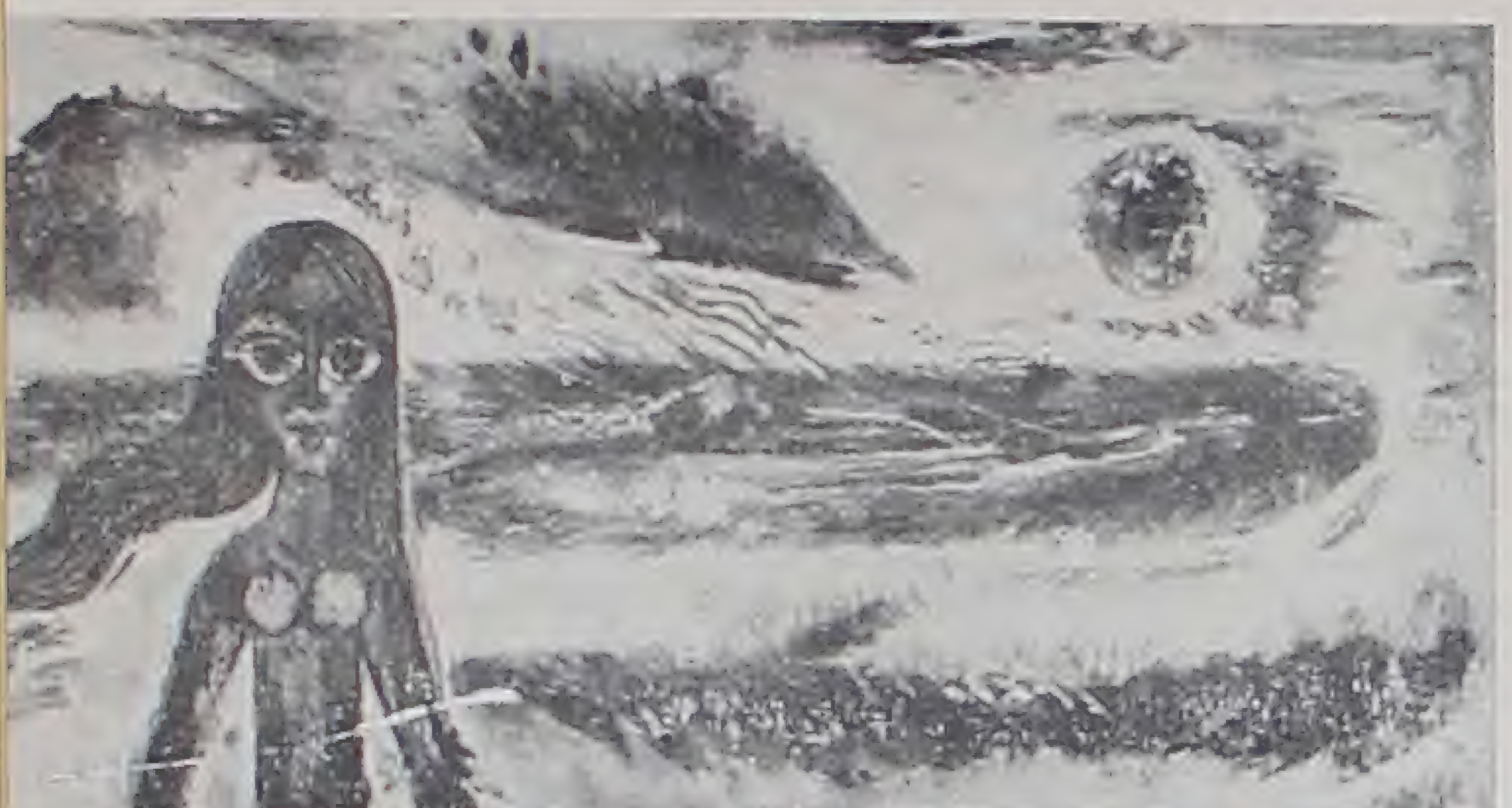


"خاموش کھڑکیاں" — (بیراجی ساگرا)



— (کے. ایس کلکرنی)





"گرہن" — (لکشمن پائی)

"چاند" — (جیوتش بھٹاچاریہ)

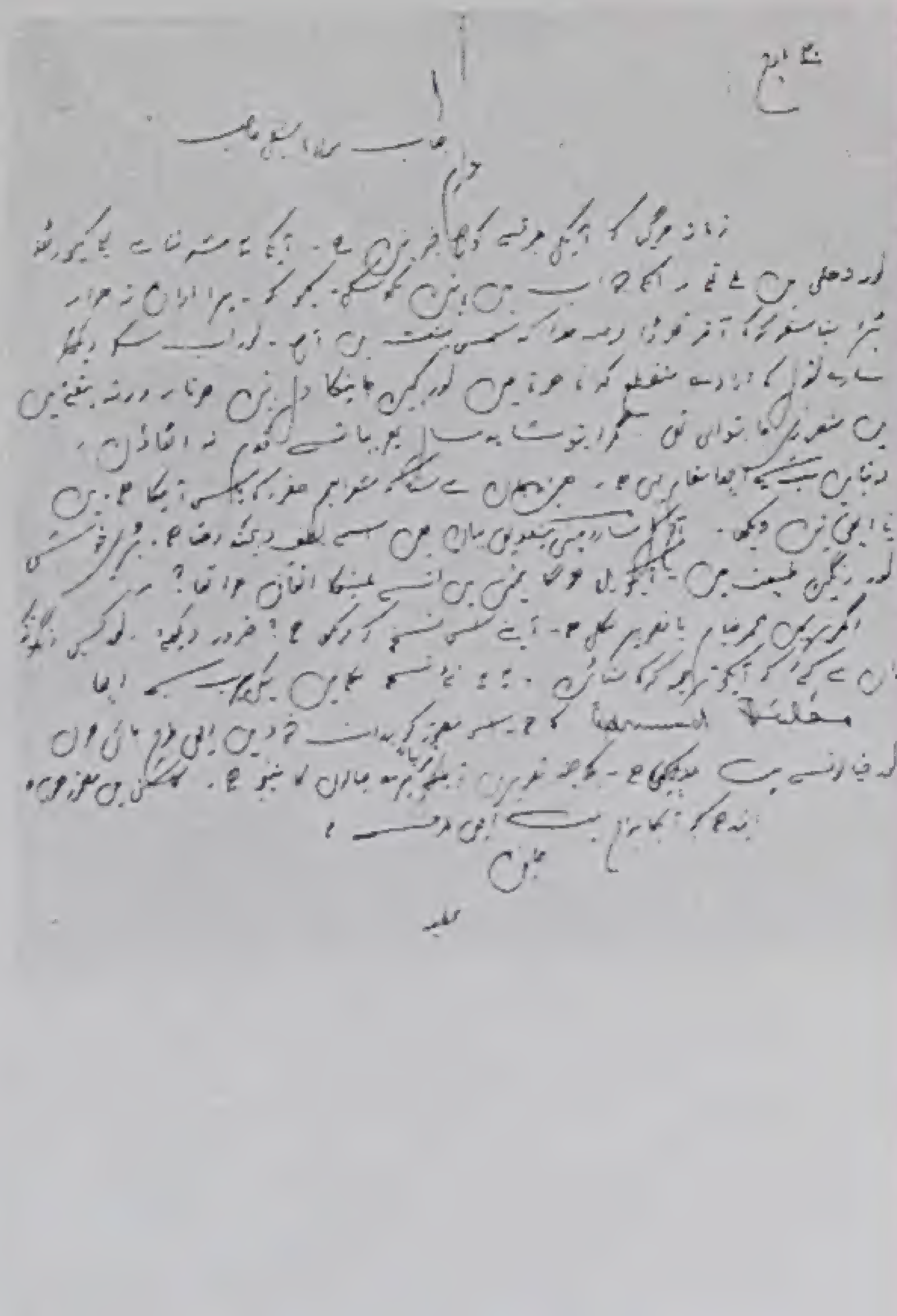
"آوٹ پوسٹ" — (ستیش گجرال)

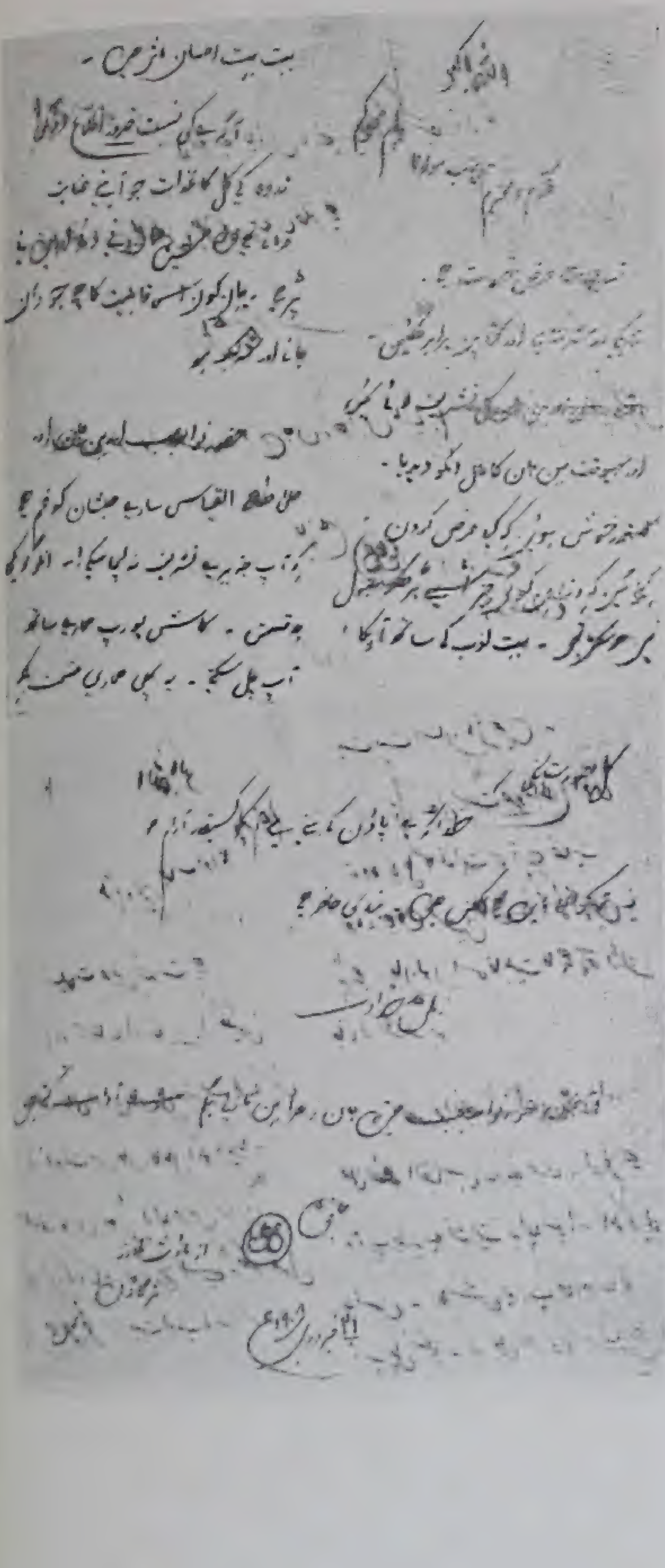




عطیہ کے خطوط موسومہ شبلی

(متعلقہ مضمون صفحہ ۷۴ پر درج ہے)





عطیہ کے خطوط موسومہ شبلی

'خطوطِ شبلی' سے اردو خطوط نویسی کی تاریخ میں یقیناً ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ ادبی اور جمالیاتی انداز نظر سے ہٹ کر انھوں نے ایک نیا روپ اختیار کر لیا ہے اور شبلی کی ذات خود معرضِ بحث میں آ گئی ہے۔ یہ خطوط جو ایک تعلیم یافتہ ترقی پسند اور دولت و جاہ کے اعتبار سے مشہور خاندان کی خواتین کو لکھے گئے، اس اعتبار سے بھی دلچسپ ہیں کہ ان سے شبلی کی زندگی کا ایک ایسا رُخ کھل کر سامنے آتا ہے جو انھیں سمجھنے اور ان کی نفسیاتی اور ذہنی ساخت کو پرکھنے میں کافی مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ ان خطوں میں شبلی نے اپنے بے ریا اور مخلص دل کی تمناؤں کو برملا زبان دے دی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ شبلی مزاجاً اور طبعاً ایک 'فن کار' تھے۔ حالات اور زمانے نے ان سے اور بہت سے گراں مایہ کام بھی لیے۔ لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ وہ جس خمیر سے اٹھائے گئے تھے وہ آرٹ اور شاعری کا خمیر تھا۔ مولانا کی اصل جولانگاہ یہی تھی۔ اگر حالات 'سازگار' ہوتے تو یقیناً اپنے وقت کے 'حافظ' ہوتے۔ لیکن زمانے کی روش اور حالات کی ناسازگاری انھیں دوسری طرف لے گئی اور اس میں شبہ نہیں کہ قومی اور ملی کاموں کو انھوں نے اپنے دل کی آواز پر ترجیح دی۔ ان کی زندگی کا سارا تضاد اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر سمجھ میں آ سکتا ہے۔

یہ بھی اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے اور تکلیف دہ حقیقت کہ ان کے جانشینوں نے ان کی زندگی کے صحیح خد و خال کو پیش کرنے سے دیدہ و دانستہ طور پر گریز کیا ہے اور ان خطوط و واقعات کو بڑھا چڑھا کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جن سے ان کی دانست میں شبلی پر دور کی بھی زد پڑ سکتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ شبلی نہ مقدس علمائے دین میں سے تھے اور نہ پاکباز صوفی صافی۔ اس کو مصنف 'حیاتِ شبلی' نے بھی تسلیم کیا ہے کہ ان میں 'مذہبیت یا روحانیت' کی کمی تھی۔ اور اگر ڈاکٹر ذاکر مرحوم کے بیان کو بھی صحیح مانا جائے تو پابندی کے ساتھ جمعہ کی نماز بھی ادا نہ کرتے تھے۔ [1] ان حالات میں اہلِ ظاہر اور کٹر مولویوں کا ان سے کدر رکھنا اور ان پر الزام تراشنا کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ شبلی کو بھی اس کا احساس تھا، مہدی حسن کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"دونوں میری تصویر غلط کھینچتے ہیں۔ ایک فرشتہ بناتا ہے، ایک دیو۔ لیکن ابھی تک تو میں انسان ہوں...."

(مکاتیب جلد دوم ص ۲۳۳)

ایک دوسری اہم بات یہ ہے کہ شبلی کی خانگی زندگی کے حالات بہت 'خوش گوار' نہ تھے، خوش گوار سے میرا مطلب محض یہ ہے کہ ان کی بیوی یقیناً ان کی مزاج داں نہ تھیں اور شبلی جیسے فن کار کا ساتھ

[1] 'صبا شبلی نمبر' مولانا شبلی کے متعلق چند غیر مطبوعہ اطلاعات

نہ دے سکتی تھیں۔ اس کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں (جو تقریباً ۱۶ سال کا تھا اور ان کی جوانی کا زمانہ تھا) وہ کبھی اپنی بیوی کو اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے ہوں۔ پہلی بیوی کے انتقال کے پانچ سال بعد انھوں نے دوسری شادی کی۔ دوسری بیوی سے متعلق اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں

"تم جانتے ہو کہ حسنِ صورت کی نوبت ہو چکی۔ میری قسمت میں دونوں کا اجتماع نہ تھا۔ اب کوئی چیز مایۂ تسکین ہو سکتی ہے تو صرف حسنِ سیرت ہے، اس کے لئے سب سے مقدم تعلیم ہے"

(مکاتیب حصہ اوّل ص ۱۰۴)

یہ ایک کھلا ہوا اشارہ ہے اپنی حسرتوں کی طرف، عطیہ اور زہرا فیضی سے تعلقات اس کے چند سال بعد پیدا ہوتے ہیں، ہو سکتا ہے، مولانا شبلی کو اپنی نارسیدہ تمنّاؤں اور حسرتوں کے شمار کا اچھا موقع مل گیا ہو، بہرکیف یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ بنا ہوا ہے، میں یہاں اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا، اس لئے کہ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ابھی حال ہی میں نصیر الدین ہاشمی صاحب کا مضمون "علاّمہ شبلی کی رنگین زندگی" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس کے آخر میں موصوف لکھتے ہیں:

"عورت کے اصل خیالات، محسوسات اس وقت اُجاگر ہوتے ہیں جب کہ اس کے اپنے خطوط جو کسی مرد کے نام لکھے گئے ہوں وہ ہمدست ہو جائیں۔ یہاں ہم کو شبلی کے خطوط موسومہ عطیہ بیگم تو مل جاتے ہیں مگر عطیہ بیگم کے لکھے ہوئے خطوط نہیں ملتے۔ جب تک شبلی کے خطوط کے ساتھ عطیہ بیگم کے لکھے ہوئے خطوط سامنے نہ آئیں اس وقت تک صرف شبلی کو نشانِ ملامت بنانا صحیح نہیں ہے۔ اگر عطیہ بیگم کے لکھے ہوئے خطوط مل جاتے تو صحیح فیصلہ ہو سکتا، ان کے بغیر علاّمہ شبلی پر ملامت کا فیصلہ صادر کرنا صحیح اور حق بجانب نہیں ہے بلکہ میرے خیال میں عطیہ بیگم بھی اس میں برابر کی شریک ثابت ہوتی ہیں۔"

(ادیب مارچ ۶۲ء)

اتفاق سے مجھے شبلی کی ذاتی ڈائری سے عطیہ بیگم کے لکھے ہوئے چند خطوط مل گئے ہیں۔ میں انھیں اربابِ ذوق کی تسکین کے لئے ذیل میں درج کرتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید اس سے کچھ نئے نتائج کا استنباط ہو سکے۔

ایک بات اور کہہ دوں جو شاید یہاں بے موقع بھی نہ ہو کہ تحقیق و تلاش کے میدان میں اترنے سے پہلے ہمارا فرض ہونا چاہیئے کہ ہم معمولی اور ذاتی پسند و ناپسند کے پیمانوں سے بلند ہو جائیں۔ یہاں شبلی یا عطیہ کسی کو بھی نشانِ ملامت بنانا مقصود نہیں بلکہ حقائق کے چہرے سے پردہ اٹھانے کی ایک حقیر سی کوشش ہے۔

خطوطِ عطیہ

(۱)

اللہ اکبر

مکرم و محترم جناب مولانا دام مجدکم

تسلیمات عرض خدمت ہے۔ آپ کے دو مشرف نامے اور کتابیں برابر مل گئیں۔ حضور عالی اور بہن جان کل تشریف لائے بمبئی اور اسی وقت بہن جان کا مال ان کو دے دیا۔ اس قدر خوش ہوئیں کہ کیا عرض کروں۔ کہنے لگیں کہ دنیا میں کوئی چیز اس سے بڑھ کر مقبول نہیں ہو سکتی تھی، بہت ادب کے ساتھ آپ کا بہت بہت احسان مانتی ہیں۔

آگرے کی نسبت ضرور اطلاع دوں گی۔ ندوہ کے کل کاغذات جو آپ نے عنایت فرمائے تھے وہ ہمشیرہ جان نے دیئے اور میں نے پڑھے۔ یہاں کون اس قابلیت کا ہے جو وہاں جائے اور شریک ہو۔ حضور نواب صاحب اور بہن جان اور علیٰ ہذا القیاس سارے حبشان[1] کو غم ہے کہ آپ جزیرے تشریف نہ لے جا سکے! ان لوگوں کی بدقسمتی۔ کاش یورپ ہمارے ساتھ آپ چل سکتے۔ یہ بھی ہماری قسمت بلکہ کل ہندوستان کی۔

خدا کرے پاؤں کے بننے سے آپ کو کسی قدر آرام ہو۔ آپ کو چند باتیں مجھے لکھنی ہیں۔ بندی حاضر ہے۔

زیادہ حدِ ادب

(بمبئی ۲۷ جون ۱۹۰۶ء)

---

[1] جزیرہ شبلی لکھتے ہیں جزیرہ یا حبشان کا نام شعر میں آ سکتا ہے (انجم ۱۹ اگست ۱۹۰۶ء)

شاد عارفی

جہیز

گزرنے والی برات پر جائزے کا اقدام کر رہا ہوں
وہ کہہ رہا ہوں جو جشنِ رسم و رواج میں ہے بڑی حماقت
جہاں جہاں بھی غلط کہوں میں سماج میری زباں پکڑ لے

وطن کی تقلیدِ صرفِ بے جا پہ نقد کا کام کر رہا ہوں
بڑی حماقت کا دوسرا رُخ، بڑی جسارت، بڑی بغاوت
نہ یہ کہ پنچائتیں بٹھائے نہ یہ کہ پائے قلم جکڑ لے

یہ بینڈ باجا کہ جس کا مقصد ہے 'شادمانی کا بول بالا'
وہ بول بالا کہ جس میں پِٹتا رہا ہے نوشاہ کا دوالہ

"غلیظ کپڑوں میں دق کے مارے"... یہ پھول باڑی[1] اُٹھانے والے
یہ کاغذی گلستاں، جو سرِ وِرداں کے مانند چل رہا ہے

غموں کی زردی کی وجہ سے جن کے رنگ "گورے رہے نہ کالے"
مُسرّتوں کے ایاغِ رنگیں میں جرمِ اسراف ڈھل رہا ہے

عروس کے ہاں سوالِ عزت بڑا کٹھن ہے، بہت اہم ہے
چنانچہ یہ آٹھ چائے کے سیٹ، یہ چار قہوے کے دو دو ڈنر کے
سہریاں دنل، پلنگ بارہ[2]، یہ بید کے کوچ ہیں وہ صوفے
بھرت کے پایوں کا وہ چھپرکھٹ کہ جس سے شرمائیں "پیل پائے"
"نثار کرنا" ٹرے میں رکھے ہوئے گلاسوں کا "غیر ممکن"
وہ خوان پوشوں میں "حشر ساماں[5]" نگاہ جس تک پہنچ نہ پائے
ظروفِ نقرئی بھی ایک "بھنگی" ہیں جس سے الماریاں سجیں گی
یہ دیگ، یہ دیگچے، پتیلے، پتیلیاں، بادیے، پیالے
کھڑونچیوں، ٹلکنوں کا وہ کارواں کہ طوفان جس کو کہئے
نمازی چوکیوں پہ بھدا کمنگرئی[8] رنگ "گلفشاں" ہے

دُلھن کے ڈولے کے آگے آگے جہیز جتنا بھی ہو، وہ کم ہے
یہ اِن میں میلے سے مِل گئے ہیں، اُفر و ربرتے ہوئے ہیں گھر کے
سنگھار میزیں جو تین، تیرہ برائے "ایٹ ہوم اور بوفے"
نہ آئیں جب تک محلّے والے، یہ کس میں طاقت اُسے ہلائے
جگوں[3] مگوں[4] کی قطار، جگ مگ، اُگالدانوں کا روپ بھن بھن[6]
تماش بینوں کی یہ تمنّا، کہیں سے گھونگھٹ ہوا اُڑائے
جہاں بھی ٹھہرے، جہاں بھی گزرے گی داد کی تالیاں بجیں گی
یہ آفتابے، یہ سینیاں، یہ لگن، یہ لوٹے نقوشش[7] والے
جو ہو "لکڑ ہٹ" میں کچھ قباحت تو پھر "لکڑ سان" اس کو کہئے
جو اک "اقامت" کا منتظر ہے جو چند سجدوں کا میہماں ہے

وطن کے "جہلِ خرد نما" کے خلاف اقدام کر رہا ہوں
سماج کے عیب گن رہا ہوں، رواج پر کام کر رہا ہوں

---

[1] پھول باڑی [2] ۔۔ [3] Jug [4] Mug [5] قسم [6] ڈھکی چھپی چیزیں [7] منقش [8] کچا اور خراب رنگ جس میں پھول زیادہ ہوتے ہیں۔

سیّد عبدالمالک

(آسامی کہانی)

ایک خبر

سوُرگ زمین کے نیچے دب گیا تھا۔

راون کی سونے کی لنکا میں سونا نہیں ہے، مٹی بھری ہے۔ سونے کی پہچان کے بعد زمین کے پیٹ سے بہت سا سونا کھود لیا گیا ہے اور اس میں سے کتنا ہی سونا پھر زمین کے اندر غائب ہو گیا ہے۔

زمین غریب نہیں ہوتی ہے۔ سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات سے زمین کبھی امیر نہیں ہوتی ہے اور نہ اس کے نہ ہونے سے کبھی زمین غریب ہوئی۔

اس دن جو ہوائی جہاز گر کر چوُر چوُر ہو گیا تھا اس کی قیمت کوئی ایک لاکھ ہوگی۔ مگر ایسے سبھی ہوائی جہاز گر گر کر چوُر چوُر ہو جانے پر بھی زمین غریب نہیں ہوگی۔

ساتھ میں میرا بایاں ہاتھ بھی چلا گیا مگر مجھے اس کے لئے زیادہ افسوس نہیں ہو رہا ہے۔ دایاں ہاتھ ابھی موجود ہے اور سر جو بچ گیا اس کے لئے پروردگار کا شکر ادا کرنے کے لئے مجھے بہت سا وقت مل جائے گا۔

ڈاکٹر بڑا رحم دل معلوم ہوتا ہے۔ میری زندگی کی کوئی امید نہ تھی۔ ہو سکتا ہے ڈاکٹر کی مہربانی سے ہی میں نہیں مرا یا میرے بچے رہنے کی وجہ سے ہی ڈاکٹر میرے لئے اتنی کوشش کر رہا ہے۔ مجھ سے اتنا پیار دکھا رہا ہے۔ مگر اس کے لئے میں ڈاکٹر کی منہ سے تعریف کر دینے پر بھی اپنی دلی احسان مندی کا اظہار نہیں کر سکا۔ بچ جانا مجھے بہت اچھا تو نہیں لگ رہا بلکہ بہت ہی پریشانی ہو رہی ہے۔

سر اور بائیں ہاتھ کا بینڈیج ابھی کھلا نہیں۔ اور اگر کسی دوسری جگہ پر بھی بینڈیج باندھا گیا ہو تو مجھے معلوم نہیں۔

ڈاکٹر نے غور و فکر کرنے کو منع کیا ہے۔ ڈاکٹر کی تلقین سے کبھی کسی کی فکر دوُر ہوتی ہے۔ میں نہیں جانتا، میں نہیں سوچتا۔ میں کچھ بھی نہیں سوچتا۔ سر کے ایک حصّہ کو توڑ کر سوچنے کی کوشش کرنا ظلم ہے۔

بند کھڑکی کے صاف شیشوں میں سے دودھ جیسی سفید چاندنی میرے بستر پر پڑ رہی ہے۔ آج ہی بچھائی گئی چادر پر چاندنی کیسی بھلی لگ رہی ہے۔ باہر مل کی طرح نرم و نازک رات کا خوبصورت سماں ہے۔ ایک محبّت بھری حسینہ کے مہکتے بالوں کی لٹوں میں جو نازک حرارت ہے، وہی باہر کی ہی ہنسی کی طرح اس روشن رات کے لمس میں ہے۔ اس روشنی سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں لیکن ڈاکٹر نے مجھے سوچنے کے لئے منع کیا ہے۔ زیادہ سوچنے پر شاید دماغ کی حرکت تیز ہو جانے سے میں مر جاؤں۔

کیا سچ مچ میں مر جاؤں گا!

جزیرہ بالی کی ایک خوبصورت عورت نے ایک دن کہا تھا۔ سمندر کے کنارے کسی باغ میں چاندنی رات میں رقص کی محفل ہوئی تھی۔ بہت ہی خوبصورت عورتیں اور تندرست دوشیزائیں مدہوش ہو کر رقص کر رہی تھیں۔ ان کے جسم کے اوپری حصّے پر کوئی کپڑا نہیں ہوتا۔ جل پریوں کی طرح ان کے نرم و نازک جسم میں جوانی کے ہزار خواب مچل رہے تھے۔ ہمارے خیر مقدم کے لئے ہی وہ ناچتی رہی تھیں۔ ناچ کے آخر میں ایک خوبصورت

دوشیزہ ہنستی ہوئی میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ اس کی ٹھوڑی اور ناک کے نیچے پسینہ کی بوندیں چمک رہی تھیں اور اس کی گردن کے نیچے بھی کئی بوندیں رقص کر رہی تھیں۔

میں نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا تھا — "اس طرح اور کتنے دن ناچوگی؟"

یہ ایک عجیب سوال تھا۔

اس نے رقص کے انداز میں اپنے جسم کو حرکت دے کر جواب میں کہا تھا۔ "جتنے دن زندہ رہوں اور جب تک ناچ سکوں۔"

"اور جب ناچ نہ سکوگی؟"

اس نے بہت اطمینان سے اور ذرا بھی سوچے بغیر کہا —

"تب مر جاؤں گی۔"

ٹھیک ہی بات — مر جاؤں گی۔

مرجانا جیسے ناچ کے بعد ایک پیالہ شربت پینے کے برابر ہے۔

ہاں — اس لڑکی نے کہا تھا کہ وہ مر جائے گی۔

بالی جزیرہ کی ناچنے والی اس خوبصورت لڑکی نے یہی کہا تھا۔

آج مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔ میری زمین آج یکایک غریب ہوگئی۔ کنگال بن گئی۔ باہر کے اندھیرے نے جیسے اس غریبی کی حقیقت کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے۔

مجھ جیسے آدمی کا کام زیادہ نہ سوچنے پر بھی چل جاتا ہے۔ قوت تخیل سے کام لینے پر بھی میں اس حق سے محروم ہوں۔ میرے لئے ہر دن زیادہ دلچسپ اور پُراسرار ہے۔ اس لئے میں حقیقت کی تلاش میں گھومتا پھرتا ہوں۔ زمین کے کونے کونے میں — میں ایک نامہ نگار جو ٹھہرا!

زمین کے پیٹ سے خبریں جو لیتی ہیں۔ ان کو چھانٹ کر دنیا میں نشر کرنے کے لئے میں نیوز ایجنسی کو بھیج دیتا ہوں۔ اس کے ذریعے بسر اوقات کرتا ہوں۔ ہمیشہ عجیب و غریب خبریں مہیا کر کے دنیا کی تیز رفتاری کی نشان دہی کرتا ہوں اور —

اور زندگی کے ایک ایک لمحہ کو برباد کرتا ہوں۔ اور بھی بہت سے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ کوئی زندگی کے قیمتی لمحات کو بیٹھے بیٹھے کھو دیتا ہے۔ کبھی کچھ نہیں کرتا۔ کوئی کام کرتے کرتے زندگی ختم کر دیتا ہے ذرا بھی آرام نہیں کرتا اور اپنی جان دے دیتا ہے۔

یہ زمین بھی عجیب و غریب ہے۔ زندگی بھی عجیب ہے۔ سمندر رقص کرتا ہے اور اس کا کنارا خاموشی کے ساتھ اس کے رقص کو دیکھتا ہے اور سمندر کے رقص کو دیکھتے دیکھتے وہ جوش میں آکر گرتا ہے۔ لیکن سمندر ہنستا ہے اور برابر ہنستا رہتا ہے۔

نامہ نگار کی زندگی تمام تر ہنگامہ۔ سنسنی خیز خبریں بھی ایک آسودگی ہے — خبر — ایجاد — زمین کے کونے کونے میں لگاتار گھومنے میں زندگی کی حرکت کا راز مضمر ہے۔ رفتار کا پجاری آج کا انسان نامہ نگاروں کی قدر و قیمت جانتا ہے۔

اس طرح میں بھی زندہ رہتا ہوں۔ میرا زندہ رہنا کوئی خبر نہیں ہے۔ مینکا بھی تو زندہ تھی۔

زمین کے پیٹ میں مینکا کے زندہ رہنے کی بات کبھی بھی خبر کی صورت میں نشر نہیں ہوئی تھی۔ مینکا کی کہانی اخباروں کے صفحات پر نہ آئی تھی۔ پھر بھی مینکا کے قریب آنے والوں کے معاملے میں اس نے ہزاروں مسائل پیدا کئے۔ مینکا بھی دُور کی ایک ادھ سنی آواز، ایک اندھیری رات کا روشن خواب تھی۔

ڈاکٹر نے منع کیا ہے، سوچنے سے نقصان ہوگا۔ سونے کی کوشش کرنا اچھا ہے۔ میرے کمرے میں کوئی آئینہ نہیں ہے۔ نہیں تو دیکھتا کہ بینڈیج میں رہنے سے میں کیسا دکھائی دیتا ہوں۔

ایسی چٹکی چاندنی کی خوب صورت رات میں کسی ہمت ور لڑکی نے حسینہ بن کر زمین کو سلام کیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اُٹھا سات سمندروں کا گہرا کاجل اور اس کے چھوٹے سے دل کی ڈیوڑھی پر لاکھوں پھاگنوں کی شیرینی سمٹ آئی

پھول کھل گئے۔ زندگی نے ایک انگڑائی لی۔ زندگی کے قدیم خواب نے شیپھالی کے روپ میں خود کو پیش کر دیا۔ مینکا نام کی نئی لڑکی کے تخیل کے روپ میں — زمین کی قسمت جاگ اُٹھی۔ مینکا نے زمین کی متوقع طاقت کو پورا کر دیا۔

ہمت ور اور خوب صورت مینکا! مینکا کی طرح ایک

خوبصورت لڑکی کا جنم اگر نہ ہوا ہوتا تو زمین غریب ہی رہتی۔

زمین مینکا کو دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ نوجوان مینکا کی آنکھوں میں ہزاروں بے نام خواب مچل رہے تھے اور اس کے دل میں ہزاروں اشعار رقصاں۔ اس نے زندگی کی دعائیں لیں مگر یہی سب کچھ نہیں۔ وہ اپنے روپ سے زمین کو دھنی بنائے گی۔

چاندنی رات میں کسی دن کوئی خوبصورت جوان اس کے پاس آئے گا اور اس کے کان میں کوئی راز کی بات کہہ جائے گا۔ وہ شاید سمجھ بھی جائے یا نہ سمجھ پائے۔ روپ کمار سے سوال کرے "تو کیوں آئے۔"

اپنی مسکراہٹ کو دانتوں سے دبا کر شاید اس کی جوانی ہی سوال کا جواب دے گی — "آنا ہی سچ ہے۔ اس کی وجہ نہ تلاش کیجئے۔"

مینکا نے جیسے اس کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا۔

اس کے بعد ایک دن مینکا کی زندگی میں اپنا ہی آدمی آ گیا — ایک خوبصورت سڈول جسم والا نوجوان آنکھوں میں چمک' ہونٹوں پر آرزوئیں اور ہاتھوں میں طاقت — دیکھتے ہی مینکا نے پہچانا اور پہچانتے ہی اس کا دل کھل اٹھا۔

کشمیر کے چنار کے درختوں کے سائے میں ڈل جھیل کے ہرے ہرے پانی میں گلمرگ کے گلابوں اور پھولوں کے درمیان مینکا اور مینکا کے دل کے آدمی نے زندگی کے قدیم سوال کا حل تلاش کیا۔ ممکن ہے اس کے نازک خیالات سے جہلم ندی کے کنارے کے درخت اور پتھر کے اوپر دھوپ کا دھیان لگا کر انتظار کرنے والی برف پگھل گئی ہو۔

ساتھ ہی پگھلے دو نازک دل بھی۔

مینکا کو سب کچھ ملا تھا — بلا کا حسن، غیر معمولی صحت، بہت سا پیار — اور بھرا پرا خاندان۔

ممکن ہے مینکا نے انہیں سے اوپر جانے کے لئے جنم لیا تھا۔ دھن، دولت سکھ دے سکتا ہے، اطمینان نہیں دے سکتا۔ حسن سے غرور پیدا ہو سکتا ہے، تشنگی دور نہیں ہو سکتی۔ اور چاہیئے۔ مینکا کو اور کچھ چاہیئے — مینکا چاہتی ہے کہ دنیا کی آنکھوں میں اس کے غیر معمولی حسن کی توقیر ہو۔ اس کا مذاق غیروں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آئے۔ اس طرح وہ دنیا بھر میں مقبول ہو جائے۔

یہ ضرور ہی میری آرزوئیں ہیں۔ ممکن ہے مینکا کے دل میں اور ہی کوئی مقصد ہو جو انسان کو موت پر فتح پانے کا حوصلہ دیتا ہے۔ ممکن ہے انسان کے لئے اس میں خاموش محبت پوشیدہ ہو۔

مینکا آ کر سب سے پیچھے میرے پاس بیٹھ گئی تھی۔ میرے دائیں طرف کی سیٹ خالی پڑی تھی۔ میرا سر چکرا رہا تھا پیٹ کی آنتوں میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ قے ہونے کو تھی۔ تبھی مینکا آ کر میرے پاس بیٹھ گئی تھی۔ ایک دوا اس نے مجھے سونگھنے کو دی اور میرا سر دبانے لگی۔ میں نے اس کی خوبصورت نوکیلی انگلیاں اور کیوٹیکس لگے ہوئے لال ناخن دیکھے۔

مینکا کا وینٹی بیگ آج میرے ہاتھ میں ہے۔ اس میں کئی چٹھیاں بھی ہیں۔ کتنی سنجیدگی سے وہ اس بے نام نوجوان کو چاہتی تھی۔

مینکا کی چٹھیوں سے اس کا زندگی پر کتنا گہرا بھروسہ ظاہر ہوتا ہے۔ ایک خط میں پڑھتا ہوں —

"محبت کو واقعی جانتا ہے اُسے زمانہ نہیں ٹھگ سکتا۔ تمہارا اتنا مجبور ہونا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمارے لئے محبت کا لامتناہی افق سامنے ہے۔ اس کی گہرائی وقت کے پیمانے سے نہیں ناپی جا سکتی۔ انتظار کرنا۔ میں تو آ رہی ہوں۔ ہم مٹی کے انسان ہیں ہمیشہ بددعاؤں سے گھرے نہیں رہ سکتے۔ مگر تم تو جانتے ہی ہو کہ ساری دنیا مجھ سے پیار کرتی ہے۔ زمین کے سارے آدمی میرا پیار چاہتے ہیں۔ کنجوس ہونے سے کیا میرا کام چلے گا۔ میں خود غرض کبھی نہیں بن سکوں گی۔

دوسرے کے لئے محبت اور تمہارے لئے پیار —

سمجھ گئے نا!

ہمیشہ تمہاری ہی

'مینکا'

مزید — اگلے ہفتہ میں آ جاؤں گی۔ سات دن کو تم ہزار سال کے برابر نہ سمجھنا۔ ان نو کہ سات دن لامتناہی وقت کا ایک معمولی حصہ

ہیں۔ ہم تو زمانے کی راہ پر چلنے والے ان تھک مسافر ہیں۔

مینکا

انتظار کے بغیر محبّت میں کچھ بھی کشش نہیں رہتی۔ ایک ایک لمحہ کا انتظار اس کی محبّت کو سو سو سال کی مدت کی طرف لے جاتا تھا۔ امید کا ہر لمحہ اس کی جوانی کو استقلال کی طرف لے جاتا تھا۔

مینکا چاہتی تھی کہ عدم سے وجود میں آجائے ، مٹی کے فرش پر اتر آئے۔ زندگی کے خوابوں کو حقیقت سے دوچار کر دے۔ محبّت میں دل ٹوٹنے کے بعد بھی مینکا نے اپنا بے لوث پیار دوسروں کو دینے کی قسم کھائی تھی۔

ہم اٹھارہ مسافر تھے۔ دو ڈرائیور اور مینکا۔ مینکا ہم اٹھارہ کی ہم سفر۔ پہلی نظر میں ہی معلوم ہوا کہ مینکا کو جیسے بہت مدّت سے دیکھتا آیا ہوں۔ بہت دنوں سے جانتا ہوں۔ مینکا کو پہچاننے کے لئے اسے دوبارہ نہیں دیکھنا پڑا۔ مینکا کی پوری شخصیت سے مجھے بخوبی تعارف حاصل تھا۔

آدھی رات کے وقت ہم سب کو کچھ جھپکی آنے لگی۔ مگر مینکا پر نیند کا اثر نہ تھا۔ وہ ایک مسافر کے پاس سے دوسرے کے پاس جاتی اور سب سے ہنس کر باتیں کرتی۔ انجان مسافر کی پیٹھ پر اپنا نازک ہاتھ رکھ کر پیار سے وہ پوچھتی تھی —

" ایک پیالہ کافی لاؤں — ایک پیالہ اوولٹین لوگے۔"

پینے کی خواہش نہ ہوتے ہوئے بھی مسافر ایک پیالہ کافی پی ہی جاتا تھا۔

زندگی کے سفر میں بہت سی خوب صورت لڑکیاں ملی ہیں اسپتال کی نرسیں ، ہوٹل کی ایجنٹ ، دوکانوں کی سیلز گرلز ، ہوائی جہازوں کی ہوسٹس سبھی خوب صورت ہیں۔ سب کے اطوار میں کشش ، بات چیت میں زیادہ تر حلیمی اور عاجزی ہے۔ انھیں ایسے مہذّب برتاؤ کے لئے رکھا جاتا ہے۔ ان کے روپے کی وجہ سے بھی۔ مگر ان سب کی انفرادی زندگی کے بارے میں میری رائے اچھی نہ تھی۔ دوسرے کو خوش اور مطمئن رکھنا ہی جس کا کام ہے اسے سب کو ہر طرح سے خوش رکھنا پڑتا ہے۔ اس معاملے میں دوسرے عقیدے کی بات سوچنا بھی میں ضروری نہیں سمجھتا تھا۔

ایک شعلے کی طرح خوبصورت ہونے کی وجہ سے اور سنجیدہ ہنسی کی وجہ سے میں نے سوچ لیا تھا — خوبصورتی کی اتنی نمائش جو کر سکتا ہے وہ زمین کی نجات کے سوا اور کچھ نہیں کرتا اور نہ کچھ کر سکتا ہے۔

مینکا کو دیکھ کر بہت سی باتیں دل میں پیدا ہوئیں۔ نامہ نگار کی حیثیت سے بہتوں سے میرا تعارف ہوا۔ بہتوں سے باتیں ہوئیں بہت سی مشہور عالم سیاسی ہستیوں سے بھی تعلق رہا ہے۔ ان کے بارے میں میری رائے اچھی ہونے پر بھی ان کی نجی زندگی کے بارے میں میرا خیال بہت اچھا نہیں ہے۔ بہتوں کے کردار کو دیکھ کر شیکسپیئر کا زندہ جاوید قول یاد آتا ہے۔ " ایک شخص برابر مسکراتے رہنے پر بھی بد اخلاق ثابت ہو سکتا ہے۔"

مینکا بھی اگر بد اخلاق ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے! زمین پر صرف اچھے لوگ ہی رہیں گے! کچھ بدکردار بھی رہیں اور ان کی مینکا ہی ہو۔

ہم بالکل نئے واقف کاروں سے بھی کچھ ایسے سوال کر دیتے ہیں جو صرف غیر ضروری ہی نہیں غیر مہذّب بھی ہوتے ہیں۔ پاس بیٹھی ہوئی مینکا سے میں نے پوچھا :-

" آپ شادی شدہ ہیں ؟ "

میرا سوال سن کر وہ گھبرائی نہیں۔ ایک معنی خیز ہنسی کے ساتھ اس نے جواب دیا

" میں جیسی ہوں ویسی ہی اچھی نہیں ہوں کیا ؟ "

میں خاموش ہو گیا — تمھیں اچھی ہو۔ تمھارا مالک ہو یا نہ ہو اس سے مجھے کوئی مطلب نہیں۔

کچھ دیر اور باتیں کرنے کے بعد پوچھا :

" آپ کا نام کیا ہے ؟ "

" مینکا "

کچھ دیر خاموش رہ کر مینکا نے کہا۔ " مگر میرا نام آپ کے

کسی کام میں نہیں آئے گا۔ میں سیاست داں نہیں ہوں۔"

ہر ایک مسافر کے بارے میں منیکا کچھ نہ کچھ جانتی ہے۔ اس لئے جیسا جس کا کاروبار ہے اس سے اسی طرح کی باتیں کر کے سوال کرتی ہے۔ باتیں زیادہ نہیں کرتی، ہنستی ہے — ایک خوبصورت ہنسی — پھاگن کے مہینے کی دھوپ جیسی ہنسی — مگر میرا جی چاہتا تھا کہ منیکا خوب بات چیت کرے۔ میرے ساتھ ہی کیوں، جس کے ساتھ جی چاہے بات کرے۔ لگاتار بہت ساری باتیں کہتی رہے۔ صرف ہنسنے سے کیا ہوتا ہے۔ بات بھی کرنی چاہیئے۔ مگر میں سمجھ گیا کہ منیکا کے ساتھ باتیں کر کے اس کی زندگی کے بارے میں کوئی زیادہ معلومات حاصل نہیں کر سکوں گا۔ پھر بھی میں نے پوچھا — "آپ کتنے دنوں سے یہاں کام کرتی ہیں؟"

"تھوڑے دن ہوئے ہیں۔ کیا دیکھنے سے میں زیادہ دن کی معلوم دیتی ہوں؟"

کچھ شرارت کرنے کو جی چاہا۔ ہم پریس رپورٹروں کی زبان کچھ بے قابو سی ہوتی ہے۔

"آپ تو مجھے کسی پلینیٹ سے لائی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں۔"

منیکا کھل کر ہنسی اور اس نے کہا — "اور کسی دوسرے پلینیٹ کو جانے کے لئے تیار ہو کر آئی ہوں — آپ کو ایسا نہیں لگ رہا؟ آپ جیسے ایک اور جرنلسٹ نے بھی مجھ سے ایک دن یہی کہا تھا۔"

کتنی پیار بھری باتیں کرتی ہے منیکا۔

میں نے اشارہ سمجھ کر کہا — "تو آپ کو پہلے سے ہی مبارکباد مل چکی ہے۔ لیکن نئے پلینیٹ میں اترتے وقت میری مبارکباد بیکار نہ سمجھیں۔"

"شکریہ! آپ کا نام وام معلوم ہونے پر ضرور خط لکھوں گی۔ نہ معلوم ہونے پر بھی آپ یاد رہیں گے۔ اگلے ہفتہ میں اس منیکا کی شادی ہو رہی ہے۔ اس شادی میں آپ شریک نہ بھی ہوئے تو آپ کے لئے ایک کرسی خالی رہے گی۔"

اس جشن شادی کی خوشی کے بارے میں وہ پھولی نہیں سماتی۔ جیسے وہ ساری دنیا کو بتا دینا چاہتی ہے کہ اگلے ہفتہ اس کی شادی ہو جائے گی، وہ دلہن بنے گی، وہ ملکہ کی پوشاک پہنے گی اور ایک بڑے جلسے میں بیٹھ کر سب کی توجہ کا مرکز بنے گی۔ اس کا رواں رواں خوشی سے پھڑک اٹھے گا، گویا وہ اپنی شادی کے لئے زمین کے سب باشندوں کو دعوت دے گی۔ ایک دن کے لئے جیسے سارا جہان اس کی دعوت قبول کرے گا اور سب لوگ اس کے گھر دوڑ کر آئیں گے، اسے مبارکباد دینے کے لئے، دعائیں دینے کے لئے اور پُرخلوص جذبے کے ساتھ اپنے دل کی اچھی خواہشات جتانے کے لئے۔ ایک ہفتہ کے بعد وہ جشن ہوگا۔ نئے ایڈوینچر کی ابتدا ہوگی منیکا کی زندگی میں، صرف ایک ہفتہ کے بعد۔

دل سے میں نے منیکا کو مبارکباد دی۔ خاموش دعائیں دے کر میں نے کہا — "تم فتحیاب ہو، تم خوش رہو، اس نئے پلینیٹ میں تم بے مثال مسافر بنو۔"

اگرچہ اپنے جذبے کا اظہار میں زبان سے نہ کر پایا تھا، لیکن منیکا سب سمجھ گئی تھی کہ میں نے کیا سوچا تھا اور کیا کہا تھا۔

سب کو تھوڑی بہت نیند آ رہی تھی۔ کچھ ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی۔ بتیوں کی ہلکی روشنی بہت ہی اچھی لگ رہی تھی۔

کتنے ملک اور شہر گھوما پھرا ہوں۔ ریل، جہاز، موٹر، ہوائی جہاز وغیرہ پر کتنا سفر کیا ہے۔ ضروری اور غیر ضروری سبھی خبریں جمع کی ہیں مگر کسی دن بھی منیکا کی خبر کہیں نہیں بھیجی۔ اگرچہ اس کے سمندر چھوٹے سے دل میں کتنے ہزار زمانوں کی خبریں پڑی ہیں۔

اگلے ہفتہ منیکا کی شادی ہو جائے گی۔ "زمین پر اس سے بڑی کیا خبر ہو سکتی ہے۔" آنکھیں بند کر کے میں منیکا کی بات سوچ رہا تھا۔ اس کی چمک والی آنکھوں اور ان کی تیز روشنی کا تصور کر رہا تھا۔

یکایک چونک کر اٹھا، دیکھا کہ سبھی ایسا کر رہے ہیں۔ پاس ہی دیکھا اس حسین منیکا کو۔ اس وقت سامنے لال روشنی کے لفظوں میں آیا — "بیلٹ باندھ لیجئے۔" ڈر کے مارے

دل کا پنچھی لگا۔ سبھی ڈر کے مارے بے چین ہو گئے۔

منیکا بھی بہت بے چین ہوئی مگر اس پر بھی وہ گھبرائی نہیں ہم ہلنے لگے۔

تب بھی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاکر منیکا نے جلدی جلدی ہر ایک مسافر کے پاس جاکر کہا — "اُٹھئے نہیں۔ خدا کا نام لیجئے —" منیکا نے کئی مسافروں کی بیلٹ باندھی۔ کچھ کو پیراشوٹ دئے۔ دوڑ کر پائلٹ کے پاس گئی اور اسے کچھ پہنا آئی۔ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی ہم سب خدا کو یاد کر رہے تھے۔

ہوائی جہاز کے انجن میں آگ لگی ہے۔ ہم زمین سے ۴۰۰۰ فٹ اوپر ہیں۔ باہر اندھیری کالی رات ہے۔

جہاز اور زیادہ ہلنے لگا۔ امید نہیں رہی کل ۲۱ آدمیوں کا یہ آخری دیدار ہے۔ مگر منیکا میں غیر معمولی ہمت آگئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اس وقت تک اس کی ہنسی بند ہو گئی تھی۔ ایک بار اور دوڑ کر منیکا پائلٹ کی پیٹھ پر پیراشوٹ باندھ آئی۔ مسافروں کے پاس کی کھڑکیاں اس نے کھول دیں۔

مجھے تے آنے لگی تھی۔ ادھر جہاز کے انجن میں آگ لگ گئی ہے اور وہ اوپر نیچے ہونے لگا ہے۔ شاید اس کی رفتار پائلٹ کے کنٹرول سے باہر ہو گئی تھی۔ منیکا میرے پاس دوڑ کر آئی۔ اپنا وینٹی بیگ میرے ہاتھ میں دے کر اس نے مجھے پکڑ لیا۔

اندھیری رات کے آسمان کے پیٹ میں ایک شعلہ اٹھا اس میں ۲۱ زندہ آدمی چاروں طرف سے گھر گئے۔ اس کے بعد ایک آواز ہوئی اور اس کے پیچھے اور کچھ نہیں ہے۔

نرس سویرے کا اخبار دے گئی۔ تاریخ دیکھ کر حیرانی میں پڑ گیا اس سے پہلے کا جو اخبار میں نے پڑھا تھا وہ تین مہینے پہلے کا تھا۔ تو یہ تین مہینے میں نے کیا ہسپتال میں ہی گزارے۔ ڈاکٹر کے آنے پر میں نے پوچھا — "مجھے یہاں آئے کتنے دن ہو گئے ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر کچھ ہنسا۔ اس نے کہا۔ "تین مہینے، آرام ہو رہا ہے نا؟ دیکھئے آپ لوگوں کے جہاز کے حادثے کی جو خبریں نکلی ہیں۔ ان میں سے ایک ہمارے یہاں سے اور دوسری سرکار کی طرف سے۔"

کوئی مجبوری نہ تھی، گھبراہٹ میں اخبار پر نظر ڈالی۔

ایک چھوٹی سی خبر تھی۔ ۲۱ مسافروں کے ساتھ حادثہ میں تباہ ہونے والے ہوائی جہاز کا صرف ایک زندہ مسافر صحت یاب ہو رہا ہے۔ وہ ایک مشہور نامہ نگار ہے۔ اس سے حادثے کے متعلق پوری خبریں ملنے کی امید کی جاتی ہے۔

دوسری خبر — انجن میں آگ لگ جانے سے اٹھارہ مسافروں کے ساتھ تباہ ہونے والے ہوائی جہاز کے مسافر اور ڈرائیوروں کو آخری وقت میں ہر طرح کا اطمینان اور ہمت دلا کر بہادری کے ساتھ مرجانے والی کماری منیکا کو بھارت سرکار نے بہادری کے لئے مرنے کے بعد اعزاز دیا ہے۔ انھیں بہادر چکر دیا گیا ہے۔ اس لڑکی کی بے مثال بہادری اور قربانی عورت کے جذبۂ خدمت کے لئے ہمیشہ آدرش بنی رہے گی۔

منیکا کا بیگ آسمان کی گود سے اتر کر میرے ہاتھ میں آیا۔ اسے آگ نہیں جلا سکی تھی۔ کوئی آگ اسے نہیں جلا سکے گی۔

میری زمین بہت سی خبریں باقی رہے گی۔ جہاز جلنے کی خبر۔ بیس آدمیوں میں سے ایک کے نہ مرنے کی خبر۔ مگر منیکا کی موت سے زمین کتنی غریب ہو گئی۔ منیکا اور اس کے دل کی لاکھوں امیدوں کی موت سے زمین کو کتنی ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کا کتنا نقصان ہوا۔ اسے کیا بڑا اعزاز سے بھی پورا کیا جا سکے گا۔

دنیا کی نظروں میں منیکا ختم ہو گئی۔ ٹوٹا ہوا سر اور کٹا ہوا ہاتھ لے کر میں بچا ہوں، لیکن کسی چنار کے درخت کے نیچے جس کے پتے جھڑ گئے ہوں، بیٹھ کر انتظار کرنے والا نوجوان تو آج بھی زندہ ہے —— اس کی خبر ہے کسی کو!

سیدہ جعفر

شاہ تراب چشتی

جنوبی ہند اجالوں کا دیس ہے۔ یہاں کی فضاؤں میں صدیوں صوفیوں کا سرمدی نغمہ گھلتا رہا اور ہدایت کی شمعیں جگمگاتی رہیں۔ اولیاء اور اصفیاء نے اس سرزمین پر اخوت کے ابدی نقش چھوڑے، صداقت کے امر گیت گائے اور 'عشق' کا پرچار کیا۔ ان بزرگوں نے تبلیغ واشاعت کی لگن میں دور دراز مقامات کا سفر کیا اور جس پستی اور بلندی سے گزرے وہاں پھول کھلائے اور موتی بکھیر دئے۔ اسی طرح کے ایک جہاں گشت صوفی شاہ تراب بھی تھے جنھوں نے مدراس، تنجور اور کرناٹک کے بہت سے مقامات کی جادہ پیمائی کی اور رُشد وہدایت کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کردی۔

نام شاہ تراب کا اصلی نام تراب علی تھا۔ صوفی اور باخدا شخص ہونے کے اعتبار سے وہ شاہ تراب کے نام سے موسوم تھے۔ شاہ تراب کی تصانیف پر کہیں تراب علی شاہ اور کہیں صرف شاہ تراب لکھا ہوا ملتا ہے۔ مثال کے طور پر شاہ تراب کی مثنوی "ظہور کلی"[1] کے ابتداء میں لکھا ہوا ہے:

"ایں کتاب ظہور کلی است۔ تصنیف حضرت تراب علی شاہ قدس اللہ سرہٗ"

"گنج الاسرار" کے دو نسخے حیدرآباد میں موجود ہیں جن میں سے ایک اسٹیٹ لائبریری اور دوسرا سالار جنگ لائبریری میں دستیاب ہے۔ ایک ہی کتاب کے ان دو نسخوں میں شاہ تراب کا نام مختلف طریقے

[1] ظہور کلی، سالار جنگ لائبریری۔ تصوف ۱۵۶

سے لکھا ہوا ملتا ہے۔ اول الذکر میں شاہ تراب اور موخر الذکر میں تراب علی شاہ تحریر کیا گیا ہے۔

اسی طرح "گلزارِ وحدت" کا جو نسخہ اسٹیٹ لائبریری میں موجود ہے۔ اس پر تراب دکنی تحریر کیا ہوا ملتا ہے۔ اور اسی مثنوی کا جو دوسرا نسخہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ میں موجود ہے اس پر شاعر کا نام شاہ تراب لکھا گیا ہے۔ شاہ تراب کی "من سمجھاون" کے مختلف نسخوں پران کا نام مختلف طریقے سے تحریر کیا ہوا ملتا ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو میں 'من سمجھاون' کا جو نسخہ موجود ہے اس پر صرف شاہ تراب لکھا ہوا ہے اور جامع مسجد بمبئی کے نسخے میں صرف 'تراب' تحریر کیا ہوا ملتا ہے۔

اسی نام کے بعض دوسرے بزرگ بھی گزرے ہیں جن میں پربھنی کے سید تراب الحق[1]، شاہ تراب علی قلندر[2]، شاہ ابو تراب[3] اور شاہ تراب متوفی[4]

[1] سید تراب الحق کا عرس پربھنی میں ۲۶ شعبان کو بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔

[2] تراب علی قلندر 'شرائط الوسائط' اور 'مطالب رشیدی' کے مصنف ہیں

[3] ابو تراب کا ذکر 'تذکرہ ریاضِ اعظم' میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو۔ تذکرہ قلمی ۲۴۳ - از سید محمد علی الموسوی - اسٹیٹ لائبریری

[4] شاہ تراب متوفی ۱۳۰۰ھ درگاہ یوسفین حیدرآباد میں مدفون ہیں - وہ شاعر تھے۔ ان کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے "بنایا پیر مجھ کو پیر نے میں پیر کے قربان" اب بھی حیدرآباد کی بعض قوالیوں میں سنائی جاتی ہے۔

۱۳۰۰ھ قابلِ ذکر ہیں۔

تخلص | شاہ تراب اتراب تخلص کرتے تھے۔ کہیں کہیں ترابی اور بوترابی بھی ملتا ہے۔ "گنج الاسرار" کی اہمیت بتاتے ہوئے اس کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

عجب ہے گنج الاسرار ترابی　　　کہ ہر اک بیت ہے او انتخابی

یا ایک اور موقع پر کہتے ہیں ؎

ترابی بول او تمثیل نادر　　　کہ ہووے سر مخفی جس سوں ظاہر

"گلزار وحدت" میں تصوف کے بعض اسرار و رموز کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

تو بس حق و حقیقت کا بیان بول　　　تراب اے بوترابی سب عیان بول

ایک اور جگہ شاہ تراب اس طرح اپنا تخلص لائے ہیں

جو ہے بوطالبی سو بوترابی　　　ہوا شیرازہ بند ختم کتابی

لقب | شاہ تراب تصوف، فلسفہ اور علم رمل میں کامل تھے اور ان کے اس علم و فضل سے متاثر ہوکر ان کے مرشد پیر پاشاہ حسینی نے انھیں گنج الاسرار کا لقب بخشا تھا۔ 'ظہور کلی' میں اس واقعے کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں ؎

روز جمعہ ماہ رجب وقت شام　　　دی خلافت گنج الاسرار بخشے نام

بھی تخلص اور ملقب ہے تراب　　　گنج الاسرار شاہ فرمانے خطاب

شاہ تراب کی ادبی تخلیق 'گنج الاسرار' کے اختتام پر جو عبارت لکھی گئی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے لقب سے بھی مشہور تھے۔ چناں چہ اس مخطوطے کے کاتب سید حسن علی نے اس کتاب کے آخر میں لکھا ہے :

"مرتب شد کتاب گنج الاسرار از تصنیف تراب گنج الاسرار"

شاہ تراب کے شاگرد اور مرید شاہ معین تجلی نے اپنی تالیف "ترجمہ دکھنی شرح جام جہاں نما الموسوم بہ فتح المبین وکلام المبین" میں انھیں "گنج الاسرار شاہ تراب چشتی" ہی لکھا ہے[۱]۔

وطن | اردو یا فارسی کے کسی تذکرے سے شاہ تراب کے حالات اور ان کے وطن کا پتہ نہیں چلتا۔ کسی ادبی تاریخ یہاں تک کہ 'مدراس میں اردو' میں بھی ایسے کثیر التصانیف اور پُرگو شاعر کا ذکر موجود نہیں ہے، البتہ

ئے ملاحظہ ہو ادعیہ قلمی ۱۷۳۔ صفحہ ۱ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد

داخلی شہادتوں سے ہمیں تراب کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ شاہ تراب مدراس کے علاقے ترنامل کے رہنے والے تھے اور ترنامل ہی میں ان کا تکیہ بھی تھا۔ یہ مقام آگ کے لنگا کی پوجا کے لئے مشہور ہے۔ ترنامل میں ایک اونچے پہاڑ کے قریب ایک مندر بنا ہوا ہے جس میں شو کی پوجا ہوتی ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہیں پاروتی نے شو کو حاصل کیا تھا۔ اس مندر میں ایک بہت بڑا گنبد ہے جس کی تعمیر وجے نگر کے راجا کرشنا دیوارایا نے ۱۵۱۶ء میں شروع کی تھی اور جس کی تکمیل تنجور کے راجا سی وپانے کی تھی۔ کرشنا دیوارایا نے اس مندر میں جو گیارہ منزلہ ہے ہزار ستونوں کا ایک منڈپ بھی تعمیر کروایا تھا۔ اس مندر کے مشرقی حصے میں ارناجل یا ارناجری کا بھی مجسمہ تراش کر رکھا گیا ہے[۱]۔ "گیان سروپ" میں شاہ تراب نے اپنے وطن ترنامل اور اس کے مشہور مندر اور ست ارناجل کے مجسمے کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے ؎

اے یاران طرفہ سنو نقل　　　ہے ارکاٹ میں ترنامل

پن مشہور ہے جس کا دیول　　　اور دیول کا دیو ارناجل

'اے بک آف ساؤتھ انڈیا' کے مصنف جے مارلس مالونی نے بھی اس مندر کا ذکر کیا ہے[۲]۔

"گنج الاسرار" اور "ظہور کلی" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترنامل میں شہر سے کچھ دور ان کا تکیہ واقع تھا جہاں ان کے فرزند غلام مرتضیٰ تکیہ نشین تھے۔

پیدائش | شاہ تراب کی صحیح تاریخ پیدائش کا علم نہیں ہو سکا۔ شاہ تراب کی ایک تصنیف "گیان سروپ" کی کتابت ۱۱۲۱ھ میں ہوئی ہے[۳]۔ اس میں ایک جگہ شاہ تراب لکھتے ہیں کہ میں نے "گیان سروپ" میں تصوّف کے رموز و غوامض کی بڑی اچھی طرح وضاحت کی ہے۔ حالانکہ میں ایک کم عمر اور بھولا بھالا لڑکا ہوں ؎

جیوں کنکر چاول ڈھولا ہوں　　　ہور بھید ابھید سب کھولا ہوں

پھر بالک بالا بھولا ہوں　　　گن لیتک جیو کے تولا ہوں

لہ ساؤتھ انڈین شرائنس از جگدیش آئر۔ باب ۶۔ صفحہ ۱۹۰

ئہ ملاحظہ ہو 'اے بک آف ساؤتھ انڈیا' از جے مارلس مالونی صفحہ ۱۹۶

ئہ ملاحظہ ہو مخطوطہ نمبر ۷۷۳۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ حیدرآباد

گیان سروپ' کا سنہ کتابت چونکہ ۱۲۱۱ھ ہے اس لئے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ نظم ۱۲۱۱ھ یا اس سے چند سال قبل کی تصنیف ہے۔ اگر ۱۲۱۱ھ میں بھی شاہ تراب نے 'گیان سروپ' لکھی تھی اور اس میں وہ خود کو 'بالک' کہتے ہیں تو ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ وہ ۱۱۰۴ھ یا ۱۱۰۵ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے ہم اس نتیجے پر بھی پہونچ سکتے ہیں کہ شاہ تراب نے عنفوان شباب ہی سے شعر گوئی شروع کر دی تھی۔

خاندان شاہ تراب ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے آبا و اجداد بھی صوفی اور عشق پیشہ تھے جیسا کہ وہ 'ظہور کلی' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

جد و آبا صوفیہ میرے ہیں سب — تھی محبت پاک او از فضل رب

شاہ تراب نے اپنے والد کا نام عبداللطیف خاں بتایا ہے اور اپنے بچوں کو دادا کے نقش قدم پہ چلنے کی ہدایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں

پدر میرا مشہور جوں آفتاب — اور عبداللطیف خاں عالی جناب
امیر کرم بخش ابن کرم ..م — سخی و جواں مرد روشن ضمیر

شاہ تراب نے 'ظہور کلی' میں اپنے چھوٹے بھائی مرزا احمد کا بھی ذکر کیا ہے جو بڑے جری اور خوبصورت تھے اور جنھوں نے عین عالم شباب میں ایلورا میں انتقال کیا تھا ؎

تھا برادر خورد میرے پیار کا — ہو گیا ہے ہے وفات اس یار کا
فال کا مرزا محمد نام تھا — مثل رستم صاحب صمصام تھا
خوبصورت سرو قد تھا نوجواں — سو اسے لے گی قضاء آسمان
سب جہاں تاریک میرے پر ہوا — جب برادر نوجوان میرا موا

اولاد شاہ تراب نے "ظہور کلی" میں اپنے فرزند غلام مرتضیٰ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور یہ مثنوی انھوں نے اپنے بیٹے ہی کو مخاطب کر کے لکھی ہے۔ چناں چہ "ظہور کلی" کی تیسری سُرخی "در مذاکرہ سبب نظم کتاب کہ برائے برخوردار غلام مرتضیٰ تصنیف نمودہ" ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تراب نے یہ کتاب اپنے فرزند کی رہبری اور رہنمائی کے لئے لکھی تھی۔ شاہ تراب کے بیٹے کا اصلی نام غلام مرتضیٰ تھا لیکن اپنی کتابوں میں انھوں نے غلام مرتضیٰ کو فریدالدین کے نام سے یاد کیا ہے اور اس کا سبب بتاتے ہوئے شاہ تراب کہتے ہیں کہ میرا بیٹا اس لئے بھی فریدالدین کہلانے کا مستحق ہے کہ وہ اپنے اوصاف کے اعتبار سے ایک دُرِ یکتا ہے۔ دوسری بات وہ یہ کہتے ہیں کہ میں غلام مرتضیٰ کو اس لئے فریدالدین کہتا ہوں کہ وہ فریدالدین گنج شکر کی طرح ہما صوفی اور عارف باللہ ثابت ہو اور اس کا دل فریدالدین گنج شکر کی طرح محبت الٰہی سے معمور ہو جائے۔ چنانچہ ظہور کلی میں اس کے متعلق شاہ تراب کہتے ہیں ؎

ہے غلام مرتضیٰ معروف نام — میں فریدالدین کہا ہوں در کلام
جو فریدالدین شکر گنج کے سبب — او پسر پیدا کرے رب کا طلب
ہور دریکتا کون کہتے ہیں فرید — ہے دریکتا او فرزند رشید

تعلیم شاہ تراب کی تعلیم و تربیت ایک صوفی گھرانے میں ہوئی تھی وہ علم رمل، تصوف، حکمت اور فلسفہ میں ماہر تھے اور ان علوم سے انھیں فطری لگاؤ اور ایک خاص شغف بھی تھا۔ علم رمل پر شاہ تراب نے ایک مستقل کتاب "گنج الاسرار" تصنیف کی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ تمام علوم میں رمل کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ اس علم کی ان کے یہاں بڑی اہمیت ہے۔ شاہ تراب کہتے ہیں ؎

اگر ہے علم تو علم رمل ہے — رمل کے علم کو لازم عمل ہے
رمل پیغمبراں کا یو عمل ہے — رمل سے بہترین پھر کیا عمل ہے

شاہ تراب نے اپنے مرشد پیر پاشاہ حسینی سے علم رمل سیکھا تھا۔ 'گنج الاسرار' میں شاہ تراب لکھتے ہیں کہ میرے مرشد علم رمل میں کامل تھے اور انھوں نے ہی مجھے پیغمبروں کے اس علم سے سرفراز کیا تھا۔

رمل میں تھے میرے استاد ممتاز — رکھے اعجاز پیغمبر کا سب راز

شاہ تراب نے لکھا ہے کہ پیر پاشاہ حسینی کے علاوہ اس علم کی تحصیل میں وہ شاہ دانیال[1] سے بھی مستفید ہوئے تھے۔ شاہ تراب نے "گنج الاسرار" میں اکثر جگہ شاہ دانیال سے فیض یاب ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شاہ دانیال

---

[1] شاہ دانیال جو سید محمد جونپوری کے استاد اور مرشد اور سید حامد شاہ کے مرید و خلیفہ تھے۔ انھیں سید حامد شاہ کی صحبت میں رہنے کا شرف حاصل تھا اور فیض باطنی میں وہ خواجہ بزرگ معین الدین حسن سنجری کے رہین منت تھے۔ ملاحظہ ہو "خزینۃ الاصفیاء" از غلام سرور نمبر ۹/۱۹ فارسی جلد اول۔ صفحہ ۳۴۴۔ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد

چشتی کا انتقال بقول غلام سرور مصنف "خزینۃ الاصفیاء" ۱۰۹۹ھ میں ہوا تھا۔ اس صورت میں شاہ تراب کے شاہ دانیال سے براہ راست فیض حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں یہ قیاس کرنا غلط نہیں کہ ترابؔ نے شاہ دانیال کے رسائل سے ضرور استفادہ کیا تھا۔ تراب شاہ دانیال کے علم رمل کو بہت سراہتے ہیں اور وہ انھیں اس علم کا ماہر سمجھتے ہیں۔ شاہ تراب خود کو 'منشی اسرار دانیال' اور 'راز دار دانیال' کہتے ہیں ؎

تراب منشی اسرار دانیال — حکایت نہیں لکھنا ہے فی الحال
تراب راز دار دانیال ہوں — رمل کے علم میں صاحب خیال ہوں

علم کی لگن

شاہ تراب کو علم حاصل کرنے کا اتنا شوق تھا کہ انھوں نے اپنے وطن سے "ملک کرناٹک" کا سفر کیا اور وہاں پہنچ کر اپنے زمانے کے مشہور ولی اور عالم کے آگے زانوئے ادب تہ کیا۔ شاہ تراب لکھتے ہیں کہ میں علم کی لگن میں اپنا وطن چھوڑ کر رستے کی صعوبتوں کو سہتا ہوا ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے فلسفہ، منطق، تصوف اور رمل کے علوم سیکھے۔

نحوی و منطق علم رمل سب — تصوف کا دیگر بخشے عل سب
کیا مرشد نے سب ظاہر سوں ماہر — بھی علم باطنی بخشا تھوا ہر
حسینی مرشد ہر دو جہان بار — کیا ہے علم ظاہر سوں خبردار

شاہ تراب کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ علوم متداولہ میں ماہر تھے اور یہ کہ عربی اور فارسی زبانوں پر بھی انھیں عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ شاہ تراب سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ "گلزار وحدت" میں وہ لکھتے ہیں کہ میں نے بھگوت گیتا، پرانوں، رامائن اور ویدوں کا بخوبی مطالعہ کیا ہے۔

خلافت

۱۱۵۰ھ میں پیر پاشاہ حسینی چشتی نے انھیں خرقۂ خلافت عطا کیا۔ "ظہور کلی" کے انیسویں باب "در مذاکرہ مرشد و کیفیت خلافت کمترین" میں شاہ تراب اس واقعے کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

حضرت پیر پاشاہ عالی جناب — ایک دن خلوت منے او آفتاب
اس غلام کمترین کے تئیں بلائے — سر سوں تا پشت او ید قدرت پھرائے
بھی کہے توں سچ میرا فرزند ہے — عاقل و ہوشیار و دانش مند ہے
تجکوں کرتا ہوں خلیفہ اب میرا — معرفت میں کوئی نہیں ثانی تیرا
جب کہا یہ بھید سب او اولیاء — ہو کے قربان جان سوں سجدہ کیا
او ولی عصر شاہ نامدار — درسن پنج وہ دیک ہزار
روز جمعہ ماہ رجب وقت شام — دی خلافت گنج الاسرار بخشے نام

اسی سال یعنی ۱۱۵۰ھ میں انھیں مرشد کے حسب ارشاد اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ پیر پاشاہ حسینی چشتی نے انھیں تبلیغ و اشاعت کی غرض سے کرناٹک جانے کا حکم دیا۔

فرانسیسیوں کا حملہ

شاہ تراب کے حالات زندگی پر "ظہور کلی" سے بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ "ظہور کلی" میں شاہ تراب لکھتے ہیں کہ ان کے مقام رہائش ترنامل اور اس کے اطراف و اکناف کے چھوٹے چھوٹے مقامات پر ۱۱۶۴ھ میں فرانسیسی فوجوں نے حملہ کر دیا اور قلعہ چیت پیٹ کا محاصرہ کر کے یہاں کے فوجدار فدوی محمد خاں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس واقعے کو شاہ تراب کی زبانی سنیئے ؎

اک بر اک آیا فرنگی بدخصال — چیت پیٹ کے تئیں لگایا مورچال
کار دی اور کافری تھے چٹ کار — کوئی لمندان کو ہی امیر صوبہ دار
قلعہ چیت پیٹ کے تئیں زغہ کئے — مار توپوں کا تو روز و شب دھرے
کوی مسلماں تئیں کمک ہرگز کئے — آخرش قلعہ فرنگی او لئے

شاہ تراب نے ترنامل پر فوج کشی کا جو واقعہ بیان کیا ہے اس کا ذکر "اختصار انور نامہ"[1] اور "تذکرہ والاجاہی" میں بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ "ہسٹری آف دی فرینچ ان انڈیا" میں بھی اس حملے کا ذکر موجود ہے اور رسالہ "اڈین تھرائنس" کے مصنف پی۔ دی جگدیش ئیر نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

سفر

"ظہور کلی" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۵۰ء میں جب پیر پاشاہ حسینی نے انھیں خلیفہ بنایا اور کرناٹک میں تبلیغ و اشاعت کی غرض سے بھیجا تو شاہ تراب ترنامل سے کرناٹک چلے آئے لیکن شاہ تراب کا سفر یہیں ختم نہیں ہوا۔ کرناٹک کے مختلف علاقوں میں گھومتے ہوئے آخر کار وہ تنجور پہنچے۔ مختصر یہ کہ شاہ تراب کی زندگی

[1] اختصار انور نامہ۔ قلمی۔ مخطوطہ نمبر ۲۵۰۱۔ صفحہ ۲۷۸۔ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد

کا ایک قابل لحاظ حصّہ جادہ پیمائی میں گزرا۔ انھوں نے کئی مقامات کا سفر کیا اور اپنے رشد و ہدایت کے کام کو جاری رکھا جیسا کہ ان کے اس شعر سے بھی مترشح ہوتا ہے

سکل ملک کے بیچ میرا ہے پھیرا   پرت کا اسے دو دو مج میں گھنیرا

۱۱۵۰ھ سے لے کر ۱۱۷۱ھ یعنی تقریباً اکیس سال تک ان کا سفر جاری رہا اور پتہ نہیں اس کے بعد بھی وہ کب تک تبلیغ و اشاعت کی غرض سے مختلف مقامات میں پھرتے رہے۔

جس زمانے میں شاہ تراب نے تنجور کا سفر کیا۔ اس زمانے میں وہاں مرہٹہ راجا پرتاپ سنگھ برسرحکومت تھے (۱۷۳۹ء تا ۱۷۶۳ء) شاہ تراب نے ۱۷۵۰ء میں تنجور کا سفر کیا تھا اور یہیں انھوں نے مشہور فلسفی اور شاعر رام داس کی مقبول عام مرہٹی نظم "شری مناچے شلوک" کے جواب میں "من سمجھاون" لکھی تھی۔ شاہ تراب "من سمجھاون" کی ابتداء میں اس کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں،

" اے اوس کی من کی پوتی کا جواب ہے کہ جس کا رام داس
خطاب ہے۔ مرہٹی بات میں پوتی وو بولیا، میں اس کا رمز
سب دکھنی میں کھولیا، بھی من سمجھاون اس کا نام راکھا
ولیکن سر بسر ہندی ہے بھاکا۔"

سلسلہ بیعت شاہ تراب پیر پاشاہ حسینی کے مرید تھے۔ جو چشتیہ سلسلے کی ایک کڑی تھے۔ "گیان سروپ" میں شاہ تراب نے اپنے مرشد و رہبر پیر پاشاہ حسینی اور ان کے پردادا کی مدح کرتے ہوئے اپنی عقیدت کا اس طرح اظہار کیا ہے ۔

پیر پاشاہ صاحب بڑے ولی   ہے دادا جن کا ولی علی
جیوں خوشبو پھول کی کلی کلی   یوں مشہور ہیں وہ گلی گلی
سب تن کی کیلی دہاں کھلی   اب بھی ذکر ہے خفی جلی
جو پیر حسینی پیارا ہے
اے تراب اسی بلہارا ہے

شاہ تراب، پیر پاشاہ حسینی ابن علی پیر حسینی ابن بابا شاہ حسینی ابن امین الدین علی ابن برہان الدین جانم ابن شاہ میراں جی شمس العشاق کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اس سلسلے کی صحت کا ثبوت ہمیں "مخزن الامین" از امین الدین علی ثانی، "مکشوف الامین"[1]، "دیوان حسینی"، "تذکرہ ریاض اعظم" از سید محمد موسوی اور مشکوٰۃ النبوت از سید شاہ غلام علی سے بھی ملتا ہے خود شاہ تراب نے گلزار وحدت میں اس سلسلے کی وضاحت کر دی ہے۔

اتھے برہان الدین برہان ناطق   سراپا بلکہ تھے قرآن ناطق
بھی ان کا نور دیدہ او ولی ہے   کہ جس کا نام امین الدین علی ہے
امین الدین علی کے نور عینی   شہنشاہ یعنی بابا شاہ حسینی
بھی فرزند ان کے ہیں حضرت علی پیر   کریں سجدہ جسے سب پیر ہور میر
اتھا حضرت علی کا نور دیدہ   او حضرت پیر پاشاہ حق رسیدہ
تراب نقش پا سے آن ولی ہے   کہ جس کا جد امین الدین علی ہے

مذہب شاہ تراب ایک سُنی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے "ظہور کلی" "گنج الاسرار" اور "گلزار وحدت" میں خلفاء راشدین کی شان میں اچھی منقبت لکھی ہے۔ گنج الاسرار میں خلفاء کرام کی مدح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عجب تھے او نبی کے چار یاراں   ہے قائم جن سوں سارا جسم انساں
ستون دین اوں چاروں کو جانو   ظہور کائنات حق پہچانو
نہیں کچھ اختلاف ان چار میں ہے   محبت روز و شب ہر یار میں ہے

شاہ تراب نے اپنی ہر تصنیف میں حضرت علی کی شان میں بہت سے مدحیہ اشعار لکھے ہیں۔ حضرت علی سے انھیں بڑی عقیدت تھی چنانچہ وہ اپنے آپ کو اکثر جگہ "تراب بو ترابی" اور "بوطالبی" یا "نقش پائے ہشت و چار" اور "نقش نعلین علی" کہتے ہیں۔ شاہ تراب نے اپنی ادبی تخلیقات میں اہلبیت اطہار سے بھی اپنی مودت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے ۔

ذرّے ذرّے میں ظہور پاک ہے   دیکھیو سا باغ کو کیا آنچ ہے
پیش عقلا اس قدر ایماں ہے بس   حُب اہلبیت بس باقی ہوس
حُب اہلبیت کوں ایمان بوجھ   جسکوں ہے ایمان سو انسان بوجھ

صوفی ہونے کی حیثیت سے شاہ تراب بڑے وسیع النظر اور روشن خیال تھے۔ وہ تمام انسانوں کو ایک ہی سطح سے دیکھتے تھے۔ "من سمجھاون" اور "گلزار وحدت" میں شاہ تراب نے اکثر جگہ اس

[1] از امین الدین علی ثانی۔ مخطوطہ نمبر ۷، شمالات۔ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد

خیال کا اظہار کیا ہے کہ ہم نے "اصطلاحیں وضع کرکے" عشق کے مذہب کو محدود کردیا ہے ورنہ سب انسان ایک ہی خالق کی مخلوق اور اس طرح سب ایک ہی صنم "کے پرستار ہیں۔ ایک وسیع المشرب صوفی کی طرح رسومات اور ظاہرداری کی پابندیوں سے بلند ہوکر شاہ تراب کہہ دیتے ہیں:

مذہب و ملّت ستی بے قید ہوں　　دامِ زلفِ مہ جبیں کا صید ہوں

تصانیف | شاہ تراب کی تصانیف کی تعداد کم نہیں۔ گیان سروپ (کتابت سنہ ۱۱۲۱ھ) رسالہ تصوف (سنہ ۱۱۵۰ھ) ظہور کلی (سنہ ۱۱۷۱ھ) من سمجاون (سنہ ۱۱۷۱ھ) گلزارِ وحدت (سنہ ۱۱۷۳ھ) گنج الاسرار (سنہ ۱۱۷۹ھ) مثنوی مہ جبین و ملا (سنہ ۱۱۸۲ھ) اور آئینہ کثرت (سنہ ۱۱۸۷ھ) ان کی ایسی تخلیقات ہیں جن کے مجموعی اشعار کی تعداد ہزاروں تک پہونچ گئی ہے۔ ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ تراب کتنے پُرگو اور کثیر التصانیف تھے۔ مضمون کی طوالت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ شاہ تراب کی تصانیف کا مفصل ذکر کیا جائے۔

شاہ تراب نے غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ شاہ تراب کے اشعار میں پیر یا شاہ حسینی کے اشعار کی طرح دردمندی، خستگی، بے ساختگی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے شاہ تراب کی شاعری کی خصوصیات، ان کی طرزِ ادا اور زبان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

دیں کوں لے ہات دل کا شمع سجن کو ڈھونڈتے چلی چلی جی
سجن سجیلا نظر میں کر کر ہر اک کوں پوچھی گلی گلی۔ جی

پرت کا بھڑکا لگا کے دھڑکا تپا تو زاری پولا سٹیا ہے
اگن کی سو ساں کوں سوس نا سک پوکارتی ہوں چلی چلی جی

چمن چمن سب کھلے سنی ہوں خبر نہیں ہے پیا گیا ہے
پیا پیا کہہ پھری دیوانی بھنور کے نمنے کلی کلی۔ جی

ہوا پکارا یہی کہ جان میں بہتر ہے تن کوں لیسیا دیوانی
برہا میں پیو کی برہانی ہوکر چلی میں غم کی دلی دلی۔ جی

کروں جو فریاد کس تے جا جو کوئی جلے دل کا داد دیوے
غزل تو میرا پوکارتا جواب خاطر ولی ولی۔ جی

اتا اشارت سون بولتے ہیں سکل محباں تراب کے تئیں
قبر سوں اپنے اوٹھایہ کہتا بہ روزِ محشر علی علی۔ جی

حبیب تنویر

لہو کا ساز

غمِ حیات کے صحرا کا وہ گلِ شاداب
فروغِ عشرتِ ہستی کا وہ حسین سراب
وہ شادکامیٔ الفت کا لمحۂ نایاب
اُلجھ گیا اسی فرصت کے ایک لمحے سے
مری نظر کا تجسس تری نگاہ کا خواب

اک ایسی منزلِ دل کش پہ کارواں ٹھہرا
کہ اب وہ منزلِ وہم و خیال و خواب سہی
مگر بنی ہے وہ راہ پاؤں کی زنجیر
ابھی تک آنکھ اسی موڑ پر بھٹکتی ہے
ہر ایک ذرّے کے رُخ پر ہو جیسے عکسِ دوام

نشاطِ عشق ہے لمحوں کی عشرتِ گزراں
نفس کے تار کے اُلجھے ہوئے بیاباں میں
لہو کے ساز سے رہ رہ کے آ رہی ہے صدا
ہوئی یہیں پہ ہر اک داستانِ عشق تمام
پرے کچھ اور یقیں بھی مکاں بنا نہ سکا

بلندا اس سے نہ اٹھا ترا ارادہ بھی
اُلجھ گیا اسی فرصت کے ایک لمحے سے
مری نظر کا تجسس تری نگاہ کا خواب

وہ شادکامیٔ الفت کا لمحۂ نایاب
بس اب اسی گلِ رعنا سے بزمِ دل کو سجا
اسی کی آگ سے سینے کو جگمگانے دے
اسی کی لَو کو بنا ایک مہرِ عالم تاب

رئیس مینائی بنگلوری

استدراک

(بہ سلسلۂ مضمون "سفرنما")

آج کل (بابت ماہ جولائی ۱۹۶۳ء) میں محترمہ قطب النساء بیگم ہاشمی کا مضمون 'سفرنما' باصرہ نواز ہوا جس محنت، خلوص، لگن اور ان تھک کوشش کے بعد یہ مضمون لکھا گیا اس پہ داد دینے کو بے ساختہ جی چاہتا ہے ع

آفریں باد بریں ہمت مردانۂ تو

واقعی یہ کام بڑے پھیلاؤ، جامعیت اور افادیت کا حامل ہے۔ مسلم لائبریری بنگلور میں علاوہ دوسرے علوم و فنون کی کتابوں کے اردو سفرناموں کا بھی ایک وافر ذخیرہ ہے۔ میں نے اردو سفرناموں کی فہرست کا اس فہرست سے تقابلی موازنہ کیا تو معلوم ہوا کہ بعض اردو سفرناموں کا ذکر اس مضمون میں آنے سے رہ گیا ہے اور بعض اردو سفرنامے جو اپنی اہمیت و انفرادیت اور گہرائی و گیرائی کی بناء پہ اردو لٹریچر میں خاص مقام رکھتے ہیں، ان کا صرف اجمالی اور ضمنی طور پہ ذکر کر دیا گیا ہے مثال کے طور پہ یوسف کمبل پوش کا سفرنامہ 'عجائبات فرہنگ' اردو کے ابتدائی سفرناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں 'سفر اودھ' مرتبہ محمد مسیح الدین بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سر سید کا سفرنامۂ انگلستان اردو سفرناموں میں اپنی عجیب زبان اور طرز بیان کی وجہ سے 'ایں گلے را رنگ و بوئے دیگر است" کا مصداق ہے اور حقیقت میں اردو سفرنامے کی ترتیب بحیثیت فن اسی سے شروع ہوتی ہے۔

یورپ کی زبانوں میں کثرت سے ہندوستان کے سفرنامے شائع ہوئے ہیں جو عیسائی مشنریوں اور سیاحوں نے مرتب کئے تھے ہندوستان کے قدیم سفرناموں میں مشہور چینی سیاح ہوان سانگ کا سفرنامہ، جو بدھ مت کے زمانہ میں ہندوستان آیا تھا، بہت مشہور ہے۔ سہو و نسیان آخر لازمۂ بشریت ہے۔ زیر نظر مضمون میں بعض غلطیاں ایسی ہیں جن کو میں سہو کتابت پہ محمول کرتا ہوں مثلاً احمد بجائے امجد یا نذالہٰی بجائے یداللہٰی اور بعض خامیاں ایسی ہیں جو محترمہ کے تسامح کا نتیجہ ہیں اور قاری کی گمراہی کا سبب بن سکتی ہیں۔ مثال کے طور پہ محمد عاشق الہٰی میرٹھی کے جس سفرنامے کا ذکر کیا گیا ہے وہ "زیارۃ الشام و القدس مع سیاحۃ المصر و العراق" ہے نہ کہ "زبدۃ الشام والقدس" مضمون کے اختتام پہ ضمیمہ کے تحت جن سفرناموں کا ذکر کیا گیا ہے اس میں 'مقام خلافت' نامی سفرنامے کو شیخ محمد اکرم سے منسوب کیا گیا ہے حالانکہ یہ سفرنامہ سر عبدالقادر ایڈیٹر مخزن کے سفر قسطنطنیہ کا نتیجہ ہے، اور شیخ محمد اکرام کے اہتمام سے مخزن پریس دہلی میں طبع ہوا۔

بہر حال تلاش و جستجو کے بعد میں نے چند سفرناموں کا پتہ لگایا ہے اور سہولت کے لئے مقام اشاعت بھی تحریر کر دیا ہے، اس سلسلہ میں کرنل عبدالرشید اور سعید الظفر چغتائی کے وہ خطوط جو روم و فرانس کی سیاحت کے دوران میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام لکھے گئے ہیں نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔

نمبر	نام سفرنامہ	نام مؤلف مترجم وغیرہ	نام مقام اشاعت
۱۔	اسّی دن میں دنیا کا سفر	سردار حسین بی۔اے	دارالاشاعت پنجاب، لاہور
۲۔	آج کا مصر	پروفیسر محمد حسن اعظمی	دین محمدی پریس میکلوڈ روڈ لاہور
۳۔	تصویر کشمیر (منظوم سفرنامہ کشمیر)	حفیظ جالندھری	حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی
۴۔	حالات سفر مالاپار	صاحبزادہ حسین میاں پھلواری	مسلم پریس کارخانہ المسلم بنگلور
۵۔	خزاں کے پھول (رپورتاژ)	عادل رشید	مکتبہ سلیمانی بمبئی ۳
۶۔	خضر راہ حجاز	نواب علی حسرت لکھنوی	مطبع جہانگیری بمبئی
۷۔	دہلی گائڈ	سید مقبول حسین	مطبع شمسی، دہلی
۸۔	سیر و سیاحت	لالہ نول اگروال	دلّی پرنٹنگ ورکس دہلی
۹۔	سیر برہما	عبدالخالق خاں موحد	نامی پریس لکھنؤ
۱۰۔	سیاحت امیر حبیب اللہ خاں	محمد اصغر علی لدھیانوی	قاسمی پریس لدھیانہ
۱۱۔	سفرنامۂ حجاز	قاضی محمد سلیمان سلمان منصورپوری	کانشی رام پریس لاہور
۱۲۔	سیّاحوں کی کہانیاں	عبدالمجید سالک	دارالاشاعت پنجاب لاہور
۱۳۔	سفرنامہ امام شافعی رح	مولانا عبدالحلیم شرر	حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی
۱۴۔	سفرنامۂ حرمین	مولانا حبیب اللہ ندوی	
۱۵۔	سفرنامۂ ابن بطوطہ	مولانا عطاء الرحمٰن ایم اے	
۱۶۔	عجائبات ہندوستان	احمد حسین خاں	قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور
۱۷۔	کاروان حجاز	ماہر القادری	مکتبہ فاران کراچی
۱۸۔	کالاپانی	مولانا محمد جعفر تھانیسری	
۱۹۔	لاہور گائیڈ	بشیر حسین خاں	بزم اردو لاہور
۲۰۔	منظوم سفرنامہ حجاز	محمد اسماعیل خاں مائل	برقی کوثر پریس بنگلور
۲۱۔	مکتوبات سفر (عراق، شام، لبنان، مصر، حجاز، عدن اور پاکستان وغیرہ کے دوران سفر میں لکھے ہوئے خطوط)	جعفر ابراہیم	برقی کوثر پریس بنگلور
۲۲	مشاہدات بلاد اسلامیہ	محمودہ عثمان حیدر	علمی مجلس ستنام ہاؤس گرانٹ روڈ کراچی
۲۳	مسافر کی ڈائری	خواجہ احمد عباس	حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی
۲۴	واقعات روم	محمد انشاء اللہ	مطبع روز بازار امرتسر
۲۵	یادیں (رپورتاژ)	سجاد ظہیر	
۲۶	یورپ نامہ	حافظ محمد سعید دہلوی	ہمدرد دواخانہ کراچی

گزارش

غیر طلبیدہ مضامین وغیرہ اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جبکہ ان کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ بھیجے جائیں۔

نعیم اقبال

بھول

اس کو خوش رکھنے کے لئے میں نے کیا کیا جتن نہ کئے!

جب بیاہ ہو کر اس گھر میں آئی تو اس وقت گڈو کوئی چار سال کا تھا۔ شادی کے تیسرے دن وہ چپکے سے میرے کمرے میں چلا آیا اور دُور سے کھڑا مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ وہ شاید یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ کون ہے جو یکایک اس کے ابا کے کمرے میں آدھمکی ہے، میں نے آہستہ سے اپنا گھونگھٹ اُلٹا۔ کمرے میں کسی اور کو نہ پایا تو میں نے اس کو پاس آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اور بھی مبہوت بنا تکے جا رہا تھا۔ وہ شاید مجھ کو گونگی سمجھ بیٹھا تھا۔ میرے بلانے پر وہ ایک دو قدم پیچھے ہٹا اور کمرے سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے سیب اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ جب اس نے ہاتھ لانبا کر کے سیب لینے کی کوشش کی تو میں نے ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب کر لیا۔ "سیب کھاؤ گے" وہ یکایک میرے بول اُٹھنے پر چونک سا گیا۔ ایک معصوم مسکراہٹ اس کے لبوں پر دوڑ گئی۔ میں نے اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے پوچھا۔ "جانتے ہو، میں کون ہوں؟" اس نے آنکھیں مٹکائیں اور نفی میں سر ہلا دیا۔ "میں تمھاری ماں ہوں ماں"۔ میں اپنے آپ جھینپ گئی۔ یہ ان کا بیٹا ہے، میرا بیٹا ہے۔ میں نے اس کو غور سے دیکھا۔ موٹے موٹے گول گول ہاتھ، گہرے کالے بال، بھوری آنکھیں اور پتلے ہونٹ بالکل اپنے باپ جیسے۔ میں نے اس کو اپنی گود میں لے لیا اور اس کے ننھے ننھے ہونٹوں کو جو ریشم سے بھی نرم اور پنکھڑیوں سے بھی نازک تھے، اپنے ہونٹوں میں دبا لیا۔ نہ جانے میں کب تک اس کو چومتی رہی پیار کرتی رہی۔ یکایک ان کی آواز آئی "اچھا تو خاصی چھن گئی ہے تم دونوں میں۔" نہ جانے وہ کب کمرے میں چلے آئے تھے۔ گڈو میری گرفت سے آزاد ہو کر مسہری سے کود کر کمرے کے باہر نکل گیا۔ میں نے کنکھیوں سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ دوسری شادی کر کے انھیں پچھتانا نہ پڑا تھا۔ گڈو کے خیال سے وہ دوسری شادی سے کتراتے رہے تھے، کہیں شادی ان کے اور اپنے گڈو کے لئے عذاب جاں نہ ہو جائے۔ جب ان کی ماں نے زیادہ زور دیا تو بمشکل شادی کے لئے اپنی رضامندی دے دی تھی۔ مجھے ان سب باتوں کا علم تھا۔ میں نے یہ بھی طے کر رکھا تھا کہ میں ایک مثالی ماں بنوں گی۔ میں سمجھتی تھی ماں صرف ماں ہے۔ اس میں سوتیلی کا اضافہ ماں کی توہین ہے۔

گھر کے پالے ہوئے کتّے اور بلیوں سے محبت ہو جاتی ہے۔ یہ تو پھر انسان۔ یہ تو ان کا بچّہ تھا۔ مجھے سچ مچ اس سے پیار ہو گیا تھا۔ میں اس سے محبّت کرنے لگی تھی۔ وہ بھی مجھ سے گھُل مِل گیا تھا۔ صبح اٹھ کر ہاتھ منہ دھلاتی، کپڑے بدلتی، اس کی دیکھ بھال میری زندگی کا جزو بن گیا۔ اس کے آرام کا خیال میرا فرض ہو گیا۔ وہ بے حد شریر ہو گیا تھا۔ بعض وقت مجھے بے جا تنگ کرتا اور اپنی شرارت سے باز نہ آتا۔ اس کی انتہا سے بڑھی ہوئی شرارتوں کو بھی میں سہہ لیتی۔ جی بُری طرح چاہتا کہ اس کو سزا دوں۔ مگر میں نے کبھی اس کو ہاتھ نہیں لگایا میں سوسائٹی سے ڈرتی تھی، مبادا کوئی یہ کہہ دے کہ سوتیلا ہے نا،

اس لئے زیادتی کرتی ہے، مجھے ان کا بھی خیال تھا کہ کہیں وہ الٹا نہ سمجھ بیٹھیں۔ ویسے تو وہ کہتے ہیں کہ اپنے لاڈ پیار سے میں نے اس کو بگاڑ دیا ہے۔ تنبیہ نہیں کرتی، سزا نہیں دیتی، سر پر چڑھا رکھا ہے۔ "اگر میں سزا دوں تو کہیں وہ بُرا نہ مان جائیں۔" میں سوچتی "کسی طرح کا خیال ان کے دل میں گھر نہ کرلے۔"

میٹرنٹی وارڈ سے جب گھر لوٹی تو وہ منّے کو دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجانے لگا۔ اس کو مجھ سے شکایت تھی کہ آٹھ دن میں اس سے دور کیوں رہی۔ وہ اس کو اسپتال نہیں لائے کہ کہیں اسپتال آکر ادھم نہ مچائے۔ شریر جو ہو گیا تھا۔ "کہاں چلی گئی تھیں مجھے چھوڑ کر۔" وہ بڑی معصوم ادا سے میرے گلے میں باہیں ڈال کر لٹک گیا۔ اس کے آنسو بھر آئے تھے۔ مجھے اس پر کتنا پیار آگیا۔ "تمھارے لئے یہ ننھا بھائی لانے گئی تھی۔" میں نے کہا۔ وہ ننھے کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے دیکھتا رہا۔

اب وہ اپنی دادی اماں کے پاس سونے لگا تھا۔ میں نے ان سے لاکھ کہا کہ اس کو اپنے پاس ہی سلاؤں گی۔ مگر وہ نہیں ملنے۔ کہنے لگے "تمھاری طبیعت بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔ دو بچوں کو سنبھالو گی تو تمھاری صحت پر بُرا اثر پڑے گا۔ تم ذرا سنبھل جاؤ تو سلا لینا۔" باتوں باتوں میں دن گزر گئے۔ تیسرے سال گڈّو کے لئے میں ایک بہن لے آئی۔ ان دونوں کو میرے ساتھ سوتا دیکھ کر وہ رشک کرتا، جلتا، ایک رات نہ جانے وہ کب میرے کمرے میں چلا آیا اور منّی کو ہٹا کر میرے سینے سے لگ کر سو گیا۔

صبح جب اُٹھی تو اس کو اپنے قریب پا کر نہ جانے کیوں میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ دیر تک اس کو سینے سے چمٹائے رکھا۔ میں تو اس کو بھی اپنے ہی پاس سلانا چاہتی تھی۔ میں کب اس کو اپنے سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ مگر وہ اس کو مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ گڈّو سات سال کا ہو گیا تھا۔ وہ کہتے جب بچّے بڑے ہو جائیں تو ان کو ماں باپ سے الگ ہی سونا چاہیئے۔ میں جل کر رہ گئی۔ ان کی مرضی کے خلاف بھی تو کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اب وہ اپنی دادی اماں کے پاس ہی سونے لگا تھا۔ میں وہیں اس کے بچھونے پر لیٹ جاتی۔ وہ اپنی باہنوں کو میرے گرد ڈال دیتا اور سو جاتا۔ جب وہ گہری نیند سو جاتا تو میں چپکے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔

ویسے بھی وہ بہت ذہین تھا۔ جب وہ دس سال کا ہو گیا تو اس کے سمجھنے کی طاقت اور تیز ہو گئی تھی، مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میری ہر بات کو جانچتا ہے، پرکھتا ہے، میری حرکات وسکنات پر نظر رکھتا ہے۔ ایک دن منّا نے پالنے کو اس زور سے ہلایا کہ منی دھڑام سے نیچے آرہی۔ میں باورچی خانے سے دوڑ کر آئی۔ پوچھا "کس نے گرایا ہے؟" ننھا کھڑا ڈر سے رونے لگا۔ میں نے اس کو اس دن خوب پیٹا تاکہ وہ پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرے۔ تیسرے یا چوتھے دن کی بات ہے کہ منّی پھر پالنے سے گر پڑی۔ وہ چیخنے لگی۔ بُری طرح چوٹ آئی تھی۔ میں غصّے میں منّے کی طرف لپکی۔ "میں نے نہیں گرایا ممّی، بھیّا نے گرایا ہے۔" ننھا مار پڑنے کے خوف سے فوراً کہہ اٹھا۔ "کیوں تم نے گرایا ہے؟" میں نے گڈّو سے پوچھا۔ اس کی خاموشی اس کا اقرار تھا۔ میں جھنجلائی اور اپنا غصّہ پی کر اس کے قریب پہونچی اور پوچھا۔ "گڈّو تم کو اپنی بہن سے پیار نہیں ہے کیا، دیکھو تو تم نے کس بری طرح دھکّا دے دیا۔" میں اس کو سمجھانے لگی۔ میں نے دیکھا اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور غصّے سے آنسو بھر آئے اور ٹپا ٹپ نکل پڑے۔ ارے میں نے تو ہاتھ بھی نہیں لگایا اسے، وہ کہیں اس وقت آجائیں اور اسے دیکھ کر یہ خیال نہ کر بیٹھیں کہ میں ان کی عدم موجودگی میں بیٹھی ہوں اور ان کے سامنے خواہ مخواہ پیار رانڈیلتی ہوں! میں نے اپنے آپ سے کہا۔

"تم نے ہی تو منّی کو گرایا ہے اور پھر خود ہی رو رہے ہو۔" میں بولی۔ اس کو اپنے قریب کرنا چاہا مگر وہ میرا ہاتھ جھٹک کر باہر نکل گیا۔

ان دنوں اس کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ میں جتنا مناتی اتنا ہی وہ بگڑتا۔ وہ ہمیشہ منہ بسورے رہتا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے محبّت نہیں کرتا بلکہ نفرت کو میرے خلاف اپنے دل اور دماغ میں پرورش دے رہا ہے۔ وہ ایک دن منّی کے ہاتھ سے دودھ کا پیالہ چھین کر خود پینے لگا اور میری طرف عجیب نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ "منی کا پیالہ کیوں لے لیا تم نے؟" میں نے پوچھا۔ "تمھارا دودھ کا پیالہ تو دھرا ہے تمھارے سامنے۔" اس نے میری بات کا

کوئی جواب نہیں دیا۔ اگر منّا سے یہ حرکت ہوتی تو اس کو ایسی سزا دیتی کہ وہ عمر بھر یاد رکھتا۔

تین چار دن سے منّی کو تیز بخار تھا۔ منّا بھی گڈّو کے ساتھ اپنی دادی اماں کے پاس سونے لگا تھا۔ ایک دن گڈّو میرے پاس چلا آیا اور اڑ گیا کہ منّی کو نیچے اتار دوں اور اس کی گود میں سلاؤں۔ ”منّی کو بخار چڑھا ہوا ہے گڈّو، یہ گود سے اترنے کا نام نہیں لیتی۔ اس کا بخار ٹوٹ جانے دو۔ میں تمھیں اپنی گود میں سلاؤں گی۔“ مگر وہ ضد کرنے لگا میری ایک نہیں سنی۔

”یہ کیا نخرے ہیں گڈّو، جاؤ اپنی دادی اماں کے پاس جا کر سو رہو۔“ انھوں نے ڈانٹ پلائی۔ گڈّو چلا گیا تو وہ بولے ”کل منّا آ کر ضد کرنے لگا تھا تو تم نے اس ننھی سی جان کو ڈانٹ کر لوٹا دیا اور اب گڈّو صاحب کی خوشامد کی جا رہی ہے۔“ وہ چڑ کر بولے۔ ”ڈانٹ کیوں نہیں دیتیں تمھاری بعض حرکتیں مجھے زہر لگتی ہیں۔ منّی کو بخار چڑھا ہوا ہے اور ہم پریشان بیٹھے ہیں، مگر تم ہو کہ گڈّو کو ڈانٹنے کے بجائے سمجھانے پر تلی ہوئی ہو۔“ ہاں میں کیوں نہیں ڈانتی اس لئے نا کہ میں دنیا والوں سے ڈرتی ہوں، ان سے ڈرتی ہوں۔

گڈّو کی شرارتیں روز بروز بڑھتی گئیں۔ کبھی کتابیں پھاڑ ڈالیں، کبھی پرچ پیالے توڑ دئے، کبھی منّی کا فراک لے کر چاک کر دیا منّا بھی گڈّو کی دیکھا دیکھی حرکتیں کرنے لگا جس پر وہ روز پٹتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر بھیّا کو کیوں نہیں مار پڑتی۔ وہ کیوں نہیں پٹتے۔ ممی تو بھیّا کو مارنے کے بجائے مٹھائی یا میوہ دے کر سمجھا دیتی ہیں مگر مجھے ڈانٹ پڑتی ہے، مار پڑتی ہے۔

مجھے ایک دن پتہ چلا کہ گڈّو ایک ہفتہ سے برابر اسکول نہیں جا رہا ہے۔ ویسے تو وہ صبح گھر سے نکل جاتا۔ دوپہر کے کھانے پر ٹھیک وقت سے موجود، پھر شام اسکول سے چھوٹنے پر حاضر۔ اب یہ راز کھلا کہ وہ اسکول نہیں بلکہ ان دنوں لگی ہوئی نمائش میں حاضری دے رہے ہیں۔ پھر سینما کی بھی لت پڑ گئی تھی۔ ——— گھر دیر سے لوٹنے کی وجہ پوچھتی تو کہہ دیتا کہ اپنے ایک دوست کے ہاں پڑھنے چلا گیا تھا۔

آج میں نے تہیّہ کر لیا کہ وہ گھر لوٹے تو اس کی خوب مرمّت کروں گی۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی تھی مگر اس کو آوارہ بنتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں تو اس کی ماں ہوں۔ میرا اس پر پورا حق ہے۔ میں دنیا سے کیوں ڈرتی۔ وہ میرا ہی تو بچّہ ہے۔ اف میں آج تک نہ جانے کیوں سوسائٹی سے ڈرتی رہی۔ دل میں بیٹھے ہوئے چور کو میں نے نکال باہر کیا۔ میں غصّے سے لرز رہی تھی۔ میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی۔ چھ بجنے کو آئے مگر گڈّو ابھی تک نہیں لوٹا۔ میں اپنے کمرے کو لوٹ ہی رہی تھی کہ وہ آتا دکھائی دیا۔

”کہاں گیا تھا گڈّو رے؟“ میرے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر وہ سہما۔ ”میں پوچھتی ہوں کہاں گیا تھا؟ جواب کیوں نہیں دیتا؟“

”اسکول سے لوٹ رہا ہوں۔“ اس نے جھوٹ بول دیا۔

میں نے اس کی جیبیں ٹٹولیں۔ سینما کے ٹکٹ کے ٹکڑے دیکھ کر میں چلّائی۔ ”یہ اسکول میں ٹکٹ بانٹے جاتے ہیں نا؟ مجھے غصہ آ گیا۔ میں اس کو پیٹنے لگی۔ ”آوارہ ہو جائے گا کیا۔“ میں کہہ بھی رہی تھی اور مار بھی رہی تھی۔ جب تھک گئی تو دیکھا کہ اس کے گال پھول گئے ہیں مگر اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ رہی ہے۔ اس نے یکایک میری گردن میں بانہیں ڈال دیں اور مجھ سے چمٹ گیا اور بولا ”مجھے اور مارو ماں، مجھے اور مارو۔“ میں نے اس کی طرف تعجّب خیز نظروں سے دیکھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ کہہ رہا ہو ’تمھاری اس مار کے لئے میں ترس گیا تھا ماں، تمھیں یاد ہے ماں جن میں نے منّی کو خواہ مخواہ اس دن اس لئے گرایا تھا کہ کم از کم آپ منّی کے گرنے کی وجہ سے مجھے پیٹیں گی — پھر اس دن میں نے زبردستی دودھ پی لیا — میں نے پرچ پیالے توڑے — اپنے کپڑوں کی دھجیاں اڑائیں — منّی کے فراک کو پھاڑ ڈالا تھا — محض اس لئے کہ تم مجھے مارو..... جب مجھے اتنا چاہتی ہو تو مجھے مارنے سے کیوں ڈرتی ہو...... تم منّی اور منّے کو مارتی ہو مگر مجھے کیوں نہیں مارتیں — میں بھی تو آپ کا بیٹا ہوں۔‘

اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کے دیکھا گویا اس کی آنکھیں کہہ رہی ہوں۔ "آج میں کتنا خوش ہوں۔ تم نے آج واقعی مجھے سچے دل سے چاہا ہے۔ مجھے اپنا سمجھا ہے" میں نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ان پھولے ہوئے گالوں کو سہلایا۔ اس کے ہونٹوں کو چوما۔ اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی۔ اس کے ہاتھوں کو لے کر اپنے رخساروں پر پھیرا۔ میرے آنسو نکل پڑے اور میں نے اس کو اپنی گود میں بھینچ لیا۔ یہ تو میری بھول تھی، نادانی تھی کہ میں نے اس کو اپنا سمجھتے ہوئے بھی اس کو غیریت کا احساس دلایا، سوتیلے پن کے جذبے کو جگایا، اس لئے کہ میں دنیا والوں سے ڈرتی رہی مجھے کسی کا ڈر کیوں ہو۔ یہ تو میرا بچہ ہے۔ میں اس کی ماں ہوں۔ میں اس کو ماروں گی بھی اور اس کو پیار بھی کروں گی۔۔۔۔۔ اس کو ڈانٹ بھی پلاؤں گی اور اس سے محبت بھی کروں گی۔

"مجھے مارو گی ناماں، مجھے مارو گی نا؟" وہ عجیب معصومانہ انداز میں پھر سے دہرا رہا تھا۔

"کیوں نہیں، سزا تو ضرور دوں گی، اگر تو نے بے جا حرکتیں کیں۔ دیکھا نہیں کہ ابھی میں نے کتنا پیٹا ہے تجھے، تو میرا بیٹا ہے، میرا اپنا۔"

اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر آئے۔

عطیہ کے خطوط موسومہ شبلی (صفحہ ۲۸ سے آگے)

اماں جان، حضور نواب صاحب ہمشیرہ جان زہرا بہن، نازلی بیگم سب آداب کہتے ہیں۔

عاجزہ

عطیہ

از مادنٹ ناورز

۱۲ فروری ۱۹۰۸ء مٹر گاؤں بمبئی۔

(۲)

Ahmed Gunj,

Murud Janjira

۳۰ مارچ [۱]

محترم جناب مولانا شبلی صاحب

زمانہ ہو گیا کہ آپ کی طرف سے کوئی خبر نہیں ہے۔ آپ کے دو مشرف نامے مجھے کپورتھلہ اور دہلی میں ملے تھے، ان کے جواب میں نہیں لکھ سکی کیونکہ میرا ارادہ نہ ہوا۔ بڑا لمبا سفر کر کے آخر تھوڑا عرصہ ہوا کہ اس بہشت میں آئی اور اب اس کو دیکھ کر سارے اول کے ارادے منقطع کرنے ہوتے ہیں۔ اور کہیں جانے کا دل نہیں ہوتا ورنہ ہفتے میں ہیں منصوری جانے والی تھی مگر اب تو شاید سال بھر یہاں سے قدم نہ اٹھاؤں۔ دنیا میں سب سے اچھا مقام یہی ہے۔ ہمشیرہ جان سے سنا کہ شعرالعجم حضور کے پاس آ چکا ہے۔ میں نے ابھی نہیں دیکھا۔ آج کل سارو جنی نائیڈو بھی یہاں ہیں اس سے لطف دیکھنے رہتا ہے۔ بڑی خوش اور رنگین طبیعت ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا بمبئی میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا!

انگریزی میں عمر خیام باتصویر نکلی ہے، آپ نے اس نسخے کو دیکھا ہے؟ ضرور دیکھئے اور کسی انگریزی داں سے کہئے کہ آپ کو ترجمہ کر کے سنائیں۔ ۳۰ ہم نئے نسخے نکلے ہیں لیکن سب سے اچھا Admund Dulac کا ہے۔ اس مصوّر کو بذات خود میں اچھی طرح جانتی ہوں اور خیالوں سے میں (نے) مدد بھی کی ہے بلکہ چند تصویریں تو قریباً میرے خیالوں کا نتیجہ ہے (ہیں) کاسشش میں مصوّر ہوتی!

اُمید ہے آپ کا مزاج بہت اچھی طرح سے ہے۔

عاجزہ

عطیہ

---

[۱] اس خط پر سنہ درج نہیں لیکن قرین قیاس ہے کہ یہ خط ۱۰ء کا ہے۔

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل دہلی

ترتیب

رسالے کی پشت پر:- کلو میں دسہرے کا میلہ

جلد ۲۲ - نمبر ۳

اسوان شک سمت ۱۸۸۵

اکتوبر ۱۹۶۳ء

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" اردو، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

سالانہ چندہ:۔	ہندوستان میں:۔	سات روپے
	پاکستان میں:۔	سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے:۔		۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر
قیمت فی پرچہ:۔	ہندوستان میں:۔	۶۰ نئے پیسے
	پاکستان میں:۔	۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے:۔		۱ شلنگ یا ۶ پنس

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

مُلاحظات

دنیا کے تمام امن پسند ملکوں نے فضا، خلا اور زیرِ آب ایٹمی تجربوں پر پابندی کے معاہدے کو 'بین قومی تعلقات کی تاریخ میں ایک سنگِ میل' قرار دیا ہے۔ یقیناً اس معاہدے سے قیامِ امن میں مدد ملے گی۔ گو کہ دنیا کے امن و سلامتی کی ضمانت تو مکمل اسلحہ بندی سے ہو سکتی ہے مگر پھر بھی یہ معاہدہ کئی لحاظ سے بڑا اہم اور دور رس نتائج کا حامل ہے توقع کی جاتی ہے کہ اس سلسلے میں سربرآوردہ قومیں مزید اقدامات کریں گی۔

دنیا کے تقریباً سبھی ملکوں نے اس معاہدے پر خوشی و مسرت کا اظہار کیا ہے اور اس معاہدے پر دستخط کر دئے ہیں۔ لیکن چین کی نظروں میں یہ معاہدہ 'سوشلسٹ چین کے خلاف ایک سازش ہے'! چین کی امن کمیٹی کے صدر مسٹر کو موجو نے اس معاہدے کو 'سامراجیوں کے ساتھ مل کر ایٹمی ہتھیاروں کا اجارہ حاصل کرنے کی کوشش' سے تعبیر کیا ہے۔

اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ چین نے جنوری ۱۹۵۸ء میں قاہرہ کانفرنس میں سری جواہر لال نہرو کے مشورے کی تائید کرتے ہوئے کہا تھا "ایشیائی اقوام اپنی اپنی حدود میں نیوکلیر ہتھیاروں پر پابندی لگائیں۔" ایشیا اور افریقہ کے استحکام سے متعلق ایک کانفرنس میں ایشیا اور افریقہ کو ایک خطۂ امن بنا دینے کی قرارداد پیش کی گئی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی بیرونی ملک یہاں ایٹمی یا راکٹ ہتھیاروں کا استعمال نہ کرے۔ ۱۰ فروری ۱۹۵۸ء کو مسٹر چو۔این۔ لائی نے اس قرارداد کو سراہتے ہوئے اسے کلیدی اہمیت کا حامل بتایا تھا۔ لیکن اب وہی چین نیوکلیر ہتھیاروں پر پابندی کو 'عیاری اور سازش' قرار دے رہا ہے۔

چین کے اس رویے کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ وہ بھی ایک ایٹمی طاقت بننا چاہتا تھا۔ کوریا کی صلح کی دسویں سالگرہ کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے مسٹر کو موجو نے کہا تھا۔ "جلد ہی ایٹمی ہتھیاروں کی اجارہ داری کو ختم کر دیا جائے گا۔"

چین کے خطرناک ارادے اور اس کی امن دشمنی اب دنیا سے مخفی نہیں ہے۔ دو تین ملکوں کو چھوڑ کر کوئی بھی اس کا ہم نوا نہیں طاقت کے گھمنڈ میں ہی اس نے ہندوستان جیسے پُرامن اور دوست ملک پر حملہ کر دیا اور وہ اب کھلم کھلا روس سے نبرد آزما ہے لیکن دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جس قوم نے طاقت کے نشے میں حق اور ناحق کا خیال نہیں رکھا ہے اس کا انجام بڑا بھیانک ہوا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ چینی حملہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان کی ناوابستگی کی پالیسی ناکام رہی ہے۔ مگر اس کے برعکس واقعات اور حالات نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ہندوستان کی پالیسی بالکل درست تھی۔ اگر ہندوستان کسی ایک گروہ سے وابستہ ہوتا اور اس کا تعلق فوجی گٹھ جوڑ سے ہوتا تو چینی حملہ عالمی جنگ کی صورت اختیار کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ ناوابستگی کا ہی کرشمہ ہے کہ ہندوستان روس اور امریکہ دونوں بلاکوں سے مدد لے رہا ہے اور دونوں کی نظروں میں اس کی وقعت اور عزت ہے۔

دنیا کے بہت سے مدبروں اور اہل الرائے حضرات نے ہندوستان کی ناوابستگی کی پالیسی کو سراہا ہے۔ لارڈ الکرڈ نکم ایک مضمون میں

لکھتے ہیں۔ "حالیہ برسوں میں ہم نے اس بارے میں بہت کچھ سنا ہے کہ جرمنی، اٹلی اور جاپان نے (جنگ کے بعد تعمیر و ترقی کے لحاظ سے) معجزہ کر دکھایا ہے لیکن ہندوستانی معجزے کے بارے میں بہت کم باتیں کہی جاتی ہیں جس کی وجہ سے ایک کثیر اور ناخواندہ آبادی جمہوریت کے راستے پر آگے بڑھ رہی ہے..... ہندوستان نے اب تک جو کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ ناوابستگی کی پالیسی کے بغیر ناممکن تھیں۔"

کنگسلے مارٹن نے اپنی ایک تقریر میں کہا۔ "ہندوستان کو اپنی ناوابستگی کی پالیسی ترک نہیں کرنی چاہیئے۔ کئی ملک ناوابستگی کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ اگر یہ پالیسی ناکام ہو گئی تو عالمی جنگ کے امکانات بڑھ جائیں گے۔"

گھانا کے وزیر انصاف مسٹر افوری عطا نے فرمایا۔ "ہمارے (افریقی) ملکوں کی اکثریت اپنے اپنے طریقے سے اس نتیجے پر پہونچی ہے کہ موجودہ عالمی صورت حال میں ہم صرف ناوابستگی کی پالیسی ہی اختیار کر سکتے ہیں۔ ہندوستان اس پالیسی کے پیش رو کی حیثیت سے تمام دنیا سے تحسین وصول کر چکا ہے۔

عرب لیگ کے نمائندے مسٹر مقصود نے اتر پردیش کی مجلس قانون ساز کے ممبروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "ہندوستان کی ناوابستگی کی پالیسی کامیاب ہوئی ہے اور یہ وقت کی کسوٹی پر پوری اُتری ہے۔

ناوابستگی کا صاف اور سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ فوجی گٹھ جوڑوں سے الگ رہا جائے۔ اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کئے جائیں اور کسی قسم کا کوئی دباؤ ہمارے فیصلوں کو متاثر نہ کرے۔ ہندوستان کا خیال ہے کہ ہر ملک کو نہ صرف آزاد ہونے کا حق حاصل ہے بلکہ اپنی پالیسی اور اپنے طریقۂ زندگی کے متعلق آزادانہ فیصلے کرنے کا بھی حق ہے۔ وابستہ ہو جانے سے یہ آزادی باقی نہیں رہتی اس لئے ناوابستگی کی پالیسی کو ہر لحاظ سے کامیاب کہا جا سکتا ہے۔

نیپال کے مہاراجہ ہمارے ملک کے لئے کوئی اجنبی نہیں ہیں۔ دونوں ملک جغرافیائی، تاریخی اور ثقافتی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ دونوں غیر جانب داری کی پالیسی پہ گامزن ہیں اور دونوں عالمی امن کے خواہاں اور تمام مسائل کو اشتراک اور مفاہمت سے حل کرنے کے قائل ہیں۔ ہندوستان نے ہمیشہ نیپال کے مفاد اور بہتری کا خیال رکھا ہے اور دونوں ملک اچھے پڑوسیوں کی طرح رہتے آئے ہیں۔ امید ہے کہ مہاراجہ اور مہارانی صاحبہ نیپال کا حالیہ دورۂ ہندوستان دوستی اور خیر سگالی کے جذبات کو مزید مستحکم اور پائیدار بنانے میں معاون ہوگا۔

وزیر اعظم سری نہرو اور مہاراجہ نیپال نے ایک مشترک بیان جاری کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دونوں ملک تجارت اور معاشی ترقی کے میدان میں زیادہ سے زیادہ اشتراک کریں گے۔ اس اعلانیے میں سونول پوکھارا روڈ کی تعمیر کے لئے بھی ہندوستان کی آمادگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ سڑک اتر پردیش کو مغربی اور وسطی نیپال سے ملائے گی۔ اس طرح دونوں پڑوسی اور نزدیک آجائیں گے۔

بوکارو میں کارخانے کے قیام کے سلسلے میں امریکی امداد نہ ملنے کے باوجود حکومت ہند اسے قائم کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ کارخانے اور ٹاؤن شپ کی تعمیر کے لئے زمین حاصل کی جا رہی ہے۔ خام لوہا کے لئے کیری بورو کی کان مخصوص کی گئی ہے۔ چونے کے پتھر کمونا تھ پور اور ستنا سے حاصل کئے جائیں گے۔ پانی اور بجلی کا انتظام ہو چکا ہے نقل و حمل سے متعلق مسائل طے پا گئے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس کی تعمیر جلد شروع ہو جائے گی۔

افسوس ہے کہ جناب ادیب سہارن پوری کا حال ہی میں پاکستان میں انتقال ہو گیا۔ ادیب صاحب اچھے غزل گو تھے اور مشاعروں میں خوب دادِ سخن وصول کرتے تھے۔

جناب سرشار کسمنڈوی کے انتقال پر ملال کی بھی خبر ملی ہے۔ سرشار مرحوم بڑے کہنہ مشق شاعر تھے۔ دونوں حضرات کی موت اردو زبان کے لئے ایک نقصانِ عظیم ہے۔

مہاتما گاندھی نے کہا

قومی لغت میں بزدلی کی کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیئے۔ بزدلی سے نجات پانے کا طریقہ یہ ہے کہ خطرات کا مقابلہ کیا جائے۔ بزدلی ہنسا (تشدد) کی ایک قسم ہے اور اس پر قابو پانا بہت مشکل ہے۔ بزدلی کے مقابلے میں کوئی بھی چیز بہتر ہے

کسی دوسرے کو نقصان پہونچانا صریحاً ہنسا ہے مگر کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کے درپے ہونا یا بزدلی کی وجہ سے اپنی یا اپنے پڑوسی کی حفاظت کی کوشش نہ کرنا بھی ہنسا ہے اور غالباً اوّل الذکر صورت کے مقابلے میں زیادہ بُرا ہے۔

حفاظت اور مدافعت خواہ تشدد کے ساتھ کی جائے یا عدم تشدد کے ساتھ خوب سوچ سمجھ کر کی جائے۔ بے سوچی سمجھی مدافعت فوجی نقطۂ نگاہ سے دکھاوے کی بہادری اور اہنسا کے لحاظ سے ہنسا یا بے وقوفی سمجھی جائے گی۔ پیچھے ہٹ جانا بعض اوقات مدافعت کی ایک صورت ہوتی ہے اور زیادہ بہادری اور قربانی کا پیش خیمہ۔ پیچھے ہٹ جانا ہر صورت میں بزدلی نہیں ہوتی جس کا مطلب موت کا خوف ہے۔ بلاشبہ ایک بہادر شخص اس حملہ آور کا متشددانہ یا عدم تشددانہ مقابلہ کرتے ہوئے جو اس کی جائیداد چھین لینا چاہتا ہے، اکثر اپنی جان دے دیتا ہے۔ لیکن اگر عقل مندی کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اس وقت پیچھے ہٹ جائے تو اس سے اس کی بہادری میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

اس سے زیادہ کوئی اور بہادری نہیں ہو سکتی کہ کسی دنیاوی طاقت کے آگے گھٹنے نہ ٹیکنے کا عزم مصمم کر لیا جائے خواہ وہ کتنی بڑی کیوں نہ ہو۔

ایسے مرد و عورت جنھوں نے موت کے خوف و ہراس کو دلوں سے بالکل نکال دیا ہے نہ صرف اپنی حفاظت کر سکتے ہیں بلکہ اپنی جانیں دے کر دوسروں کی بھی حفاظت کر سکتے ہیں۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ ہم موت سے بہت ڈرتے ہیں اور اس وجہ سے انجام کار طاقت ور کے آگے جھک جاتے ہیں۔ کچھ لوگ حملہ آور کے آگے گھٹنے ٹیک دیں گے، کچھ لوگ رشوت دیں گے، کچھ پیٹ کے بل رینگ کر چلیں گے یا اس قسم کی دوسری بے عزتی برداشت کریں گے۔ اس لئے وہی شخص جو اپنی جان گنوا سکتا ہے اس کی حفاظت کر سکتا ہے۔

دنیا میں ایسے لوگوں کی کوئی جگہ نہیں جو روحانی طور سے کمزور ہیں۔ خدا سے ڈرنے والے موت سے نہیں ڈرتے۔ بلکہ یہ (موت) ان کے لئے ایک نشاط انگیز نیند ہے جس کے بعد بیدار ہوں گے اور اس لمبی نیند کے بعد یہ بیداری بڑی فرحت بخش ہوگی۔

روحانی کردار کی پہلی شرط بے خوفی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ تمام خوف و ہراس کو اپنے دل سے نکال دینے کا پکّا عہد کر لیں۔ بے خوفی کے بغیر تمام دوسری خوبیاں خاک میں مل جاتی ہیں۔ سچائی یا اہنسا کا حصول نڈرتا کے بغیر ناممکن ہے۔

میرا اہنسا کا جو تصوّر ہے اس میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ اپنے عزیزوں کو خطرے میں چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کی جائے۔ تشدد اور بزدلانہ فرار کے درمیان میں بزدلی کے مقابلے میں تشدد کو ترجیح دوں گا۔ اہنسا بہادری کی بلند ترین چوٹی ہے۔

افراد یا اقوام (آخری آدمی تک) کو اپنی عزت و وقار کے علاوہ ہر چیز قربان کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ خودداری اور عزت کی حفاظت دوسرے نہیں کر سکتے۔ اس کی حفاظت ہر فرد کو کرنی چاہیئے۔

ایک بہادر آدمی اپنی خودداری اور عزت کھو دینے کے مقابلے میں موت کو ترجیح دیتا ہے۔

شمعِ خوش فروغ

روحِ میخانہ کہاں سے آئی ہے
گوشۂ چشمِ بتاں سے آئی ہے
خاک کوئے یار بن کر رہ گئی
جو تجلّی آسماں سے آئی ہے
میکدے میں ایک شمعِ خوش فروغ
محفلِ روحانیاں سے آئی ہے
رنگ و بو کا قافلہ لے کر بہار
خاک دخوں کے درمیاں سے آئی ہے
چہرۂ اہلِ یقیں پر تازگی
غازۂ حسنِ گماں سے آئی ہے
کم نظر، منزل سمجھ بیٹھے اسے
گرد اُٹھ کر کارواں سے آئی ہے
رات بھر یادِ خدا ہوتی رہی
نیند پھر ذکرِ بتاں سے آئی ہے
رکھ لیا آنکھوں پہ دامانِ صبا
اب یہ کیا کہئے کہاں سے آئی ہے
لائی ہے تسکینِ جاں، شامِ فراق
مِل کے اس آرامِ جاں سے آئی ہے
یہ دل آویزی غزل میں اے روشؔن
تیرے اندازِ بیاں سے آئی ہے

سیّد غلام حسنین قدرؔ بلگرامی

۱۲۴۹ھ تا ۱۳۰۱ھ

ہندوستان میں بلگرام کا وہی درجہ ہے جو یورپ میں یونان کا تھا۔ یونانی علم و دانائی میں مشہور عالم تھے۔ یہی حال اہلِ بلگرام کا تھا۔ مگر افسوس نہ علم یونان میں باقی رہا نہ بلگرام کی میراث رہ سکا۔ سیّد محب اللہ مد ظلہ، علامہ سیّد عبد الجلیل بلگرامی، علامہ سیّد غلام علی آزادؔ بلگرامی، حافظ سیّد عبد الجلیل بلگرامی، حضرت سیّد صاحب عالم صاحب بلگرامی، سیّد فرزند احمد صفیرؔ بلگرامی، حاجی شاہ سیّد علی حسن بلگرامی ثم مارہروی، سیّد مبارک محدث رح، مولوی سیّد علی بلگرامی، حاجی سیّد وصی احمد بلگرامی — جیسی شخصیتیں خطۂ بلگرام نے پیدا کیں۔ جن کے علمی تبحر اور ذہنی نشو و نما کی برکاتِ جلیلہ سے دنیائے علم آج بھی روشن و منور ہے۔ ایسی ہی شخصیتوں میں سیّد غلام حسین قدرؔ بلگرامی کا شمار ہے۔

قدرؔ کا خاندانی اور تاریخی نام غلام حسنین ہے۔ انھوں نے اپنے نام کی شانِ نزول میں جو قطعہ نظم کیا تھا وہ درج ذیل کیا جاتا ہے :۔

سو جان سے ہیں فدائے نام حسنینؑ	ہے چشم و دل و جگر مقام حسنینؑ
ہم روزِ ولادت سے ہوئے نام اُن کے	تاریخی نام ہے غلام حسنین

۱۲۴۹ھ

اپنے وطن مالوف کی نسبت فرماتے ہیں :۔

ہشیار ہو قدرؔ بلگرام آیا ہے
سوچو تو زمانہ کس کے کام آیا ہے
آتا نہ ہنسو یہیں ہوئے تھے پیدا
روتے تھے جہاں وہی مقام آیا ہے

قدرؔ کے دادا کا نام سیّد کرامت علی اور باپ کا اسمِ گرامی سیّد خلف علی تھا۔ ان کی پیدائش ماہ جمادی الآخر ۱۲۴۹ھ میں محلہ سلہڑہ قصبہ بلگرام ضلع ہردوئی (یو۔پی) میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم قصبۂ بلگرام ہی میں حاصل کی تھی۔ اس سلسلہ میں ان کے معاصر، ہم نام اور ہم عمر و دوست سیّد فرزند احمد صفیرؔ بلگرامی اپنے تذکرہ 'جلوۂ خضر' میں یوں رقمطراز ہیں :۔

"قدرؔ۔ سیّد غلام حسنین بلگرامی ولد میر خلف علی ساکن محلہ سلہڑہ بلگرام، اس یکتائے زمانہ کا حال کمالِ شہرت سے اظہر من الشمس ہے۔ یہ مؤلف کے ہم نام اور ہم وطن تھے۔ یعنی غلام حسنین نام تاریخی ہے اور مؤلف کے نانا حضرت صاحب عالم صاحبؒ نے مؤلف کا تاریخی نام یہی نکالا تھا، مگر مشہور فرزند احمد ہوا۔ ۱۲۴۹ ہجری میں قدرؔ بلگرامی کی ولادت ہے۔ ان کے والد ماجد بڑے متقی پرہیزگار تھے۔

بھائی قدر کی شادی قصبہ کواتھ ضلع شاہ آباد (بہار) میں کہ آرہ سے اٹھارہ کوس پر ہے، میرے خاندان میں ہوئی تھی۔ اس وقت سے میرے ساتھ اون کو ایک خلوص خاص تھا۔ میں اس وقت شعر کہتا تھا مگر بھائی قدر کو شوق نہ تھا۔ جب وہ بعد شادی بلگرام گئے اور [وہاں سے] لکھنؤ میں جا کر رہے، حضرت سحر کے شاگرد ہوئے۔ اور مرزا برق سے اور سحر سے عروض وغیرہ پڑھا۔ اساتذہ کی صحبتیں دیکھیں، جھگڑے اور معرکوں میں شریک رہے۔ آخر مدرس سرکار ہو گئے۔ ۱۲۸۰ ہجری میں [ص ۲۲۷ جلوۂ خضر] جب میں اپنی شادی کو بلگرام گیا اور میری دوسری شادی قدر کے خاندان میں ہوئی ہے۔ اوس وقت بھائی قدر ہردوئی میں مدرس تھے۔ مجھ سے بلگرام میں ملاقات کی۔ اور چند مشاعرے بھی کئے۔ اور اون کا کلام سب دیکھا۔ اون کی معلومات اور بلند فکری کا کیا کہنا ہے۔ بعد حضرت سحر کے حضرت بحر اور

لے

شجرہ صفیر و قدر بلگرامی

صفیر بلگرامی

سید غلام یحیی
سید عبدالحی عرف سید احمد
سید فرزند احمد صفیر

زوجہ صفیر وجاہت فاطمہ
بنت محمد حیات ابن علی نقی

سید نور احمد — سیدہ فاطمہ

سید عنایت احمد — سید وصی احمد — اکرام فاطمہ [مضمون نگار کی والدہ]

(۱) محمد حیات بن علی نقی بن محمد حسن
ان کی ایک لڑکی زوجۂ صفیر اور دوسری زوجۂ سید محمد روشن خان بلگرامی

(۲) یہ دونوں بہنیں تھیں محمد محسن بن محمد حیات بن علی نقی کی

(۳) محمد محسن

اسد اللہ — نور اللہ — امیر حسن

کاظم حسین (فوت) — یاد حسین (حیات) — کلثوم فاطمہ (فوت)

قدر بلگرامی

سید کرامت علی
سید خلف علی
سید غلام حسنین قدر

زوجۂ قدر = محبت فاطمہ
بنت محمد تقی برادر علی نقی و ہمشیر الطاف فاطمہ

× لاولد

(۱) محبت فاطمہ زوجۂ قدر لاولد

(۲) محبت فاطمہ کی بہن الطاف فاطمہ زوجۂ ڈپٹی سید علی حسین بن سید ابو محمد کواتھ ضلع آرہ (بہار) [مضمون نگار کے جد اعلیٰ]

(۳) محبت فاطمہ کے چچا زاد بھائی محمد حیات ابن علی نقی برادر محمد تقی

(۴) علی نقی کی پوتی [وجاہت فاطمہ] صفیر سے اور محمد تقی کی بیٹی قدر سے منسوب تھیں۔

(۵) قدر بلگرامی ہم زلف ڈپٹی علی حسین صاحب کواتھ ضلع آرہ

صفیر اور قدر کا رشتہ تشریح بالا سے اظہر من الشمس ہے۔

حضرت غالب سے بھی مشورہ لیا - اون کا سرمایہ سب میری نظر سے گزرا - آخر ہردوئی سے بدل کر کیننگ کالج لکھنؤ کے مدرس ہوئے اور وہیں عمر گزری -

لطیفہ : بھائی قدر نے مجھ سے کہا تھا کہ عجب طرح کی
بات ہے کہ قدر اور مدرس کے عدد ایک ہیں
۳۰۴ ۳۰۴
میری قسمت میں اس نوکری کے سوا دوسری
نوکری نہیں ہے - وہی ہوا -

آخر عمر میں جب ۱۳۰۰ ہجری میں حضور نظام حیدرآباد نمائش گاہ کلکتہ میں تشریف لائے تھے، لوگوں نے بھائی قدر کو آمادہ کیا - قدر نے ایک قصیدہ غرا لکھ کر حضور نظام کی ملازمت کی - حضور عالی نے چار سو روپیہ مشاہرہ کا نوکر رکھ لیا اور اپنے ساتھ حیدرآباد لے گئے، مگر افسوس -

قسمت کو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

بیمار تو کلکتہ ہی میں ہوئے تھے - مگر حیدرآباد جا کر بہت بیمار ہوئے یہاں تک کہ حضور عالی کی ملازمت بھی شاید دو ایک بار ہوئی - باقی فرش آزار پر پڑے رہے - جب بیماری کی شدت ہوئی تو آخر ۱۳۰۰ھ میں لکھنؤ آئے - علاج ہوتا رہا - پہلو میں دنبل نکل آیا - اوس کی تکلیف سے جاں بر نہ ہوئے - ۱۴ ستمبر ۱۸۸۴ء مطابق ۲۳ ذی قعدہ ۱۳۰۱ھ لکھنؤ میں انتقال کیا اور [1] وہیں دفن ہوئے - جنازہ کے ساتھ صدہا بلکہ ہزارہا شاعر و غیر شاعر تھے - سب کو ایسے شخص کے مرنے کا افسوس ہوا - آبروئے بلگرام تھے، بلکہ ہندوستان کے محقق گرامی تھے - خدا بخشے -

صفیر نے ان کے غم میں نالۂ جاں سوز کئے اور چند رباعیات لکھیں - جو بے تکلف شاعری ہیں - وہ مناسب مقام سمجھ کر لکھی جاتی ہیں -

افسوس بھائی قدر لا ولد گئے اور نہ اون کا کلام سب چھپنے پایا - چند کتابیں اسکول کے متعلق ان کی تحقیق کی گواہ ہیں -

ایک مثنوی قضا و قدر شعلۂ طور کانپور میں چھپی تھی -

رباعیات صفیر در غم قدر بلگرامی (ص ۲۲۸ جلوۂ خضر)

(۱) بے قدر کٹی یہ زندگانی تیری
جز شعر رہی نہ کچھ نشانی تیری
اے قدر گیا تو جانب ملک عدم
بات قدر کسی نے بھی نہ جانی تیری

(۲) سونا ہے قدر تیرے مرنے سے وطن
کس کس کو نہیں ہے تیری رحلت کا محن
کیا قدر ہوئی ہے عمر آخر تیری
افسوس کہ کھا گیا تجھے ملک دکن

(۳) کس حوصلے پہ مشق ہنر تجھ کو تھی
مر جائے گا یوں، یہ کیا خبر تجھ کو تھی
بارہ [۱۲] استادوں کی تھیں آنکھیں دیکھیں
اے قدر یہ کھنے کی نظر تجھ کو تھی

(۴) تیرا ہے فقط مقام سونا، اے قدر
یاں عالم ہے تمام سونا، اے قدر
لگتا نہیں جی صفیر کا بے تیرے
بے تیرے ہے بلگرام سونا، اے قدر

---

[1] "حضرت قدر غلام حسنین اسم شریف بلگرامش وطن و سید رتبہ و جاہ
روز یکشنبہ و بست و سوم ذی القعدہ فوت کردآں شہ اقلیم سخن وا ویلاہ
سنہ رحلت او ارشد مغموم نوشت تشد روان قدر بسوئی ارم - انا للہ"

۱۳۰۱ ہجری

ارشد بلگرامی شاگرد قدر بلگرامی

دیباچہ کلیات قدر مرتبہ سید ابن علی بلگرامی عم زاد قدر میں ہے:

"...... باون برس کی عمر میں بست و سوم ماہ ذی القعدہ ۱۳۰۱ ہجری مطابق چہاردہم ماہ ستمبر ۱۸۸۴ء روز یکشنبہ شہر لکھنؤ میں اس دار فانی سے رحلت فرمائی - اور وہیں میر خدا بخش کی کربلا میں مدفون ہوئے ......"

[کلیات قدر ص ۷-۸]

ان کی بی بی کا [ص ۲۲۹ تذکرۂ خضر] دو سو روپیہ مشاہرہ مقرر کر دیا۔ سنا ہے کہ ان کی بی بی اودن کا کلام چھپوانے[1] کو ہیں۔ چند شعر اس معرکہ آرائی سخن[2] کے لکھے جائیں گے۔ پہلے ان کا ایک خط جو میرے نام ہے اور وہ آخری خط ہے۔ اس کے بعد پھر کوئی تحریر نہیں آئی۔[3] لکھا جاتا ہے۔ یہ خط میرے ایک نامہ کے جواب میں ہے جو ان کو 'تاریخ بلگرام' کے مادہ میں لکھا گیا تھا:

خط سید غلام حسنین قدرؔ بلگرامی غفران مآب
بنام صفیرؔ بلگرامی دل کباب

خط کی بھی کیا بات ہے، دور کی سوغات ہے
نصف ملاقات ہے، بھیجئے اے یار خط

برادر برابر سید فرزند احمد صاحب صفیر دیروزی۔ بجرا۔ مزاج اقدس۔

دو خط آپ نے بھیجے اور ایک پیغام۔ آپ نے بلگرام کی تاریخ شروع کی بلکہ تمام۔ یہ بڑا کام کیا۔ قیدیں بھی اچھی لگائیں۔ مجھے کیوں نہ لکھ دیا کہ ایک فقیر مذہب آزاد مشرب ہے۔ نکما

---

[1] کلیات قدر۔ دفاتِ قدر کے سات سال بعد اور دفاتِ صفیر کے ایک سال بعد ۱۳۰۸ ہجری میں مطبع مفید عام آگرہ سے طبع ہوا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سید علی بلگرامی کی سعی بے انتہا شاملِ حال تھی۔ حکیم قیام الدین نیرؔ نے تاریخ سالِ طبع کہی:

بہر سن تین بار نیرؔ نے
کہہ دیا: چھپ گیا کلامِ قدرؔ: = ۴۳۶ × ۳

۴۳۶ ۱۳۰۸ھ

[2] معرکہ آرائی سخن کے ضمن میں صفیرؔ کے علاوہ سید ابن علی بلگرامی کا بیان کلیاتِ قدر میں ص ۴-۶ پر موجود ہے۔ ایک معرکہ ملاحظہ ہو:

دل شرر تھا سوزشِ غم سے اوچھل کر رہ گیا
میں جہاں بیٹھا برنگِ شمع جل کر رہ گیا (قدر بلگرامی)

نواب غلام حسین خان، حسین تخلص نے فرمایا کہ شمع کے واسطے بیٹھنا نہیں آیا اوٹھنا البتہ مسموع ہے۔ قدرؔ نے مصحفیؔ کا مطلع سنداً پڑھا۔

شمع کی طرح سے چپ بیٹھے ہیں آسن مارے
گر ہلاتے ہیں زباں جاتے ہیں گردن مارے

اسی طرح ایک اور مشاعرہ میں قدرؔ کے اس شعر پر اعتراض ہوا جس کی تفصیل بھی کلیاتِ قدر میں موجود ہے:

قاصد یہ کہنا یار کے مرتِ یار کا مزاج پوچھا ہے اک غریب نے سرکار کا مزاج
(قدر بلگرامی)

سرِ مشاعرہ خواجہ وزیر کے ایک شاگرد نے اعتراض کیا کہ:
'محبوب کو سرکار کہنا کمہاروں کی بولی ہے'
قدرؔ نے فوراً جواب دیا کہ آپ کے استاد کا شعر ہے:

باغ کو جائے گا ابرِ سیہ مست اٹھا پیش خیمہ تو روانہ ہوا سرکار کا آج

[3] "یہ آخری خط ہے اس کے بعد پھر کوئی تحریر نہیں آئی۔۔۔"

یہ بیان قابلِ توجہ ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ جلوۂ خضر میں اس خط کے اندراج کے بعد سال تحریر نہیں درج کیا گیا۔ لیکن آخر خط سے اشتباہ ہوتا ہے بلکہ یقین کہ یہ خط ۱۲۹۹ ہجری کے لگ بھگ لکھا گیا ہوگا۔ کیوں کہ ۱۳۰۱ھ میں قدرؔ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ یہ خیال اس لئے بھی ہوتا ہے کہ صفیر کا جوابی مکتوب از آرہ ۱۲۹۹ھ کا موجود ہے۔

لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ دراصل قدرؔ کا خط ۲۳ شعبان ۱۲۹۸ ہجری کا لکھا ہوا ہے۔ میرے پاس اس خط کی نقل خود صفیر کے دستِ قلم کی موجود ہے، جس کے جواب میں قدرؔ نے اپنا مکتوب بھیجا تھا، اس خط کے آخر میں یہ عبارت درج ہے:

" اس خط کا جواب غلام حسنین قدرؔ نے ۲۳ شعبان ۱۲۹۸ھ کا لکھا ہوا بھیجا، جو آنند رام وغیرہ کے نام کے خط کے بعد لگایا گیا۔"

صفیر بلگرامی کی اس تحریر کے بعد قدرؔ کے مکتوب کی نشان دہی ہو جاتی ہے کہ یہ خط ۱۲۹۹ ہجری میں نہیں بلکہ ۱۲۹۸ ہجری میں لکھا گیا تھا۔ جس کی تحریر کے ۳ سال بعد قدرؔ کا انتقال ہو گیا۔ یہ خط آخر اس وجہ سے ہے کہ قدرؔ کو سفر بنارس، الکلتہ اور حیدرآباد اسی سال کے بعد پیش آیا اور پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے قدرؔ اور صفیرؔ کے درمیان مزید خط و کتابت نہیں ہو سکی۔

لاابالی مزاج ۔ نیم دیوانہ نیم ہوشیار ہے

زہے آزاد پابندی — زہے پابند آزادی

بکارِ خویش سرمستی — بکارِ غیر ہوشیاری

بھئی سچ کہوں یا جھوٹ ۔ جھوٹ بولے میری بلا ۔ میرا خدا اور میں اتنا جانتا ہوں کہ خلف علی میرے باپ کا نام اور کرامت علی دادا تھے اور شاہ عبدالواحد شاہدی جدِّ اعلیٰ اور سید محمد صاحب الدعوۃ الصغریٰ جدّ القبیلہ زیدیہ سید ہوں ۔ زید سجادؑ کے بیٹے ۔ سجادؑ حسینؑ کے فرزند حسینؑ حضرت فاطمہؑ کے جسم کے گوشہ فاطمہؑ پیغمبرؐ کے جسم کا ٹکڑا ۔ طریقہ پوچھو تو نصیری ہوں ؎

شیعی مرا طریق ہے آگے خدا کا نام

بے شک علیؑ بھی نام ہے پروردگار کا

فارسی گویوں میں غالب سے بہتر اور اردو میں تجھ سے بہتر اور مرثیہ میں انیس سے بہتر کسی کو نہیں جانتا ۔ تیس برس سے شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا نہ آیا ۔ دو دیوان مرتب تھے ۔ انھیں چھانٹ کر ۱۲۹۶ ہجری میں ایک کیا اور خم خانہ[1] رکھ دیا ۔ اب تیسرا دیوان جس کو میرے حسابوں دوسرا سمجھنا چاہیئے ترتیب دے رہا ہوں ۔ اس میں صرف مسمط چہار خانہ کے اوزان ہیں ۔ علاوہ کوئی غزل نہیں ۔ ابتدائی مشق میں ایک مثنوی قضا و قدر کہی اور چھپی ۔ جس کو اب میں خود ناپسند کرتا ہوں ۔ دوسری مثنوی [بادۂ ارغوانی] بطور ساقی نامہ ظہوری[2] کی نظم کی تھی جس میں سید فرزند احمد صفیر کے ذکر کی [ص ۲۳۰

[1] دو دیوانوں کا انتخاب بنام 'خم خانہ' مرتبہ ۱۲۹۶ ہجری، ممکن ہے کہ کلیات قدر مطبوعہ ۱۳۰۰ھ میں شامل کر دیا گیا ہو ورنہ خم خانہ قدر اگر الگ سے چھپا ہے تو دیکھنے میں نہیں آیا ۔ خم خانہ 'صغر سن ۱۲۷۲ھ تا ۱۲۹۶ھ (۲۴ سال)' کے کلام کا نام بھی تھا جس کا ذکر جلوۂ خضر کے ص ۲۳۵ پر موجود ہے ۔

[2] ملا ظہوری ۔ وفات ۱۰۲۵ھ ۔ داماد ملک الکلام ملا قمی ۔ در دربار برہان شاہ والی احمد نگر ۔ دکن کی مثنوی کا ہے ۔

تذکرہ خضر[1] ایک پوری داستان رکھی تھی جس کا مطلع یہ ہے :

کروں حمد ساقیٔ جامِ الست — کہ ہو جس سے در مست دیوار مست

کھلے جب قلمدان میخانہ ہو — چلے جب قلم رقصِ مستانہ ہو

مگر افسوس کہ ۱۲۹۳ ہجری میں جب میں مہونا سے تبدیل ہو کر ہردوئی جانے لگا وہ کتاب ۹ جزو کی اور ۱۶ قصیدے ریل پر رہ گئے جن کا ایک مصرع میرے پاس نہ رہا ۔ پھر اب تیسری میں لگا لگا ہے اور لیلۃ القدر اس کا نام ہے ۔ یہ مثنوی کلیلہ دمنہ کا ترجمہ ہے ۔ نصف کتاب نظم ہو چکی تھی کہ کار فرما کا انتقال ہو گیا ۔ وہ اسی طرح ادھوری پڑی ہے ۔

عروض فارسی عربی اردو میں ایک رسالہ ۳۶ جزو کا مرتب ہو گیا ۔ اس کا تاریخی نام 'قواعد العروض'[2] ہے ۔ اب تک اہلِ فن سے مباحثہ کرتے گزری ۔ آخر میری رائیں بحال رہیں اور وہ کتاب تمامت کو پہنچی ۔ کیا عجب کہ جلد چھپ جائے ۔

بعدہ اشعار گلستاں کے کل نظم کی تقطیع مع چند فوائد لکھ کر بفرمائش نظام یار جنگ بہادر حیدرآبادی نظم الارکان ۱۲۹۳ ہجری سے موسوم کیا اور حیدرآباد بھجوایا ۔ ابھی تک دو برس سے وہاں پڑی ہوئی وعدوں کا دودھ پی رہی ہے نہ چھاپنے دیتے ہیں نہ خود لیتے ہیں ۔

نظم الارکان سے پیشتر بحکم ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم اودھ ایک رسالہ الموسوم : عطر مجموعہ : لکھا اس کا انعام بھی مل گیا اور چھپ بھی گیا ۔ یہ کتاب ایک رسالہ کی شرح ہے جس کا نام 'مجموعہ سخن' ہے ۔

فی الحال ایک کتاب اور زیر تحریر ہے ۔ اس میں اردو کے محاورات ہیں اور اہلِ دہلی میں ذوق غالب مومن اور

[1] یہ ناتمام مثنوی کلیات قدر میں ص ۶۰ تا ۷۹ پر موجود ہے ۔

[2] یہ کتاب اب نایاب ہے ۔ مگر اردو عروض پر اس سے عمدہ کتاب اب تک نظر سے نہیں گزری ۔ اس کتاب کا ایک نسخہ محترمی ڈاکٹر مختار الدین صاحب کی عنایت سے مجھے مل گیا ہے، جو میرے پاس محفوظ ہے ۔

لکھنؤ والوں میں ناسخ آتش اور ان دونوں کے تلامذہ یک لخت کے کلام سے نظایر لکھتا ہوں۔ یہ کتاب ابھی ناتمام ہے اور اصل میں پانچ مبحث ہیں :-

اول : محاورات حال و تمیز محاورات محلی و بیرونی

دوم : وہ تذکیر و تانیث جو ان دونوں میں مشترک ہیں یا تفصیل طلب

سوم : وہ الفاظ جن کا تعلق محاورات سے ہے مثلاً ڈھے پڑ دیا اوک وغیرہ

چہارم : وہ محاورے جن کا ترجمہ فارسی میں موجود ہے مثلاً آگ لینے آنا۔ آتش گرفتن و رفتن فارسی میں موجود ہے اور ایک ہی معنی پر۔

پنجم : وہ الفاظ جن میں اساتذہ کی بحثیں ہیں کہ آیا یہ فارسی الاصل ہیں یا مورد۔ مثل نیمچہ وغیرہ۔

الغرض ابھی تک صرف پانچ چھ شعراء کے کلام سے محاورہ لکھے ہیں [ص ۲۳۱ تذکرۂ خضر] اور کتاب قریب ۴۰ جزو کے پہونچ گئی۔ ظاہرا یہ کتاب میری عمر سے پیشتر ختم ہوتی معلوم نہیں ہوتی ؎

دل انگندیم۔ بسم اللہ مجریہا و مرسیٰہا

اے فرزند۔ تیرے سر عزیز کی قسم کہ مجھے اپنا حال اسی قدر معلوم تھا۔ بزرگوں کے مقامات لبشرح و بسط بزرگ جانتے ہیں۔ میں نے اپنے بڑے ماموں کو لکھا ہے جو وہ لکھیں گے تمھیں بھیج دوں گا میں نے اپنا دیوان ایک شاگرد کو دیا ہے کہ وہ دو غزلوں کی نقل کر دے اور یہ کہا ہے کہ جو تمھیں پسند آئیں وہ غزلیں لکھ دو۔ آج شام کو وہ دے گا اوس دم اس خط میں رکھ دوں گا۔ اور خط روانہ کر دوں گا۔

تم نے نام تاریخ بلگرام کا میری رائے کے خلاف رکھا۔ دارلسلام کیوں نہیں رکھتے۔ یہ نام یعنی دارالسلام بلگرام[1] کا لقب ہے۔

جب تک تم پسند نہ کرو گے میں کتاب محاورات کو کتاب نہ لکھوں گا۔ ایک جزو بھیجنے میں مجھے نہایت تکلیف ہو گی نقل کرنے کو میں تالیف سے زیادہ مشکل جانتا ہوں۔

شیخ امان علی سحر مرحوم کا چھوٹا سا دیوان چھپ گیا ہے۔ اگر اوس کے علاوہ آپ کے پاس ان کی غزلیں اور ہوں تو ہم از سرِ نو چھپوا سکتے ہیں۔"

نقل لفافہ

یارب ملک مشرق آرہ ضلع شاہ آباد بھاٹک سادات بلگرام خدمت برادرم سید فرزند احمد صفیر بلگرامی موصول باد

راقم غلام حسنین قدر

۲۳ شعبان روز پنجشنبہ (سنہ درج نہیں)

[تذکرہ جلوۂ خضر جلد دوم۔ حصہ اول مطبوعہ ۱۳۰۲ھ]

مطبع نور الانوار۔ آرہ۔ شاہ آباد صوبہ بہار

اس طویل اور بسیط اقتباس سے قدر بلگرامی کی شخصیت اور ان کی علمی صلاحیت و وسعت نظر اور ان کی بالغ نظری کے سارے مناظر سامنے آجاتے ہیں۔ قدر کی نگاہ بصیرت اتنی روشن اور فنی شعور اس قدر عظیم و پختہ تھا کہ وہ اپنے ہم عصروں میں سے کسی سے بھی آنکھ چیار کرتے ہوئے نہیں شرماتے تھے۔ سر بزم وہ اس حاضر جوابی سے معترضین کو جواب دیتے تھے کہ حاضرین جلسہ متحیر رہ جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں سرشار کا بیان ہے کہ :

لکھنؤ کے نوجوان خوش رنگ نحیف الجثہ شاعر کا کلام کافی مقبول ہے۔ مشاعرے میں جب پڑھتے ہیں تو مشکل پورا مصرع ادا ہوتا ہے کہ اطراف سے واہ واہ کے نعرے بلند ہوتے ہیں اور خاک سنائی نہیں دیتا۔ یہ بھی کوئی داد دینے کا شیوہ ہے : (فسانۂ آزاد)

[1] بلگرام کو اب بھی نگر کے نام سے پکارتے ہیں۔ ویسے اس کا لقب 'دارالسلام' ہے۔ چناں چہ صفیر کی مطبوعہ 'تاریخ بلگرام' میں : دارالسلام ملقب بہ بلگرام : تحریر ہے اور ظاہر ہے اس میں قدر کا مشورہ شریک ہے۔

تذکرۂ جلوۂ خضر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدر نے صفیر کے نام مندرجہ بالا خط کے ساتھ جو اپنی دو غزلیں بھیجی تھیں ان کے کل اشعار ۵۶ تھے ۔ اس میں بھی قدر نے اپنی پسند کے بجائے شاگرد کی پسند کو ترجیح دی تھی ۔ دونوں غزلوں کے مطلع اور مقطع یہ ہیں :

غزل اول

مطلع : الٹ دیا وہ طبق زمیں کا پتا نہیں چرخ ہفتمیں کا
بُرا ہو آہ دلِ حزیں کا کہ مجھ کو رکھا نہیں کہیں کا

مقطع : سخن کو قدر اوج دے زباں سے کہ تم افشاں ہو لامکاں سے
کیا ہے ناسخ نے آسماں سے بلند تر مرتبہ اس زمیں کا

[جلوۂ خضر ۲۳۱ تا ۲۳۳ ص = ۳۰ شعر]

غزل دوم

مطلع : ہوئے کارواں سے جدا جو ہم رہ عاشقی میں فنا ہوئے
جو گرے تو نقشِ قدم بنے جو اٹھے تو بانگِ درا ہوئے

[جلوۂ خضر ص ۲۳۳ تا ۲۳۴ = ۲۶ شعر]

یہ دونوں غزلیں کلیات قدر میں صفحہ ۱۴۲ اور صفحہ ۲۰۸ پر علی الترتیب موجود ہیں ۔ اس خط کے جواب میں صفیر بلگرامی نے جو خط بھیجا تھا، اس کا اقتباس : جلوۂ خضر : میں موجود ہے ۔ اس خط کے یہ مندرجات قابلِ غور ہیں :

۱ ۔ میرے پیارے قدر ۔ خدا تم کو بہت دنوں تک اور بدرجۂ مجبوری میری زندگی تک ضرور سلامت رکھے ۔ تمہارا خط آیا یا فلک اخلاص کا صحیفہ ۔ میں نے حرف حرف دل سے پڑھا اور بار بار پڑھا ۔ ہر فقرے پر ہر جملہ پر پھڑک پھڑک گیا ۔ کیوں نہ ہو کہاں کے ہو اور کہاں رہتے ہو ۔ خدا تمہارے اقتدار اور اعتبار اور عمر و منزلت میں ترقی اور افزونی عطا فرمائے ۔

۲ ۔ الحمد للہ ۔ آپ کو تاریخ بلگرام کا لکھنا پسند آیا اور اس کی قیدیں بھی منظور کیں

یہ آپ نے اپنا ترجمہ کیا اول جلول بے سر و پا لکھ بھیجا ہے ۔ مجھے بھی قسم ہے کہ میں اس طرح لکھ کر، پھر جو کچھ میرے جی میں آئے گا برا بھلا لکھ دوں گا ۔ سب تو سب مرد آدمی یہ نصیری مذہب، شیعی طریق، چہ معنی دارد ۔ مگر یہ بھی آزادوں کی بڑ ہے ۔

۳ ۔ شعرائے مقبول کا جو تین[۳] پر انحصار کیا یہ تو اپنا اپنا مذاق ہے ۔ میں پہلے ہی بلگرام میں ایک غزل کے مقطع کو آپ کے سامنے پڑھ چکا ہوں :

صفیر گو کہ ہے مدّاح تیرا، پر اے قدر
ترا مذاق الگ ہے ۔ مرا مذاق الگ

۴ ۔ مثنوی بادۂ ارغوانی کا گم ہو جانا قیامت ہے ۔ شاید میرے پاس تمہارا وہ خط جس میں کچھ اشعار اس کے تم نے لکھے تھے کہیں پڑا ہوگا ۔ شاید میرا ذکر اسی شعر سے کیا ہے :

لنڈھاتے ہیں صہبائے خمِ غدیر
چلو میر فرزند احمد صفیر

۵ ۔ محاورات کی کتاب کہ قریب چالیس جزو کے لکھی گئی اور اس کی بنا پانچ بحث پر رکھی گئی ۔ یہ بڑے کام کی چیز ہوگی ۔ . . . . . اب تم نے اس وادی میں قدم اٹھائے ہیں ۔ خدا انجام کو پہنچائے . . . . . . خدا کے لئے اگر ممکن ہو تو کاتب سے لکھوا کر اس کے اجزا روانہ کرو ۔

[جلوۂ خضر ص ۲۳۴ تا ۲۳۶]

اس خط کی نقل صفیر بلگرامی کے دست و قلم کی، جو خاصے اضافے کے ساتھ ہے، میرے پاس محفوظ ہے ۔ جو کسی اور موقع پر پیش کیا جائے گا ۔ اس وقت مندرجہ بالا تحریر سے، جس قدر باتیں واضح ہوئی ہیں، وہ یہ ہیں :-

۱ ۔ قدر اور صفیر کے درمیان یارانہ تھا ۔ دوستی تھی ۔ حجاب تھا ۔

۲ ۔ قدر اور صفیر کے درمیان کسی طرح کا تکلف نہ تھا ۔ دونوں ایک دوسرے کو ہر طرح کے الفاظ سے خطاب کر لیتے تھے ۔ قدر اسے فرزند اور صفیر اول جلول، بے سر و پا جیسے الفاظ بھی استعمال کر لیتے تھے بلکہ مرد آدمی اور آزادوں کی بڑ بھی لکھ سکتے تھے ۔

۳ ۔ صفیر و قدر کے خیالات میں ہم آہنگی اور دوستی و یکسانیت کے باوجود ادبی مذاق اور فکری مذاق کی موزونیت کے باوجود

بعض باتوں میں سخت اختلاف تھا۔ اسی لئے صفیر کو یہ کہنا پڑا

: ترا مذاق الگ ہے مرا مذاق الگ :

۴۔ تمہارا وہ خط جس میں کچھ اشعار اس کے تم نے لکھے تھے کہیں پڑا ہوگا۔

۵۔ ...... اب تم نے اس وادی میں قدم اُٹھائے ہیں۔ خدا انجام کو پہنچائے۔ یہ تم سے خطاب آپ برابر یا بڑے ہی کر سکتے ہیں۔ چھوٹے یا شاگرد سے نہیں۔

اسی طرح قدر بلگرامی کے خط کے مندرجات بھی قابلِ ملاحظہ ہیں:۔

۱۔ نصف ملاقات ہے بھیجئے اسے یار خط

۲۔ برادر برابر۔ مجرا۔ مزاج اقدس

۳۔ جب تک تم پسند نہ کر لو گے میں کتاب محاورات کو کتاب نہ کہوں گا۔

۴۔ خدمت برادرم سید فرزند احمد صفیر بلگرامی موصول باد

مکتوبِ قدر کے ان مندرجات سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دونوں کے درمیان بے حد بے تکلفی تھی۔ یہاں تک کہ قدر اپنی تصنیف 'محاورات' کو صفیر کی نظر سے گزارنے کا یقین دلاتے ہیں اور صاف صاف لکھ دیتے ہیں کہ 'تم پسند نہ کر لو گے' اس وقت تک اسے 'کتاب محاورات' کہنے کے لئے تیار نہیں۔ بالفاظ دگر وہ صفیر کی بالغ نظری، وسعت معلومات، مشاہدۂ علم سے کما حقہ آگاہ تھے اور اُسے وقیع درجہ دیتے تھے۔

لیکن تعجب اور حیرت ہے کہ ان شواہد کے باوجود، ان براہین کے ہوتے ہوئے حضرت مالک رام اپنی تالیف 'تلامذۂ غالب' میں صفیر بلگرامی کے حالات لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"غالب کی وفات کے بعد چندے غلام حسنین قدر بلگرامی سے بھی

شاگرد: سحر، غالب، مرزا دبیر

فارسی میں: غالب دہلوی مرثیہ میں: مرزا دبیر لکھنوی

اردو میں: سحر لکھنوی

کے تلامذہ میں شامل تھے۔ غالب کی وفات (۱۲۸۵ھ) کے بعد کسی کے شاگرد نہیں ہوئے۔ نہ ہی اب سن و سال کا تقاضا تھا کہ کسی کی شاگردی اختیار کرتے۔ کیونکہ اس وقت تک صفیر نے خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ کئی کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہو چکے تھے سیکڑوں کی تعداد میں شاگرد بن چکے تھے ڈاکٹر فیلن اور ڈپٹی سورج مل کی فرمائش پر 'تسہیل تانیث و تذکیر' کا رسالہ مرتب کر کے داد و تحسین حاصل کر چکے تھے اور رسالہ اسکولوں میں داخلِ نصاب ہو چکا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ فیض صفیر پر حضرت غالب سے صلاح و مشورہ کر کے ان کی داد حاصل کر چکے تھے اور اس پر تقریظ لکھوا چکے تھے جو عودِ ہندی میں شامل ہے۔ اس طرح صفیر کی علمیت، قابلیت اور صلاحیت کا شہرہ چار دانگ عالم میں ہو چکا تھا۔ اس لئے بھی اب کوئی ضرورت نہ تھی کہ وہ کسی کی شاگردی اختیار کرتے۔ اس کے علاوہ کلیات قدر وفاتِ صفیر کے بعد شائع ہوئی ہے۔ اس میں قدر کے شاگردوں میں صفیر کا کوئی تذکرہ نہیں۔

یہاں شاد و صفیر کی استادی اور شاگردی کا ذکر خارج از موضوع ہے، مگر برائے اطلاع یہ عرض کرنے کی اجازت اور جسارت چاہتا ہوں کہ ہمارے خاندان میں شاد عظیم آبادی کا وہ مرثیہ آج بھی شاہد عادل کے طور پر موجود و محفوظ ہے۔ جس پر صفیر اور مرزا دبیر دونوں کی اصلاحیں ہیں۔ یہ دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ صفیر کی قابلیت و استادی دونوں پر مزید دال ہے۔ اس سلسلہ میں قاضی عبدالودود صاحب کی یہ تحریر بھی جو ہنوز پردۂ خفا میں ہے، قابلِ ملاحظہ ہے:

"...... صفیر بلگرامی مدعی تھے کہ شاد عظیم آبادی میرے شاگرد ہیں اور شاد کو اس سے انکار تھا ...... میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ صفیر کا دعویٰ صحیح ہے ......"

۲۱۔جنوری ۱۹۵۸ء

یہ ایک ماہر قانون کی رائے، منصف مزاج اور ناقد و محقق کا فیصلہ ہے!

ل صفیر بلگرامی کی تاریخ پیدائش 'شمس الضحیٰ' اور تاریخ وفات 'شہر رمضان المبارک' کے اعداد میں مضمر ہے:

پیدائش: ۹ اپریل ۱۸۳۴ء

وفات: ۱۱ مئی ۱۸۹۰ء

مولد: مارہرہ ضلع ایٹہ (یو۔پی)

مدفن: آرہ ضلع شاہ آباد (بہار)

مشورہ کرتے رہے۔"

[تلامذۂ غالب ص ۱۹۴ طبع اول ۱۹۵۷ء]

غالب کی وفات ۱۲۸۵ھ میں ہوئی تھی۔ تاریخ مکتوبات قدر و صفیر ۱۲۹۸ ہجری اور وفات قدر ۱۳۰۱ ہجری ہے۔ اس طرح رحلت غالب کے ۱۴-۱۵ سال بعد اور رحلت قدر کے دو تین سال پیشتر یہ خطوط لکھے گئے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قدر کا خط صفیر کے نام یارانہ ہے، استادانہ نہیں۔ اور صفیر کا خط قدر کے نام یارانہ ہے، شاگردانہ نہیں۔ اور یہ بھی اعلان ہو چکا ہے کہ شاعری میں ان دونوں کے مذاق ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ یعنی قدر حضرت انیس کے مداح اور صفیر حضرت دبیر کے مداحوں میں تھے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر خلیق انجم کا ادعا بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ وہ اپنی تالیف: غالب کی نادر تحریریں، میں ایک 'جعلی خط' کے عنوان سے صفیر بلگرامی کے نام حضرت غالب کا خط درج کرتے ہیں۔ اس کے لئے اتنی گزارش کی اجازت چاہتا ہوں کہ جب انھیں یہ بات تسلیم ہے کہ یہ 'خط جعلی' ہے تو شاملِ کتاب کیوں کیا؟ دوسری بات یہ کہ یہ خط 'جعلی' کیوں ہے؟ اس کے اسباب اور اس کی توجیہات پیش کرنی چاہیئے تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل و براہین پیش کرنے کی ضرورت کا احساس انہیں ہونا چاہیئے تھا۔

غالب کے شاگرد خاص، خطوط اردوئے معلی کے شریک، قدر بلگرامی کی تصویر میرے ذاتی اور خاندانی 'نگار خانے' میں موجود ہے جس پر قدر کے دست و قلم کا تحریر کردہ یہ شعر ہے:

تاریخ سن شبیہ کھنچی میر قدر کی
پہلوئے دل میں کھب گئی تصویر قدر کی ۱۲۹۴ھ

اب یہ تصویر ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔ سال تاریخ تصویر سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدر کی وفات سے ۸ سال قبل یہ تصویر کھنچی تھی۔ اس تصویر کے دیکھنے سے سرشار کے بیان کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے۔

له - اس 'جعلی خط' کے 'اصل خط' ہونے کے لئے ڈاکٹر انجم نے ذرا بھی تحقیق سے کام نہیں لیا ورنہ ڈاکٹر آرزو کے شائع کردہ قطعۂ عبدالغفور مارہروی اور خط غالب بنام چودھری عبدالغفور سرور مارہروی کے بعد تو اس الزام میں کوئی صداقت ہی باقی نہیں رہتی۔ آرزو صاحب کا متذکرہ مضمون 'آج کل' ماہ فروری ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔

حق کی فتح

اگر جنگ بذاتِ خود ایک غلط فعل ہے تو پھر اسے کوئی اخلاقی مدد کیسے مل سکتی ہے؟ میرا مقصد ہے کہ جنگ قطعی غلط چیز ہے۔ لیکن اگر ہم دو لڑنے والوں کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ ان میں سے ایک حق پر ہے اور دوسرا غلطی پر۔ مثلاً اگر الف، ب کا ملک ہتھیانا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ ب کے ساتھ ناانصافی کی جا رہی ہے۔ دونوں ہتھیار اٹھا لیتے ہیں اور لڑائی ہو جاتی ہے۔ میں تشدد آمیز لڑائی کا قائل نہیں، اس کے باوجود چونکہ 'ب' کا مقصد صحیح ہے اس لئے میری اخلاقی امداد اور دعائیں اس کے ساتھ ہوں گی۔

(مہاتما گاندھی)

عہد

وہی دھرتی ہے وہی کوچہ و بازار کا رنگ
وہی ندیوں کا تقدس وہی رفتار کا رنگ

وہی چہرے کی صباحت وہی رخسار کا رنگ
وہی آہو ہیں وہی چشمِ فسوں کار کا رنگ

مرکزِ علم و ہنر کارگہِ شیشہ گراں
ہاں وہی ہند وہی قبلۂ صاحب نظراں

اک نئے دور میں اب جلوہ فگن ہے کہ نہیں
اس کو نادیدہ جہانوں کی لگن ہے کہ نہیں

اب ضرورت ہے چراغوں کی لویں تیز کریں
اپنے افکار کو زرّین و گہر ریز کریں

اس کے چرنوں میں عقیدت کی ضیا نذر کریں
خونِ دل نذر کریں مہر و وفا نذر کریں

جگمگاتے رہیں آپس میں لگاوٹ کے چراغ
آؤ ہم توڑ دیں چُن چُن کے من و تو کے ایاغ

کسی مذہب کسی فرقہ پہ نہ ہو طعنہ زنی
داخلِ مشربِ اخلاق نہ ہو دل شکنی

دیکھنا شمعِ اخوت کی ضیا مٹ نہ سکے
درد سینے سے تو آنکھوں سے حیا مٹ نہ سکے

چاک داماں نہ رہے کوئی طلب گاروں میں
آبروِ عشق کی لٹ جائے نہ بازاروں میں

عقلِ برگشتہ کو آدابِ جنوں سکھلائیں
سببِ سستیٔ افکارِ رسا بتلائیں

سرنگوں ہو نہ کبھی زندگیٔ آدمِ نَو
منجمد ہو نہ بہکتے ہوئے جذبات کی رَو

شعلۂ عشق سے گرمائیں در و بامِ حیات
روز سجتی رہے معصوم امنگوں کی برات

بادِ نمناک سنکتی رہے ویرانوں میں
دعوتِ وجد ملے سب کو طرب خانوں میں

کوئی شہروں میں نظر آئے نہ بیگانہ صفت
بزمِ رنداں میں ہر اک شخص ہو پیمانہ صفت

کوئی ہادی ہو تو سینے سے لگائیں اس کو
ہدفِ فرقہ و مذہب نہ بنائیں اس کو

لطف تو یہ ہے کہ ہر پھول سے خوشبو لے کر
روز مہکاتے رہیں دامنِ سلمائے ہنر

رابطۂ باہم میں کبھی فرق نہ آنے پائے
بڑھ کے ہر شخص اٹھا لے جو کوئی گر جائے

داد پاتے رہیں ہر ایک سے گلرنگ رواج
ایک ہی روح کے حامل ہوں زبانوں کے مزاج

حلقۂ فکر میں یک رنگیٔ جذبات رہے
ذکرِ شائستگیٔ بزمِ خرابات رہے

رام لعل

دھرتی

رمیش جان دے دینے کی دھمکی دے کر نیچے اترا تو دیارانی نے اسے روکنا چاہا۔ لیکن اس کی دیورانی سروج نے غصّے سے چلّا کر کہا۔ "اسے جانے دو دیدی۔ مرتا ہے تو مرے۔ روز روز کا ٹنٹا آج ختم ہی ہو جائے۔"

وہ اپنے کمرے کے دروازے میں بھیگے ہوئے بالوں کو سکھانے کے لئے تولیئے سے زور زور سے جھٹک رہی تھی۔ بڑی جیٹھانی نے آنگن میں واپس آکر کہا۔ "آخر بچّہ ہے سروج۔"

یہ سن کر سروج نے اپنے بھیگے ہوئے بال سر کو زور سے گھما کر پیٹھ پر پھینک دئے۔ قدرے بپھر کر بولی۔ "ابھی یہ بچّہ ہے۔ تم اسے بچّہ کہتی ہو؟ اگر ایسا ہی ہے تو پھر پڑھتا لکھتا کیوں نہیں؟ اس کی عمر کے لڑکے تو دن رات ایک کر کے وظیفے اور انعام پر انعام پا رہے ہیں۔ اسے تو یونیورسٹی کے نام سے ہی بَیر ہے جیسے۔ سب کتابیں بیچ کر کھا گیا۔ یہاں سے فیس لے جا جا کر سنیما اور جوئے پر لگا دی۔ کیوں؟ کوئی حرام کی کمائی ہے کیا؟ آئندہ سے ایک پیسہ تک نہیں دوں گی۔ میں نے خیرات خانہ نہیں کھول رکھا ہے!

دیارانی کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ کسی سوچ میں ڈوب کر سر جھکا لیا۔ پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "سروج، میں یہ تو کبھی نہیں بھول سکتی کہ تم نے میری بڑی مدد کی ہے۔ ڈوبتے کو سہارا دے دیا۔ میرا سارا سنکٹ ہر لیا۔ میرے بچّوں کو پڑھایا، لکھایا، ان کی شادیاں بھی کر دیں۔ ان کے سورگیہ پتا کی آتما کو شانتی بخشی۔ میں جب تک تمھارے قدموں پر پڑی ہوں تمھیں ہمیشہ دعائیں دیتی رہوں گی۔ پھر بھی پوچھنا چاہتی ہوں اگر تمھیں میری وجہ سے کوئی کشٹ ہوتا ہو تو میں اپنے بیٹے کے پاس ہری پور جانے کے لئے تیار ہوں، لیکن بھگوان کے لئے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ میں تمھارا احسان بھلا کر ایسا کہہ رہی ہوں۔"

سروج ہکّا بکّا رہ گئی۔ "دیدی!" اس نے آگے بڑھ کر جیٹھانی کو گلے سے لگا لیا۔ "یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ میرے منہ سے ایسی غلط بات بھی نکل سکتی ہے۔ لیکن میرا یہ مطلب کبھی نہیں تھا۔ نہیں دیدی نہیں۔ یہ تو میں اس نالائق رمیش کے لئے کہہ رہی تھی۔ اپنے چھوٹے بھائی کے لئے۔ لیکن تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تم مجھ پر بوجھ ہو؟ تم تو میری ساس کی طرح میرے لئے قابلِ عزّت ہو۔ پھر تم خود بھی تو ناری شلپ نکیتن میں محنت مزدوری کرتی ہو۔ بتاؤ بھلا تم مجھ پر بوجھ کس طرح ہوئیں؟"

اچانک نیچے سے گھنٹی بجی۔ نیچے کوئی آیا تھا۔ سروج نے بڑی ملتجیانہ نظروں سے اپنی جیٹھانی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "کیا میں وشواس کر سکتی ہوں کہ اب تم مجھے کبھی غلط نہیں سمجھو گی؟ نہیں نا؟"

دونوں کی آنکھیں چھلچھلا اٹھیں۔ دیارانی آنکھیں پونچھتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سروج نے بھی آنکھیں پونچھ ڈالیں اور بکھرے ہوئے گیلے بالوں کو جلدی جلدی ایک ڈھیلی کھلی چوٹی میں سمیٹا۔ اس کے کالے بالوں میں چاندی کی طرح سفید بالوں کی بھی بڑی کثرت تھی۔ وہ پینتیس برس کی تھی۔ صحت مند، گورے چکنے چہرے اور سڈول جسم کی۔ بڑی جذباتی اور سنجیدہ، بڑی ہمّت والی بھی۔ اس کے باحوصلہ ہونے کا احساس اس کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک اور اونچی گھٹے ہوئے نتھنوں والی

ناک بھینچے رہنے والے پتلے پتلے ہونٹوں اور چوڑی ٹھوڑی کی سختی سے بھی ہوتا تھا۔ ربڑ سول کی سُرخ چپل، سفید وائل کی دھوتی اور پیلے رنگ کا بنا آستین کا بلاؤز پہنے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی وہ نیچے اُتر گئی۔

اس کے مکان کے نچلے حصّے میں "آروہ شلپ نکیتن" کا دفتر اور سلائی گھر تھا۔ دو بڑے بڑے کمرے، میں بجلی اور ہاتھ سے چلنے والی مشینوں کے سامنے عورتیں اور مرد الگ الگ بیٹھے کپڑے سی رہے تھے۔ مشینوں کی مسلسل اور ایک ساتھ گونجنے والی گھر گھر سے ایک عجیب سی نغمگی پیدا ہو رہی تھی۔ یہ سنگیت روز ہی گونجتا تھا۔ صبح ۹ بجے سے لے کر رات کے ۸ بجے تک۔ پچھلے پندرہ برسوں میں سروج شاہ نے کپڑا سینے والی مشینوں کے مدھر سنگیت میں اپنی کتنی مایوسیوں، محرومیوں اور کئی دوسری مشکلات کو بھلانے کی کوشش کی تھی۔ انہیں وہ کسی حد تک بھول بھی چکی تھی۔ اپنی نئی زندگی بنانے میں وہ خاصی کامیاب نظر آتی تھی۔ اس نے سب کے کہنے کے باوجود دوسری شادی نہیں کی تھی۔ وہ اپنی تنہا زندگی ہی میں بہت خوش رہتی تھی۔ لیکن اگر کبھی کوئی چھوٹی سی بات بھی اس کی مرضی کے خلاف ہو جاتی تو اس کی قوت برداشت اُسے جواب دے جاتی تھی۔ آج اس کے دل پر اپنے بنا ماں باپ کے چھوٹے بھائی کے تعلیم سے جی چرانے اور بُری عادتوں کا شکار ہو جانے کی وجہ سے بہت بڑا بوجھ پڑا ہوا تھا۔

وہ کاریگروں کے کمروں میں سے ہوتی ہوئی اپنے دفتر میں پہنچی تو وہاں دیوار سے لگے ہوئے ایک لمبے اور چوڑے صوفے پر ایک عورت کو اپنے ننھے منے بچے کے ساتھ انتظار کرتے ہوئے پایا۔ دونوں عورتوں نے ایک دوسرے کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کہا۔ یہ بات صرف حیرت ناک تھی کہ سروج جو چند لمحے پہلے تک بہت ہی افسردہ نظر آ رہی تھی اپنے سامنے ایک دوسری عورت کو دیکھ کر ایسی آسانی سے مسکرا رہی تھی جیسے کوئی بات ہوئی بھی نہ ہو۔ اس کا دل خوشی اور اطمینان سے بھرا ہوا ہو۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بچے کو بھی پیار کیا اور پھر اپنی چوڑی میز کی طرف جاتی ہوئی بولی۔ "کہیئے بہن جی، کیا حکم ہے؟"

اس عورت نے کپڑوں کا ایک بنڈل اس کی میز پر رکھ دیا اور بولی۔ "میں نے کبھی شلوار قمیض نہیں پہنی۔ اب تو ان کا بہت فیشن چل پڑا ہے۔ دو شلواریں اور دو قمیض بنا دیجئے۔ چار فراک اور چار نکریں اس راجیو کے لئے ہوں گے۔"

سروج جلدی جلدی کپڑوں کا بنڈل کھولنے لگی۔ اس کے پیچھے اور دائیں بائیں شیشوں کی بڑی بڑی الماریاں تھیں۔ ان میں عورتوں اور بچّوں کے بڑے ہی سُندر اور دل کش کٹنگ کے نئے نئے فراک، بلاؤز، قمیص اور شلواریں سجی ہوئی تھیں۔ طرح طرح کے پھولوں، بوٹیوں اور بارڈروں سے کاڑھے ہوئے رنگ برنگے ریشمی دوپٹے اور ساڑھیاں بھی تھیں۔ عورتوں کے ہاف اور پورے کوٹ بھی تھے۔ جہاں وہ کھڑی تھی اس کے پیچھے کئی ایک سلائی کی فیشن کی کتابوں، بٹنوں، تاگوں اور دوسری ضروری چیزوں سے بھرے ہوئے ڈبوں سے پُر تھے اور ان کے اوپر دیوار پر ایک وجیہہ اور صحت مند نوجوان کا فوٹو ٹنگا ہوا تھا۔ کالے چمکیلے بال، آنکھوں پر جھکی ہوئی محراب دار گھنی بھویں، ہونٹوں پر ایک شرارت بھری مسکراہٹ، دھاریوں والے گہرے رنگ کے کوٹ کے ساتھ قمیص اور نکٹائی۔ یہ تھے سروج شاہ کے پتی مہاشے ہمدر ناتھ شاہ۔

سروج نے سب کپڑوں کو ایک نظر دیکھ کر پلاسٹک کے ایک فیتے سے عورت اور اس کے بچے کا ماپ لیا اور ان سے ایک ہفتہ بعد آنے کا وعدہ کر کے انہیں رخصت کر دیا۔

کاریگروں کو کام دینے کے لئے اس کے پاس بہت سے کپڑے رکھے تھے۔ دوسرے کمروں میں سے کاریگر کام لینے کے لئے اس کے پاس آنے لگے۔ عورتیں بھی اور مرد بھی۔ اس نے سب کو کام بانٹ دیا۔ جن کے پاس کام تیار تھا اس کی سلائی دے کر اسے اور کام دے دیا۔ گاہک بھی بیچ بیچ میں آتے رہے۔ شلپ نکیتن میں بہت دور دور سے گاہک آتے تھے۔ اچھی سلائی اور نئے نئے ڈیزائن پیش کرنے کی وجہ سے سروج شاہ نے بڑی شہرت پائی تھی۔ یہ دو منزلہ مکان سروج نے اپنی ہی محنت سے بنایا تھا۔ اس کی ایک ایک اینٹ پر اس کی کڑی محنت اور حوصلے کی گہری چھاپ تھی۔ پندرہ سال پہلے جب اس نے اپنا پیٹ پالنے کے لئے مشین چلانی شروع کی تھی اس وقت اس کے پاس اس مشین کے علاوہ اپنے پتی کی رُلانے تڑپانے والی صرف ایک یاد ہی تھی۔ پاکستان سے آنے کے دو ہی مہینے بعد اس کا پتی اچانک کہیں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے پاس کئی ہزار روپے تھے۔ وہ کوئی کاروبار شروع کرنا چاہتا تھا۔ بہت

انتظار اور تلاش کے بعد اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا تھا۔ یہی سمجھ لیا گیا تھا آزادی کے بعد کی افراتفری میں کسی نے اس کی جان لے لی تھی۔ یا وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔

اس وقت سروج کی عمر بیس سال تھی۔ بیس سال اور کچھ مہینے۔ اس کی شادی ہوئے بھی آٹھ مہینے ہوئے تھے۔ ان دنوں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ خود غرضی اور چشم پوشی ایک مجبوری بن گئی تھی۔ کوئی کسی کا شکوہ کرنے کے لئے بھی حق بجانب نہیں رہا تھا۔ اس کے ساتھ اپنے سورگباشی ماں باپ کا پانچ سال کا ہی رمیش بھی تھا۔ اس کے سسرال میں ایک جیٹھ زندہ تھے جو فوج میں تھے۔ وہ اپنے بیوی بچے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔

پارٹیشن کے ریلے میں دیارانی بھی دو لڑکیوں اور ایک لڑکے کے ساتھ سروج کے پاس آ گئی تھی۔ لکھنؤ پہنچ کر اس کا خاوند ایک ہی بار اس سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ اس کے بعد اچانک ایک مہلک عارضہ سے اس کا انتقال ہو گیا۔

لیکن وقت تو گزر جاتا ہے، اچھا بھی اور برا بھی۔ انسانی زندگی میں جب بھی طوفان آتے ہیں، جب بھی آندھیاں چلتی ہیں اور حادثات گزرتے ہیں۔ وہ سب کہیں نہ کہیں گہرے، ہلکے نقوش یقیناً چھوڑ جاتے ہیں۔ دھرتی پر بھی اور چہروں پر بھی۔ انسان دھرتی کا ایک روپ ہی تو ہوتا ہے۔ دھرتی کی طرح دکھ سہتا ہے، اجڑتا ہے اور پھر پھلنے پھولنے لگتا ہے۔

اتنے دل شکن حالات کے باوجود سروج بوڑھی نہیں ہوئی تھی، کمہلائی نہیں تھی۔ کچھ تنک مزاج ضرور ہو گئی تھی۔ لیکن غصہ اُسے کبھی کبھی ہی آتا تھا۔ اس کے چہرے سے اس کے اندر کے خلاء اور ویرانی کا شدید احساس ہوتا تھا۔

اچانک شلپ نکیتن کے گیٹ پر ایک نئی اور قیمتی کار آ کر رک گئی اس میں سے شہر کا میئر اس کی بیوی اور رمیش نکلے۔ رمیش کو ان کے ساتھ دیکھ کر وہ چونک گئی۔ میئر ہنستا ہوا اندر آیا۔ بولا ـــ "مسز شاہ، اس جانور کو کیوں گھر سے باہر ہانک دیا ہے؟ کانجی ہاؤس والے پکڑ کر لے جائیں؟ کیا یہی چاہتی ہو؟ یہ میری کار کے آگے آگے بڑی مستی سے چلا جا رہا تھا۔ میں نے بہت ہارن دئے، اسے پکارا بھی لیکن اسے تو جیسے کچھ سنائی ہی نہیں دیا۔ یہ تو میری خوش نصیبی ہے کہ اس وقت میں تھانے میں ہونے کی بجائے تمہارے پاس آ کر اس کی شکایت کر رہا ہوں۔"

سروج کا دل غصّے، تعجب اور ہمدردی سے بیک وقت بھر گیا۔ اس نے رمیش کو ہلکی سی چپت لگا کر ایک طرف بٹھا دیا اور پھر حافظ صاحب کا اس کی جان بچانے کے لئے شکریہ ادا کیا۔ پھر اس نے حافظ صاحب سے رمیش کے سارے کرتوتوں کی کہانی بھی کہہ سنائی جسے سُن کر انھوں نے کچھ سوچا اور پھر کہا ـ "تم فکر نہ کرو مسز شاہ، کل اسے میرے پاس بھیج دینا۔ میرے کاغذ کے کارخانے میں ایک ایسی جگہ خالی ہے۔ جہاں اچھی تنخواہ بھی ملتی ہے اور دن بھر کی مصروفیت بھی رہتی ہے۔ خدا نے چاہا تو وہاں آ کر یہ آدمی بن کر نکلے گا۔"

سروج نے ان کا پھر شکریہ ادا کیا۔ اس کی مشکلیں اسی طرح کسی نہ کسی کی بروقت مداخلت سے آسان ہوتی رہتی تھیں۔ اسی لئے تو اس نے کبھی حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ میئر کی بیگم جواب تک خاموش بیٹھی تھی موقع پا کر بولی ـ "ہم تو تمہارے ہی پاس کپڑے سلوانے کے لئے آ رہے تھے۔"

یہ کہہ کر اس نے کار میں رکھے ہوئے کپڑوں کے دو بنڈل منگوائے یہ لوگ پچھلے کئی سالوں سے یہیں سے کپڑے سلوا رہے تھے۔ وہ ابھی شلپ نکیتن ہی میں تھے کہ کسی ہائی اسکول کی لڑکیوں کی فوج کی فوج اندر گھس آئی۔ انھیں اپنی یونیفارمیں سلوانی تھیں۔

سروج اپنے معزز گاہکوں سے معذرت خواہ ہو کر اور انھیں وداع کر کے لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ایک ہی رنگ کے کپڑے کی کئی یونیفارمیں بنانا تھیں۔ چونکہ لڑکیاں بہت کافی تعداد میں تھیں اس لئے ان سب کا ماپ لیتے لیتے دوپہر ہو گئی۔ اس درمیان میں اس کی جیٹھانی اپنا شلپ کا کام ختم کر کے دو ایک بار جھانک گئی۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ سروج تو کھانا ہمیشہ دیر سے کھاتی تھی۔ کوئی نہ کوئی آیا ہی رہتا تھا۔

جب لڑکیاں ایک دوسرے کو دھکا دیتی، چیختی، چلاتی باہر چلی گئیں تو دیارانی اُسے بلانے کے لئے ایک بار پھر اندر آئی لیکن اسی وقت ایک تانگا پانچ لڑکیوں اور ایک تیس برس کی عورت اور تھوڑے سے سامان کے ساتھ لدا پھندا سانکیتن کے سامنے آ کر رکا۔ اس عورت کے ہاتھ میں شلپ نکیتن والی سروج کا پتہ لکھا ہوا تھا۔

وہ سب اندر آ گئیں۔ لڑکیاں ایک دوسرے کے اوپر آتی ہوئی لگتی تھیں۔ بارہ، آٹھ، چھ، چار اور ایک سال کی۔ سب سے چھوٹی

کو بڑی لڑکی نے بغل میں لے رکھا۔ سب کی سب میلے اور معمولی فراکوں میں بکھرے بکھرے بے ترتیب بالوں والی۔ اس عورت نے بھی بہت اچھے کپڑے نہیں پہن رکھے تھے۔ اس کے بھورے کالے بالوں پر سفر کی گرد جمی ہوئی تھی جیسے کہیں بہت دُور سے لڑکیوں کو لے آ رہی ہو۔ وہ دُبلے پتلے شریر کی بڑے دل کش ناک نقشے والی عورت تھی لیکن اس وقت اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ بہت پریشان معلوم ہوتی تھی۔ تھکی ہوئی بھی لگتی تھی۔

سروج ان سب کو اپنی چوڑی میز کے پار سے بڑی حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ انھیں نہیں جانتی تھی۔ لیکن وہ اُسی کے پاس آئی تھیں۔

باہر سے آنے والی عورت کچھ دیر تک صوفے پر لڑکیوں کے درمیان اس طرح خاموش بیٹھی رہی جیسے چاہتی ہو سروج اسے پہچان لے تو پھر کچھ کہے۔ جب سروج خاموش رہی تو وہ اٹھ کر اس کے پاس آئی اور بولی — "میرا نام کُنتی ہے۔ میرا باپ انجینئر تھا۔ ہم دونوں نے کئی دن تک ایک ہی گاڑی میں سفر کیا تھا۔ خانیوال سے جالندھر تک۔ پھر کچھ دن ہم ایک ہی کیمپ میں بھی رہی تھیں، یاد ہے؟"

سروج کو جیسے ایک لمحے میں سب کچھ یاد ہو آیا۔ اس نے کنتی کو کپڑوں کا اپنا ایک فالتو جوڑا بھی دیا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی توے پر روٹی پکاتی رہی تھیں۔ ایک ہی برتن میں کھانا تیار کر لیتی تھیں۔

"ارے تو کُنتی! میری اچھی کنتی!" وہ خوشی سے باؤلی ہو کر اس سے لپٹ جانے کے لئے دوڑ پڑی۔ لیکن کنتی نے اُسے روک دیا۔ میز پر پڑی ہوئی وزنی قینچی اُٹھا کر دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر کو دیکھ کر بولی "رک جاؤ۔ اس طرح مت بھاگو۔ پہلے میری بات سُن لو۔ تم جس پتی کی پتنی تھیں۔ اگر میں کہوں کہ میں بھی پچھلے پندرہ سال سے اسی کی پتنی ہی ہوں اور یہ سب لڑکیاں اسی کی ہیں تو تم یہ قینچی لے کر میرے منہ پر تو نہیں دے مارو گی۔ لیکن مارو۔ میں تمھارے ہاتھ سے یہ چوٹ سہنے کے لئے ہی یہاں آئی ہوں۔"

سروج جہاں تھی وہیں رکی رہ گئی۔ بالکل سکتے کے عالم میں جیسے اس نے کچھ سُنا بھی نہ ہو۔ اگر سُنا بھی ہو تو کہیں بہت دُور سے، اتنی دُور سے کہ وہ آواز ابھی تک صاف صاف شبدوں کی شکل بھی اختیار نہ کر سکی ہو۔ لیکن کنتی نے اس کے پتی کا نام کیوں لیا تھا۔ وہ دراصل کیا کہنا چاہتی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر اپنے پتی کی تصویر کو دیکھا پھر اپنے اندر کے سارے طوفان کو جو نہ جانے کیسے اس قدر اچانک اُٹھ کھڑا ہوا تھا، روک کر بڑے ضبط سے پوچھا — "کنتی! تم یہاں کیوں آئی ہو؟ تم کیا چاہتی ہو؟"

لیکن کنتی کوئی جواب دینے کی بجائے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھپک پھپک کر رو رہی تھی۔ وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ سروج کی جیٹھانی حیرت کا بت بنی ایک طرف کھڑی رہ گئی تھی۔ کنتی کے رونے کی آواز سُن کر سارا اسٹاف جمع ہو گیا تھا۔ سروج نے ان سب لوگوں کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کر دیا۔ اس کی جیٹھانی نے سارے دروازے بند کر دئے اور اس عورت کو خاموش کرانے کے لئے اس کے پاس گئی۔

"تم کون ہو بہن؟ یہاں کیوں آئی ہو؟ تمھیں کیا دُکھ ہے؟"

سروج کا دل ایک عجیب سی چبھن سے چھلنی ہوا جا رہا تھا۔ اُسے یاد آ رہا تھا ایک دن اس عورت نے ان سب کے کپڑے دھوئے تھے۔ وہ بہت بیمار تھی۔ اس کا پتی اسے پانی بھر بھر کر لا دیتا رہا تھا۔ دونوں نے مل کر کپڑے سکھائے تھے۔ پھر مل کر ہی کھانا بنایا تھا۔ بس اتنی سی بات اسے یاد تھی جو اب پھوڑے کی طرح اس کے ذہن میں ابھر آئی۔ اس نے اچانک میز پر رکھی ہوئی قینچی اٹھا لی۔ اس نے کنتی کے چہرے کو نشانہ نہیں بنایا بلکہ اس تصویر کو بنایا جو دیوار پر ٹنگی تھی۔ تصویر کا شیشہ چھن کر ادھر اُدھر بکھر گیا اور تصویر الٹی ہو کر کیل کے ساتھ لٹکی لٹکی کانپنے لگی۔

"کہاں ہیں وہ جنھوں نے مجھے پندرہ سال سے بیوہ بنا کر رکھا ہے؟ میں انھیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

کُنتی نے منہ پر سے ہاتھ ہٹائے اور روتے روتے بولی۔ "اب وہ زندہ نہیں ہیں۔ پانچ مہینے ہوئے، ٹی۔بی سے چل بسے۔ دو سال پہلے ایک بار یہاں تم سے ملنے کے لئے آئے تھے لیکن شرم کے مارے بغیر ملے لوٹ گئے۔ مرنے سے پہلے مجھے ہدایت کر گئے تھے کہ میں لڑکیوں کو لے کر تمھارے ہی قدموں میں جاؤں۔ کیونکہ انھیں یقین تھا کہ تم انھیں اور مجھے ضرور معاف کر دو گی۔

بدیع الزماں اعظمی

زمین کی میخیں

تاریخی پس منظر | ماہرین ہئیت کا خیال ہے اور ان کا اندازہ ہے کہ یہ کرہ جس پر ہم بستے ہیں مادرِ سیّارہ سے جدا ہونے کے بعد کروڑوں برس تک ایک دہکتے ہوئے گیس کی حالت میں تھا۔ یہ اسی طرح گرم اور روشن تھا جس طرح سورج۔ کروڑوں برس تک اس حالت میں رہتے ہوئے اور سورج کا طواف کرتے ہوئے اس کی سطح نسبتاً ٹھنڈی ہوتی گئی۔ مگر یہ کرہ ایسے سمندر کے غلاف میں لپٹا ہوا تھا جس کا پانی آج کے سمندروں کی طرح نیلا نہ تھا جس کی لہریں آ کر ساحل سے ٹکراتی نہ تھیں۔ جس کی سطح پر سفید رنگ کے جہاز چلتے نہ تھے بلکہ دہکتے ہوئے لاوا کا ایک طوفانی مدوجزری سمندر تھا جس کی بھیانک لہریں شعلوں کے روپ میں اٹھ کر چاروں طرف پھیل جاتی تھیں۔ اس وقت بھی قطبین کے درمیان سمندری دھارے بہتے تھے مگر کون سے دھارے؟ پگھلے ہوئے لاوا کے مہیب دھارے۔ اس وقت بھی سیقلون پیدا ہوتے تھے اور ان کے ساتھ لاوا کے بادل امڈ امڈ کر اٹھتے تھے اور تیزی سے گزر جاتے تھے۔ اس عالم میں کرۂ ارض نے کروڑوں برس بسر کئے۔

وقت کے ساتھ ساتھ انقلابات ہوتے رہے۔ کرۂ ارض ٹھنڈا ہوتا گیا۔ لاوا کا وہ سمندر بھی جم کر ٹھوس ہوتا گیا۔ گیسوں کے اختلاط سے پانی بنتا اور برستا رہا۔ مگر یہ بارش کھولتے ہوئے پانی کی بارش تھی جو تپتی ہوئی سطح ارض پر گر کر فوراً بھاپ بن کر فضا میں اٹھ جاتی تھی۔ ہمارے موجودہ سمندروں کا سارا پانی فضا میں معلق تھا، گویا کرۂ ارض پانی کے دو میل موٹے غلاف میں لپٹا رہا ہوگا اور اس کا دباؤ اتنا شدید پڑتا رہا ہوگا کہ ۶ ۲۰۰۰ درجۂ حرارت پر بھی قشر ارض جم کر ٹھوس ہونے لگا ہوگا۔ کسے خبر تھی کہ پانی کی یہ چادر اپنے اندر دنیا کے براعظموں کو سموئے ہوئے ہے۔ لاکھوں برس تک کرۂ ارض اس فضائی آبی غلاف میں اس طرح لپٹا ہوا تھا کہ سورج کی روشنی بھی زمین تک نہ آ سکتی تھی سطح ارض پر گھپ اندھیرا تھا۔ ہاں! کبھی کبھی شہاب ثاقب کے ٹوٹنے سے روشنی کی ایک لکیر سی چمک جاتی تھی۔

براعظموں کا جنم | سائنس دانوں کا خیال ہے کہ کرۂ ارض ٹھوس ہو کر پہلے ایک ہی براعظم بنا جسے پین جیا کہتے ہیں۔ جب یہ ٹھنڈا ہو کر ٹھوس تر ہوتا گیا تو اس میں درازیں پڑتی گئیں اور وہ درازیں پھیل کر اور ٹوٹ کر موجودہ براعظموں کے جنم کا سبب بنیں جیسا کہ ذیل کی شکل سے ظاہر ہے۔



مگر اس ضمن میں مشہور سائنس دان اور ماہر علم طبقات الارض مسٹر وجینر کا نظریہ براعظمی بہاؤ (Continental Drift) زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ اس نظریہ کے مطابق براعظم ہیں جیا زمین کی کسی ناگہانی اندرونی حرکت سے ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ وہ منتشر ٹکڑے آج مختلف براعظموں کے نام سے موسوم ہیں۔ ایک بڑا ٹکڑہ شمال کی طرف کھسک کر یوریشیا براعظم بن گیا اور ایک مغرب کی طرف کھسک کر شمالی امریکہ کہلایا۔ جنوبی بڑی حصہ جسے گونڈوانا لینڈ بھی کہا گیا ہے جنوبی امریکہ، افریقہ آسٹریلیا، انٹارکٹیکا، جزیرہ نما ہند اور جزیرہ نما عرب میں منقسم ہو گیا۔

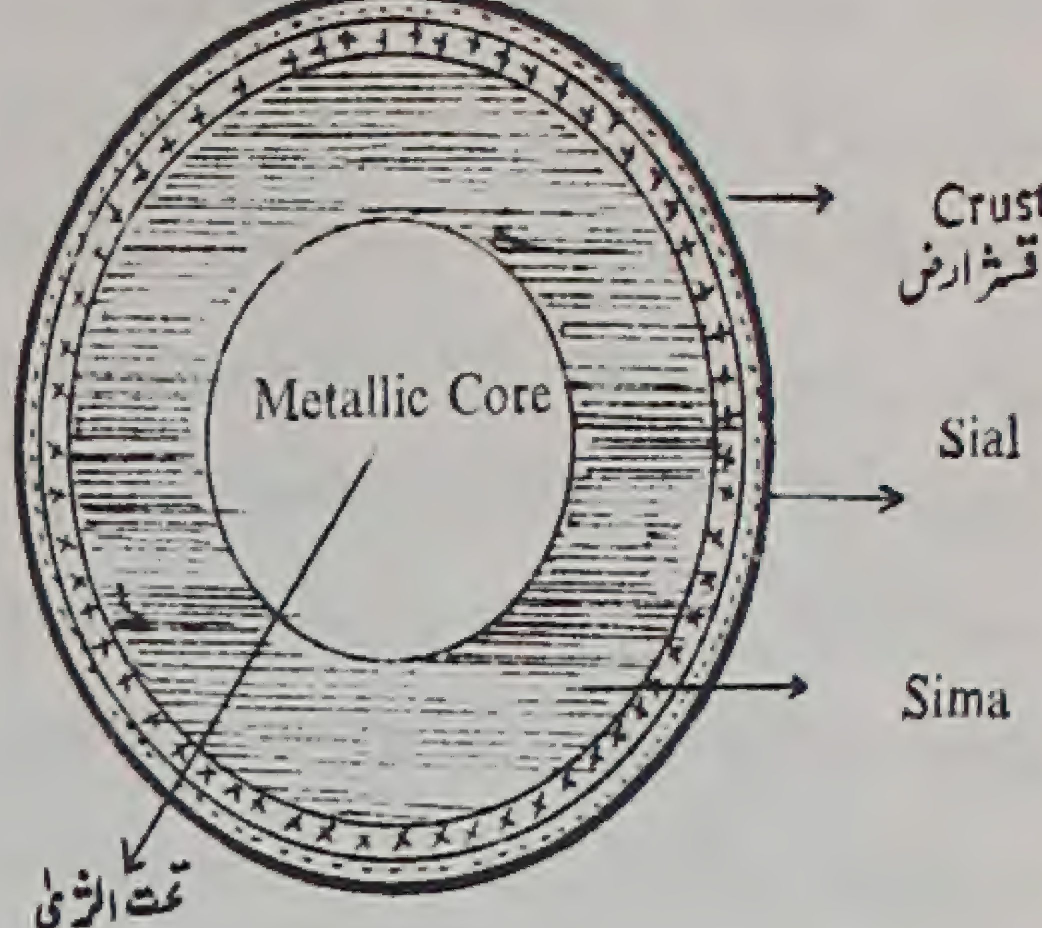
مسٹر وجینر اپنے اس نظریہ کو مقبول عام بنانے کے لئے دو دلیلوں سے کام لیتے ہیں۔ اولاً یہ کہ اگر ہم کسی مافوق الفطرت قوت سے ان منتشر ٹکڑوں کو پھر یکجا کر دیں تو وہ ایک دوسرے سے آکر ٹھیک اس طرح فٹ ہو جائیں گے جس طرح باہم ٹوٹے ہوئے لکڑی کے دو ٹکڑے اور دوئم یہ کہ ان دور افتادہ بڑے ٹکڑوں کی چٹانیں اور ان میں پائے جانے والے حیوانات اور نباتات کے مردہ اجسام (Fossils) بالکل ایک جیسے ہیں جو اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ یقیناً کسی زمانے میں یہ ایک دوسرے سے ملے رہے ہوں گے۔ شمالی اور جنوبی خشکی کے بڑے ٹکڑوں کے درمیان ایک لمبا اور تنگ سمندر تھا جو ٹیتھیز کے نام سے موسوم تھا۔ بحرۂ روم اسی سمندر کا بچا ہوا ایک حصہ ہے۔

پہاڑوں کی تعمیر کرۂ ارض کی تاریخ میں اب تک پہاڑوں کی تعمیر کے نو ادوار گزر چکے ہیں۔ شروع کے چھ ادوار کے بنے ہوئے پہاڑوں کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہے۔ ان کے نشانات اب کہیں نہیں ملتے۔ آخری تین ادوار کے پہاڑوں کے نمونے اس وقت بھی موجود ہیں۔ ہمالیہ، آلپس اور راکی کے پہاڑی سلسلے سب سے آخری دور کی پیداوار ہیں جسے الپائن دور کہتے ہیں۔ اس کے قبل آج سے بیس کروڑ برس پیشتر ہرسی نین دور کے بنے ہوئے پہاڑ ہیں جو مختلف براعظموں میں بکھرے ہوئے ہیں جو عوامل شکست و ریخت کے ہاتھوں گھس گھسا کر نیچے ہو گئے ہیں۔ بھارت کے کوہ اراولی اور وندھیاچل ان کی زندہ مثالیں ہیں۔ کیلی ڈونین کے پہاڑ جن کو بنے ہوئے چالیس کروڑ برس کا زمانہ گزر چکا ہے نسبتاً زیادہ گھس گئے ہیں۔ ان کی اونچائی بہت کم رہ گئی ہے اور ان کی چوٹیاں نکونی نہ رہ کر سڈول بن گئی ہیں۔ مگر ہمالیہ، آلپس اور راکی وغیرہ کا جنھوں نے الپائن دور میں جنم لیا آج سے سات کروڑ برس پہلے وجود نہ تھا۔ ہمالیہ کی جگہ بحر ٹیتھیز موجیں مار رہا تھا۔ بھارت اور عرب کے جزیرہ نما زمین کی اندرونی حرکت سے اتر کی طرف کھسکے۔ ان کے کھسکنے سے بحر ٹیتھیز کی تہ کی مٹی ابھرنا شروع ہوئی اور پانچ چھ کروڑ برس تک ابھرتی رہی۔ اس طور پر بالآخر ہمالیہ، زاغ روس اور ترکی کے پہاڑوں کا جنم ہوا۔ ٹھیک اسی وقت افریقہ براعظم بھی اتر کو کھسکا اور اس کے کھسکنے سے بحر روم کی تہ کی مٹی ابھرنا شروع ہوئی اور آلپس کے پہاڑی سلسلے ظہور میں آئے۔ ہمالیہ اور آلپس کے سلسلے بالکل نوعمر پربت ہیں جن کی عمریں بہت کم ہیں۔ صرف سات کروڑ برس۔ یہ اپنی طفلی کا زمانہ ختم کر کے جوانی میں قدم رکھ رہے ہیں۔ ابھی تو ان کی بالیدگی کا زمانہ ہے۔ یہ اب تک ابھرتے جا رہے ہیں۔ ہمالیہ اور سطح مرتفع دکن پر بہنے والی ندیوں نے بحر ٹیتھیز کو پاٹ کر سندھ اور گنگا کے میدان میں تبدیل کر دیا ہے۔ سال بہ سال اس پر نئی مٹی کی تہ جمتی جا رہی ہے جس سے اس کی دبازت بڑھتی جا رہی ہے۔ ڈر ہے خدانخواستہ یہ اپنے بڑھتے ہوئے بوجھ کی وجہ سے پھر دھنس کر سمندر کی شکل نہ اختیار کر لے۔ مگر آپ خائف نہ ہوں! ایسا ہونے کے لئے کروڑوں برس کی مدت درکار ہوگی۔

چوں کہ نوعمر پہاڑوں کی جڑیں کرۂ ارض کے اس نیم جامد طبق کے اندر ہیں جسے (Sima) کہتے ہیں اس لئے ان پر جس قدر عوامل شکست و ریخت کا تخریبی اثر پڑتا ہے وہ اسی قدر اور ابھر آتے ہیں۔ لہٰذا اس بات کے امکانات اب بھی نہیں رہ گئے کہ یہ بھی اپنے سے ماقبل پہاڑوں کی طرح گھس گھسا کر نیچے ہو جائیں۔ علاوہ بریں ان کی دو پٹیاں ہیں۔ ایک یوریشیا میں جو مشرق سے مغرب اور دوسری امریکہ میں جو شمال سے جنوب کو پھیلی ہوئی ہیں۔ قدرت نے ان کی ساخت اور تنظیم اس نہج پر کر کے براعظمی بہاؤ کے مزید امکانات بھی ختم کر دئے ہیں۔

کرۂ ارض کی ساخت اس میں شک نہیں کہ مسٹر وجینر نے اپنا نظریہ (براعظمی بہاؤ) پیش کر کے ہمارے لئے تحقیقات کی راہیں کھول دی ہیں۔ ہم بروقت ان کے نظریہ کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور بھی ہیں۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنے وزنی اور ٹھوس ٹکڑوں نے آخر کس طرح اپنی جگہ چھوڑی ہوگی۔ اس کے جواب میں معاً یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ یقیناً ان کی بنیاد مستحکم نہ ہوگی ورنہ وہ جنبش نہ کر پائے ہوتے۔ اسے سمجھنے کے لئے ہمیں کرۂ ارض کی ساخت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ کرۂ ارض کی بناوٹ مختلف طبقات پر مشتمل ہے جیسا کہ ذیل کی شکل سے اندازہ ہوگا۔



کرۂ ارض کا اوپری حصہ قشرِ ارض کہلاتا ہے جو انسان اور عام حیوانات کی جولانگاہ ہے۔ یہ ٹھوس ہے اور مٹی، ریت اور پتھر کا بنا ہوا ہے۔ یہ زیادہ تر آبی اور کہیں کہیں آتشی چٹانوں پر مشتمل ہے۔ اس کی اوسط موٹائی نصف میل ہے مگر جا بجا اس کی موٹائی چھ میل کے لگ بھگ ہے۔ اس کے نیچے سخت آتشی چٹانوں کا ایک طبق ہے۔ اس کی دبازت تیس اور چالیس میل کے درمیان ہے۔ اس کے نیچے نیم جامد مادہ کا ایک طبق ہے جو تارکول کی طرح نیم جامد ہے۔ اس کی موٹائی ساڑھے سترہ سو میل ہے۔ یہ وہی طبق ہے جو آتش فشاں پہاڑوں کو جنم دیتا ہے

اس کے نیچے تقریباً ساڑھے اکیس سو میل موٹا طبق ہے جو مرکز تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ تحت الثریٰ کہلاتا ہے۔ اس کے متعلق سائنس دانوں کے نظریات میں اختلاف ہے۔ ایک گروپ کا خیال ہے کہ یہ مرکزی طبق گیس کی حالت میں ہوگا کیونکہ زمین کے اندر جانے میں درجۂ حرارت جس حساب سے بڑھتا ہے اس کی بنا پر مرکزی طبق میں اتنا زیادہ درجۂ حرارت کا ہونا قرین قیاس ہے کہ سخت ترین دھات بھی نہ صرف سیال بلکہ گیس کی حالت میں ہوگی۔ دوسرے گروپ کا یہ کہنا ہے کہ اوپری طبقوں کا دباؤ اس طبق پر اتنا شدید پڑتا ہے کہ وہ بڑھا ہوا درجۂ حرارت بھی اسے پگھلانے کے لئے ناکافی ہے۔ اس لئے دباؤ کی زیادتی سے یہ طبق نہ گیس کی شکل میں ہے نہ سیال بلکہ لوہے سے بھی سخت ہے۔ کیونکہ خیال یہ ہے کہ ایک ہزار میل کی گہرائی پر پکنی مٹی بھی اوپر کے دباؤ سے لوہے کی طرح سخت ہوگی۔

قشر ارض اور اوپری ٹھوس طبق وسطی نیم جامد طبق پر اس طرح تیر رہے ہیں جس طرح برف کا ٹکڑا پانی میں تیرتا ہے۔ یعنی تیرتے ہوئے برف کے ٹکڑے کا ایک حصہ پانی کے اوپر اور آٹھ حصے پانی کے نیچے رہتے ہیں۔ چناں چہ ہمارے جملہ براعظم اپنی اپنی گودوں میں فلک بوس پہاڑی سلسلے اونچے پلیٹیوؤں اور نشیبی میدانوں کو لئے ہوئے اس نیم جامد طبق پر اس طرح تیر رہے ہیں جس طرح ایک آئس برگ (برف کا بہت بڑا ٹکڑا) سمندر میں تیرتا ہے۔ اگر ہمالیہ پربت کی اوسط اونچائی چار میل ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کی جڑ تقریباً ۳۲ میل زمین کے اندر ہوگی۔ گویا پہاڑ زمین پر میخوں کی طرح گاڑ دئے گئے ہیں۔ پھر علم طبقات الارض کی جدید تحقیق کی روشنی میں کون اس حقیقت سے انکار کرسکتا ہے۔

گزارش



قدر بلگرامی، تلمیذ غالب

متعلقہ مضمون صفحہ ۶ پر ملاحظہ فرمائیں

.جون پور



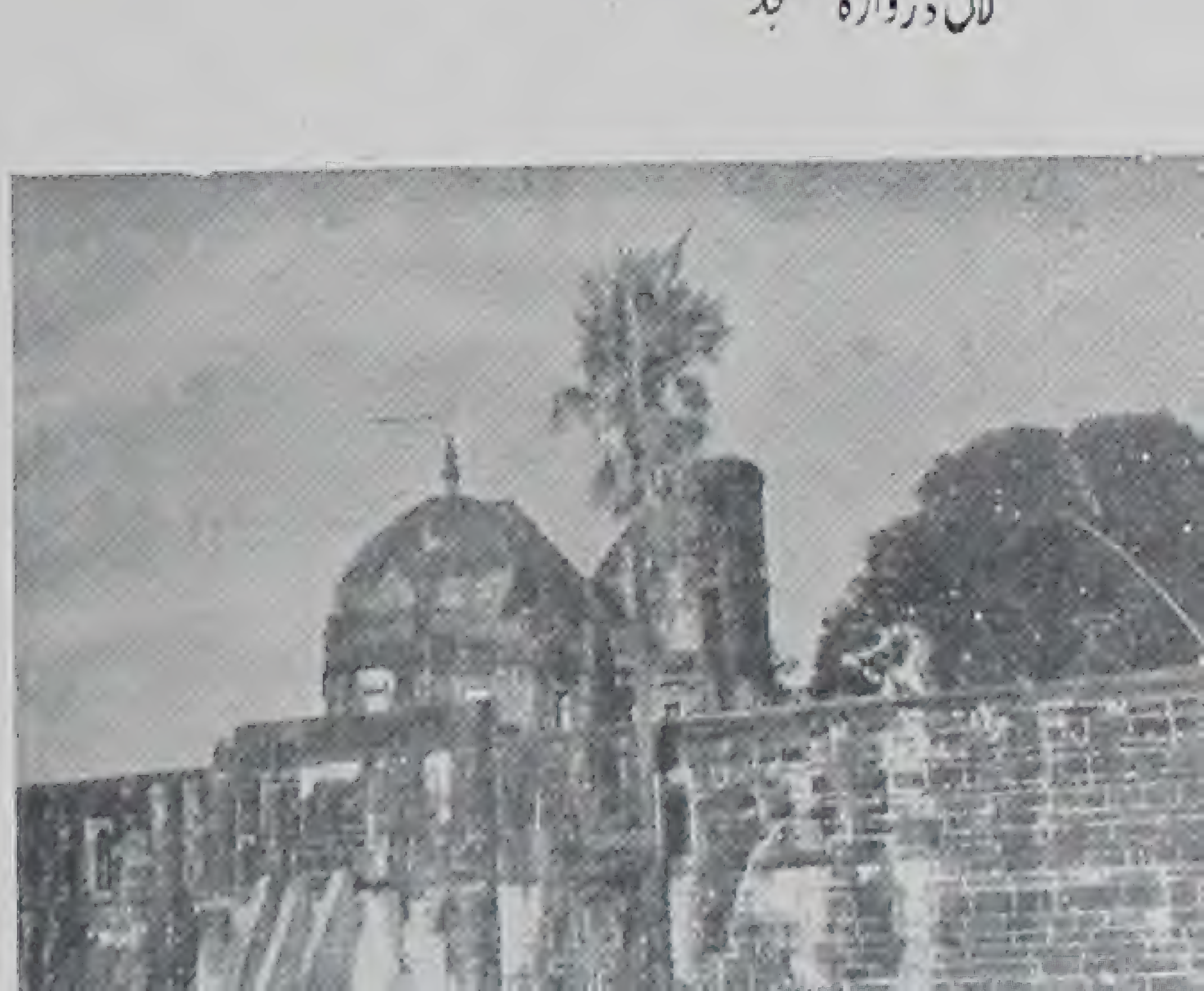


.جونپور کا قلعہ

ابراہیم باربک کی مسجد



لال دروازہ مسجد



تاریخی عمارتیں



اکبری پُل

جامع مسجد





لا مسجد

متعلقہ مضمون صفحہ ۲۷ پر پڑھیے



ہندوستان اور نیپال میں جغرافیائی، تہذیبی اور تمدنی رشتے زمانۂ دراز سے قائم ہیں۔ اور دونوں اچھے پڑوسیوں کی طرح رہتے آئے ہیں۔ خیرسگالی کے دَورے آپس کے رشتوں کو پائیدار بناتے ہیں۔

حال میں مہاراجہ صاحب اور مہارانی صاحبہ نیپال دلّی تشریف لائی تھیں۔ پالم ہوائی اڈّے پر اُن کا شاندار استقبال کیا گیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے۔

غلام احمد فرقت کاکوروی

جون پور کی تاریخی عمارتیں

چودھویں صدی کے وسط میں خاندان تغلق کے مشہور بادشاہ محمد بن تغلق نے خواجہ جہاں کو اپنی سلطنت کے مشرقی صوبوں کا مدار المہام (گورنر) مقرر کیا۔ اس نے ملک الشرق کا لقب اختیار کرکے جون پور کو اپنا صدر مقام بنایا اور وہاں رہنا شروع کر دیا۔ چناں چہ وہ شرقی خاندان کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ جونپور تقریباً ایک صدی تک مشرقی بادشاہوں کی راجدھانی رہا۔ ملک الشرق یعنی خواجہ جہاں کے مرنے کے بعد جب اس کا بیٹا مبارک تخت نشین ہوا تو اس نے ایک مطلق العنان حکومت قائم کر لی۔ تخت نشین ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اس نے اپنی سلطنت کو وسعت دینا شروع کر دی اور قنوج سے بہار اور بہرائچ سے اٹاوہ تک کے علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ مبارک کو فنِ تعمیرات سے بڑی دل چسپی تھی۔ چناں چہ اس نے جونپور میں کئی خوب صورت مساجد تعمیر کرائیں۔ اس کی بنوائی ہوئی مساجد قنوج، اٹاوہ اور بنارس میں اب تک موجود ہیں۔ جون پور کا وہی پہلا بادشاہ ہے جس نے اپنے نام کے سکے ڈھلوائے۔ چناں چہ جنرل کننگھم نے لکھا ہے کہ جون پور میں جو پرانی مساجد نظر آتی ہیں وہ سلاطین شرق ہی کی بنوائی ہوئی ہیں۔

جون پور کا شہر دریائے گومتی پر واقع ہے جس کا منبع پیلی بھیت (روہیلکھنڈ) میں ہے۔ وہاں دو ریلوے اسٹیشن ہیں۔ ایک ڈاک بنگلہ اور ایک ویٹنگ روم ہے۔ جون پور شہر کے پیچھے ایک بہت بڑی تاریخ ہے جس پر وقت کے اتنے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں کہ اس کا پتہ چلانا مشکل ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل اس شہر کا اصلی نام کیا تھا۔ برہمنوں کا کہنا ہے کہ اس کا اصلی نام جمادگنی پورا تھا۔ بندھیل کھنڈ میں ایک کتبہ بھی دستیاب ہوا ہے جس سے اس شہر کی اصلیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتبہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں گومتی کے کنارے جوانا پور یا یوندرا پورہ نام کا ایک شہر تھا۔ مگر بعض انگریز مؤرخین کا خیال ہے کہ محمد بن تغلق جو جوناخاں کے نام سے بھی موسوم ہے یہ اسی کے نام پر آباد کیا گیا ہے اور فیروز شاہ تغلق نے اپنے چچا زاد بھائی جوناخان کی یاد میں اسے بسایا تھا۔ مگر اس کے بارے میں جو چند روایات ہیں وہ یہ ہیں کہ جس جگہ جون پور کا شہر واقع ہے وہاں ایک نہایت طاقت ور اور بہادر دیو برسرِ حکمران تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب رام چندر جی اجودھیا کے حکمران تھے۔ چناں چہ رام چندر جی نے اس دیو سے جنگ کی اور اسے قتل کر دیا۔ رام چندر جی کا مندر اب تک اس جگہ موجود ہے۔ لیکن ایک دوسرے مؤرخ کا بیان اس سے بھی زیادہ ثقہ اور مدلل معلوم ہوتا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ دسویں صدی میں جب ۱۱۶۸ میں وجے چندر تخت نشین ہوا تو اس کے زمانہ میں ایک تالاب تھا جو اب حوض خاص کہلاتا ہے۔ اس تالاب کے پاس بہت سے مندر تھے اور مندروں کے علاوہ اور دوسری خوب صورت عمارتیں بھی تھیں۔

۱۱۹۴ء میں محمد غوری کے مشہور غلام اور جنرل قطب الدین ایبک نے جے چند کو جب شکست دے کر قتل کر دیا تو اس وقت جون پور اور

ظفر آباد کو بالکل ہی تاراج کردیا۔ اس کے بعد غیاث الدّین تغلق کے دور تک پتہ نہیں چلتا کہ اس زمانہ میں ان جگہوں پر کیا گزری۔ بہر صورت ۱۳۳۹ء میں جب فیروز شاہ تغلق کا اُدھر گزر ہوا تو اُسے یہ جگہ بہت پسند آئی اور اس نے ظفر آباد محمد بن تغلق کے منجھلے بیٹے ظفر کے نام کا شہر بسایا اور ظفر کو یہاں کا گورنر مقرر کیا۔ اس کے بعد اس مقام پر نہایت خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ بہر صورت ملک الشرق جس نے اس شہر کی بنیاد رکھی تھی اس کے خاندان کی حکومت ۱۵۰۴ء تک جاری رہی اور سلاطینِ شرقیہ کا آخری بادشاہ حسین شاہ شرقی تھا۔ اس کے بعد اس پر سکندر لودی کا قبضہ ہوگیا۔ لیکن یہ قبضہ زیادہ عرصے تک نہ رہا۔ لودی حکومت کے ختم ہونے کے بعد یہ شہر پھر ایک زمانہ تک گمنامی کا شکار رہا۔ یہاں تک کہ اکبر نے ۱۵۶۴ء میں منعم خاں خانخاناں کو یہاں کا گورنر مقرر کیا۔ اور دو مرتبہ خود اکبر نے بھی اس جگہ کا معائنہ کیا۔ اس زمانے میں یہ شہر اوجِ کمال پر تھا۔ اکبر کے مرنے کے بعد پھر رفتہ رفتہ یہ شہر گمنامی میں آگیا اس کے بعد جب اودھ میں شجاع الدولہ کا زمانہ آیا تو اس نے ۱۷۶۴ء میں یہ شہر ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا۔ ۱۸۵۷ء میں جب غدر ہوا تو اس جگہ باغیوں اور برطانوی حکمرانوں کے درمیان بڑی خونریز جنگیں ہوئیں ۱۸۵۸ء میں لارڈ مارکر اور سر ایڈورڈ لگارو نے یہاں امن و امان قائم کیا۔

ظفر آباد جون پور کے قریب ہی واقع ہے۔ ظفر آباد میں ایک عمارت بودھوں کے زمانہ کی ہے۔ لیکن اس عمارت کے بارے میں شک ہے کہ یہ بودھوں ہی کے زمانہ کی ہے یا اس کے بعد کی۔ کیونکہ گپتا عہد کے بعد کی تاریخ تو ملتی ہے مگر اس سے قبل کی کوئی لکھی ہوئی تاریخ موجود نہیں ہے۔ ظفر آباد کے پاس ایک بستی تھی جو منیچ کہلاتی تھی۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ جس جگہ ظفر آباد واقع ہے یہ مقام پہلے منیچ کہلاتا تھا اور اس کی راجدھانی آسنی تھی۔ مگر مشہور انگریز مؤرخ ایلیٹ نے مسلمان مؤرخین کے حوالوں سے اس کا نام مُنج مَنج مُباج اور بھج بتایا ہے۔ ۱۰۱۹ء میں جب محمود غزنوی نے جے پال کا تعاقب کیا تو وہ منیچ تک آیا تھا اور جے پال نے بنارس کے راجہ چندر پال سے امداد بھی طلب کی تھی اور اپنی جو ظفر آباد کی راجدھانی تھی اسی مقام پر محمود غزنوی نے چندر پال کو قتل کیا تھا اور ظفر آباد کے شمال میں جو رتن گڑھ کا مشہور قلعہ تھا اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ سید سالار غازی کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ وہ ظفر آباد کی طرف سے گزرے تھے مگر پروفیسر حبیب کو نہ صرف اس سے اختلاف ہے کہ وہ ادھر سے گزرے تھے بلکہ وہ سرے سے اس کے منکر ہیں کہ سید سالار غازی کوئی بزرگ تھے بھی۔ اگرچہ ۱۰۱۹ء سے ۱۰۹۷ء کا کوئی رکارڈ موجود نہیں ہے تاہم اس معاملے میں تمام مؤرخین کی رائے ہے کہ ۱۰۳۳ء میں احمد نیلتگین نے اس علاقے پر حملہ کیا تھا۔

ظفر آباد میں جو مسجد شیخ برہان کے نام سے موسوم ہے وہ ۱۳۲۱ء میں علاء الدّین خلجی کے دور کی تعمیر ہے۔ اسی سال ظفر نے جو غیاث الدّین تغلق کا منجھلا لڑکا تھا سکت سنگھ کو شکست دی تھی۔ یہ عمارت عجیب وغریب ساخت کی ہے۔ اس مسجد میں ۵۶ منارے ہیں جو قدیم ہندو مناروں کی وضع کے ہیں۔ ظفر آباد کے گرد و پیش اونچے اونچے ٹیلے ہیں۔ ان ٹیلوں پر کسی زمانہ میں ہندو راجاؤں کے محلات تھے یا وہاں پر عظیم الشان مندر اور مسلمانوں کے مقبرے بنے ہوئے تھے۔ قنوج کے راجہ وجے چندر کا مندر جو وجے منڈل کے نام سے موسوم تھا، اب منہدم ہو کر زمین کے برابر ہو گیا ہے اور صرف اس کا ملبہ اب سے چالیس پچاس برس پہلے تک نظر آتا تھا۔ ظفر آباد سے تقریباً ایک میل کی دُوری پر قنوج کے راجاؤں کا محل تھا جہاں انگریزوں کے عہد میں گپتا دور کے سکے برآمد ہوئے تھے۔

ظفر آباد میں جو بازار ہے اس کے جنوب میں ایک اونچا سا ٹیلا ہے جس کے چہار طرف خندق کھدی ہوئی ہے۔ شمال کی جانب یہ خندق خاصی گہری ہے۔ اسی ٹیلے پر وجے چندر یا جے چندر کا قلعہ تھا۔ اگرچہ قلعہ کی عمارت منہدم ہو چکی ہے اور اس کا صرف ملبہ ہی ملبہ باقی ہے مگر اس ملبہ میں قدیم ہندو وضع کی اینٹیں ملتی ہیں۔

یہاں چراغ ہند کے نام سے جو روضہ ہے اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ظفر شاہ کا بنوایا ہوا ہے۔ اس پر ایک کتبہ بھی نصب ہے جس میں ظفر شاہ کا نام درج ہے اور اس پر ۱۳۱۹ء تاریخ درج ہے۔ یہاں پر اور بہت سے قابل ذکر مقابر ہیں۔ ان میں بہت سے مقابر تو بہت ہی عمدہ بنے ہوئے ہیں اور تاریخی اور تعمیری نقطہ نظر سے ایک

خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے ابتدائی دور میں اس مقام پر قبضہ کرنے میں بہت سے مسلم امراء کے درمیان زبردست کشت و خون ہوا اور جونپور کے گرد و نواح میں زبردست لڑائیاں ہوئیں اور دو درجنوں بادشاہ یکے بعد دیگرے اس پر قابض رہے۔ ان میں سے بعض کی بنوائی ہوئی عمارتیں اب تک موجود ہیں۔ اور بہت سے سلاطین جنھوں نے کوئی عمارت نہیں بنوائی بے نام و نشان مرے۔ اس وقت جونپور میں تین مساجد تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سب سے قدیم مسجد وہ ہے جو قلعہ کے اندر واقع ہے۔ یہ ایک بنگالی وضع کی تپلی محراب دار عمارت ہے جس کی سادہ محرابیں قدیم وضع کے ہندوانہ ستونوں پر رکی ہوئی ہیں۔ اس کے وسط میں تین نیچے گنبد ہیں۔ یہ مسجد ایک سو تیس فٹ چار انچ لمبی اور باہر کی طرف سے تیئیس فٹ چوڑی ہے۔ ایک کمرہ اس کے وسط میں واقع ہے اور اس میں دو بغلی کمرے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس میں منارے نہیں ہیں بلکہ مناروں کی جگہ پتھر کے ستون ذرا فاصلے پر بنے ہوئے ہیں۔ مشہور ماہر آثارِ قدیمہ کڈ نے اس کے بارے میں بڑی دل چسپ تفصیل دی ہے اور اس کا خیال ہے کہ یہ مسجد فیروز شاہ تغلق کی بنوائی ہوئی ہے۔ لیکن اس میں فارسی کا جو ایک طویل کتبہ نصب ہے اس میں اس کی تاریخ تعمیر ۱۳۷۷ء درج ہے اور اس میں ابراہیم نائب باربک کا نام درج ہے۔ ضیاء الدین برنی نے ابراہیم نائب باربک کو فیروز شاہ تغلق کا بھائی لکھا ہے۔

دوسری مشہور مسجد اٹالہ ہے جسے ابراہیم شاہ نے اپنے ابتدائی دورِ حکومت میں بنوایا تھا۔ فرگوسن کا خیال ہے کہ جونپور میں جتنی بھی مسجدیں ہیں ان میں اٹالہ کی مسجد بے حد حسین اور خوب صورت ہے۔ جنرل کننگھم کو بھی فرگوسن کی اس رائے سے پورا پورا اتفاق ہے۔ یہ ایک چوپہل عمارت ہے جس کے گرد تین طرف دو منزلہ خانقاہیں بنی ہوئی ہیں اور مسجد مغرب کی طرف بنی ہوئی ہے۔ پوری عمارت دو سو باون فٹ لمبی اراضی پہ واقع ہے اور اس کا رُخ شمال سے جنوب کی طرف ہے باہر کی طرف سے اس کی چوڑائی دو سو اڑتالیس فٹ ہے۔ مسجد کے وسط میں جو محراب ہے وہ حد درجہ مزین اور خوب صورت ہے۔ مسجد پانچ حصوں میں تقسیم ہے۔ درمیان میں جو کمرے ہیں ان پر ایک گنبد ہے جس کا قطر تیس فٹ ہے اور بغلی کمرے شاہی خاندان کی خواتین کے لئے مخصوص تھے۔ درمیانی کمرے کی ترتیب بھی عجیب و غریب قسم کی ہے۔ چونکہ یہ مستطیل ہے پھر بھی جو گنبد ہے وہ نصف کرہ کی طرح کا ہے۔

ابراہیم شاہ شرقی نے اپنے دورِ حکومت میں دو مسجدیں تعمیر کرائی تھیں۔ خالص و مخلص کی جو مسجد ہے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ ملک خالص اور ملک مخلص جون پور کے گورنر تھے اور ابراہیم شاہ شرقی کے مقربین امراء میں سے تھے۔ یہ مسجد بھی اب منہدم ہو گئی ہے اور اس کے صرف کھنڈر رہ گئے ہیں۔ یہ مسجد ۱۴۱۷ء کے لگ بھگ تعمیر ہوئی تھی۔

جامع مسجد جو مسجد جامع الشرق کے نام سے موسوم تھی جونپور کی سب سے بڑی مسجدوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس مسجد کی بنیاد ۱۴۳۸ء میں ڈالی گئی تھی لیکن ۱۴۴۰ء تک اس کی تعمیر نہیں شروع کی گئی۔ ۱۴۷۱ء میں حسین شاہ شرقی کے دور میں اس کی تکمیل ہوئی۔ یہ مسجد ایک چبوترے پر واقع ہے اور اٹالا مسجد سے ملتی جلتی ہے۔ یہ ڈھائی سو فٹ لمبی اور اٹھاون فٹ چوڑی ہے۔ اس میں بھی پانچ کمرے ہیں۔ اس مسجد کے گنبد میں فن نقاشی کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ اس کا صحن دو سو انیس فٹ لمبا اور دو سو سترہ فٹ چوڑا ہے۔ اس کا پھاٹک بیس فٹ اونچا اور تین سو سات فٹ چوڑا ہے۔ اس کے شمال میں جو پھاٹک ہے اس کے سامنے سلاطین شرقیہ کا قبرستان ہے۔

لال دروازہ یا بی بی راجی کی مسجد جون پور کی مسجدوں میں سب سے چھوٹی مسجد ہے۔ بی بی راجی محمد شاہ شرقی کی ملکہ تھی جو اپنے شوہر کے مرنے کے بعد ۱۴۷۷ء میں اٹاوہ میں مری۔ اس میں جو ہشت پہل منارے ہیں ان پر ایک کتبہ نصب ہے جس پر ۱۲۹۶ء درج ہے۔ ایک دوسرے کتبہ میں بارھویں صدی عیسوی کا ابتدائی زمانہ درج ہے۔ یہ مسجد بھی ہندو معماروں کی تعمیر کی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

قلعہ فیروز شاہ تغلق کا بنوایا ہوا ہے لیکن اب وہ تقریباً منہدم ہو چکا ہے اور محض اس کے آثار باقی رہ گئے ہیں۔ صرف قلعہ میں جو ترکی حمام تھا وہ باقی ہے۔ اس کے داخلے کا پھاٹک اب بھی موجود ہے اور اس میں خوب صورت قسم کی ٹائلس ہیں اور اس کی محراب بھی بہت ہی خوب صورت ہے

اس میں چہ پہل ستون یا چالیس منارے تھے انھیں لفٹنٹ مالکم نے منہدم کرادیا۔ یہ چالیس منارے ہی ساری عمارت کی جان تھے۔

شہر کے اندر دریائے گومتی پر جو پتھر کا پُل ہے وہ بھی فنِ تعمیرات کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ مشرقی بادشاہوں کے زمانے تک کشتیوں کا پل تھا جو تقریباً سو برس تک استعمال ہوتا رہا۔

۱۵۶۵ء میں اکبر بادشاہ جون پور گیا تھا جس کی بڑی دلچسپ تفصیلی تاریخ ہے۔ اس کا ترجمہ بیگی نے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اکبر برابر تفریح اور شکار کی غرض سے اپنے درباریوں کے ہمراہ شاہی کشتیوں پر بیٹھ کر دریائے گومتی جایا کرتا تھا۔ ایک دن جب وہ اپنی کشتی پر سیر سے واپس ہو رہا تھا کہ اس نے ایک عورت کو منہ ڈھانپے روتے ہوئے دیکھا۔ اس کی آہ وزاری سن کر اکبر کا دل بے چین ہوگیا۔ اس نے اپنے درباریوں سے دریافت کیا کہ یہ عورت کیوں اس قدر زار وقطار رو رہی ہے۔ درباریوں نے کشتی سے اُتر کر اس عورت سے رونے کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک بیوہ ہے اور شاہی اعزاز میں دریا کے کنارے جو بازار لگتا ہے اس میں بھکیں بیچنے گئی تھی اور اپنا شیر خوار بچہ دریا کے دوسرے کنارے پر چھوڑ آئی تھی مگر جب وہ بازار پہنچی تو کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی اور شاہی سواری ادھر سے گزر گئی۔ اب اُسے دوسرے کنارے جانا ہے اور دیکھنا ہے کہ بچہ کس حال میں ہے۔ یہ سن کر بادشاہ نے بیوہ کو اپنی کشتی میں بٹھا لیا اور جون پور کے حاکموں کو حکم دیا کہ اس قسم کی بیواؤں اور دوسرے ضرورت مندوں کے لئے کچھ کشتیاں مخصوص کردی جائیں جو انھیں دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پہنچایا کریں۔ اس کے بعد اس نے امراء سے جس میں اتفاق سے خانخاناں بھی موجود تھا مخاطب ہوکر کہا کہ شرقی بادشاہوں نے اپنی حکومت تو قائم کرلی اور بہت سی نامضبوط اور غیر مستحکم عمارتیں بھی تعمیر کرائیں مگر اُن سے اتنا نہ ہوا کہ بجائے اس قسم کی عمارتیں بنوانے کے ایک پختہ پتھر کا پل دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک لوگوں کے آنے جانے کے لئے تعمیر کرادیتے جس سے ان کی شہرت برقرار رہتی۔ اس پر خانخاناں نے عرض کی کہ اگر گستاخی معاف ہو تو عرض کروں جہاں پناہ! بات یہ ہے کہ حضور کے اعمال میں قسامِ ازل نے جو نیکیاں لکھ رکھی ہیں ان میں یہ نیک کام بھی شامل ہے۔ لہٰذا وہ کیسے قضا وقدر کے معاملات میں دخل دینے کی جرأت کرسکتے تھے۔ اس پر بادشاہ نے انتہائی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے خانخاناں کو ایک خلعتِ فاخرہ عطا کی اور خانخاناں کی اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ خانخاناں جب بادشاہ کی حضوری سے چلا آیا تو اس نے اس بات کا تہیہ کیا کہ وہ جس طرح بھی ہوسکے گا دریا پر ایک مضبوط پُل تعمیر کروائے گا۔ چناں چہ اس نے نہایت تجربہ کار انجینئر کو بلوایا اور انھوں نے کہا کہ دریا کی مغرب جانب بدیع منزل کے مقابل جہاں زمین شکستہ ہے پُل کے لئے وہی جگہ مناسب رہے گی۔ اسی جگہ کو سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے اس وجہ سے پسند کیا تھا کہ گرمی کے موسم میں یہ جگہ پایاب ہو جاتی تھی خانخاناں نے کہا کہ میں قلعہ کے مقابل جس جگہ شہنشاہ نے بتایا ہے ایک مضبوط پُل بنوانا چاہتا ہوں۔ اس پر حاضرین میں سے لوگوں نے کہا کہ جس مقام پر آپ پل بنوانا چاہتے ہیں وہ جگہ ان کے ہوش میں کبھی پایاب نہیں رہی بلکہ اس کے شمال جانب ایک گہری کھائی چلی گئی ہے جس کی تہ کا آج تک کوئی پتہ نہیں لگا سکا۔ اور جو بھی اس کی تہ کا پتہ لگانے گیا واپس نہیں پلٹا۔ خانخاناں نے جواب دیا کہ اگر اس جگہ پل نہ بنا تو پھر میری بات ہی کیا رہی دوسری جگہ پُل تو دوسرے بھی بنوا سکتے ہیں۔ اس کے بننے میں خاص بات کیا ہوگی۔ بہرصورت یہ سُن کر ایک تجربہ کار انجینئر نے کہا کہ کل ایک کشتی پر چل کر حضور موقع کا معائنہ کرلیں۔ دوسرے روز خانخاناں نے جاکر اس جگہ کو دیکھا اور انجینئر سے وعدہ کیا کہ وہ جیسا کہے گا اس کی پابندی کی جائے گی۔ دوسرے دن خانخاناں پھر اسے دیکھنے گیا اور اپنے ہمراہ دوسری کشتی پر روپیوں کی تھیلیاں بھی لے گیا۔ جب خانخاناں اس مقام پر پہنچا تو انجینئر نے کشتی میں سے روپیوں کی ایک تھیلی نکال کر اس جگہ دریا میں یہ کہہ کر ڈالی کہ اس جگہ پر پل اُسی صورت میں بن سکتا ہے جب دریا میں اتنی بوریاں ڈالی جائیں کہ وہ سطح تک آجائیں۔ یہ سن کر خانخاناں نے کشتی کو جو تھیلیوں سے لدی ہوئی تھی اسی مقام پر ڈبو دینے کا حکم دیا اور کہا کہ روپیہ کی ایسی ایسی ہزاروں کشتیاں بھی اگر ڈبونے کی ضرورت پڑے تو ڈبو دی جائیں۔ غرض یہ پُل اس طرح پر بنا کہ سب سے

پہلے ایک بہت ہی مضبوط قسم کا پل جنوب کے رُخ بنایا گیا۔ اس کے بعد شمال کی جانب تھوڑی سی مٹی کی آمیزش سے چونے اور پتھر کا ایک مضبوط پشت بند تعمیر کیا گیا۔ پھر دریا کے دھارے کے رُخ کو بند باندھ کر مغرب کی طرف سے دوسری طرف موڑ دیا گیا۔ آخر میں جس جگہ پر کھائی تھی وہاں بہت سی کشتیوں پر سیسہ لاد کر اور انہیں ایک دوسرے سے باندھ کر سینکڑوں کی تعداد میں ڈبو دیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ سیسہ سطح آب کے برابر آگیا اور اس سطح پر سے پل کی تین محرابیں تعمیر کی گئیں۔ اس کی ایک محراب جب بن کر تیار ہوئی تو ایک شاعر نے اس کا قطعۂ تاریخ نکالا۔ یہ قطعۂ تاریخ خانخاناں کو اس درجہ پسند آیا کہ خانخاناں نے اُسے نو سو بہتر اشرفیاں انعام میں دیں اس کے بعد دوسری محرابیں بنائی گئیں۔

۱۵۶۷ء میں یہ پل بن کر تیار ہوا اور بقول کننگھم یہ پل ہندوستان کے تمام پلوں میں فن تعمیر کے لحاظ سے حسین ترین ہے۔

شبیر کاظمی کاظم مظفر پوری

غزل

خدا سمجھے دلِ رنگیں ادا سے بتوں کو مانگ بیٹھا ہے خدا سے
تری رحمت کا پھر کیا حشر ہوگا اگر ہم باز آ جائیں خطا سے
فرشتوں کے لکھے کا کیا بھروسہ کہ یہ بد ظن ہیں ہم سے ابتدا سے
ہوا ہے آپ کی آمد کا دھوکا کبھی جو ہل گیا پردہ ہوا سے
بنا کر توڑتا ہے کیوں کھلونے ملا موقع تو پوچھوں گا خدا سے
نہ آئے آنچ دامانِ چمن پر نشیمن خاک ہو جائے بلا سے
نہ ان کی بندگی بھی راس آئی وہ بُت جو ہم کو لگتے تھے خدا سے
ہجومِ غم سے گھبراتا ہے جب دل خیالِ یار دیتا ہے دلاسے
ہوا ہے شوق کو منزل کا دھوکا نظر آئے جہاں کچھ نقشِ پا سے
خودی نے اس جگہ پہنچا دیا ہے جہاں بندہ اُلجھتا ہے خدا سے

نہ جانے کیا گزرتی مجھ پہ کاظم
اگر محروم ہو جاتا خدا سے

شیکسپیر

(انگلستان کی سرزمین بالخصوص اسٹرٹیفورڈ اپان ایون میں لکھی گئی)

اس طرح آج پھر آباد ہے ویرانۂ دل
کہ ہے لبریز مئے شوق سے پیمانۂ دل

دلِ بیتاب میں پنہاں ہے ہر ارمانِ نظر
چشمِ مشتاق میں ہے سرخئ افسانۂ دل

آج شمعوں سے یہ کہہ دو کہ خبردار رہیں
آج بیدار ہے خاکسترِ پروانۂ دل

اس کو ہے ایک فقط دیکھنے والا درکار
طور سے کم تو نہیں جلوۂ جانانۂ دل

جاگ بھی خواب سے اے مشرق و مغرب کے حکیم
کہ ترے واسطے لایا ہوں میں نذرانۂ دل

یہ ذرا دیکھ کہ آئے ہیں کہاں سے دونوں
دل تری خاک کا دیوانہ میں دیوانۂ دل

شوق کی راہ میں اک سخت مقام آیا ہے
مرا ٹوٹا ہوا دل ہی مرے کام آیا ہے

ساقئ جاں ترے میخانے کا اک رندِ حقیر
مثلِ بُو توڑ کے ہر قیدِ مقام آیا ہے

اللہ اللہ تری بزم کا یہ عالمِ کیف
مرے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آیا ہے

ترے نام آج زمانے کے مہکتے ہوئے پھول
غالبؔ و میرؔ کے گلشن کا سلام آیا ہے

وہ مری حسرتِ دیرینہ کا شہبازِ جلیل
کتنی مدت میں بالآخر تہِ دام آیا ہے

تجھ کو سینے میں بسایا ہے جو اقبال کے ساتھ
تو کہیں جا کے یہ اندازِ کلام آیا ہے

کیوں تجھے یہ ابدی نیند پسند آئی ہے
اے کہ ہر لفظ ترا شانِ مسیحائی ہے

ساقیٔ میکدۂ زیست ذرا آنکھ تو کھول
تری تربت پہ سیہ مست گھٹا چھائی ہے

جاگ بھی خواب سے دل دادۂ گل زار و چمن
کہ ترے دیس کے باغوں پہ بہار آئی ہے

جو ترے گھر میں ہے آج اس چمنستاں کو تو دیکھ
ذرّے ذرّے کو جنونِ چمن آرائی ہے

ہاتھوے[1] کا ہے مکاں وہ کہ مقامِ نو[2] ہے
جو بھی خطّہ ہے وہ اک پیکرِ زیبائی ہے

کچھ خبر بھی ہے کہ ایون[3] کی حسیں موجوں میں
جو ترے دور میں تھی اب بھی وہ رعنائی ہے

وہ ترا نغمہ کہ سینوں میں تپاں آج بھی ہے
اہلِ احساس کا سرمایۂ جاں آج بھی ہے

رند ہیں مشرق و مغرب میں اسی کے مشتاق
وہ ترا بادۂ کہنہ کہ جواں آج بھی ہے

آج بھی کعبۂ اربابِ نظر ہے تری فکر
وارثۂ اہلِ جنوں تیرا بیاں آج بھی ہے

آج سے چار صدی قبل جو چمکا تھا کبھی
ترے نغمات میں وہ سوزِ نہاں آج بھی ہے

جس میں ہے بادہ جنوں کا بھی مئے ہوش کے ساتھ
ترے ہاتھوں میں وہی رطلِ گراں آج بھی ہے

تو نے تمثیل کے جادے پہ دکھایا جو کبھی
"وہی میل اور وہی سنگِ نشاں آج بھی ہے"

ظلمتِ دہر کی راتوں میں سحر بار ہے تو
زیست اک قافلہ ہے قافلہ سالار ہے تو

تو ہر اک دور میں ہے دیدۂ بینا کی طرح
ہر زمانے میں دلِ زندہ و بیدار ہے تو

جس کی باتوں میں دھڑکتا ہے دلِ عصرِ رواں
آج تمثیلِ زمانہ کا وہ کردار ہے تو

کیوں نہ ہو لوح و قلم کو ترے اسلوب پہ ناز
حسنِ گفتار ہے، گنجینۂ افکار ہے تو

بزمِ جاناں ہو تو انداز ترا پھول کی شاخ
ظلم کے سامنے شمشیرِ جگر دار ہے تو

تو کسی ملک، کسی دور کا فن کار نہیں
بلکہ ہر ملک کا ہر دور کا فن کار ہے تو

---

[1] Anne Hathaway's College
[2] The New Place
[3] دریائے ایون جس کے کنارے شیکسپیئر کا وطن اسٹرٹیفورڈ آباد ہے۔ ایون کی وجہ ہی سے اس شہر کو اسٹرٹیفورڈ اپان ایون کہتے ہیں۔

عبدالمجیب سہالوی

صرف ۲۰ آنے کا سوال ہے

اتوار کا دن تھا۔ گھڑی نے ٹھیک بارہ بجائے تھے۔ میں کھانا کھا کر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں لیٹ کر اخبار یا کتاب پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ نیند بلانے کے لئے پڑھتا ہوں اس لئے کہ نیند کو شاید ضد ہے کہ وہ بس پڑھتے ہی وقت آتی ہے ورنہ غالب صاحب کی طرح ہمیں بھی ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ 'نیند کیوں رات بھر نہیں آتی'۔

ابھی میں "نیند آتی ہے پر نہیں آتی" والی منزل سے گزر رہا تھا بار بار ہاتھ سے اخبار گر جاتا اور آنکھ کھل جاتی اور میں پھر وہی خبر پڑھنے لگتا جو میں نے بہت پہلے شروع کی تھی اور کئی بار پڑھنے کے باوجود نیند کی وجہ سے کچھ پلے نہ پڑا تھا۔

خبر غالباً یہ تھی کہ حکومت گداگری بند کرنے کے معاملہ پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔ ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی ہے۔ یہ کمیٹی سب سے پہلے تو اس مسئلہ پر غور کرے گی کہ ہندوستان میں گداگری کے وجوہ کیا ہیں کیونکہ یہاں گداگری صرف معاشی بدحالی اور جسمانی معذوری ہی کی بنا پر نہیں کی جاتی ہے بلکہ اپنی اس قیمتی وراثت کو محفوظ رکھنے کے لئے کی جاتی ہے جو بزرگوں سے ترکہ میں ملی ہے۔ دوسری بات جس پر کمیٹی کو غور کرنا ہوگا وہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ سالہا سال کی ریاضت کے بعد کلاکار گداگروں نے اسے پیشہ کی سطح سے بلند کر کے ایک آرٹ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اسے ختم کرنا مناسب ہوگا یا نہیں اور اس کا ملک کے فن کاروں پر کیا ردِّ عمل ہوگا؟

ابھی میں یہ خبر ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ نیچے گلی سے صدا آئی کہ 'دنیا کے مالک کے نام پر صرف بیس آنے کا سوال ہے جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا'۔ اس صدا میں بلا کی بے نیازی، خود اعتمادی اور بے ہنگم پن پایا جاتا ہے جس نے میری نیند کافور کر دی اور میں سائیں بابا کی زیارت کے لئے چارپائی سے اٹھ کر چھجے سے جھانکنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دھوپ میں سڑک کے کنارے آنکھیں بند کئے منہ آسمان کی طرف اٹھائے کھڑے ہیں۔ ان کے سامنے ایک بورا کچھ خالی اور کچھ بھرا رکھا ہے اور ایک چھوٹا تھیلا پیروں کے پاس پڑا ہے اور وہ سانس لئے بغیر یہ صدا لگا رہے ہیں 'دنیا کے مالک کے نام پر صرف بیس آنے کا سوال ہے' جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا

سائیں بابا کا حُلیہ ہمارے دیس کی رنگا رنگ تہذیب کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھا جس میں ہر فرقہ کی جھلک پائی جاتی تھی۔ ننگے پاؤں' اونچی سفید تہبند اس پر برٹش شرٹ، لیکن کثرتِ استعمال سے دونوں کا رنگ مٹیالا ہو گیا تھا۔ سر پر بڑے بڑے بال جو چٹے اور زلف کی درمیانی منزل طے کر رہے تھے اور چکٹ جانے کی وجہ سے ان میں گھنگھریالے ہونے کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ داڑھی ایک مشت دو انگل سے زائد ہو کر شرعی حدود سے نکل کر بزرگی کی حدود میں پہنچ گئی تھی۔ قد لانبا جسم چھریرا، چہرہ طباق، رنگ سفید اور دل کا حال خدا کو معلوم۔ یہ تھا سائیں بابا کا حُلیہ جو غالباً فقیروں کا بھیس بدل کر تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کے لئے ہماری گلی میں صدا لگا رہے تھے۔

ہماری گلی اپنی رنگا رنگ آبادی کی وجہ سے گلی نہیں گلدستہ

ہے جس میں ہر قسم کے پھول لگے ہیں لیکن افلاس اور جہالت کی گرد سے میلے اور مرجھائے ہوئے ہیں۔ ایک لائن میں مزدور، ترکاری والے، موچی، بڑھئی، پنساری اور میوہ والے، دوسری لائن میں مہتر، دھوبی، چکوا، پان والا اور دودھ والے رہتے ہیں۔ کوٹھوں پر دفتر کے بابو، اسکول کے ٹیچر، پرانے مولوی، نئے وکیل، مریض کے غم میں سوکھے حکیم اور شہر کے اندیشہ میں دبلے اخبار نویس رہتے ہیں۔ ہماری گلی کا سب سے دل چسپ مشغلہ لڑائی ہے جس کا زور دن میں بارہ اور دو کے درمیان اور رات میں دس سے بارہ کے بیچ میں ہوتا ہے۔ جب مہتر تاڑی خانہ سے لڑکھڑاتے اور کاروباری کام کے بوجھ سے چور گھر واپس ہوتے ہیں اور اپنا سارا تکان اپنی گھروالی کی پتلی گردن پر اتارتے ہیں۔ ہماری گلی کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کبھی چوری نہیں ہوتی اور جب کبھی کسی ناتجربہ کار چور نے ایسی گستاخی کی جرأت کی تو اڑنے سے پہلے گرفتار ہوگیا۔ بات یہ ہے گلی تپلی، گنجان آبادی جس میں سے آدھی سے زائد آبادی سڑک کے کنارے سوتی کم اور لڑتی زیادہ رہتی ہے۔ اس لئے چور بھاگ کے جائے تو کیسے اور چوری کرے تو کیونکر۔

لیکن اس گلی میں رات کے چوروں کے بجائے دن کے سینہ زوروں کا بڑا زور رہتا ہے اور کوئی ایسا ہی منحوس دن ہوگا جس دن کوئی پہنچے ہوئے فقیر اپنی کرامات دکھا کر یہاں کی بھوکی ننگی آبادی سے اپنا ٹیکس نہ وصول کرلے جاتے ہوں۔ ابھی چند ہفتے ہوئے ایک پہونچے بزرگ "بھوکا ہوں اور ننگا ہوں کچھ رحم کرو کنجوسو!" کی دھمکی دے کر اپنا خراج کپڑے اور جنس کی شکل میں وصول کرلے جا چکے ہیں اور آج یہ بزرگ خالص نقدی کا سوال کر رہے ہیں۔ دیکھئے ان کی جھولی کس طرح بھرتی ہے۔

سائیں بابا یونہی صدا لگاتے رہے۔ گلی سے گزرنے والے لوگ ان کی طرف دیکھتے، کچھ دیر ٹھہرتے اور پھر مسکراتے چلے جاتے۔ محلہ کے کچھ لڑکے مزدوران کے پاس جمع ہوگئے تھے لیکن سائیں بابا کے حلیے، پاٹ دار آواز اور انوکھی صدا سے وہ کچھ سہمے ہوئے تھے اور سائیں بابا کے ساتھ انھیں کسی شرارت کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ محلہ کی عورتیں کوٹھریوں سے نکل کر چوکھٹ پر آگئی تھیں اور سائیں بابا کو ایک گھنٹے سے دھوپ میں برابر صدا لگاتے دیکھ کر ان کے دل میں ہمدردی اور خوف کے ملے جلے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ کوٹھوں پر سے لڑکیاں سائیں بابا کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں اور بوڑھیاں انھیں ڈانٹ رہی تھیں۔

سائیں بابا ایک گھنٹے کی لگاتار ریاضت سے کچھ تھک سے گئے تھے اس لئے انھوں نے دنیا کے مالک کے نام پر صرف بیس آنے کا سوال ہے کے ساتھ کچھ تقریروں اور اشعار کا سلسلہ شروع کر دیا تاکہ دم لے سکیں۔ تقریر میں ربط کم اور جذب زیادہ تھا اور یہی حال اشعار کا تھا: ایک مصرعہ ایک شعر کا اور دوسرا مصرعہ دوسرے شعر کا، لیکن دیوانہ بکار خویش ہشیار کے مطابق مطلب کے لحاظ سے سب باموقع اور بامعنی تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ انھوں نے سر کو خاص طرح سے جنبش دے کر کہنا شروع کیا۔

'یہ دنیا آنی جانی ہے، یہ دنیا رام کہانی ہے'

اور اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی جوڑ دیا کہ

آج وہ کل ہماری باری ہے

اس کے بعد انھوں نے تقریر شروع کی اور کہنے لگے "دھن ہاتھ کا میل ہے۔ میل چھڑانا پاپ نہیں پن ہے"۔ اور اسی کے ساتھ انھوں نے جوڑ دیا۔ "رام رحیم ایکئے نام، دان دے وہی بھگوان" اس کے بعد انھوں نے لوگوں کو مخاطب کر کے بڑے جوش سے سوال کیا۔ "اللہ ایشور کیا ہے اور کہاں ہے؟ آنکھ بند کر، دل میں ڈھونڈھ جو ڈھونڈے گا وہ پائے گا۔"

اس کے بعد انھوں نے پھر وہی صدا لگانی شروع کی لیکن تھوڑی ترمیم کے ساتھ یعنی سوال کو چندہ میں تبدیل کر دیا اور اب اس کی شکل یہ ہوگئی۔

'دنیا کے مالک کے نام پر صرف بیس آنے کا چندہ'

ایک ایک آنہ کر کے

انھوں نے یہ تبدیلی غالباً آبادی کی معاشی حالت کا اندازہ کرنے کے بعد ضروری خیال کی اور اب انھوں نے تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ ترمیم شدہ صدا لگانی شروع کر دی۔ اس ترمیم کا خاطر خواہ اثر پڑا اور

کوٹھریوں کی چوکھٹ پر بیٹھی عورتیں جو سائیں بابا کی ریاضت سے کافی متاثر ہو چکی تھیں۔ لیکن بیس آنے کی بھاری رقم عقیدت کی راہ میں روڑا بنی ہوئی تھی۔ اس کے ہٹ جانے سے اب وہ چوکھٹ سے اتر کر سڑک پر آ گئی تھیں اور آپس میں کھسر پھسر شروع ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ سائیں بابا کے لہجے میں اور زیادہ جلال پیدا ہونے لگا اور انھوں نے کہنا شروع کیا۔ کتھا ہو گی یا میلاد سب چندہ دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ لیکن دنیا کے مالک کے چاہنے والے کی کتھا سننے والا کوئی نہیں۔ پھر وہ اس طرح بڑبڑانے لگا۔

"دھن وان کیا دے گا، اس کا دل تھوڑا ہوتا ہے

غریب دے گا جس کی پونجی تھوڑی اور دل بڑا ہوتا ہے"

اس کے بعد پھر انھوں نے صدا لگانی شروع کی "دنیا کے مالک کے نام پر صرف بیس آنے کا چندہ۔" تھوڑی دیر کے بعد دم لینے کے لئے انھوں نے پھر تقریر شروع کی اور کہنے لگے میں کسی سے بھیک نہیں مانگتا ہیں جو کچھ مانگتا ہوں اپنے بھگوان اور اللہ سے مانگتا ہوں جس کے دل میں جس کے ہردے میں بھگوان اور اللہ بسا ہو گا۔ وہ دے گا اور جس کے دل میں راون اور شیطان گھسا ہو گا وہ کیا دے گا؟ اس کے بعد انھوں نے پھر گانا شروع کیا۔

یہ دنیا آنی جانی ہے یہ دنیا رام کہانی ہے

اور گلی کے موڑ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا

آج وہ کل ہماری باری ہے

اور اسی وقت اسی طرف سے ایک لڑکا ہائے نانی چیختا ہوا بھاگا اور عورتوں نے جو مڑ کر دیکھا تو ایک بڑھیا زمین پر پڑی ہے۔ اس کے بعد سائیں بابا نے کڑک دار آواز میں کہا جس کو دینا ہو دے ورنہ

'سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ'

اور اسی کے ساتھ وہ سامنے پڑے ہوئے بورے کو اٹھانے کے لئے جھکے۔ اب عورتوں میں ضبط کا یارا نہ رہا۔ کوئی ڈوپٹے کے پلو سے پیسے کھولنے لگی۔ کوئی جیب ٹٹول کر اکنی نکالنے لگی اور کوئی پٹاری الٹ پلٹ کر بچی کھچی ریزگاری تلاش کرنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے سائیں بابا کے سامنے اکنیوں اور پیسوں کا ڈھیر لگ گیا۔ دو ایک کو چھوڑ پر سے نیچے ہاتھوں میں ایک روپے کا نوٹ اور چار آنے دبائے سائیں بابا کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

سائیں بابا نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے اپنی دو گھنٹے کی سخت ریاضت کی گاڑھی کمائی بٹور کر جھولے میں بھری اور 'جو دے اس کا بھی بھلا اور جو نہ دے اس کا بھی بھلا' کہتے ہوئے غائب ہو گئے۔ ساتھ ہی گلی کے موڑ پر پڑی بوڑھیا بھی کسمسا کر کروٹیں بدلنے لگی، اور تھوڑی دیر میں اسی لڑکے کے کاندھے پر ہاتھ رکھے چلی گئی۔

دو گھنٹے سے سائیں بابا کی بک بک سنتے سر میں درد سا ہونے لگا تھا۔ اب جو ذرا سکون ہوا تو میری آنکھ لگ گئی۔

اب دیکھتا کیا ہوں کہ یہی سائیں بابا، بوڑھا اور وہی لڑکا بارہ دروں کے ایک بڑے دربار میں ایک اونچے درخت کے سامنے کھڑے ہیں۔ اس دربار میں اتنی روشنی اور اتنی خوشبو ہے کہ روشنی سے آنکھیں چکا چوند ہوئی جاتی ہیں اور خوشبو سے دماغ عرش اعلیٰ کی سیر کر رہا ہے۔ تخت پر ایک نورانی شکل کے بزرگ سے بیٹھے معلوم ہوتے ہیں لیکن تیز روشنی کی وجہ سے سوائے نورانی ڈھیر کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔

سائیں بابا نے ادب سے جھک کر کہا۔ میں اس دربار میں جھوٹ بولنا نہیں چاہتا۔ میں خاندانی سائیں ہوں۔ میرا باپ بمبئی میں اور میرا چچا کلکتہ میں یہی کاروبار بڑے پیمانے پر کر رہے ہیں اور اس فن کے استاد خیال کئے جاتے ہیں۔ ان کے سیکڑوں چیلے ہیں۔ جو بھی ان کی شاگردی میں ہے اور جم کر ریاضت کی۔ وہ کبھی بھوکے نہیں رہے لیکن اپنے شاگردوں پر دشمن کی طرح کڑی نگاہ رکھتے ہیں اور ذرا سی چوک پر چرسا کھینچ لیتے ہیں۔ میں نے دو دو سال دونوں کے ساتھ گزارے ہیں اور دن رات کی ریاضت کے بعد یہ فن حاصل کیا ہے جو میری روزی کا واحد ذریعہ ہے۔

مجھے تیرے سیدھے سادے بندوں پر رنگ جمانے اور اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کرنے کے لئے اس سوکھے لڑکے اور اس کبڑی بڑھیا کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے ڈرامے میں ان کا چند منٹ کا ہلکا پھلکا سا پارٹ ہے جس کے لئے میں انھیں پورے دن کی مزدوری دیتا ہوں لیکن یہ میری گاڑھی کمائی میں برابر کا حصہ مانگتے ہیں جو میں نے برسوں کی ریاضت

کے بعد اپنے فن کی مہارت کی بدولت حاصل کی ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ کوئی وکیل اپنے منشی کو، کوئی ڈاکٹر اپنے کمپونڈر کو، کوئی بنیا اپنے پلے دار کو اور کوئی ٹھیکہ دار اپنے مزدور کو جو آٹھ گھنٹے اس کے ساتھ رہ کر خون پسینہ ایک کرتا ہے اپنی کمائی میں برابر کا شریک کرتا ہو تو میں ان دونوں کو اپنی کل کمائی دینے کو تیار ہوں۔

میں یہ جھگڑا تیرے سامنے اس لئے لایا ہوں کہ میں ایک سائیں ہوں۔ میں دیس بدیس گھوما ہوں، در در کی خاک چھانی ہے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ میں نے دنیا کی چھوٹی سی چھوٹی اور بڑی سے بڑی عدالت دیکھی ہے۔ جہاں انصاف ہوتا ہے لیکن وہاں انصاف اتنا گراں ہے کہ وہ پونجی جو میں نے تیرے نیک بندوں کو دھوکا دے کر جمع کی ہے سب کی سب پیروی کی نذر ہو جائے گی اور فیصلہ کے بعد بٹوارہ کے لئے ہمارے پاس بھوک کے سوائے اور کوئی چیز باقی نہیں رہ جائے گی۔ اس لئے ہم تیرے دربار میں حاضر ہوئے ہیں کہ تو ہماری کھوٹی کمائی کا کھرا بٹوارہ مفت میں کر دے۔

اس کے بعد بجلی سی چمکی اور ایک گرج کے ساتھ یہ آواز سنائی دی۔

تم دنیا والوں کے آئے دن کے بٹواروں سے عاجز آ چکا ہوں۔ تمہاری بناوٹی تہذیب نے تمہارے اندر بٹوارے کی وہ لت پیدا کر دی ہے کہ تم نے میری ہر نعمت بانٹ کر رکھ دی۔ وہ دھرتی جس کی گود میں میں نے تم کو جنم دیا اور جس کی آغوش ہر شخص کے لئے کھلی تھی اسے تم نے ملکوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے پر تنگ کر دیا۔ اس کے بعد بھی بٹوارے کی یہ آگ تمہارے دل میں نہ بجھی اور انسانیت کے اس رشتہ کو جس میں میں نے تم سب کو ایک ساتھ پرو دیا تھا اسے تم نے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی کی گرہیں ڈال کر بالکل الجھا کر دیا۔ آگ۔ پانی، ہوا، مٹی سے نکلی دولت جو میں نے سب کے لئے عام کی تھی اس کا بھی تم نے طاقت کے ترازو میں بند بانٹ کر کے ستیاناس کر دیا اور انسانوں کو غریب امیر میں تقسیم کر کے لوٹ کھسوٹ اور دھوکا دھاندلی کے لئے دروازے کھول دئے اور اب تم دنیا والو! اپنی کھوٹی کمائی کی تقسیم پر جھگڑ رہے ہو۔

جاؤ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ! میری نعمت عام ہے میں بٹوارہ نہیں کرتا۔ جاؤ! اپنی بندر بانٹ والی دنیا میں جا کر اپنی کمائی کا کھوٹے باٹوں سے بٹوارہ کرو۔

اس ڈانٹ پھٹکار سے میری آنکھ کھل گئی اور میرے کانوں میں یہ الفاظ بڑی دیر تک گونجتے رہے

"جاؤ! اپنی کمائی کا بٹوارہ کھوٹے باٹوں سے کرو۔"

ڈیزل اور بجلی کے ریلوے انجن

ریلوے وزارت کے تحت پبلک سیکٹر میں ڈیزل کے ریلوے انجنوں کی تیاری کے فیصلہ کی پیروی میں وارانسی میں ڈیزل لوکوموٹو ورکس کے قیام کے لئے ضروری اقدام کئے گئے ہیں۔ اس پراجیکٹ کے لئے ۵ء۱۹ کروڑ روپے کی رقم منظور کی گئی۔ امریکہ کے ڈیزل انجن سازی کے ایک ممتاز ادارے کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں ٹیکنیکل اشتراک کا ایک معاہدہ کیا گیا ہے۔

کارخانے اور ٹاؤن شپ ایریا دونوں میں تعمیر و نصیب کا کام جاری ہے۔ ایک اندازے کے مطابق جون ۱۹۶۳ء کے آخر تک مجموعی طور پر تقریباً ۲۷ فی صدی ترقی کی گئی۔ توقع ہے کہ ۱۹۶۵ء کے آخر تک یہ پراجیکٹ مکمل ہو جائے گا۔

یوگیندر پال صابر

جنگِ خیر و شر

پھر آسماں پہ چھائے ہیں جنگ کے بادل چلی ہے فوج اندھیرے کی روشنی کی طرف
سفیرِ موت سیہ کار چین کا فرزند بڑھا رہا ہے قدم قصرِ زندگی کی طرف

بھرے نہیں ہیں ابھی تک، غرورِ ہٹلر نے جو گہرے زخم لگائے تھے جسمِ عالم پر
پھر ایک شخص کے ارمانِ ملک گیری نے بدل کے بھیس کیا وار نسلِ آدم پر

ہے آج موت کے خطرے میں امنِ عالم کا یہ بات ہند کی دس بیس گز زمیں کی نہیں
سکونِ زیست اِدھر ہے فساد و فتنہ اُدھر یہ خیر و شر کی لڑائی ہے ہند و چیں کی نہیں

یہ خیر و شر کی لڑائی بہت پرانی ہے جڑ اس کی ہے کبھی برلن کبھی یزید کا کاخ
بدلتا رہتا ہے میدانِ جنگ دور بدور کبھی ہے لنکا، کبھی کربلا، کبھی لداخ

جہاں کو خون و خرابی سے دور رکھنے کو خود آج خون و خرابی میں پڑ رہا ہے ہند
سُنیں جہاں بھی کہیں بس رہے ہوں آدم زاد ہر ایک ملک کی جانب سے لڑ رہا ہے ہند

اب آسماں سے فرشتے یہاں نہ آئیں گے نہ سورگ لوک سے اترے گا دیوتا کوئی
ہمیں تمہیں کو بچانے ہیں زندگی کے حقوق سوا عوام کے مشکل میں کب پڑا کوئی

ہے کوئی مکرِ سیاست جو ہے سکون اس وقت پیامِ جنگ ہے یہ امن کا پیام نہیں
بہوش باش سپاہی کی موت ہے غفلت ہماری جنگ ابھی چین سے تمام نہیں

بہا ہے جن کے لئے خون ہم غریبوں کا ابھی درندوں سے وہ وادیاں نہیں چھوٹیں
ابھی تو قید میں راون کی ہیں جگت ماتا ابھی تو شام سے شہزادیاں نہیں چھوٹیں

ہماری فتح یقینی ہے یہ یقین کرو
رہے گا اور نہ کبھی سُرخ رو رہا ہے ظلم

ہماری بات کی تاریخ کرتی ہے تصدیق
ہمیشہ اپنی ہی تلوار سے مرا ہے ظلم

زمیں کا حسن حقیقت میں لالہ و گل ہیں
زمیں کا حسن بشر کے لہو کا رنگ نہیں

جنونِ جنگ ہے مانند اک مرض کے مگر
مزاجِ زیست کا امن و سکوں ہے جنگ نہیں

یہ ممتا یہ محبّت یہ پیار بہنوں کا
یہ زندگی کا چمن ہی ہمارا گلشن ہے

کسی کی فتنہ گری ہم کو اب نہیں برداشت
جو زندگی کا عدو ہے ہمارا دشمن ہے

مرے وطن مرے ہندوستاں مرے محبوب
تری خوشی کے لئے ہر الم گوارا ہے

ہر ایک شے سے زیادہ تو جان ہے پیاری
ترا وقار مگر جان سے بھی پیارا ہے

ثریا محمود ندرت

غزل

کتنے دل سوزِ حرماں سے جلتے رہے
آئینے موم بن کر پگھلتے رہے

رہنمائی کو ان کی نہ آیا کوئی
راہرو تیرے گرتے سنبھلتے رہے

گاہ صحرا بھی ذرّہ تھا میرے لئے
گاہ قطرے سے طوفاں اُبلتے رہے

خندہ زن تھیں حقائق کی نیرنگیاں
وقت کی آنکھ میں خواب پلتے رہے

اہلِ دل حالتِ دل پہ تا زندگی
مسکراتے رہے ہاتھ ملتے رہے

خم سلجھتے رہے کاکلِ زیست کے
گیسوئے دوست کے بل نکلتے رہے

ظلمتوں نے لیا انتقام اس طرح
شمع کے ساتھ کچھ دل بھی جلتے رہے

انقلابوں کو ملتا رہا حوصلہ
ان کے بیمار کروٹ بدلتے رہے

سیج پھولوں کی ندرت تھی جن کے لئے
اک نہ اک آگ میں وہ بھی جلتے رہے

شاہدہ سعید

گرُزادہ اپّاراؤ

(جدید تلیگو ادب کے معمار)

جس طرح اردو کی بیانیہ شاعری میں میرانیس نے ، غزل میں غالب نے اور نثر میں میرامن نے اسلوب اور اظہار کی نئی راہیں نکالیں اسی طرح جدید تلیگو ادب کی تاریخ میں گرُزادہ اپّاراؤ کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

گرزادہ اپّاراؤ کا جنم نومبر ۱۸۶۱ء میں ہوا اور ان کا انتقال نومبر ۱۹۱۵ء میں۔ وہ شاعر، انشاپرداز، نقّاد اور افسانہ نگار سب کچھ تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے روایتی انداز سے گریز کر کے اسلوب اور اظہار کی نئی راہیں تلاش کیں اور تلیگو ادب کو نئے موضوعاتِ فکر اور طرزِ کلام وسخن کی نئی ہئیتوں سے آشنا کرایا۔ انھوں نے بہت زیادہ نہیں لکھا لیکن ان کی ہر تخلیق تلیگو ادب کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

جب اپّاراؤ کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا، اس وقت تلیگو زبان روایات میں جکڑی، قواعد کی گرفت میں مجبور، مصنوعی بندشوں اور ترکیبوں کے بوجھ تلے مُرجھا رہی تھی۔ تیرھویں اور چودھویں صدی میں جو ادبی سانچے بن چکے تھے اور جو الفاظ اور ترکیبیں زبان میں اس وقت شامل تھیں، ادیب اور عالم انھیں حرفِ آخر سمجھ کر لکیر پیٹتے جا رہے تھے۔ اضافہ، ترمیم اور تنسیخ کی راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ نئے الفاظ زبان میں جگہ نہیں پا رہے تھے۔ اس کورانہ روایت پرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادبی زبان اور عام بولی میں کافی فاصلہ پیدا ہو گیا تھا۔

اس فاصلے کو ختم کرنے کے لئے سب سے پہلے گدگو رام مورتی نے ایک تحریک شروع کی۔ رام مورتی عالم، ماہر لسانیات اور زبان دان تھے۔ ان کی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ادبی زبان کو عام بول چال سے ہم آہنگ کیا جائے اور "گرنتھی" (قدیم ادبی زبان) کی جگہ 'ویوہاری' (عام بولی) کو ادب میں جگہ دی جائے۔ رام مورتی نے یہ اجتہاد جاری رکھا اور الفاظ کی بناوٹ پر روشنی ڈال کر روایت پرستوں کے دعوے کو باطل ثابت کرنے کی کوشش کی۔

لیکن علم، شعور اور آگہی کے باوجود کسی ماہرِ لسانیات کے لئے اسلوب اور اظہار کے میدان میں کوئی تبدیلی لانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ کام تنقید کے دائرے میں نہیں، تخلیق کے دائرے میں پورا ہوتا ہے رام مورتی کے اس مشن کو اپّاراؤ نے اپنی تخلیقات کے ذریعے پورا کیا۔

اپّاراؤ وہ پہلے تلیگو ادیب تھے جنھوں نے پرانی تلیگو زبان سے گریز کر کے بول چال کی تلیگو کو ادب میں جگہ دی اور اس کی معنی آفرینی مٹھاس، لوچ اور زرخیزی کے نمونے اپنی تخلیقات میں پیش کئے۔

جب روایت پرست نقّادوں نے ان پر اعتراضات کئے تو ان کا جواب یہ تھا "جو آنکھیں صرف لکڑی کے کھلونے دیکھنے کی عادی ہیں وہ کسی دوشیزہ کے حسن کی تاب کس طرح لا سکتی ہیں۔

اپاراؤ نے قدیم ہئیتوں کو چھوڑ کر نئے شعری سانچے ایجاد کئے جن کو وہ 'متیالہ سرم' (موتیوں کا ہار) کہا کرتے تھے۔ وہ قدیم فن پاروں کی عظمت سے منکر نہیں تھے لیکن وہ قدیم اور جدید دونوں کے حسن کو نئی ہئیتوں میں جلوہ گر دیکھنا چاہتے تھے۔

اپاراؤ کے ذہن کی ایجاد و اختراع محض نئی ہئیتوں کی تشکیل تک محدود نہیں رہی۔ انسان دوستی اور انصاف پرستی کے جذبہ کے ساتھ وسعت نظر نے ان کے فن کے قالب میں نئی روح پھونک دی اور وہ تیلگو ادب میں نئے شعور کے نقیب بن گئے۔ ان کی تحریروں نے عوام کو سماجی ذمّہ داریوں کا احساس دلایا اور ان کو سماجی خرابیوں کو دُور کرنے کی تحریک دی، جو اُن کی ترقی میں مزاحم تھیں۔ ان کی نظموں، افسانوں اور ڈراموں میں ہر جگہ یہ انسان دوستی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔

اپاراؤ کے نزدیک وطن پرستی اور انسان دوستی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ وطن پرستی پر ان کی مشہور نظم میں اسی بات پر زور دیا گیا ہے کہ وطن صرف زمین کا نام نہیں، رہنے والوں کا نام ہے۔ اپنے وطن سے محبّت کرو۔ دوسروں کا بھلا کرو، محض الفاظ سے کام نہ لو۔ وطن ایک شاندار درخت ہے اور محبّت کو اس پر پھول بن کر مہکنا چاہیئے۔

اپاراؤ کی شاعری کا ذکر کرتے وقت ذہن سب سے پہلے ان کی منظوم داستانوں کی طرف جاتا ہے۔ ان میں سے دو خاص شہرت کی مالک ہیں۔ 'پورنما' میں انھوں نے ایک کم سن دلھن کی داستان بیان کی ہے جسے ایک بڈھے سے شادی کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے تو وہ اپنی جان دے دیتی ہے۔ 'کنیا کا' ایک دوسری منظوم داستان ہے جس میں ایک دوشیزہ راجا کی دست درازیوں سے تنگ آکر جان تیاگ دیتی ہے۔

یہ داستانیں نزاکت احساس کے ساتھ بھرپور طنز کی نشتریت لئے ہوئے ہیں۔ فن کار ہمدردی اور نرمی کے ساتھ اپنے مقصد کا اظہار کرتا ہے بلکہ اس کے لہجہ میں کہیں ترشی اور تلخی نہیں پیدا ہوتی۔ مثال کے لئے 'پورنیما' کا باپ جو اسے بڈھے سے شادی پر مجبور کرتا ہے۔ اسے اپاراؤ نے بُرا آدمی نہ بنا کر ایک بے وقوف کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

اپاراؤ نے اندھی روایت پرستی کا مذاق اڑایا۔ کورانہ تقلید کے نقصانات کی طرف اشارہ کیا لیکن انھوں نے ہر جگہ اور ہمیشہ قول اور عمل دونوں میں شدت، انتہا پسندی اور سختی سے گریز کیا۔

منظوم داستانوں کے علاوہ اپاراؤ نے نثری افسانے بھی لکھے ہیں، اگرچہ ان کی تعداد زیادہ نہیں پھر بھی ان کی کہانیاں تیلگو ادب میں منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی کہانی 'سدھار' تیلگو کی بہترین کہانیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کہانی میں بڑے دلچسپ انداز میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ایک سمجھ دار بیوی اپنے گمراہ شوہر کو صحیح راستے پر لے آتی ہے۔

انھوں نے عام تیلگو کے ادبی استعمال کے حق میں جو مضامین لکھے وہ مضبوط دلیل، منطقی استدلال اور فنی بحث کے خوبصورت نمونے ہیں لیکن ان کی شہرت جس تخلیق کی وجہ سے ابد تک قائم رہے گی وہ ان کا ڈراما کنیا شلکم' (دُلھن کی قیمت) ہے۔

جس طرح موجودہ دور میں 'جہیز' کا رواج ایک سماجی روگ بن گیا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں آندھرا پردیش کے بعض علاقوں میں 'دختر فروشی' ایک عام لعنت تھی۔ لڑکی کی شادی کرنے کے لئے ایک خاص رقم لی جاتی تھی۔ لڑکی کی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی قیمت بڑھتی جاتی تھی۔

اپاراؤ وزیانگرم ریاست کے ملازم تھے۔ خوش قسمتی سے وزیانگرم کے مہاراجہ آنند گاپتی بھی اس رواج کے خلاف تھے۔ اور اس کا خاتمہ چاہتے تھے۔ مسئلے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے انھوں نے اپنے اہلکاروں سے اعداد و شمار مانگے۔ اس تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ صرف وشاکھا پٹنم کے ضلعے میں ایک ہزار سے زیادہ ایسی شادیاں ہوئی تھیں۔ صرف ایک سال میں ۹۹۔ ایسی لڑکیوں کی شادیاں ہوئیں جن کی عمر شادی کے وقت، صرف پانچ سال تھی۔ ۴۴ دُلھنیں صرف چار سال کی عمر میں بیاہی گئیں۔ ۳۷ لڑکیوں کی عمر شادی کے وقت صرف تین سال تھی، صرف یہی نہیں تین لڑکیوں کی عمر بیاہ کے وقت ایک سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں ایک سالی کی دُلھن کی قیمت بھی ساڑھے تین سو اور چار سو کے بیچ ہوا کرتی

تھی، چناں چہ پیٹ میں بھی جو بچے ہوتے تھے ان کا بھی سودا ہو جاتا تھا۔ جب یہ انکشافات ہوئے تو اس گھناؤنے رواج کے خلاف نفرت کا جذبہ بھی زور پکڑنے لگا اور اپّا راؤ نے بڑی فنی مہارت کے ساتھ اس مسئلے کو اپنے ڈرامے میں پیش کیا۔

اپنے اس ڈرامے کے دیباچے میں انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت اس طرح کی ہے۔ "اس طرح کے گھناؤنے رواج سماج کا کلنک ہیں اور ادب کا اس سے بڑا مقصد اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے حالات کو بے نقاب کرے اور عوام کو اعلیٰ اخلاقی قدروں کا احساس دلائے۔ لیکن جب تک عوام میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہیں ہوتا ہمیں ان کے ذہن پر صحت مند اثر ڈالنے کے لئے اسٹیج کا سہارا لینا پڑے گا۔

اپّا راؤ ہندوستان کے ان بڑے ادیبوں میں سے تھے جنھوں نے بہت پہلے اسٹیج کے اثر اور اس کی افادیت کو محسوس کیا۔

"کنیا شلکم" (دلھن کی قیمت) واقعات کی ترتیب کے لحاظ سے زیادہ مربوط ڈراما نہیں ہے لیکن ڈرامے کا ہر منظر بھرپور اور دلکش ہے۔ اگرچہ ڈرامے کا بنیادی مقصد 'دختر فروشی' کے مذموم رواج کو بے نقاب کرنا ہے، لیکن ڈرامے میں کسی جگہ پر بھی مقصد کے لئے فن کا خون نہیں کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے وقت کی سماجی زندگی کی اتنی مکمل تصویریں پیش کی ہیں اور ڈرامے کے کردار تلیگو علاقے کی اتنی صحیح نمائندگی کرتے ہیں کہ لوگ انھیں حقیقی سمجھنے لگتے ہیں اور عام گفتگو میں ان کے لب ولہجہ کی نقل اتارتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اپّا راؤ کے مزاحیہ کردار شکسپیر کے مشہور مزاحیہ کرداروں کی یاد دلاتے ہیں۔ ان خصوصیات کی بنا پر اپّا راؤ کا ڈراما صرف تلیگو زبان ہی میں نہیں، سارے ہندوستان کے ڈرامائی ادب میں ممتاز مقام کا مستحق ہے۔

انیسویں صدی کے آخری دَور میں سماج سدھار کی تحریک نے بہت سے نقلی چہرے بھی پیدا کئے تھے۔ ایسا ہی ایک کردار 'گریشم' 'کنیا شلکم' کا مرکزی کردار ہے۔ وہ بُرا آدمی نہیں لیکن پرخود غلط اور کج رو ضرور ہے۔ مگر ان کمزوریوں کے باوجود اسے پیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ ہوشیار، حاضر جواب اور بذلہ سنج ہے۔ جب وہ بات کرتا ہے تو اس کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ وہ چاہے جتنی بیوقوفی کی بات کرے، آدمی اس کی باتوں میں آ جاتا ہے۔

بچپن کی شادیوں کے حق میں اس کی دلیل ملاحظہ ہو:

" سماج سدھار کی روح ہے بیواؤں کی شادی۔ اور بیوہ کی شادی کا مطلب ہے جوان بیوہ کی شادی، تو اگر بچپن میں شادیاں ہی نہ ہوں گی تو جوان بیوائیں کہاں سے آئیں گی۔"

انتہائی مضحکہ خیز دلیلیں اور بے بنیاد تاویلیں بھی اس کی زبان سے شہد میں ڈوب کر نکلتی ہیں۔ خواہ وہ جیسی صحبت میں ہو، سارے ماحول پر چھا جاتا ہے۔ یہ کردار ڈرامے میں بتدریج اتنا زیادہ ابھر آتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ ڈرامے کے سنجیدہ مقصد کو نہ ختم کر دے۔ لیکن ڈراما نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ دوسرے کرداروں اور واقعات کی مدد سے ڈرامے کو گڈھے سے نکال لے جاتا ہے، اور ڈراما محض نقل، تماشا اور تفریح نہ بن کر اپنا مقصد اور مرکزی تاثر ابھارنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

"اگنی ہوتر وادھنی" لڑکی کا حریص باپ ہے جو لڑکی کی شادی کا سودا ایک بڈھے رنڈوے 'بدھر وادھنی' کے ہاتھ کرنا چاہتا ہے۔ لڑکی کی ماں مخالفت کرتی ہے، کیونکہ اس کی بڑی لڑکی کا حشر اس کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس کی شادی بہت چھوٹی عمر میں کر دی گئی تھی اور وہ 'جوان بیوہ' بن کر بیٹھی تھی۔ ماں اپنی چھوٹی بیٹی کا بھی یہ انجام نہیں دیکھنا چاہتی۔ ایسے وقت میں لڑکی کا ماموں کام آتا ہے اور ایک طوائف (مدھوراوانی) کی مدد سے حریص باپ کے مذموم منصوبے کو ناکام بنا دیتا ہے۔

ڈراما جب شروع ہوتا ہے تو تماشائی یہ دیکھتے ہیں کہ مدھوراوانی ناچ کے خلاف تحریک چلانے والے گریشم کی داشتہ ہے۔ مدھوراوانی کا کردار ڈرامے کا دوسرا اہم کردار ہے اور دیکھنے والوں کا ذہن بار بار مشہور سنسکرت ڈرامے مرچھ کٹیکا (مٹی کی گاڑی) کی طوائف وسنت سینا کی طرف جاتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ مدھوراوانی کے کردار میں زیادہ زندگی ہے۔ وہ بہت شوخ، شریر اور چنچل ہے۔ طوائف ہوتے ہوئے بھی اپنے اخلاقی اصول رکھتی ہے اور ان کی سختی سے پابند ہے۔ اس کی ماں نے اُسے یہ تعلیم دی ہے کہ وہ کسی ایسے آدمی کو گمراہ نہ کرے جس کا

پہلے کوئی قدم غلط نہ اُٹھا ہو۔ جب لڑکی غائب ہو جاتی ہے اور مدھو راؤ نی سے اس پر روشنی ڈالنے کو کہا جاتا ہے تو وہ اصول پرست وکیل سوجنیہ راؤ سے ایک بوسے کا مطالبہ کرتی ہے اور جب اس کی شرط مان لی جاتی ہے تو وہ اپنی ماں کی نصیحت کے مطابق اپنے مطالبہ سے دست بردار ہو جاتی ہے۔

ڈرامے کے معمولی کردار بھی بڑی چابک دستی سے اُبھارے گئے ہیں۔ اور پڑھنے والوں اور دیکھنے والوں کے ذہن پر اپنا لافانی نقش چھوڑ جاتے ہیں۔

تکنیک کی خوب صورتی اور مقصد کی عظمت کے علاوہ اس ڈرامے کا سب سے زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ یہ پہلا تلیگو ڈراما ہے جو عام زبان میں لکھا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے دیباچے میں اس طرف بھی اشارا کیا تھا۔ تلیگو ادبی زبان میں پرانی ہیئتوں، متروک الفاظ اور مصنوعی ترکیبوں کی بہت بڑی تعداد شامل ہے۔ سنسکرت کی بھرتی نے زبان کو اور زیادہ مردہ بنا دیا ہے۔ اگر تلیگو کو تہذیبی زندگی کا مؤثر وسیلہ بننا ہے تو اسے متروک الفاظ، مصنوعی بندشوں اور سنسکرت کی فضول بھرتی سے آزاد کرانا ہوگا۔ اور عوام کی بولی سے ادبی زبان کو قریب لاکر اس کے سرمایہ میں اضافہ کرنا ہوگا۔"

تلیگو زبان کو زنجیروں سے آزاد کرانا اپّا راؤ کی زندگی کا بنیادی مقصد تھا اُور کنیا شلکم' وہ تخلیق تھی جس نے یہ ثابت کر دیا کہ عام بول چال کی تلیگو کتنی شیریں اور مؤثر ہو سکتی ہے۔ اگرچہ صحت کی خرابی ان کی راہ میں مزاحم رہی لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے عرصۂ حیات میں ہی اپنا ادبی مقام پیدا کر لیا اور ان کے انتقال کے بعد بھی برابر ان کی شہرت میں اضافہ ہوا ہے۔ کیونکہ گرزادہ اپّا راؤ محض ادیب، شاعر اور نقاد نہیں تھے، وہ صحیح معنوں میں عہد آفریں فن کار تھے جنھیں جدید تلیگو ادب کا معمار کہا جا سکتا ہے۔

بھارت میں کوآپریٹو فارمنگ سوسائیٹیوں کی رفتار ترقی

مرکزی وزارت اجتماعی ترقی و امداد باہمی کی تازہ ترین اطلاعات کے مطابق رہنمایانہ علاقوں میں امداد باہمی کی بنیادوں پر کھیتی باڑی کی تقریباً ۷۹۹ سوسائیٹیاں منظم کی جا چکی ہیں جبکہ رہنمایانہ علاقوں سے باہر ان سوسائیٹیوں کی تعداد ۹۴۴ ہے۔

رہنمایانہ علاقوں میں ان سوسائیٹیوں نے تقریباً ۹۶۰۸۰۔ ایکڑ اراضی یک جا کر لی ہے۔ ان سوسائیٹیوں کے ارکان کی تعداد تقریباً ۲۰ ہزار ہے جبکہ غیر رہنمایانہ علاقوں میں تنظیم شدہ ایسی سوسائیٹیوں کے ارکان کی تعداد ۱۹۴۶۲ ہے اور ان سوسائیٹیوں نے ۱۳۱۵۳۳ ایکڑ اراضی ایک ساتھ مجتمع کر لی ہے۔ رہنمایانہ علاقوں کی ۷۹۹ سوسائیٹیوں میں سے ۴۶۱ سوسائیٹیاں ۶۲-۱۹۶۱ء میں تنظیم دی گئی تھیں اور ۳۳۵ سوسائیٹیوں کو سال ۶۳-۱۹۶۲ء میں منظم کیا گیا تھا۔ اسی طرح غیر اور رہنمایانہ علاقوں کی ۹۴۴ سوسائیٹیوں میں سے ۴۴۴ سوسائیٹیوں کو ۶۲-۱۹۶۱ء میں اور ۵۰۰ سوسائیٹیوں کو سال ۶۳-۱۹۶۲ء میں منظم کیا گیا تھا۔

تمام ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں ہر دو مذکورہ قسم کی سوسائیٹیاں منظم کی گئی ہیں۔ اعداد و شمار کے تجزیے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ امداد باہمی کی بنیادوں پر مشترکہ کھیتی باڑی کا کام سال ۶۳-۱۹۶۲ء میں بڑے جوش و خروش سے شروع کیا گیا تھا۔

ع - م
ش - ح

نئی کتابیں اور رسالے

فردوسِ گوش

حضرت جوش ملسیانی کا نیا مجموعۂ کلام 'فردوسِ گوش' کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں غزلیں بھی ہیں نظمیں بھی، رباعیاں بھی ہیں قطعات بھی۔ اس سے پہلے ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ملک کے نامور ادیبوں، نقادوں اور شاعروں سے انھیں داد مل چکی ہے۔ یوں تو جوش صاحب ہر صنفِ سخن پر قادر ہیں لیکن غزل ان کا خاص میدان ہے۔ ان کا شمار نہ صرف دورِ حاضر کے غزل گویوں میں بلکہ اردو کے تمام غزل گویوں میں صفِ اوّل میں کیا جاتا ہے۔ مضامین کی بندش، مطالب کی ادائیگی، خیالات کی بلندی، زبان کی شستگی یہ سب کچھ جوش صاحب کے یہاں موجود ہے۔ فصاحت بھی ہے اور بلاغت بھی۔ ان کا کلام سادگی و پُرکاری کا ایک اعلےٰ نمونہ ہے۔ جوش صاحب داغ دہلوی کے ان گنے چُنے شاگردوں میں ہیں جو استاد کے رنگ میں بھی کہتے ہیں اور جن کا کلام رکاکت سے مبرا بھی ہے۔ حسن و عشق کے مضامین حضرت جوش کے یہاں کثرت سے بندھے ہیں مگر ابتذال نام کو نہیں۔ صنعتیں اس خوبی سے آئی ہیں کہ کہیں نہ تکلف ہے نہ مطالب کا خون ہوا ہے۔ مثلاً

پاؤں پھیلانے سے ہو جس کو گریز　　ہاتھ بھی اپنے وہ پھیلاتا نہیں

کس بے تکلفی سے دونوں محاورے آئے ہیں۔ خیالات کی بلندی کا ایک نمونہ یہ ہے

یا ستائے نہ مرے دل کو تمنائے جمال　　یا مرا ذوقِ نظر حسنِ نظر تک پہنچے

صنعتِ تجنیس کی بے ساختگی ملاحظہ ہو:

کیوں مرہمِ دل کے لئے تکلیف کریں وہ
راحت کوئی دیکھے کہ جراحت کوئی دیکھے

حفظِ مراتب کے ساتھ شوخی کا ایک نمونہ

جائیں کیوں دیر و حرم کی سیر کو　　ان میں کیا ہے بس خدا کا نام ہے

چھوٹی بحر اور مشکل ردیف میں مطلع نکالنا بہت مشکل ہے لیکن جوش صاحب کا کمال دیکھئے

حسن کا جور ناروا تو نہیں　　آزمائش کوئی خطا تو نہیں

اسی غزل میں صنعتِ تجنیس کا یہ شعر ہے

جام لے کر کہا یہ زاہد نے　　دیکھنا کوئی دیکھتا تو نہیں

دیکھئے مشکل زمین میں کیا شعر نکالا ہے

میرے نغمے حسن کے بت خانے کی ہر مورت ہے مست
پھول برساتے ہیں مجھ پر سیکڑوں پتھر کے ہاتھ

ان غزلوں کے ساتھ ساتھ وطن کے نغمے بھی ہیں اور آزادی کے ترانے بھی، رہنمایانِ وطن کی مدحت بھی اور شہیدوں سے عقیدت بھی۔ غرضکہ یہ مجموعہ اگر سامعین کے لئے فردوسِ گوش ہے تو اہلِ مطالعہ کے لئے جنت نگاہ۔

قیمت چھ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ مرکزِ تصنیف و تالیف نکودر (پنجاب)

(گوپی ناتھ امن)

برگِ نوخیز

ڈاکٹر عزیز تمنائی اس نادر ادبی تحفے کے لئے مبارک باد کے

مستحق ہیں کہ انھوں نے اردو زبان میں سانیٹ کا پہلا مجموعہ شائع کیا۔ ناشر دارالتصنیف مدراس ۱۴ - قیمت ڈھائی روپے۔

کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔ حسن ظاہر ہر پہلو سے قابل تعریف ہے اور حسن باطن قابل قدر ہے۔ جلد اور جلد پوش نہایت خوبصورت ہے۔ سید احتشام حسین نے پیش لفظ لکھا ہے اور سانیٹ کا مفصل تعارف خود مصنف نے۔ ۱۰۹ سانیٹ اس کتاب کی زینت ہیں۔ ان کے عنوانات کی رنگارنگی اور ہر عنوان کی اصل نظم سے مطابقت عزیز تمنائی صاحب کے کمال سخن کی مظہر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس مجموعۂ سخن کی نہ صرف قدر کی جائے گی بلکہ اہل ذوق اسے اردو نظم کا ایک زریں تحفہ سمجھیں گے۔

آہنگ حیات	قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے
نوائے دل	قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے

مصنف ۔ منشاء الرحمن خاں منشاء

یہ دونوں نظم کے مجموعے حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ ناشر بیت الاشاعت ناگ پور۔

منشا صاحب نظم، غزل، قطعات سب کچھ کہتے ہیں۔ یہ وہ شاعر ہیں جو آزادی کے بعد اُبھرے ہیں۔ اس لئے ان کی نظموں میں دعوت عمل، حب الوطنی اور آزاد روی ہے۔ ان کی غزلیں ان کی نظموں سے زیادہ پُرکیف ہیں۔ یہ دونوں مجموعے اس بات کے آئینہ دار ہیں کہ منشا صاحب میں ایک اچھے شاعر کی صلاحیتیں موجود ہیں۔

... اور ہندوستان جاگ اُٹھا

مرتب عبدالقوی دسنوی ۔ ناشر سیفیہ ڈگری کالج۔ بھوپال۔

چینی حملے کے بعد ملک بیدار ہوا۔ ملک کے ہر شعبے میں ہل چل مچی۔ ادب اس سے مبرا نہیں رہ سکتا تھا۔ اردو شعراء نے اس جارحیت کے خلاف اپنے قلم کو جنبش دی۔ یہ مجموعہ انیس نظموں پر مشتمل ہے۔

بڑھے چلو

کروڑی مل کالج دہلی یونیورسٹی نے بھی اسی طرح کا ایک مجموعۂ نظم شائع کیا ہے۔ مرتب ہیں ڈاکٹر خلیق انجم۔

اس قسم کے مجموعے جہاں ادب کے لئے فال نیک ہیں وہاں ملک کی ایک بہت بڑی خدمت بجا لاتے ہیں۔

شعر امین

پنڈت سروپ نارائن رازدان امین امرتسری کی غزلیات کا انتخاب۔ مرتبہ مفہوم دہلوی۔ ملنے کا پتہ دارالادب رونق ۱۲/۱۲۳۹ شورہ گلی سوہن گنج، سبزی منڈی دہلی۔ قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے۔

امین صاحب بہت کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کی کہنہ مشقی اور خوش کلامی ان کے کلام سے ظاہر ہے۔ کتاب کے آخر میں تشریحات بھی شامل ہیں۔

کیفی چڑیاکوٹی **اصغر گونڈوی** **الم مظفر نگری**	انجمن ترقی اُردو علی گڑھ نے اردو شاعروں کا جو انتخابی سلسلہ شائع کیا ہے۔ اس سلسلے کی تین فردوی کڑیاں ہیں۔ ہر ایک کتاب کی

قیمت ۷۵ نئے پیسے ہے۔

تمھاری باتیں

مصنف ع۔م سوز۔ ناشر مکتبۂ ماحول ۹ بہادر شاہ مارکیٹ بندر روڈ کراچی۔

یہ کتاب سوز کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ سوز کا انداز فکر اور انداز بیان دونوں کلاسیکی ہیں۔ زبان سادہ ہے۔ شعر کے اچھے گوشے نکالتے ہیں۔

زندگی بھر موت سرگرداں پھری ایک نازک سے بہانے کے لئے

ویرانۂ خیال میں رات اس طرح وہ آئے
جیسے بہار بھول کے صحرا میں آگئی

مطائباتِ شبلی

مرتب ایس جالب مظاہری ۔ ناشر علوی بک ڈپو، محمد علی روڈ بمبئی ۳۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔

شبلی ایک بہت بڑے ادیب اور شاعر تھے۔ ان کے دل کا سوز و گداز ان کے فارسی کلام سے ظاہر ہے۔ اس کتاب میں ان کی ذہانت کا یہ پہلو بھی ظاہر ہے کہ وہ بڑے بذلہ سنج انسان بھی تھے۔

شعلۂ تشنگی

جاوید وششٹ کے کلام کا مجموعہ ۔ ناشر حلقۂ ارباب فکر دہلی ملنے کا پتہ ۲۵۴۲ کوچہ میر عاشق چاوڑی بازار دہلی۔ قیمت چھ روپے۔

یہ کتاب نہایت حسین وجمیل چھپی ہے۔ کتابت، طباعت، گرد پوش عمدہ۔ ضخامت ۷۶ صفحات۔

جاوید وششٹ بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔ غزل ان کی محبوب صنفِ سخن ہے۔ کتاب میں کچھ قطعات، غزلیں، نظمیں اور گیت بھی شامل ہیں۔ ان کے کچھ اچھے شعر ملاحظہ فرمائیے:

وہ مل گئے مگر اے بےخودئ شوق بتا
یکساں سے آج ہم اپنے کو ڈھونڈ کر لائیں

دُور پر دُور چلتے رہے
گردشِ وقت ٹلتی گئی

زندگی کے صحرا میں دھوپ تیز ہے تو کیا
تیری زلف کا سایہ اور بھی گھنیرا ہے

بندگی میں نجاسات کی تلقین
ایک آزاد ذہن کی توہین

تلاشِ راہ میں خرد ہے سرگرداں، جنوں کے سامنے منزل ہے راہگزر نہیں

جاوید کو تخلیقی ادب اور روایتی سخن سازی کے قائل نہیں ان کا ذاتی جوہر ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا تصور پاکیزہ اور ان کی فکر میں گہرائی ہے، اس پر حسن بیاں نے اور چار چاند لگا دئے ہیں۔ (ع - م)

اُردو مخطوطات جلد اوّل و دوم

مرتّب نصیر الدّین ہاشمی۔ قیمت فی جلد دس روپے۔ بڑی تقطیع۔ صفحات — جلد اوّل ۴۲۴ - جلد دوم ۴۰۴۔ لکھائی اور چھپائی اچھی۔ کتاب انجمن ترقّیٔ اردو حیدرآباد اور مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ دلّی و بمبئی سے مل سکتی ہے۔

یہ دونوں جلدیں اسٹیٹ سنٹرل لائبریری آندھرا پردیش (سابق کتب خانۂ آصفیہ) کے اردو مخطوطات کی فہرست ہیں جسے جناب نصیر الدّین ہاشمی نے بڑی محنت اور جانفشانی سے مرتّب کیا ہے۔ دونوں جلدوں میں ۲۴۳ مخطوطوں کی فہرست اور ان کا مختصر تعارف شامل ہے۔ پہلی جلد میں سات ابواب ہیں (۱) ادبیات (۲) تاریخ (۳) سائنس (۴) علوم عمرانیات (۵) فلسفہ (۶) لسانیات (۷) مذاہب اور ہندی کتابیں۔ ان عنوانوں کے تحت ۲۳۰ مخطوطات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ دوسری جلد میں اسلامیات اور تکملہ جلد اوّل کے ۲۱۲ مخطوطات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور حسبِ ذیل عنوانات قائم کئے گئے ہیں (۱) تجوید علوم قرآن (۲) تفسیر و ترجمہ قرآن (۳) حدیث (۴) فقہ و عقائد (۵) ادعیہ (۶) پند و نصائح۔ (۷) مناظرہ و کلام (۸) تصوف اخلاق۔

یہ کام بڑا صبر طلب اور محنت کا تھا جسے ہاشمی صاحب نے حسن و خوبی سے انجام دیا ہے۔ امید ہے ہاشمی صاحب کا یہ کارنامہ علمی اور ادبی حلقوں میں مقبول ہوگا۔ اس ادبی خدمت کے لئے وہ یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔

صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات [۱۸۴۸ء - ۱۸۵۵ء]

مؤلف۔ محمد عتیق صدیقی، ناشر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔ قیمت درج نہیں ہے۔ صفحات ۴۰۳۔ مجلد مع گرد پوش لکھائی چھپائی اچھی ہے۔

صوبہ شمالی و مغربی کے لفٹنٹ گورنر کے ملاحظہ کے لئے ہر سال ایک مفصل رپورٹ تیار کی جاتی تھی۔ ان میں دیسی مطابع کے بارے میں بھی مفصل رپورٹ ہوتی تھی۔ یہ رپورٹیں ۱۸۴۸ء سے لے کر ۱۸۵۳ء تک ان اخبارات سے متعلق تھیں جن کا اس صوبے سے براہ راست تعلق تھا۔ ۱۸۵۰ء سے متعلق بھی ایک رپورٹ مختصر سی شامل کر لی گئی تھی۔ چوں کہ ان میں اردو اخبارات اور مطابع سے متعلق بعض تفصیلی اور کارآمد باتیں بتائی گئی تھیں اس لئے جناب عتیق احمد صاحب نے انھیں اردو کا جامہ پہنا دیا۔ یقیناً یہ ایک مستحسن قدم ہے۔ ان سے اردو صحافت کے ابتدائی دَور کے بہت سے گوشوں پر روشنی پڑے گی اور نئی و کارآمد باتیں معلوم ہوں گی۔ اخبارات، رسالوں اور کتابوں کی ۲۶ تصاویر بھی دی گئی ہیں جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

امام الہند (تعمیر افکار) مصنف ابوسلمان الہندی۔ ناشر مکتبۂ اسلوب کراچی ۱۸۔ صفحات ۳۰۶۔ مجلد مع گرد پوش۔ لکھائی چھپائی گوارا۔ قیمت چھ روپے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی موت کے بعد ہندوستان اور پاکستان سے بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اسی سلسلے

کی ایک اچھی کڑی ہے۔ ابوسلمان صاحب کی اس کتاب میں تفصیل سے مولانا مرحوم کے خاندان، حسب و نسب اور ذاتی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے ابتدائی دور کی تصانیف و تالیفات کا بھی جائزہ لیا ہے۔

مولانا آزاد مرحوم سے متعلق جو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ مصنف نے تقریباً سب سے استفادہ کیا ہے۔ جگہ جگہ مولانا کی اپنی تحریر کے اقتباسات بھی پیش کئے گئے ہیں۔ اس طرح مولانا سے متعلق ایک اچھی اور کارآمد کتاب پیش کی ہے۔

مکتوباتِ عبدالحق

مرتب:۔ جلیل قدوائی۔ ناشر مکتبۂ اسلوب کراچی۔ ۱۸ مجلد مع گرد پوش۔ صفحات ۴۸۰۔ قیمت بارہ روپے۔ لکھائی چھپائی گوارا۔

اس مجموعے میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے خطوں کا ایک انتخاب شائع کیا گیا ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولانا عبدالماجد دریا بادی، ڈاکٹر عابد حسین، نصیرالدین ہاشمی، ڈاکٹر قادری زور مرحوم، مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، سر تیج بہادر سپرو اور سر سکندر حیات خاں کے علاوہ اور بہت سے دوسرے لوگوں کو لکھے ہیں۔

مولوی عبدالحق مرحوم اردو کے سچے خادم تھے۔ لہٰذا تقریباً تمام خطوں میں اردو کے مختلف مسائل ہی کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا طرزِ نگارش سیدھا سادا اور اندازِ بیاں دل نشین ہے۔

نجی خطوط انسان کی شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں۔ ان خطوں سے ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے مزاج، طبیعت اور اردو سے ان کے بے پناہ لگاؤ کا ہر قدم پر اندازہ ہوتا ہے۔

جلیل قدوائی صاحب نے ان خطوط کو مرتب کرکے اردو کے مکاتیبی ادب میں اچھا اضافہ کیا ہے۔

تذکرہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت

مصنف سخاوت مرزا۔ شائع کردہ انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز، ۴۷۰ آغا پورہ۔ حیدرآباد۔ قیمت ۶ روپے پچاس نئے پیسے۔ مجلد مع گرد پوش۔ کتابت طباعت اچھی ہے۔ صفحات ۳۰۰۔

سادات بخارا میں سے حضرت سید جلال اعظم میر سرخ بخاری سب سے پہلے بزرگ ہیں جو ۶۰۷ ہجری میں ہندوستان تشریف لائے۔ آپ ہی کے نامور پوتے سید جلال الدین بخاری؟ مخدوم جہانیاں جہاں گشت ہیں۔ آپ کی اولاد برصغیر ہند و پاک میں پھیلی ہوئی ہے اس خانوادۂ معظم میں کئی ایسے بزرگ ہیں جن کے مزار مرجع خلائق ہیں۔ سخاوت مرزا نے بڑی تلاش، جستجو اور محنت کے بعد اس "خانوادے کی تاریخ اور بانی خاندان کی سوانح عمری" اس کتاب میں پیش کی ہے۔

کنگ لیئر (شیکسپیئر)

مترجم۔ مجنوں گورکھپوری۔ ناشر ساہتیہ اکادمی۔ نئی دلی۔ قیمت پانچ روپے۔ صفحات ۱۷۲۔ طباعت، کاغذ اور کتابت اچھی ہے۔

کنگ لیئر شہرہ آفاق ڈرامانویس ولیم شیکسپیئر کے عظیم ڈراموں میں سے ایک ہے۔ ساہتیہ اکادمی نے یونیسکو کی اعانت سے اس کا اردو ترجمہ شائع کرایا ہے۔ مغربی ادب عالیہ کے اچھے ترجموں کی اردو میں بہت کمی ہے۔ ساہتیہ اکادمی نے اردو میں ممتاز مغربی مصنفوں کی کئی کتابوں کا ترجمہ شائع کیا ہے جو یقیناً اردو کی ایک بڑی خدمت ہے۔ مجنوں گورکھپوری کا نام ہی ترجمے کی اچھائی کی ضمانت ہے۔

سیرِ افلاک

مصنف حکیم احمد۔ ناشر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔ قیمت پانچ روپے۔ صفحات ۲۲۰۔ مجلد مع گرد پوش۔ لکھائی چھپائی اچھی ہے۔

'سیر افلاک' میں اجرامِ فلکی، سیارگان، ستارے اور نیبولا وغیرہ کی ماہیت، کائنات کی وسعت اور سیاروں کی حالت سے متعلق پُر از معلومات اور کارآمد باتیں بتائی گئی ہیں۔ اردو میں غالباً یہ اس موضوع پر پہلی کتاب ہے جس میں نقشوں اور تصویروں کے ذریعے مشکل اور ٹیکنیکل باتیں عام فہم انداز میں پیش کی گئی ہیں۔

حکیم احمد صاحب نے ایک قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس وقت جبکہ خلاء سے انسان کی دلچسپی بڑھتی جارہی ہے۔ امید ہے یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

انجمن ترقی اردو کو ایسی کتابوں کی اشاعت پر زیادہ توجہ کرنی چاہیئے۔

سفینہ وساحل

مصنف عزیز وارثی۔ ناشر مکتبۂ شانِ ہند۔ دہلی ۶۔ قیمت چار روپے۔ صفحات ۱۹۲۔ مجلد مع گرد پوش۔ طباعت اور کتابت اچھی ہے۔

'سفینہ وساحل' عزیز وارثی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ عزیز وارثی غزل کے شاعر ہیں۔ آخر میں چند نظمیں اسلام و پیغمبرِ اسلام و دیگر بزرگانِ دین، گرو نانک، مولانا ابوالکلام آزاد اور میرابھات کے عنوان سے ہیں۔

شروع میں متقدر اہلِ قلم کی رائیں درج کی گئی ہیں اور یقیناً ان بزرگوں نے ان کی شاعری کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان پر صادق آتے ہیں۔ عزیز صاحب کی غزلوں میں روانی اور اثرانگیزی ہے۔ کلام اغلاط اور اسقام سے پاک ہے۔ سفینہ وساحل کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے اور یہی اس کی مقبولیت کی دلیل ہے۔

عزیز صاحب نے اپنا مجموعۂ کلام دیوناگری رسم الخط میں بھی شائع کیا ہے۔

طنز وتبسم

مصنف واہی۔ ناشر مکتبۂ ادب، روڈ نمبر ۵/۱ گردنی باغ۔ پٹنہ ۱۔ قیمت تین روپے، صفحات ۱۵۲۔ مجلد مع گرد پوش۔ کتابت طباعت گوارا۔

'طنز وتبسم' میں واہی نے طنز وظرافت کے بڑے حسین اور شوخ گل بوٹے کھلائے ہیں۔ اس مجموعے کی اکثر نظمیں مختلف جرائد میں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ بہ قول احمد جمال پاشا "واہی کے یہاں موضوعات کی ایک وسیع کائنات ملتی ہے۔ ان میں فکر ونظر کی وسعت، خیال کی گہرائی، جذبے کی گرمی اور حقیقت بیانی بدرجہ اتم موجود ہے۔" ان کی طرح ہمیں بھی یقین ہے کہ 'طنز وتبسم' کا ادبی حلقوں میں خاطر خواہ استقبال کیا جائے گا۔

زمزمہ

مصنف رشید کوثر فاروقی۔ ناشر ادارۂ ادبیات عالیہ لکھنؤ۔ قیمت تین روپے، مجلد۔ صفحات ۱۶۰۔ لکھائی اور چھپائی اچھی ہے۔

زیر نظر کتاب رشید کوثر فاروقی صاحب کی ۱۰۶ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ مصنف نے شروع میں 'میں اور میری شاعری' کے عنوان سے ایک مقالہ سپردِ قلم کیا ہے جو ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس سے مصنف اور اس کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

فاروقی صاحب کو ابھی جواں سال شاعر ہی کہا جا سکتا ہے مگر ان کے یہاں فن کی پختگی، دل نشین انداز، حسنِ کلام اور تاثر سبھی کچھ ہے۔ چند شعر آپ بھی سنیئے۔

کچھ حیا آڑے آ گئی ورنہ ۔۔۔ کم نہ تھی ان کی بے قراری بھی

مجھ سے خود ہیں کو عشق کیا ہوتا ۔۔۔ پیار پر تیرے پیار آتا ہے

تری آنکھوں کو نرگس منھ چڑاتی ہے مگر اس میں

نہ یہ مستی، نہ یہ شوخی، نہ معصومی، نہ گویائی

رسالے

خاتونِ مشرق۔ رسول نمبر۔ مدیر شفیق بریلوی۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ:- ۵ گارڈن کراچی ۳۔

خاتونِ مشرق ایک زمانے سے شائع ہو رہا ہے اور اپنے صاف ستھرے مذاق ومعیار کے لئے مشہور ہے۔

رسول نمبر حضرت محمد صلعم کی زندگی، شخصیت اور سیرت کے تقریباً تمام پہلوؤں پر محیط ہے اور مذہبیات میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے اور لکھائی چھپائی اچھی ہے۔

دوماہی **شیرازہ** (سری نگر) نذور نمبر۔ ایڈیٹر محمد یوسف ٹینگ صفحات ۱۸۴۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر (کشمیر)

اکیڈمی آف آرٹس اور کلچر کا یہ ترجمان اردو رسائل میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔

اس رسالے کا نذور نمبر ان کے فکر وفن کے بارے میں ایک عمدہ دستاویز ہے اور ہر لحاظ سے ان کی شایانِ شان ہے۔ متقدر اہلِ فن نے نذور صاحب کو ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے اور ان کی ہمہ گیر شخصیت اور متنوع ادبی خدمت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ نمبر ہر صاحب ذوق کے لئے قابلِ مطالعہ ہے۔ (ش۔ ح)

ترتیب

سرورق :- مور

رسالے کی پشت پر :- دارجلنگ سے ہمالیہ کا ایک منظر

جلد ۲۲ - نمبر ۵

اگرہائن شک سمت ۱۸۸۵

دسمبر ۱۹۶۳ء

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل (اردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل دہلی

سالانہ چندہ :-
- ہندوستان میں :- سات روپے
- پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
- غیر ممالک سے :- ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ :-
- ہندوستان میں :- ۶۰ نئے پیسے
- پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
- غیر ممالک سے :- ا شلنگ یا ۶ پنس

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

مُلاحظات

چین کے صوبہ سنکیانگ میں ایک کروڑ کے قریب مسلمان بستے تھے۔ پچھلے آٹھ دس سال سے وہ بے شمار بے رحمیوں کا نشانہ بن رہے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں مسجدیں نابود کردی گئی ہیں اور ہزاروں مسلمان روسی علاقے میں بھاگ کر پناہ لے چکے ہیں۔ ان مسلمانوں کے سینکڑوں رہنماؤں کو آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ سنا جاتا ہے کہ چینی مظالم کا شکار عیسائی بھی ہیں۔ چنانچہ سنکیانگ میں کلیسا بھی ڈھا دئے گئے ہیں۔ سنکیانگ کے مسلمانوں کے خلاف سخت گیری کی کارروائی کو چین چھپانے کی کوشش میں ہے اور وہ اُلٹا روس پر الزام لگاتا ہے کہ وہاں کے معاملات میں اثر انداز ہو رہا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ چین کے فسطائی حاکموں کے ظلم و تعدی سے خود چین کے باشندے بھی محفوظ نہیں ہیں۔

ایران کے ایک روز نامے "تہران جرنل" نے اپنے ایک اداریے میں پاکستان کے چین کی طرف بڑھنے کی پالیسی کی مذمّت کی ہے۔ اخبار مذکور نے لکھا ہے کہ پاکستان کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ بھارت سے دوستی رکھے کیونکہ چین کی پالیسی مسلسل جارحیت ہے۔ روسی علاقوں میں چینیوں کے ناجائز داخلے کی اطلاعات نیز پچھلے سال بھارت پر چین کے حملے پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار مذکور نے لکھا ہے کہ چین کی جارحانہ پالیسی کا خاص مقصد بین الاقوامی طور پر سرحدی علاقوں کی خلاف ورزی کرنا ہے۔

مراکو اور الجیریا پر جب فرانس کی حکومت تھی تو فرانسیسیوں نے دونوں ملکوں کی سرحد قائم کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہ سمجھی۔ اب جبکہ ۱۹۵۶ء میں مراکو کو آزادی حاصل ہوئی اور اس کے چھ سال بعد الجیریا آزاد ہوا تو دونوں آزاد ملکوں میں سرحدی جھگڑا شروع ہو گیا۔ اس کو خاص طور پر اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ صحرا کی ریت کے نیچے خام لوہے اور کوئلے کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ مراکو کے شاہ حسن نے سرحد کے اس صحرا کو اپنی پرانی مملکت کا حصّہ قرار دیا ہے۔ الجیریا کے صدر بن بیلا، جو سوشلسٹ نظام کے حامی ہیں، اپنے ملک کے باغیوں کو راہ راست پر لانے میں مصروف تھے کہ یہ دوسری بلا ان پر نازل ہوئی۔ لیکن مقام مسرت ہے کہ شاہ حسن اور بن بیلا نے حبشہ کے بادشاہ ہیل سلاسی کی صدارت میں گفت و شنید کی ہے۔ بہت اچھا ہوا کہ افریقہ کی بقاء اور تحفّظ امن کی خاطر دونوں شخصیتوں نے باعزت فیصلہ کر کے جنگ بندی منظور کر لی ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ قاضی معراج الدّین صاحب دھولپوری ۱۱۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو دھولپور میں انتقال فرما گئے۔ مرحوم ایک اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ تاریخ گوئی میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ آج کل میں اکثر ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔ بڑے خاموش قسم کے وضع دار انسان تھے لیکن افسوس ع آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اثر لکھنوی

شعر بمبدرسہ

رسالہ نقش کراچی نمبر ۶-۴۳ میں جناب شاد عارفی کا مضمون "تواردیا ترجمہ" (منقول از رسالہ آج کل' دہلی مارچ ۱۹۶۳ء) نظر سے گزرا مجھے ان کے بعض ارشادات کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ (غالب نے) میر سے اس قدر عقیدت کیوں ظاہر کی ہے کہ۔۔۔ جو بھی معتقدِ میر نہیں۔۔۔۔ وہ بے بہرہ ہے۔ (گویا 'بہرہ'[1] وہ ہے جو میر کو 'جوان' مانے یعنی 'ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا' یہاں میر کے مفہوم کا تعین کافی الجھاؤ رکھتا ہے۔۔۔"

'معتقدِ میر' کا ٹکڑا جناب موصوف نے غالب کے اس مقطع سے لیا ہے جس میں اس نے ناسخ کے اس مصرع کو تضمین کیا ہے

'آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں' پہلا مصرع ہے
غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقول ناسخ

رہا 'جواں میر' کا الجھاؤ وہ ان کی سمجھ میں کیونکر آئے جب اسے موضوع سے الگ کر کے معنی پہنانے کی سعیٔ نامشکور کریں۔ غالب کا پورا شعر جس میں اس نے 'جواں میر' کا ٹکڑا (ترکیب مقلوب جواں مرنے والا) استعمال کیا ہے یہ ہے

پیشے میں عیب نہیں رکھئے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ظاہر ہے کہ 'جواں میر' سے فرہاد کی طرف اشارہ ہے نہ کہ میر سے تمسخر۔ شاد عارفی صاحب نے ناسخ کا یہ شعر نقل کر کے اُسے اصلاح دی ہے کہ 'مدت ہوئی' کی جگہ 'دیر ہوئی' چاہیئے ؎

دیکھا نہیں جمال بھی آیا نہیں پیام بھی
مدت ہوئی کہ ایک سی حالت چشم و گوش ہے

کاش جناب موصوف مدت اور دیر کے فرق مفاہیم اور وقفۂ زمانی پر غور کرنے کے بعد ناسخ کے منھ آتے۔ اور اگر در پردہ یہ اعتراض ہے کہ مفتعلن کی جگہ مستفعلن استعمال ہوا ہے تو کسی کتاب عروض کا مطالعہ کر لیجئے اور عروض سے اپنی واقفیت کا ڈھنڈورا نہ پیٹئے۔ ناسخ کی اسی غزل کا مقطع ہے ؎

ناسخ یہ قول ہے بجا حضرت میر درد کا
حسن بلائے چشم ہے نغمہ وبال گوش ہے

"ناسخ یہ قول ہے بجا" مستفعلن مفاعلن بجائے مفتعلن مفاعلن

حضرت شاد عارفی کو غالب کے صرف دو ایسے شعر ملے جو میر کے اشعار سے (بلحاظ مفہوم) ملتے جلتے ہیں:-

میر ؎ کب تک آئینے کا یہ حسنِ قبول
منھ ترا اس طرف کبھی تو ہو

غالب ؎ تماشا کہ اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

میر ؎ عشق کرتے ہیں اس پری رو سے میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں
غالب ؎ چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

میں نے ایک زمانے میں میر و غالب کے ایسے اشعار کا انتخاب

[1] بہرہ ور؟ اثر۔

کیا تھا جن کا مفہوم ملتا جلتا ہے۔ ان کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب تھی۔ ایک صاحب یہ انتخاب پڑھنے کو لے گئے اور پھر واپس نہیں کیا۔ اس کو مدّت ہو گئی اور اب ان حضرت کا نام تک یاد نہیں۔ صرف وہ اشعار درج کئے جاتے ہیں جو اب تک حافظے میں محفوظ ہیں:۔

غالب۔ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

میر۔ بزم میں پوچھا تو یوں انجان ہو
میر ان لوگوں میں کس کا نام ہے

غالب۔ بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

میر۔ جیسے بجلی کے چمکنے سے کسو کی سدھ جائے
بے خودی آئی اچانک ترے آ جانے میں

غالب۔ غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

میر۔ لعل خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں
پھر پوچھتے ہو ہنس کر مجھ بے نوا کی خواہش

غالب۔ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

میر۔ ہر قطعۂ چمن پہ ٹک غور سے نظر کر
بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے

قطعہ۔ یاں بلبل اور گل پہ تو عبرت کی آنکھ کھول
گلگشت سرسری نہیں اس گلستان کا
گل یادگار چہرۂ خوباں ہے بے خبر
مرغ چمن نشاں ہے کسو خوش بیان کا

غالب۔ ہے مشتمل نمود صُور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

میر۔ ہستی ہے اپنے طور پہ جوں بحر جوش میں
گرداب کیسا، موج کہاں ہے حباب کیا

غالب۔ آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

میر۔ عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصوّر بے مثل
ہائے کیا صورتیں پردے میں بنا دیتا ہے

غالب۔ نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

میر۔ سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے

مری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک
میں نقشِ پا کی طرح پائمال اپنا ہوں

ایک تھے ہم وے نہ ہوتے ہست اگر
اپنا ہونا بیچ میں حائل ہوا

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ
ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

غالب۔ گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

میر۔ ذلیل اس کی گلی میں ہیں تو ہوں آزردگی کیسی
کہ رنجش تو وہاں ہووے جہاں ہو اعتبار اپنا

غالب۔ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

میر۔ بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

غالب۔ وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

میر۔ اب پھر ہمارا اس کا محشر میں ماجرا ہے
دیکھیں تو اس جگہ کیا انصاف دادگر ہے

غالب۔ قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

میر۔ عشق ان کو[1] ہے جو یار کو اپنے دمِ رفتن
کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

غالب۔ بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

میر۔ ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا
دیکھا جو خوب تو ہے دُنیا عجب تماشا

غالب جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

میر۔ قصدِ طریقِ عشق کیا سب نے بعدِ قیس
لیکن ہوا نہ ایک بھی اس رہ نورد سا

غالب کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

میر۔ میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

غالب۔ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

میر۔ آدمِ خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

غالب۔ دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

میر۔ دل بہم پہنچا بدن میں تب سے سارا تن جلا
آ پڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا

غالب۔ دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میر۔ عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں
لگ گئی یہ آگ ناگاہی کہ گھر سب پھک گیا

غالب۔ اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

میر۔ کہاں آتے میسر تجھ سے مجھ کو خود نما اتنے
یہ حسنِ اتفاق آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا

غالب۔ زکوٰۃِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

میر۔ کاسۂ چشم لے کے جوں نرگس
ہم نے دیدار کی گدائی کی

غالب۔ نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

میر۔ ڈرتا ہوں مالکان جزا چھاتی دیکھ کر
کہنے لگیں نہ واہ رے زخم اس کی تیغ کا

غالب۔ نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
اُسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

میر۔ نسیمِ مصر کب آئی سوادِ شہرِ کنعاں کو
کہ بھر جھولی نہ یاں سے لے گئی گلہائے جاں کو

غالب کے ایک خط سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے میر کی غزلیات کا انتخاب کیا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ میر کے کلام سے شغف تھا اور غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ صفیر بلگرامی فارسی شاعری میں غالب کے شاگرد تھے۔ وہ اپنے تذکرۂ جلوہ خضر میں خود غالب کی زبانی لکھتے ہیں کہ انھوں نے اور مومن خاں نے ناسخ کے رنگ میں دادِ سخن دینا چاہی مگر ناکام رہے۔ آخر کار غالب نے میر کو اپنا رہنما بنایا اور مومن خاں جرأت کی طرف مائل ہوئے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غالب کے صاف اور پھڑکتے ہوئے اشعار میں میر کا رنگ جھلکتا ہے۔

میں نے کبھی کہا تھا اور اپنے قول پر قائم ہوں ؎

میر و غالب سے اٹھی ہے گرمیٔ بزمِ سخن
وہ خدائی کر گیا اور یہ پیمبر ہو گیا

[1] یعنی ان کو آفرین ہے۔

واجدہ تبسّم

سچّے موتی

میں ایک بہت اونچے گھرانے کی بہو ہوں۔ میرے سسر ایک چھوٹے سے مگر پورے گاؤں کے حاکم ہیں۔ وہاں کی عورتیں اب تک سیپیوں میں مستور موتیوں کی طرح ہیں کہ کسی کی نظر ان پر نہ پڑ جائے — میں نے جب کبھی گاؤں کی ٹھنڈی ہوا کھانے کے بارے میں سوچا۔ ریشمی جھالروں اور پردوں جھروں سے سجی بنی بیل گاڑی میرے لئے حاضر کر دی گئی — ایسے میں یہ بڑی ناممکن سی بات تھی کہ میں کبھی باہر نکلنے کے بارے میں سوچ بھی سکوں ! مگر چھوٹی سی وہ بستی جو غریبوں، ڈھیڑوں، چماروں، ہری جنوں اور چند کھاتے پیتے افراد پر مشتمل تھی میری توجہ کا مرکز بنی رہی۔

چین نے ہندوستان کا چین لوٹا تو ہماری چھوٹی سی نگری بھی حرکت میں آئی — میرے شوہر اشفاق کئی دنوں تک مسلسل نیشنل ڈیفنس فنڈ کے لئے گھومتے رہے — انھیں اپنے مقصد میں کامیابی بھی ہوئی — ان کا جوش وخروش دیکھ کر میرا جی بھی ان کا ساتھ دینے چاہا — سبھوں کی مخالفت کے باوجود میں ایک دن ان کے ساتھ گئی — وہ دن میری زندگی کا یادگار دن ہے — وہ دن جبکہ میں نے بن داموں سچے موتی پائے تھے۔

ہم اپنے محل نما مکان سے اتر کر چوبارے میں اترے اور پھر سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے گاؤں کی اور چلے۔

"کیوں جی — ؟" میں نے انھیں مخاطب کیا — "یہ لوگ بھلا سیاست وغیرہ کیا جانتے ہوں گے — ملک میں کیا ہو رہا ہے انھیں کیا خبر — وہ اپنا روپیہ پیسہ کیوں دیتے ہوں گے بھلا۔"

انھوں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے میرا جواب دے دیا۔ "اچھا دیکھو —" وہ مجھ سے مخاطب تھے۔ "یہ گھر ایک غریب ڈھیڑ کا ہے — یہاں رک جائیں۔"

دروازے کے باہر کھڑے کھڑے ہی میں نے ذرا اندر کی طرف جھانکا — دو تین بچّے ننھی سی جھونپڑیا میں کھیل رہے تھے — سب سے بڑی بچّی کی عمر بمشکل دس برس ہو گی۔ وہ اینٹوں سے بنے چولھے پر ہنڈیا چڑھائے بیٹھی تھی — ہمارے اس طرح کھڑے ہونے سے چونکہ روشنی مدّھم ہو گئی تھی اور "گھر" میں مٹیالا سا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا اس لئے اس نے چونک کر سر اٹھایا — ہمیں دیکھتے ہی وہ لپکی آئی —

وہ بڑی تیزی سے آئی اور ایک دم رک گئی — اس نے کتنی ہی دیر تک تو ہمیں یوں ہی دیکھا — پھر ذرا اچنبھے سے بولی "آپ لوگ ہمارے یہاں آئے ہیں ؟"

"ہاں ہاں" میں ہنس کر بولی — "بالکل تمھارے ہاں — کیوں — ؟؟"

اس نے بے اعتباری سے ادھر اُدھر دیکھا — پھر ہاتھ مل کر خاموش رہ گئی۔

"بات یہ ہے بی بی —" اشفاق نے کہنا شروع کیا — "تم تو کافی سمجھ دار بچّی معلوم ہوتی ہو — تمھیں معلوم ہو گا نا کہ بھارت پر . . . . .

وہ بڑے جانے بوجھے انداز میں بولی — "ہاں باپو بتا رہے تھے کہ جنگ ہو رہی ہے۔

میں نے جملہ پورا کیا — اور اس کے لئے ہمیں پیسے کی سخت ضرورت ہے۔"

"مگر میں — ؟" وہ حیرت سے بولی — "میں تو بالکل غریب ہوں —" اس نے اپنی ننھی ننھی ہتھیلیاں سامنے بچھا دیں۔ "میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے —" وہ ہنسی — "ایک پیسہ بھی نہیں۔"

میں نے گھبرا کر اشفاق کی طرف دیکھا — اشفاق سنبھلے۔

"دیکھو بی بی — صرف پیسہ ہی تو ضروری نہیں — ممکن ہے تمہارے گھر میں کوئی ایسی قیمتی مگر بے کار سی چیز ہو جس کا استعمال کبھی نہ ہوتا ہو — اگر تم ہمیں وہی چیز دے دو تو ہم اسے بیچ کر وہی روپیہ حکومت کو دے دیں گے۔ اس نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

بے کار چیز — اور قیمتی چیز — ؟ — ہمارے ہاں تو ایسی کوئی چیز نہیں — ہمارے ہاں تو کوئی چیز بے کار نہیں — دیکھئے یہ ہنڈیا ہے اس میں میں پکاتی ہوں — یہ بستر ہے اس پر ہم سب سوتے ہیں — یہ گلاس ہے اس میں پانی پیتے ہیں — یہ رکابیاں ہیں اس میں کھاتے ہیں — بے کار چیز —" وہ ادھر اُدھر دیکھ کر سر ہلانے لگی — "اونہوں — !"

میں نے اشفاق سے دھیرے سے کہا۔ "ہم بہت نامناسب جگہ آگئے ہیں — فرض کریں اگر یہ ایک نیا پیسہ دے بھی دیتی تو ہمارا کیا ہو جاتا — ؟"

"قطرہ قطرہ کرتے ہی سمندر بنتا ہے —" اشفاق نے اعتماد سے کہا۔ پھر بچی سے بولے — "اچھا بی بی — معاف کرنا تمہیں بڑی تکلیف ہوئی — ہم سمجھے تھے ......"

اک دم اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں روک دیا —

ٹھہریئے میرے پاس ایک بہت قیمتی چیز ہے — اس کا سانولا مٹیالا چہرہ اک دم چراغ کی طرح روشن ہو گیا۔ ذرا ٹھہر جایئے —"

اس نے پھرتی سے دو تین ٹوٹے ہوئے بکسے اور صندوق اوپر تلے رکھے اور سیڑھی سی بنا کر دو چھتی پر سے ایک فریم نکال لائی۔

اپنے پلو سے بڑی محبت اور ممتا کے ساتھ وہ شیشہ صاف کرتی ہوئی بولی۔

یہ میری ماں کی تصویر ہے — اسے آپ بیچ کر پیسے بنا لیجئے — وہ رکی پھر خود ہی سے بولی — "ہمارے گھر کی سب سے قیمتی چیز تو یہی ہے — مگر بے کار نہیں ہے نا —" وہ ذرا تہدیدی انداز سے بولی — "جب ہم سب بہت چھوٹے چھوٹے تھے تو ہماری ماں مر گئی تھی — باپو نے تو ہمیں نہیں بتایا — ماسٹر جی نے تو بتایا تھا — وہ معصوم مسرت سے کھلی جا رہی تھی — "میں چوتھی کلاس میں پڑھنے جاتی ہوں نا ؟ ماسٹر جی اچھی اچھی باتیں بتاتے ہیں — ان نے یہ بھی بتایا تھا کہ جس کی ماں مر جاتی ہے اس کی رکشا بھگوان کرتے ہیں — سچی ہے نا یہ بات ؟ دیکھئے میں ....." وہ کچھ کہتے کہتے رکی — ہم دونوں کی طرف بڑے غور سے دیکھا اور پھر پوچھنے لگی — "آپ کو قیمتی نہیں لگی یہ تصویر —" ؟

میں نے بڑی بے بسی سے اُسے اور پھر اشفاق کو دیکھا

"ایسی بات نہیں بی بی — ہم تو تمہاری باتوں میں کھو گئے تھے — تصویر تو بہت اچھی ہے، بہت قیمتی — میں نے تصویر کی طرف دیکھا ملگجے سُرخی مائل کاغذ پر ایک بے حد بیمار اور مصیبت زدہ سی عورت کی تصویر — فریم جگہ جگہ سے تڑخا ہوا — اس کی قیمت کیا ہوگی — ؟ میرے دل نے مجھ سے پوچھا۔

وہ پھر ہنسی — گاؤں میں جب بیساکھی کا میلہ لگا تھا، ایک فوٹو والے نے میری ماں کی یہ تصویر لی تھی — ماسٹر جی نے یہ بھی بتایا تھا کہ — " وہ ہنستے ہنستے اک دم خاموش ہو گئی۔

اور عبادت کرنے والی سنجیدگی کے ساتھ بولی —

"دیکھئے — آپ جس کسی کو یہ تصویر بیچیں نا — اس سے کہہ دیں کہ اسے ذرا حفاظت سے رکھیں —"

ہمارا اگلا پڑاؤ ایک شکستہ سے گھر پر تھا — جو مٹی کا بنا ہوا تھا — ہمارے پیروں کی چاپ سن کر دو چار بچے بھاگے آئے اور ہمیں تصویر حیرت بن کر دیکھنے لگے۔

" تم ملک کے واسطے چندہ مانگنے آئے ہو ۔" ایک بچے نے بڑی بے باکی سے پوچھا۔

میں نے ہنس کر اس کے گالوں کو تھپ تھپایا — تم تو بہت سمجھدار معلوم ہوتے ہو ۔ تمھیں پتہ ہے کہ ملک کے لئے چندہ کیوں جمع کیا جا رہا ہے — ؟"

وہ فخر سے بولا —" ہاں ہاں ہم کو سب معلوم رہتا ہے ۔ بڑے مالک (اس کا اشارہ میرے سسر کی طرف تھا) کے گھر ریڈیو باجا ہے — اس سے سب حال معلوم ہوتا رہتا ہے —"
اس نے بڑے سیاسی تدبر کے ساتھ پوچھا —" یہ لڑائی دلنگا کب تک چلتا رہے گا —"

میں نے گھبرا کر اشفاق کی طرف دیکھا — یہ گاؤں کی بعید چھوٹی اور کمترین مخلوق — کس طرح حالاتِ حاضرہ سے باخبر ہے ۔ اشفاق اسے مطمئن کر رہے تھے — بس چند دنوں کی بات ہے ۔ جب تک ہم ایک ہیں کوئی ہمیں نہیں توڑ سکتا —"

" ابے او عثمان — اندر سے ایک تیز آواز آئی — کیا ٹرٹر لگا رہا ہے — کون ہے باہر — اور ساتھ ہی ایک تگڑا سا آدمی باہر نکل آیا — ہمیں دیکھ کر وہ حواس باختہ سا ہو گیا — گھبرا کر بولا —

بہو رانی — آپ — (میں اپنے آپ میں سخت خجل ہوئی)
ابا — یہ پیسے مانگنے آئے ہیں عثمان باپ کے بازو میں جھول کر بولا ۔

اندر سے ایک بے حد تیز اور جلی ہوئی آواز آئی —" پیسہ — پیسہ — پیسہ — موئی لڑائی کیا چھڑی کہ حکومت کو بھیک ہی روزی ہو گئی — ہمیں کون سے بڑے عیش میں ہیں کہ حکومت کو دان دیں ۔ نہیں ہے پیسہ دھیلہ —"

آدمی کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا — وہ ہمیں منانے کے انداز سے بولا —" حضور آپ لوگ برا نہ مانیں یہ تو پاگل ہو گئی ہے —"

اشفاق بڑی صاف دلی سے ہنسے —" کوئی بات نہیں۔ پیسہ نہیں ہے تو کوئی فکر نہیں — فوجی جوانوں کے لئے کوئی سی چیز جو ان کے کام آ سکے، بڑی خوشی سے قبول کی جائے گی — کھانے پینے کی ہو یا پہننے اوڑھنے کی — یا .....

ہاں ہاں — ہم نے تو خزانہ ہی کھول رکھا ہے نا — ادھر کیوں نہیں جاتے جدھر بڑے لوگوں کے مکان آسمان سے باتیں کر رہے ہیں —"

اشفاق نے بڑے صبر سے جواب دیا —" بہن جی دیش کی حفاظت کے لئے امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہے ۔ انھوں نے کندھے سے لٹکتا ہوا بیگ تھپ تھپایا — روپے، پیسے، آنے کھن کھن بج اٹھے —" ہم تو سبھی سے مانگ رہے ہیں —"

تھوڑی دیر ہر طرف خاموشی رہی — پھر عثمان دوڑتا ہوا گیا اور ایک کالا کلوٹا نیا پیسہ لا کر بڑے فخر سے اشفاق کی ہتھیلی پر رکھ دیا — یہ میری طرف سے دیش کی رکشا کے لئے — ملک کے لئے —"

ابھی ہم چل ہی رہے تھے کہ دروازہ چرچرایا اور چودہ سال کا ایک لڑکا نمودار ہوا — بخار سے جسم جھلستا ہوا — آنکھیں خون رنگ — بال الجھے — ڈگمگاتا ہوا آیا اور اپنے جسم سے ایک بوسیدہ سا کمبل اتار کر اشفاق کے کندھے پر ڈالتا ہوا بولا —

" میں یہاں آگ تاپ کر رہ لوں گا — یہ کمبل کسی فوجی بھائی کو بھجوا دیجئے گا بھائی صاحب — تھر تھر کانپتا، دانت کٹکٹاتا وہ اندر چلا گیا ۔

کتنے ہی گھروں پر ہم نے دستک دی ۔ کتنی ہی جگہوں پر رکے — اشفاق کے کندھے سے لٹکے بیگ کا وزن بڑھتا گیا ۔ سہ پہر کے قریب ہم نے ایک چھوٹے سے صاف ستھرے لپے پتے گھر پر دستک دی — ایک جوان لڑکی نے دروازہ کھولا — ہمیں دیکھ کر جھجکی اور جیسے گناہ کا اعتراف کیا —

" مالک — ہم تو اچھوت ہیں —"

میں نے تکلف کی دیوار گرانے کے لئے پینے کو پانی مانگا۔

"ہمارے برتن سے بئیں گے آپ —" اس کی آواز حیرت سے بوجھل تھی۔

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔" میں بولی — "انسان انسان سب برابر ہیں۔"

پانی پی کر میں نے اس سے پوچھا — "تم لوگوں کو پتہ ہے آج کل دیش میں کیا ہو رہا ہے۔"

اس سوال پر وہ چونکی نہیں۔ بہت اطمینان سے اس نے کہا۔ "ہاں گاؤں چھوٹا ہے، لوگ چھوٹے ہیں مگر ادھر اُدھر کی پوری خبر رکھتے ہیں مجھے معلوم ہے لڑائی چھڑی ہوئی ہے اور اسی کے لئے آپ جیسے مہان لوگ اپنا آرام چھوڑ کر گھروں گھر چندے لینے پھر رہے ہیں۔"

میں نے بے اطمینانی سے اس کی طرف دیکھا اس کے لہجے میں صرف خلوص تھا۔

"کون ہے چمپا۔ ؟" اندر سے ایک کانپتی آواز آئی۔ اس نے بنا پوچھے تعارف کروا دیا — "میری اندھی دادی ہے —" وہ اندر اُٹھ کر گئی۔ کچھ باتیں ہوئیں۔ پھر دادی کی آواز باہر تک آئی۔

"میرے پاس بلانا ان دونو کو۔ میں ان کو چھو کر دیکھتی ہوں۔"

میں جلدی سے اٹھ کر اندر بھاگی۔ اشفاق بھی پیچھے ہی آئے۔

ہڈیوں کا پنجر سامنے رکھا ہوا تھا۔ چمپا نے دھیرے دھیرے بتایا۔

"دادا برسوں پیچھے لام پر مارے گئے۔ روتے روتے غم میں دادی اندھی ہو گئی۔ مگر اندھی ہو کر بھی بدلے میں کیا ملا۔ ؟ پنشن کے چند روپے ماہوار۔" اس کی آواز میں بلا کا طنز تھا۔

دادی نے ہاتھوں سے مجھے ٹٹولا۔ چہرہ چھوا۔ بڑے پیار سے سنتی ہوں، اب پھر جنگ ہو رہی ہے۔" وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

جواب دینے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔

اشفاق نے گڑبڑا کر لہجے کو سنبھالا — "دادی جب کی بات اور تھی۔ اب کی بات اور ہے۔ اب تو دیش اپنا ہے۔ سب اپنے ہیں۔ جیسے یہ چمپا تمھاری بیٹی ہے نا۔ ایسے ہی بھارت بھی تمھاری بیٹی سمجھ لو — تم بھلا پسند کروگی کہ اس کا سہاگ لٹ جائے۔

بڑھیا نے بڑی سمجھداری سے سر ہلایا اور کٹیلے لہجے میں بولی — بات ایک ہی ہے — کچھ فرق نہیں پڑتا۔"

بہت فرق پڑ جاتا ہے دادی — زمین آسمان کا فرق — غلامی اور آزادی کا فرق۔ تم بوڑھی ہو کر بھی نہ سمجھوگی تو کون سمجھے گا۔"

بڑھیا نے جھلا کر پوچھا — "سمجھ کر کروں بھی کیا۔ سہاگ تو برسوں پیچھے لٹا دیا۔ اب گھر کا اکلوتا دیا بیٹا ہے وہ بھی دے دوں۔ ؟"

دادی یہ تمھیں کون کہہ رہا ہے —؟ بیٹے کے سمجھنے کی بات ہے وہ خود ہی سمجھ لے گا۔ تم سے تو ہم چندہ مانگنے آئے ہیں — یہ نہیں تو چند پیسے ہی دے دو۔"

دادی بڑی دیر تک خاموش رہی — چمپا بھی — اشفاق بھی — میں بھی — ! پھر بڑھیا نے چمپا کو حکم دیا — میری لُٹیا اُٹھا لا۔"

چمپا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا — وہ ڈولتے گرتے قدموں سے کونے میں گئی اور ایک لٹیا لا کر دادی کو تھما دی — بڑھیا نے وہ لٹیا آگے بڑھا دی — "یہ لے لو میرے سہاگ کی قیمت۔ میری زندگی بھر کی کمائی —

ہم نے حیرت سے لٹیا کو دیکھا اور پھر بڑھیا کو۔ مگر بڑھیا کی اندھی آنکھوں میں تو سچے موتیوں کی سی جگمگاہٹ دمک رہی تھی گھبرا کر چمپا نے ہمیں باہر آنے کا اشارا کیا۔

"غریبی نے تو ہمیں کہیں کا نہ رکھا — دادی نے دادا جی کی پنشن کو سنبھال کر رکھا مگر وقت پڑنے پر ہم اس میں سے روپے نکالتے گئے اور روپے کے سائز کے کاغذ کاٹ کر بجائے نوٹ ڈالتے گئے۔ بھگوان کے لئے دادی کو اسی بھول میں رہنے دیجئے کہ انھوں نے آپ کو لٹیا بھر روپے دیش کے لئے دئے ہیں۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بری طرح برس پڑے۔

ٹوٹے ہوئے فریم — بوسیدہ کمبل اور کاغذوں سے بھری لٹیا کو دیکھ کر میں نے اشفاق سے پوچھا ——— ان کی قیمت بھی کوئی لگا سکے گا ———؟ ان کا جواب صرف آنسو تھے —!

بھونج

دیدی نے کل نہاتے وقت کہا تھا کہ اسکول میں دعوت ہوگی اور وہ اسے ضرور اپنے ساتھ لے جائے گی۔

تمام رات نبو کو نیند نہیں آئی۔ وہ بار بار ماں کو جگا کر پوچھتا رہا کہ صبح ہوئی یا نہیں۔ بہن نے کہا ہے کہ وہ آج ہمیں اسکول لے جائیں گی۔ وہاں کئی بچوں سے جان پہچان کرادیں گی۔ نبو بستر پر لیٹے لیٹے ہی سوچ رہا ہے۔ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے اور ماں کو جھنجھوڑ کر کہتا ہے۔" ماں، ماں اُٹھو۔ سویرا ہو چلا۔ کوے کائیں کائیں کرنے لگے۔"

ماں نے نیند سے بوجھل آنکھوں سے کھڑکی کی طرف دیکھا تو ابھی بہت اندھیرا تھا۔ "اوہ بیٹا تم مجھے سونے بھی نہیں دو گے۔ ابھی اتنا اندھیرا ہے، سویرا کہاں ہوا ہے؟"

"ہاں، ایک کوا بول گیا ہے۔ میں نے صاف سُنا ہے۔"

ماں کے جاگتے ہی نبو نے رما کو پکارا۔" دیدی، صبح ہوگئی۔ اٹھوگی نہیں؟ او دیدی۔"

کواڑ کھول کر تینوں باہر آئے۔ ماں نے نبو کا تقاضا بار بار ٹالنے کے بجائے اسے مان لینا ہی بہتر سمجھا۔

تالاب کے پتھر پر بیٹھا جھانوا ہاتھ میں لئے نبو اپنے بدن کو رگڑ رہا ہے اور بیچ بیچ میں پوچھ لیتا ہے۔" ماں، اب میں گورا نظر آتا ہوں۔" ماں کے لاکھ کہنے پر بھی نبو کا دل نہیں مانتا۔ وہ اور بھی رگڑتا جاتا ہے۔ آخر اس نے ضد پکڑ لی کہ ماں آکر ایک مرتبہ دیکھ جائے۔ برتن مانجھنا چھوڑ کر ماں نے آکر دیکھا جھانوے کی رگڑ سے بدن کی ملائم جلد لگ بھگ چھل گئی ہے اور وہ جگہ سُرخ ہوگئی ہے بیٹے کے ہاتھ جھانوا چھین کر اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے ماں نے کہا۔" ارے، جھانوے سے کوئی دیہہ رگڑتا ہے۔

نہانا ختم ہوا لیکن نبو کا سارا جسم جلنے لگا۔ پونچھ پانچھ کر وہ گھر آیا۔ گھر کی مٹی کی دیوار میں ایک آئینہ ٹنگا ہے۔ وہیں آکر نبو کھڑا ہوگیا۔ ہاتھ میں کنگھی، کنگھی کے بیچ کے سب دانتے جھڑ گئے ہیں۔ دونوں طرف جو آٹھ دس دانتے ہیں بس اتنے ہی سے وہ کنگھی کر رہا ہے۔ ریلی تیل سے سنے اپنے سخت بالوں کو سنوارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دل مسرت سے بریز ہے۔ آج اس کا سب کچھ صاف ستھرا ہے۔

اسکول کے پھاٹک کے پاس پہونچ کر نبو نے کہا۔" دیدی مجھے سبھی چیزیں دکھا دینا اور دوسرے بچوں سے ملاقات بھی کرا دینا۔"

"اچھا دیکھو یہاں سُندر دوب اُگی ہے اور یہاں موتیا پھیلا ہے۔"

" ارے ہاں تو" کہہ کر نبو نے گھاس کو یوں چھو لیا جیسے زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔ اس کے بعد وہ دونوں آگے بڑھے۔ رما ایک کے بعد ایک پیڑ دکھاتی گئی۔ مندارا، پلاسش، کرشن چوڑا، رجنی گندھا، آم، بیل وغیرہ۔ کوئی پھل پھول سے لدا

ہوا ہے اور کوئی ابھی تک ٹھونٹھ پڑا ہے۔ لیکن نبو کی نظر میں آج سب خوبصورت ہیں۔ آنکھوں میں قوس قزح کا رنگ چڑھا کر چاروں طرف دیکھتا ہے۔ پھر آگے بڑھ جاتا ہے۔

پیڑ پودوں کا منظر ختم ہو گیا۔ باقی رہ گئی سکول کی عمارت، جہاں بچّے بیٹھ کر آرام سے سبق پڑھتے ہیں۔ رما نے دیکھا کہ کلاس روم کھلا نہیں ہے۔ ٹوٹی کھڑکی میں چڑھ کر بھائی کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ اندر لے گئی۔ کھڑکی کے کواڑ بند اور چاروں طرف اندھیرا۔ چلتے چلتے بنچ سے جسم ٹکرا جاتا ہے اور نبو چلّاتا ہے — "باپ رے باپ!" آخر رما کا کرتہ کھینچ کر اس نے کہا۔ "نہیں دیدی۔ یہاں بھوت ہو گا چلو لوٹ چلیں۔"

دفعتاً بجلی جل اُٹھی اور اس کی روشنی میں نظر آئی رما کے ہونٹوں کی مسکراہٹ۔ نبو حیران ہو کر دیکھنے لگا۔ "دیدی بہت سی باتیں جانتی ہے۔ اس کے کہنے سے بجلی بھی جل جاتی ہے۔

خوشی کے مارے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہا۔ اس جگہ سے اس جگہ جانا اور لوٹ آنا۔ اوپر نیلا آسمان نہیں اور نیچے ملائم گھاس نہیں پھر بھی اس بند کمرے میں دو انسانی بچّے بہار کے تیتلوں کی طرح اپنے کو خوشی میں بھول گئے۔

میدان میں بچّے جوق در جوق ٹہل رہے ہیں۔ جان پہچان کے بچّوں کو دیکھ کر رما بھائی کا ہاتھ پکڑے ان کے پاس گئی۔ بچّوں کا مجمع نبو کو دیکھنے لگا۔ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں کھیل رہی تھیں۔

"یہ کون ہے رما؟"

"میرا بھائی۔"

"بالکل گھامڑ نظر آتا ہے۔" کسی نے فقرہ کسا۔

رما کا منہ سوکھ گیا۔ مشکوک نگاہوں سے اس نے بھائی کی طرف دیکھا۔ نبو کی چپٹی ناک، موٹے ہونٹھ، گھنے گال اور پکے تال جیسا جسم کا رنگ، کہیں بھی کچھ نقص نظر نہیں آیا۔ بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تجھے وہ جھوٹ موٹ ایسا کہہ رہے ہیں۔ ڈرو مت۔"

نبو ڈرا نہیں، یہ دکھانے کے لئے وہ ہنس پڑا۔ موٹے ہونٹوں میں سے پتلی زبان باہر نکلی اور بلبلاتی ہوئی اندر گھس گئی۔ ٹھیک سانپ کی طرح۔

"بچّے، ذرا ہنسو تو۔"

"نہیں۔" نبو منہ بنا کر کھڑا ہو گیا

"ارے، نہایت گھامڑ بچّہ ہے۔ ذرا ہنسو تو۔"

"دیدی۔ کھیلنے چلو۔"

اور وہ دیدی کا ہاتھ پکڑ کر کھیلنے چلا گیا۔

کھیلتے کھیلتے جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ سورج سر سے نیچے اتر آیا۔ پھر بھی رسوئی ختم نہیں ہوئی۔

بچّے گروہ در گروہ چل پڑے۔ ایک ہاتھ میں چٹائی اور دوسرے میں پتل۔ ایک قطار کے آخر میں بیٹھے ہیں نبو اور رما۔ نبو کی لوبھری دونوں آنکھیں لگی ہیں پتل پر۔ رہ رہ کر دیدی کو چٹکی کاٹ لیتا ہے دیدی کے شروع کرنے پر ہی وہ شروع کرے گا۔ کھیلتے وقت دیدی نے اسے بار بار سمجھایا ہے کہ جب میں کھانا شروع کر دوں تبھی تم کرنا۔

اسکول کے منتظم یہ دیکھتے ہوئے گھوم رہے ہیں کہ سب کچھ ٹھیک ڈھنگ سے پروسا جا رہا ہے یا نہیں۔ اچانک کسی کی نظر پڑ گئی۔ رما پاؤں کھجلا رہی ہے۔ یہ دیکھ کر وہ منتظم چلّایا۔ "تمہیں کھجلی ہے۔ دوسروں کو بھی ہو جائے گی۔ تم ابھی جاؤ۔ ٹھیرو۔ ان لوگوں کے کھا لینے کے بعد تمہیں بُلا لوں گا۔"

رما اُٹھ کھڑی ہوئی۔

نبو ہکا بکا بہن کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ کون ہے؟"

"میرا بھائی۔"

اچھا، اسے بھی ساتھ لے جاؤ۔ جب تم کھاؤ گی تو وہ بھی کھائے گا۔

بھائی بہن دونوں اُٹھ کر چلے گئے، سامنے پروسی ہوئی چیزوں کو للچائی نظروں سے دیکھتے ہوئے۔

"سنو، نبو۔ ان لوگوں کے بعد ہم کھائیں گے۔"

"نہیں دیدی، مجھے بہت بھوک لگی ہے، متلی ہو رہی ہے۔"

"سویرے ماں کے کھانا دینے پر تم نے منع کیا تھا۔"

"اچھا، ابھی تھوڑی ہی تو دیر ہے۔ دیکھو نا کتنی اچھی چیزیں بنی ہیں۔ سویرے تو ماں پر والا (پانی ملا بھات) دے رہی تھیں۔ وہ کھا کر کیا تم اچھی چیزیں کھا لیتے؟"

مجھے متلی آ رہی ہے۔"

اچھا تب چلو، دو بیل پتر سونگھ لینے سے متلی بند ہو جائے گی۔

بیل پتر سونگھنے کے بجائے چار میٹھی بیل پتر چبا کر نبو نے کہا

دیدی بڑی بھوک لگی ہے۔"

"اچھا دیکھو، کیا چیزیں بنی ہیں۔ میں تمھیں یہیں سے دکھا دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر رما نے گھاس پھونس اکٹھا کیا۔ اسے مچھلی ماس اور سبزی ترکاری کے روپ میں اور اینٹ پتھر کو مٹھائی کے روپ میں دکھایا۔ نبو کی آنکھوں میں بھوک دیکھ کر رما نے بھوت کے متعلق گپ شروع کی "وہاں اس دیوار کے اُس طرف جو اندھیرا کمرہ دیکھ رہے ہو اس میں بھوت رہتا ہے۔"

جوتوں کی گپوں میں کتنا وقت گزر گیا، معلوم نہیں ڈوبتے سورج کی سُرخ کرنیں بکھر گئیں۔ دونوں بچے اس گھاس پر ایک دوسرے سے سٹے بیٹھے تھے۔ اچانک کسی کی آواز سن کر رما نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ چپڑاسی پکار رہا ہے۔

وہ خوشی خوشی اٹھی اور بھائی کا ہاتھ پکڑ کر بولی — "چلو کھانا کھائیں۔ دیکھو نا چپڑاسی بُلانے آیا ہے۔"

وہ سوکھے منہ سے مسکرائی اور پلٹ کر چپڑاسی سے پوچھا "ان لوگوں نے کھا لیا؟"

"ہاں سبھی لوگ کھا کر چلے گئے ہیں۔ تم یہیں بیٹھی ہو — گھر نہیں جاؤ گی کیا؟"

فوراً بھائی کا ہاتھ چھوٹ گیا اور آنکھوں میں پانی آ گیا۔

چپڑاسی ہمدردی سے بولا — "چلو میں گھر چھوڑ آؤں۔"

"ضرورت نہیں، ہم خود چلے جائیں گے۔

دعوت کی جگہ جھوٹے پتوں پر کتے اور کوّے لڑ رہے تھے۔ گرد آلودہ چاروں ننھے منے پاؤں ایک لمحہ کے لئے رکے اور پھر آگے بڑھے۔

سویرے جو چاروں پاؤں زمین پر نہیں پڑتے تھے شام کو ان میں گویا مٹی سے اوپر اٹھنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ (مترجم سنت راج رہبر)

قیصر تمکین

بھرم

ننی بخار میں پھنک رہی تھی ۔ صفو بار بار اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر حرارت کا اندازہ کرتی اور پھر دوسرے ہاتھ سے جلدی جلدی اپنی آنکھیں اور ناک صاف کرتی ۔

وہ چپکے چپکے رو رہی تھی اور اپنی بے بسی کا حال کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی تھی ۔ اس نے ایک بار پھر ننی کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر بخار کی شدّت کا اندازہ کیا اور ننی کی غفلت کو دیکھ کر تڑپ اٹھی ۔ ننی بالکل بے حال پڑی تھی ۔ صفو سے جب کچھ نہ بن پڑا تو وہ ننی کو گود میں اٹھا کر ٹہلنے لگی ۔

اتنے میں رسولن بھی آگئی ۔ پورے محلے بلکہ پوری دنیا میں اس وقت صفو کی سب کچھ رسولن بی ہی تھی وہ اس کی رشتہ دار ، سہیلی پڑوسن ، خادمہ غرضیکہ ہر طرح کے فرائض انجام دیتی ۔

” اے کیا ہوا بی بی ۔ بخار نہیں اترا ۔۔ “ رسولن نے اپنا برقعہ الٹ کر پوچھا ۔ ہمدردی کے صرف ایک جملے سے صفو کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے جلتے جلتے زخم پر ٹھنڈا سا پھاہا رکھ دیا ہو ۔

” میں کہوں بی بی کہ ضد اچھی نہیں ۔ تم کہو تو میں ابھی اچھے میاں سے جا کر کہوں وہ خود ہی دوڑے دوڑے آئیں گے اور ڈانگدار کو بھی لیتے آئیں گے ۔۔۔ “

” نہیں نہیں ایسا مت کرنا ۔ “ صفو نے چونک کر کہا ۔

اچھے میاں صفو کے بھائی تھے ۔ ان کی شادی کو تین چار سال ہو چکے تھے اور کوئی اولاد نہیں تھی ۔ وہ ہر وقت صفو پر زور دیتے کہ ننی کو مجھے دے دو ۔ اس کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام ہو جائے گا ۔

ممکن ہے کہ ان کی نیت صاف رہی ہو مگر صفو کو ان کی پیشکش بڑی گراں گزرتی ۔ جب سے اس کے شوہر پر پریشانیوں کا ہجوم ہوا وہ خود ہی سب سے الگ تھلگ رہنے لگی تھی ۔ نسیم نے ابھی تھوڑے دن پہلے ہی لکھا تھا کہ اس کو جلد ہی ملازمت مل جانے کی امید ہے ۔ مگر اس بات کو بھی اب دو تین مہینوں سے زائد ہو چکے تھے ۔ پھر اس کی کوئی خبر نہیں آئی ۔ معلوم نہیں کیا ہوا ۔ صفو کو ہر وقت طرح طرح کے خیالات ستاتے رہتے ۔ پہلے اس کو نسیم کی پریشانیوں سے ہمدردی تھی مگر اب وہ اپنے کو اور شوہر کو دونوں کو بُرا ٹھہراتی ۔ وہ کبھی کبھی نسیم میں طرح طرح کے عیب بھی نکالتی ۔ مگر کبھی اس کو یہ بھی خیال آتا کہ وہ بے چارہ معلوم نہیں کن مشکلوں میں مبتلا ہو گا ۔ کبھی اس کو یہ بھی خیال آتا کہ نہیں ...... اس کے آگے اور سوچ ہی نہیں سکتی تھی ۔

اور ان حالات میں سب سے بڑھ کر جھنجھلا دینے والی اچھے میاں کی پیشکش تھی کہ ننی کو میرے پاس رہنے دو ۔ اس کے لئے ہر طرح کی آسائشوں کا انتظام ہو جائے گا ۔ ایک دو بار صفو نے ہنس کر ٹالا اور پھر ایک دفعہ سختی سے اچھے میاں سے کہہ دیا کہ وہ بچّی کو یتیم و لاوارث نہ سمجھیں ۔

اور تب سے اچھے میاں سے اس کے تعلقات ایک طرح سے خراب ہی ہو چکے تھے ۔ وہ اسی شہر میں رہتے تھے اور ان کو معلوم تھا کہ صفو پیسے پیسے کی محتاج ہے مگر پھر بھی وہ انتقاماً ادھر کا رُخ نہیں کرتے تھے ۔

رسولن کی بات سن کر صفو کو بڑی تکلیف ہوئی اور کوئی وقت ہوتا تو وہ خفا بھی ہو جاتی۔ مگر اس وقت تو سوال نبی کی زندگی کا تھا۔ اس کو ڈبل نمونیہ تھا۔ اگر ڈاکٹر نہ آیا۔ علاج نہ ہوا تو —

رسولن نے کہا۔ "اے بی بی اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ آدمی آدمی کے ہی کام آتا ہے۔ پھر اچھے میاں تو تمھارے سگے بھائی ہیں۔ تم کسی غیر سے کچھ مانگنے تھوڑی جا رہی ہو۔ اور پھر وہ خود نبی کو اور تم کو کتنا چاہتے ہیں۔

"نہیں۔ نہیں —" صفو اڑ گئی۔ اس کو خیال آ گیا کہ اس کا شوہر اس بات کو کتنی بری نظر سے دیکھے گا۔ پھر وہ بھی بھائی اور بھاوج کے سامنے سر اونچا نہیں کر سکے گی۔ اس کا سرمایہ فخر یہی غیرت تو تھی کہ اس نے آج تک کسی کے آگے مدد کے لئے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اور اب اگر وہ کسی کے پاس گئی تو کیسی بے عزّتی ہو گی اور پھر اگر بھائی نہیں تو بھاوج تو ضرور کسی نہ کسی موقع پر خوش اسلوبی سے کوئی جملہ چپکا ہی دے گی۔ کیا پتہ وہ اس طرح کہے۔ "اے صفو۔ مانو نہ مانو — مگر نبی کے لئے ہماری محبت سچّی ثابت ہوئی۔" اور اس کا مطلب کچھ اس طرح ہو گا۔ دیکھا ہم نہ کہتے تھے کہ یہ بچّی تم سے نہیں پل سکتی۔ پہلے تم نے انکار کر دیا تھا اب اپنا تھوکا آپ ہی چاٹو — بڑی غیرت دار تھیں نا تم —"

یہ سب سوچ سوچ کر صفو پر پھر عجیب اختلاجی کیفیت طاری ہونے لگی۔

رسولن بولی۔ "اے بہن میرے کنے اب اس وقت کچھ نہیں۔ نہیں تو موئے ڈانگدار کو میں ہی بلا لاتی۔ وہ کیا وکیل صاحب کے مکان کے آگے رہتا ہے۔"

"میری سنو۔" صفو ایک دم کھڑی ہو گئی۔ "رسولن بی تم ذرا کی ذرا ٹھہرو، میں ابھی آئی۔ ذرا گلی کے موڑ تک جا کے ہو آتی ہوں۔"

اس نے بچّی کو آہستگی سے پلنگ پر لٹایا اور رضائی دوہری کر کے اس پر ڈال دی اور پھر کوٹھڑی میں چلی گئی۔ اس نے اپنی صندوقچی کھولی اور اس کے اندر سے چھپکے کی ڈبیا نکالی۔ کوٹھڑی میں ہلکا اندھیرا تھا۔ اس نے ڈبیا آہستگی سے کھولی اور چھپکے کو نکال کر ہتھیلی پر رکھا اور پھر جلدی سے اس کو ڈبیہ میں بند کر کے باہر نکل آئی۔ رسولن نبی کو گود میں لے کر بیٹھی تھی۔ وہ کچھ کچھ سمجھ چکی تھی کہ صفو کا کیا ارادہ تھا مگر وہ اس کی طبیعت سے بھی واقف تھی اس لئے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کا دل چاہا کہ صفو سے پوچھے اور اگر وہ بنواری لعل صراف ہی کے یہاں جا رہی ہو تو اس کو منع کر دے اور اس کی جگہ پر خود چلی جائے مگر صفو نے برقع اوڑھا اور جلدی سے باہر چل دی۔

وہ جھجک رہی تھی۔ زیور یا کسی قیمتی مال کے نام پر اس کے پاس بس اب یہی چھپکا باقی بچا تھا۔ چھپکا تو یہ نام ہی کا تھا کیونکہ بہت چھوٹا تھا۔ اور اس طرح کا دوسرا مل جاتا تو کانوں میں جھومر کے طور پر استعمال ہو سکتا تھا۔ مگر خاص بات یہ تھی کہ یہ نسیم نے صفو کو بطور تحفہ دیا تھا اور بتایا تھا کہ اس کی ماں نے اس کو تیس برس تک سنبھال سنبھال اس لئے رکھا تھا کہ اپنی بہو کو دے۔ مگر وہ اپنے ہاتھ سے بہو کو یہ تحفہ نہ دے سکی۔ خود نسیم کی ماں کو یہ زیور اس کے شوہر نے شادی کی پہلی رات کو دیا تھا۔ مرنے سے کچھ دن پہلے اس نے یہ تحفہ نسیم کے سپرد کیا تھا کہ وہ اپنی دولھن کو دے۔ اور جب شادی کی رات کو نسیم نے یہ امانت اپنی بیوی کو سونپی تو وہ خوش بھی تھا اور مغموم بھی۔ اس کو افسوس تھا کہ ماں اپنے ہاتھ سے یہ تحفہ بہو کو نہ دے پائی اور خوشی اس بات کی کہ اس کی آرزو پوری ہو گئی اور یہ تحفہ بہو تک پہونچ گیا۔

اتنی بہت سی یادیں جمع ہو جانے کی وجہ سے صفو کو اس تحفے سے جان سے بھی زیادہ پیار تھا۔ چھوٹے موٹے جو بھی زیور اس کے پاس تھے اس نے اپنی مفلسی کے دنوں میں بنواری لعل کے ہاتھ بیچ دئے۔ مگر اس چھپکے کے بارے میں اس کو کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اس عزیز نشانی کو اپنے سے کبھی الگ نہیں کرے گی۔

گھر سے بنواری لعل کا مکان صرف چند منٹ کے فاصلے ہی پر تھا وہ دکان پر گئی اور ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ دوسرے گاہکوں سے نپٹ کر بنواری لعل نے صفو کی طرف توجہ دی اور محبّت سے بولا۔ "کیا ہے بیٹی مٹرو کی کوئی خبر آئی —"

بنواری لال نسیم کو بچپن سے جانتا تھا۔ اس نے اس کا نام مٹرو رکھ چھوڑا تھا اور تب سے اب تک وہ نسیم کو مٹرو ہی کے نام سے پکارتا۔ نسیم کو اس نام سے چڑھ تھی۔ وہ بنواری سے خفا بھی ہوتا مگر صفو کو یہ

نام پہ ہنس کر مزہ آتا تھا بلکہ اکثر وہ خود بھی چڑھانے کے لئے نسیم کو "مرڈو" کہہ دیتی۔

"نہیں۔" صفو نے آہستگی سے جواب دیا۔

بنواری لعل چپ ہو گیا۔ وہ صفو کی حالت سے واقف تھا اس لئے تھوڑی دیر بعد خود ہی اس نے پوچھا۔ "کچھ لائی ہو۔"

صفو نے جواب دینے کے بجائے ڈبیہ اس کی طرف بڑھا دی۔

بنواری لال نے ایک طرف آڑ میں ہو کر چھپکا نکالا۔ اس کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر پھیلایا۔ پھر اس نے کیش بکس کے اوپر لگا ہوا بلب جلایا۔ تھوڑی دیر اس کو اُدھر اُدھر الٹا پلٹا اور پھر کسوٹی اُٹھا کر اس کو رگڑا۔ کئی کناروں اور کئی حصّوں کو کسوٹی پر گھسنے کے بعد اس نے چھپکا ڈبیہ میں رکھتے ہوئے روکھی ہنسی سے صفو کی طرف دیکھا۔

"کیوں ہنسی کرتی ہو بٹیا۔"

صفو پر بجلی سی گری۔ "کیا مطلب؟"

"یہ تو امیٹیشن ہے پکا امیٹشن۔ ایک روپے کا بھی نہیں۔"

وہ جب گھر پہونچی تو اس نے دیکھا اچھے بھائی نبی کے سرہانے کھڑے تھے اور ڈاکٹر اپنا چرمی بکس بند کر کے واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

دنیا کو ایٹمی جنگ سے بچانے میں نہرو کا عظیم حصّہ

لبنان کے اخبار 'النّہور' نے اپنی حالیہ اشاعت میں پنڈت جواہر لال نہرو کی عدم وابستگی کی پالیسی اور دنیا کو ایٹمی جنگ کے خطرات سے بچانے کی کوششوں کو شاندار الفاظ میں سراہا ہے۔ اس سلسلے میں پنڈت نہرو کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے اخبار مذکور نے لکھا ہے کہ،

گاندھی جی نے برت رکھ کر، گھر کا بنا ہوا کپڑا پہن کر اور خاموش احتجاج کے ذریعہ برطانوی نوآبادکاروں کی فوجی قوّت کا مقابلہ کیا اور اس طرح ملک کو آزاد کرایا۔ نہرو نے چینی جارحیت کا مقابلہ ہتھیاروں سے کیا۔ کیوں کہ ان کے سامنے اپنے ملک کی آزادی کا تحفّظ کرنے کا یہ واحد راستہ تھا۔ یہ وہی آزادی تھی جو امن کے دیوتا نے حاصل کر کے ملک کو دی تھی۔

پنڈت نہرو دنیا کی ممتاز ترین ہستیوں میں سے ایک ہیں۔ دانائی، ظاہری اور باطنی خوبیوں، انسان دوستی اور بعض قدروں پر یقین کی بدولت انھیں دنیا کے عظیم لوگوں کی صف میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں اس پر تعجّب نہ ہونا چاہیئے کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے ملکوں نے حتّٰی کہ روس نے بھی انھیں کمیونسٹ چین کے حملے کو پسپا کرنے کے لئے مدد کی پیش کش کی ہے۔ تاریخ میں ان کا نام یقیناً سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا کیوں کہ وہ عدم وابستگی کی پالیسی کے زبردست حامی رہے ہیں اور افریقی ایشیائی ممالک کی ایک غیر جانب دار قوت، جسے دنیا کی تیسری قوت کا نام دیا جا سکتا ہے، کا قیام انھیں کا مرہونِ منّت ہے۔ ان افریقی ایشیائی ممالک نے مشرقی اور مغربی دونوں بلاکوں کو یعنی روس اور امریکہ کو اپنی قوت کا احساس کرا دیا ہے۔ دنیا اس تیسری قوت کی کافی حد تک زیر بار احسان ہے جس نے دنیا کو ایٹمی جنگ سے بچانے میں عظیم رول ادا کیا ہے ورنہ یہ جنگ دنیا میں کسی کو زندہ نہ چھوڑتی۔

تخت سنگھ

اندیشہ

مرے کلام میں افکار کی خزاں ہے ابھی
لٹا لٹا سا تصوّر کا گلستاں ہے ابھی
دل و دماغ پہ طاری ہے بے بسی کا جمود
مسرّتوں کی پری مجھ سے بدگماں ہے ابھی

شبِ خیال میں حل غم کا نور ہے ایسے
خزاں کی رات میں کاتک کی چاندنی جیسے
سماں محیط ہے ہوش و حواس پہ ہُو کا
خموشیوں کی مسلسل دبی دبی لے سے

سوادِ یاس میں بجھتی ہوئی امیدوں سے
نواحِ قلب میں رقصاں سنہری شام سی ہے
شعور چاک پھٹے ابر کے گریباں سا
نگاہ خونِ تمنّا سے سُرخ فام سی ہے

دمک رہے ہیں جواں حسرتوں کے کانوں میں
الم بدوش پشیمانیوں کے آویزے
ہیں ریگ زارِ خلش کے تڑپتے ذرّے جنھیں
جہاں سمجھتا ہے الماسِ فکر کے ریزے

کڑے نظام کے دھارے کی بھوکی لہروں پہ
جلا جلا کے دیے چُن رہا ہوں خوابوں کے
یہ ولولے ہیں کہ دھڑکن کی چلبلی رُو میں
نقوش بنتے بگڑتے ہوئے حبابوں کے

اداس من کی فضاؤں میں من کے منصوبے
بھٹکتے پھرتے ہیں بے آب بادلوں کی طرح
بکھر چکے ہیں خرد کے افق تک اندیشے
غم و ہراس کے جذبوں پہ کاجلوں کی طرح

بہت قریب ہے رُت روح کے زمستاں کی
فسردہ اور بھی طبعِ حیات ابھی ہوگی
بڑھے گی اور بھی زخمِ جگر کی ٹیس ابھی
مہیب اور بھی آفت کی رات ابھی ہوگی

مرے ہنر کی، مرے فن کی جھلملاہٹ پہ
نہ جانے برف سی جم جائے کب دھندلکوں کی
نہ جانے سوچ کی ننھی تپش پہ کر ڈالے
سکوت چھاؤں سی کب سرد سرد پلکوں کی

نگاہ و فکر کی یخ بستگی کے بوجھ تلے
نہ جانے کب مرے جوہر کا شہد جم جائے
ٹھٹھر کے جانے کب ان وسوسوں کی ٹھنڈک سے
رگوں میں زیست کی سُرخ آبشار تھم جائے

نہ جانے اور بھی گزرے گی جان پر کیا کیا
مری طویل شبِ غم کا انت ہونے تک
میں سوچتا ہوں بہ قیدِ حیات بھی ہوں گا
مرے رفیق میں سکھ کی بسنت آنے تک

من موہن تلخ

ہاتھی اور قدیم ہندوستانی فن

ہندوستان کی فنی تاریخ کے آغاز ہی سے ہندوستانی فن کاروں نے حیوانات اور جانوروں کی زندگی کے مختلف اور گوناگوں پہلوؤں کو کمال کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر اُتارا ہے۔ فنونِ لطیفہ کے مستند مغربی نقّاد ہندوستانی فن کار کے اس رجحان پر جہاں عش عش کر اُٹھے ہیں وہاں ان لوگوں نے ہندوستانی فن کار کی نفسیاتی گہرائیوں میں جاکر یہ جاننے کی کوشش بھی کی ہے کہ آخر ہندوستانی فن کار کی تخلیقی قوّتوں کو اس نیچرل زندگی نے کیوں کر تحریک دی۔

اس سوال کو جاننے کے لئے — اور اس کا مناسب اور صحیح جواب حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ فن کار کی ملکی اور قومی روایات کو پیشِ نظر رکھا جائے اور پھر کسی ملک کے مذہبی ادب اور قومی رسم و رواج میں قدرت کی اس تخلیق کو کیا مقام حاصل رہا ہے یہ جاننا بھی بہت ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کیا قدیم اور کیا جدید، ہندوستانی فن کار کے دماغ میں انسانی اور حیوانی دنیا نام کے کوئی دو الگ الگ خانے نہیں ہیں۔ اور پھر ہندوستانی فن کار قدرت کو اصل اور حقیقی روپ میں پیش کرنے کا شروع ہی سے متجسس رہا ہے۔ ہندوستان کے سنگیت کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ تمام تر سنگیت میں نیچر کی پرستش کی لہریں تھرکتی ہوئی صاف محسوس ہوتی ہیں۔ ویدوں میں قدرت کی پوجا کی گئی ہے۔ ہندو دھرم کے شاستروں اور ادبی تصنیفات میں بے زبان جانداروں کا جگہ جگہ ذکر ملتا ہے۔

آپ بھولے ناتھ مہادیو شو کی کسی بھی تصویر کا تصوّر ناگوں کے بغیر کر ہی نہیں سکتے۔ وشنو بھگوان بھی بہت بڑے سانپ پر نیم دراز نظر آتے ہیں۔ بھگوان گنیش کو چوہے کی سواری کرتے دکھایا جاتا ہے اس طرح رامائن اور مہا بھارت یگ میں گرڑ — بندر اور بیسیوں دیگر جانداروں کا ذکر آتا ہے۔ شکتی کی اوتار درگا ماں کی سواری شیر ہے۔ بھگوان کرشن کے متعلق کوئی واقعہ گائے کی تصویر کے بغیر ناممکن ہے۔ ہماری دھارمک کتھاؤں میں اس کہانی کو بہت اہمیت حاصل ہے کہ جب ایک مگرمچھ نے گجراج (ہاتھی) کا پاؤں اپنے جبڑوں میں پکڑ لیا تھا تو بالآخر بھگوان وشنو کو ہاتھی کی جان بچانی پڑی تھی۔

مندرجہ بالا سطور میں آپ نے دیکھا ہی ہوگا کہ ہماری دھارمک اور تمدّنی کہانیوں میں کتنے ہی حیوانوں اور دیگر جانوروں کا ذکر آیا ہے۔ سانپ، اجگر، گرڑ، بندر، چوہا، شیر، گائے، مگرمچھ، ہاتھی وغیرہ۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب فنونِ لطیفہ کے مغربی نقّاد کسی پرانے دور کی ہندوستانی تصویر یا پتھّر کی مورتی میں اس غیر انسانی دنیا کی بھرپور عکاسی اور نمائندگی دیکھتے ہیں تو وہ حیران رہ جاتے ہیں۔ لیکن اس دھرتی کے باسی کے لئے ہندوستانی فن کا یہ پہلو قطعی حیرت انگیز نہیں ہے اور اس کے تمدّنی اسباب کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں بلکہ ہمارے لئے تو یہ بات حیرت انگیز ہوگی کہ شو بھگوان بغیر کسی سانپ کے پیش کئے جائیں۔ کسی تصویر میں کرشن کو بانسری بجاتے ہوئے دکھایا جائے اور پاس ہی بڑی معصومیت سے گائے کا کوئی بچھڑا نظر

نہ آئے اور بانرسینا کا ذکر نہ کیا جائے اور ہاں گیند کو دریا سے نکالتے ہوئے کرشن کا شیش ناگ کو نتھ لینے والا واقعہ حذف کر دیا جائے تو ہم لوگ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

یہ تو اپنی اپنی مٹی اور اپنے اپنے خمیر کی بات ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی واضح کر دینا چاہوں گا کہ ہر مذہبی اور تمدنی روایت یا کتھا تخلیقی فن کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ مثلاً آپ نے بیسیوں ہندوستانی مصوروں کی نمائش دیکھی ہوں گی۔ کہیں آپ کو پورے کینوس پر بندر یا چوہا یا شیر یا سانپ یا گائے یا مگرمچھ نظر آیا ہے؟ حیوانی دنیا کے یہ جانور ہماری دھارمک کتھاؤں میں آنے والے پھر ہماری زندگی کا جیسے ایک جزو بن گئے۔ ہم نے انھیں قبول کر لیا۔ اور پھر جو جانور ہماری روزمرہ زندگی میں رچ بس جاتے ہیں وہ کسی فنی تخلیقی جذبے کے محرک نہیں بنتے۔

ہندوستانی فن کے دو شعبوں نے اس حیوانی دنیا کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ مصوری اور سنگ تراشی، اور دونوں ہی میں جس کمالِ فن، شدت اور کثرت کے ساتھ ہاتھی کے تصور کو پیش کیا گیا ہے اور کسی جانور کو پیش نہیں کیا گیا اور ہندوستانی مصوری اور سنگ تراشی کا انتہائی سنجیدگی سے مشاہدہ کرنے والے محققین میری اس رائے کی تائید کریں گے کہ ہاتھی کو پیش کرتے وقت ہندوستانی فن کاروں نے نہ صرف اپنے فن کو عروج پر پہنچایا ہے بلکہ ہاتھی کو ہمارے لئے ایک عجیب حیرت انگیز جانور بنا کے رکھ دیا ہے اور پھر کچھ مورتیوں اور تصویروں میں تو ہاتھی کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ہم تصویر کی داد دینا تو بھول جاتے ہیں نہ جانے کیوں ہمیں ہاتھی بہت ہی پیارا جانور محسوس ہونے لگتا ہے۔ ہماری تمام تر ہمدردیاں اس کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہیں گویا پالتو جانور ہو۔ یوں جان پڑتا ہے جیسے یہ تصویر ابھی بول پڑے گی اور یہ ہاتھی اپنے بڑے بڑے کان ہلا کر، سونڈ کو ذرا سا اوپر اٹھا کر کہے گا "سواری کرو گے؟" میں ان تصویروں پر آگے چل کر بحث کروں گا۔ اس وقت تو مجھے بے ساختہ ایک واقعہ یاد آ گیا ہے۔

کئی برس پہلے ایک بار میں ہندوستانی فن کے ایک بالغ نظر نقاد اور ہندوستانی سنگیت کے سچے پجاری دیویک کے ہمراہ کسی چڑیا گھر میں گیا تھا۔ وہاں ایک ہاتھی بڑی مستی میں جھوم رہا تھا۔ جھوم رہا تھا۔ ڈول یوں رہا تھا کہ اس کے چاروں پاؤں لوہے کی بہت بھاری زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور وہ اسی جگہ پر کھڑے کھڑے جھول رہا تھا۔ اور اپنی ترچھی آنکھوں سے ہمیں بھی مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ دیویک کچھ دیر تو وہاں کھڑا رہا پھر آلتی پالتی مار کر ہاتھی اور اپنے درمیان ایک معقول فاصلہ قائم کر کے بیٹھ گیا۔ مجھے اس کی دُھن سمجھ میں نہ آئی اور میری سوالیہ نظروں کا مطلب دیویک بخوبی سمجھ گیا تھا۔ بڑے زور سے ہنس کر بولا: "تلخ! تم نے غالباً قدیم آرٹ کا اتنا گہرا مطالعہ نہیں کیا۔ ورنہ ابھی تک آگے چلنے کے بے انداز میں یوں نہ کھڑے رہتے۔"

میں اس وقت تو دیویک کے اس جملے کی گہرائی کو نہ پا سکا تھا لیکن اس مضمون کو لکھتے وقت جب میں نے واقعی قدیم آرٹ کا بغور مطالعہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس وقت میں نہ صرف ہاتھی کے اس مخصوص انداز میں جھومنے کے لطف سے محروم رہا تھا بلکہ ان ہزار دل ہندوستانی فن کاروں کی کاوش کی داد بھی نہ دے سکا تھا جنھوں نے ہاتھی کے جھومنے کی ایک ایک ادا کو تصویروں اور مورتیوں میں منہ بولتا روپ عطا کر دیا تھا۔

مصوری اور سنگ تراشی کے علاوہ ہندوستان کی غالباً سبھی زبانوں کے ادب میں سنسکرت اور ہندی (قدیم) ادب میں بھی ہاتھی کا ذکر بار بار مختلف پیرایوں میں کیا گیا ہے۔ اور پھر جو کان اس واقعی صحیح ہندوستانی جانور کو محض موٹی عقل کا جانور ہی سننے کے عادی ہو چکے ہیں انھیں ہاتھی سے متعلق انتہائی لطیف و نازک تشبیہوں سے آشنا کرانے کی سعی ریت پہ دودھ گرانے کے مترادف ہے۔ مثلاً ہمارے قدیم ادب میں ایک خوبصورت عورت کی چال کو ہاتھی کے آہستہ آہستہ جھومنے سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ اس کے لئے ہندی ادب میں ایک خاص اصطلاح بھی موجود ہے — گج گامنی۔ ہندی کے ممتاز شاعر کرن نے موسم گرما کی آمد کو غصے میں پاگل ہاتھی کے حملے سے تشبیہہ دی ہے۔

ہندو شاستروں میں ہاتھی کے وجود میں آنے سے متعلق دو

الگ الگ کہانیاں موجود ہیں۔ ایک کہانی کے مطابق جب دیوتا لوگ سمندر کا منتھن کر رہے تھے تو دودھ جیسا سفید ہاتھی ان چند نادر عجوبوں میں سے ایک تھا جو کہ سمندر سے برآمد ہوئے تھے۔ اس ہاتھی کو ہندو شاستروں میں ایراوت کہا گیا ہے اور یہ اندر دیوتا کی سواری ہے۔ دوسری کہانی یہ ہے کہ جس انڈے کے خول سے گرڑ کا جنم ہوا تھا۔ برہما نے اس خول کے دونوں حصے اٹھا لئے تھے اور ان سے ایراوت کی تخلیق کی (اس دوسری کہانی کے مطابق برہما کے ساتھی کا نام ایراوت ہے) برہما نے ایراوت کے علاوہ سات اور حصّوں کی تخلیق کی۔ ہمارے شاستروں میں ان آٹھ حصّوں کو 'دگ گج' کا نام دیا گیا ہے۔ پھر برہما نے ان میں سے چار حصّوں کو تو پائے کے طور پر اس کائنات کے نیچے ٹکا دیا اور باقی کے چار ان چاروں پاؤں پر ٹکا دئے۔ اس کہانی کی رُو سے ہمارے قدیم تمدّنی ادب میں ہاتھی کے لئے سہارا دینے والا یا ستون کا تصوّر قائم ہوا۔

اب آپ اس کہانی کو دماغ میں رکھیے اور کیلاش اور ایلورا کے مندروں کی ساخت کا تصوّر کیجئے۔ ان کے دیو قامت ستونوں اور ان ستونوں پر ٹکی ہوئی منقش چھتوں کے انداز تعمیر کا تصوّر کیجئے تو آپ کو اس کہانی کی سچائی پر خواہ مخواہ یقین آنے لگے گا۔ کیلاش اور ایلورا کے مندروں کے لئے ممتاز مغربی نقاد ہیلین میک کریگ جو لکھ گئے ہیں اس سے زیادہ اور کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ آپ لکھتے ہیں "یہ دو مندر آخر کار اس کائنات کی ایک چھوٹے پیمانے کی عکاسی ہی تو ہیں۔" ان کے اصل لفظ یہ ہیں:۔

They are after all universes in miniature.

ہندو سماج میں ہاتھی کو خوش حالی اور دولت کی علامت بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کا سبب ہیں ہماری پورانک اور دیوی دیوتاؤں کی کہانیاں۔ آپ نے دھن دولت کی دیوی لکشمی کی تصویر میں دیکھا ہوگا کہ دو ہاتھی اپنی اپنی سونڈ میں ہار لئے کھڑے ہیں۔ لیکن ہندو سماج میں دیوی دیوتاؤں کی کہانیوں کے علاوہ کچھ قدرتی اسباب کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ یعنی ہاتھی کے ساتھ آپ کے دماغ میں کس چیز کا تصوّر آتا ہے — بہتے دریا کا — گھنے جنگلات کا — بہتا دریا — یعنی کبھی نہ سوکھنے والا ذخیرہ اور دریا ہی کی رعایت سے ہندوستانی فن کاروں نے ہاتھی کے ساتھ کنول کے پھول کو بھی وابستہ کر دیا۔ یہ سب باتیں — یعنی دریا — جنگل — کنول کا پھول زرخیزی کی علامت ہیں — اور جہاں زرخیزی ہوگی وہاں دولت ہوگی — خوشحالی ہوگی۔ لہٰذا ہندوستانی معاشرے میں ہاتھی کو زرخیزی کی علامت بھی تسلیم کر لیا گیا۔ غالباً اسی وجہ سے دھن دولت کی دیوی لکشمی کے ساتھ ہاتھی کو دکھایا جاتا ہے۔ اور چونکہ ہاتھی ہمارے قدیم معاشرے کی نگاہ میں خوش حالی کی علامت تھا لہٰذا ہمارے فن کاروں نے ہاتھی کی تصویروں کو عجب انداز میں سجا کر پیش کیا۔ ماتھے تک پھولوں کے ہاروں سے ڈھکا ہوا۔ گلے میں سونے کی زنجیریں لٹکتی ہوئیں۔ پیٹھ پر زرّیں اور منقش لبادہ اوڑھے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ سونڈ پر طرح طرح کے رنگوں سے بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں اور کانوں کے دونوں طرف گھنٹیاں لٹک رہی ہیں۔

جس معاشرے کی طرزِ زندگی جیسے ہوتی ہے اس کے فن میں ویسے ہی نقش و نگار نظر آئیں گے۔ یہ ایک مسلّمہ امر ہے۔ قدیم ہندو معاشرے میں (اور آج کے بھی) زندگی ایک عجیب خوب صورتی سنگیت اور گہما گہمی کا نام رہی ہے۔ لہٰذا اس زندگی سے وابستہ جتنی بھی چیزیں تھیں ان میں اسی زندگی کی روپ ریکھا ابھاری گئی۔ آپ اگر میری اس رائے سے متفق نہ ہوں تو صاحب مجھے کہیں بھی ٹنڈ منڈ سے ہاتھی کی کوئی فنی تصویر دکھا دیجئے۔ ہندو معاشرہ تاریخ کے ہر دور میں خوشحال ہی نہیں رہا۔ لیکن نہ جانے اس معاشرے میں کب کی زندگی کا نشہ رچا بسا ہوا تھا کہ سنگار کے بغیر کسی تمدّنی فنی شاہکار کا کہیں وجود ہی نہیں ہے۔

خیر — یہ تو ہمارے اساطیر (مائتھالوجی) اور قدیم سماج کی باتیں تھیں۔ مائتھالوجی کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کو حقیقت سے کوئی نسبت نہ ہو۔ جو محض پرواز تخیّل کا نتیجہ ہو۔ لہٰذا یہ روپ رنگ یہ بناؤ سنگار جتنا بھی تصویروں اور مورتیوں میں دکھا دیا جاتا کم تھا۔ لیکن اس کا کیا کیجئے کہ ہاتھی کی سائنٹفک ابتدا کی کہانی بھی اتنی ہی رنگین ہے۔

ہاتھی کی اصل ابتدا — میری مراد ہے سائنٹیفک ابتدا — کب اور کہاں ہوئی اس کے متعلق علم الحیوانات کے ماہرین کی متفقہ رائے یہ ہے کہ دراصل ہاتھی کی پیدائش افریقہ میں ہوئی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ جانور دنیا کے ہر خطے میں ملنے لگا۔ ہاں آسٹریلیا اور قطب جنوبی کے کئی علاقے اس جانور سے محروم رہے۔ علم الحیوانات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ہاتھی کی ۳۰۰ مختلف قد و قامت کی نسلیں تھیں۔ یہ بات ہزاروں برس پہلے کی ہے۔ رفتہ رفتہ ہاتھی کی نادر ترین نسلیں ختم ہوتے ہوئے ناپید ہوگئیں اور آج محض افریقہ اور چند ایشیائی ممالک کی نسلیں موجود ہیں۔

ہندوستانی ہاتھی کی آج بھی کئی نسلیں ہیں اور ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ افریقہ کا ہاتھی ہندوستانی ہاتھی سے بالکل ہی الگ نسل کا ہے۔ افریقی ہاتھی ہندوستانی ہاتھی کے مقابلے میں بہت بڑا ہے۔ اور ہندوستانی ہاتھی جتنا خوب صورت اور دل کش ہے افریقی ہاتھی اتنا ہی بدصورت اور بھدا ہے۔ اور فطری طور پر لڑاکو اور خونخوار بھی زیادہ ہے۔

نہ جانے ہاتھی کو موٹی عقل کا جانور کہنے کا رواج کب سے اور کیوں پڑا تھا جبکہ حقیقت اس کے عین برعکس ہے۔ میں یہ لکھ کر کوئی مضمون لکھنے کا جواز نہیں پیدا کر رہا۔ کیوں کہ ہاتھی کی عقل کیسی ہے اس کا راقم الحروف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تو صرف حقائق پیش کروں گا اور فیصلہ آپ کے ذوقِ سلیم پر چھوڑ دوں گا۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسان نے آج سے ہزاروں برس پہلے بھی ہاتھی کو سدھایا ہے اور اس سے باربرداری کا کام لیا ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں موہنجو داڑو تہذیب کے تاریخی آثار سے ملا ہے۔ موہنجو داڑو تہذیب کی ایک مہر میں سدھائے ہوئے ہاتھی کو دکھایا گیا ہے اور اس کی پیٹھ پر سامان رکھنے کی کوئی باقاعدہ چیز بنی ہوئی ہے۔ دوسری صدی قبل از مسیح کے زمانے کی ایک اور پتھر کی مورتی میں ہاتھی کو کسی دروازے سے باہر نکلتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور اس پر ایک مہاوت سوار ہے۔ اسی طرح دوسری صدی بعد از مسیح کے زمانے کی تانبے کی ایک بے نظیر مورتی کولھاپور میں آج بھی موجود ہے۔ اس مورتی میں ہاتھی اپنے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھا ہوا ہے اور چار اشخاص اس پر سوار ہیں۔

سانچی کے عظیم استوپ میں ہاتھی کے بیسیوں روپ پتھروں میں اُبھارے گئے ہیں۔ وہ خاص طور پر میدانِ جنگ میں دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے ہاتھیوں کی مورتیاں تو واقعی دیدنی ہیں۔ ایک مورتی میں دکھایا گیا ہے کہ بہت بڑے بڑے بند دروازوں کو جنگی ہاتھی اپنے ماتھے کی قوت سے توڑنے میں مصروف ہے۔ دروازوں کے اوپر دیواروں سے بھی فوجی تیر برسا رہے ہیں اور نیچے سے بھی تیروں کی بارش ہو رہی ہے۔ اور جو ہاتھی گھیرے میں آئے ہوئے شہر کے بند دروازوں کو توڑنے میں مصروف ہیں ان کا پوز سنگ تراشوں نے اس خوب صورتی سے پتھروں پر ابھارا ہے کہ اگلی دونوں ٹانگیں آگے کو قدرے جھکی ہوئی ہیں۔ مہاوت نے اپنا بلّم ان کے کان میں گاڑ رکھا ہے۔ ہودہ پر بیٹھا ہوا فوجی کمان سے تیر چھوڑ چکا ہے اور ہاتھی کی پچھلی دو ٹانگیں ۸۰ ڈگری کے زاویے پر جیسے آگے کو بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں۔

ہندوستانی فن مصوری اور سنگ تراشی میں ہاتھی کی جتنی بھی تصویریں بنائی گئی ہیں سانچی کے فن کاروں کی تصویریں سب پر سبقت لے جاتی ہیں۔ سانچی کے بعد پتھروں پر ہاتھی کی تصویریں بنانے میں دوسرا نمبر ہے کارلے کی چیتنہ غاروں کا۔

اب اگر میں یہ بھی بتانے لگوں کہ ہاتھی کتنا بڑا جانور ہے تو آپ ہنس دیں گے۔ لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہاتھی کی جسامت، قد و قامت، جنگی افادیت اور دیگر باتوں کے پیشِ نظر ہاتھی کو تہذیبی زندگی کا جزو بنانے کا اعزاز راجاؤں مہاراجوں کو حاصل رہا ہے۔ اور رفتہ رفتہ محلوں کے احاطوں میں ہاتھی باندھنے کا رواج اس قدر بڑھ گیا کہ جس مہاراجہ کے پاس زیادہ ہاتھی ہوتے تھے اس کی شان و شوکت کے دُور دُور تک چرچے ہوتے تھے۔ اور پورس کے زمانے تک بھارت کی جنگی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جس مہاراجہ کی فوج میں جتنے زیادہ ہاتھی ہوتے اس کی فوجی طاقت کا اتنا ہی لوہا مانا جاتا۔ اور پھر ہاتھی رؤسا اور مہاراجوں کی شان و شوکت

کا اس طرح لازمی جزو بن گیا کہ ہاتھی کی مختلف نسلوں کو ایک دوسرے پر ترجیح دی جانے لگی۔ گورے یا سفید رنگ کا ہاتھی اگر کسی مہاراجہ کی سواری ہے تو پھر اس کے ٹھاٹھ کے کیا ہی کہنے۔ سفید ہاتھی کو اس قدر ترجیح کیوں دی گئی؟ اس کا صحیح جواب تا حال نہیں مل سکا۔ ہاں ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ ہماری دھارمک کتھاؤں میں اندر دیوتا سفید ہاتھی ایراوت کی سواری کرتے تھے۔ غالباً اسی لئے راجاؤں مہاراجوں میں بھی سفید ہاتھی حاصل کرنے کی ریس شروع ہو گئی۔ اور ویسے جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے بھی سفید ہاتھی باقی ہاتھیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوب صورت ہوتا ہے۔

بھگوان بدھ کے جنم کے بارے میں بھی ایک مقبول عام کہاوت یہ ہے کہ بھگوان بدھ ایک سفید ہاتھی کے روپ میں اپنی ماتا کے بطن میں جلوہ گر ہوئے تھے۔ سفید ہاتھی کے متعلق یہ روایت بھی بہت مشہور ہے کہ اس میں بارش لانے کی روحانی شکتی ہوتی ہے اور ہماری قدیم تمدنی تاریخ میں تو چکرورتی (کل کائنات کا شہنشاہ) کا لقب ہی اسے حاصل ہوتا تھا جس کے پاس سفید ہاتھی ہوتا تھا۔ سفید ہاتھی کی پانی برسانے کی روحانی طاقت کے بارے میں جاتک کتھاؤں میں ایک کہانی بہت مشہور ہے۔ اور اس خاص واقعے کو بدھ دھرم سے متعلق فنی اور تمدنی تصویروں میں بار بار پیش کیا گیا ہے۔ ان بدھ تصویروں میں ایک ایسے بودھی ستو کو مرکزی کردار بنایا گیا ہے جو کسی زمانے میں اپنی سلطنت کا شہزادہ تھا لیکن ایک بار اس کے پڑوسی ملک میں بلا کا سوکھا پڑا۔ اس رحم دل شہزادے نے بارش لانے کی روحانی طاقت رکھنے والا اپنا سفید ہاتھی اس ملک کے راجا کو دے دیا۔ اس پر اس کی اپنی رعایا نے اس شہزادے کو جلاوطن کر دیا۔

سفید ہاتھی ہی کا ذکر آ رہا ہے تو میں یہاں ایک خاص تصویر کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ تصویر بھارتیہ کلا بھون بنارس میں ہے اور مغل دور کی تصویر ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس مغل دور سے شہنشاہ اکبر کے آخری زمانے سے مراد ہے یا شہنشاہ جہانگیر کے ابتدائی زمانے سے۔ بہرصورت اس تصویر میں سفید ہاتھی کو سونے کی زنجیروں، سونے کی گھنٹیوں، کمخواب کی چادر، زرّیں پوشاک اور زیورات سے آراستہ و پیراستہ دکھایا گیا ہے۔ یہ ہاتھی ایک شامیانے کے نیچے کھڑا ہے اور دو سرمئی رنگ کے ہاتھی اس کے دائیں بائیں بطور باڈی گارڈ کھڑے ہیں۔ ایک گھوڑا ہے اور ایک اونٹ ہے۔ تصویر کے مزاج سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سفید ہاتھی کو شاہی سواری کے لئے سجایا گیا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ جنگ میں ہاتھی کو کب اور کس دور سے فوج کا جزوِ اہم بنایا گیا، اس کے متعلق پورے وثوق سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ چندر گپت موریہ نے سیلوکس کو کئی ہندوستانی جنگی ہاتھی دیئے تھے۔ پورس کی فوج میں بھی ہاتھیوں کا ایک منظم دستہ تھا۔

بارہوت، سانچی، امراوتی اور کئی دیگر قدیم مقامات کے فنی مقامات کے فنی شاہکاروں کا مشاہدہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہاتھی کو جنگی مناظر میں بکثرت اور بار بار پیش کیا گیا ہے۔ کونارک کے مشہور مندر کے بڑے دروازے کے عین بعد ہی پتھر کی ایک دیو قامت ہاتھی کی مورتی آج بھی اپنے تمام تر فنی کمال اور جاہ و جلال کے ساتھ موجود ہے۔ اس تصویر میں ایک غضب ناک ہاتھی کو اپنی سونڈ میں دشمن کو لپیٹ کر کچلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ہاتھی کی جنگی افادیت کے قائل نہ صرف ہندو مہاراجے ہی تھے بلکہ غیر ملکی حملہ آور بھی ہاتھی کی جنگی طاقت کے معترف تھے۔ اسے جنگی درندے کا لقب دیا گیا۔ ابوالفضل نے ایک جگہ لکھا ہے: — "ایک جنگی ہاتھی پانچ سو گھوڑوں کے برابر ہے۔ اور اگر اس کے دائیں بائیں دس پندرہ باکمال (؟) کو فوجیوں کا دستہ بھی موجود ہو تو پھر وہ جنگی ہاتھی روایتی انداز کے ایک ہزار گھوڑ سوار فوجیوں کے برابر ہے۔" ابوالفضل کے الفاظ میں:— جسامت اور طاقت کے لحاظ سے ہاتھی ایک پہاڑ کی مانند ہے اور بہادری اور غیض و غضب کے نقطۂ نگاہ سے شیر کی مانند ہے۔"

شہنشاہ اکبر کو ہاتھیوں کا بہت شوق تھا۔ اس نے ہاتھیوں کو پکڑنے اور سدھانے کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے تھے۔ ابوالفضل

نے ان تمام باتوں کا آئینِ اکبری میں تفصیل سے ذکر کیا ہے اور غالباً ابوالفضل کے بیان ہی سے متاثر ہو کر مغل دور کے مصوّروں اور سنگتراشوں نے جنگ لڑتے ہوئے ہاتھیوں، جنگل سے پکڑے جانے والے ہاتھیوں شاہی جلوس کے ہاتھیوں کی ایسی ایسی نادر اور منہ بولتی تصویریں تیار کی ہیں کہ ہر فنی نقاد اس بات پر متفق ہے کہ جہاں تک تصویروں اور مورتیوں میں ہاتھیوں کو پیش کرنے کا تعلق ہے مغل دور کی مصوری نے ہندوستانی فنِ مصوری کو نہ صرف عروج پر پہنچا دیا بلکہ ہندوستانی فنِ مصوری کی ایک ایسی شان دار روایت قائم کر دی جو آج تک بہترین تسلیم کی جا رہی ہے۔ میں یہاں ایک غضب کی تصویر کا ذکر کرتا ہوں۔ ہاتھی پر سوار ہو کر شہنشاہ اکبر کا کشتیوں کا پُل پار کرنے کی تصویر۔

مغل دور کی مصوری کا ذکر کرتے وقت راجستھانی اسکول کی مصوری کو ہم کسی اور اسکول سے کم نہیں ٹھہرا سکتے۔ راجستھانی مصوری میں بھی جس شدّت کے ساتھ ہاتھی کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کا بھی کوئی جواب نہیں ہے۔ میں نے مضمون کے شروع میں بھگوان وشنو کے ہاتھوں مگر مچھ سے ہاتھی کی جان بچانے کا جو واقعہ پیش کیا ہے اُسے مصوری میں پیش کرنے کا سہرا صرف راجستھانی اسکول ہی کے سر ہے۔

بھارت و افغانستان کے درمیان ثقافتی معاہدہ

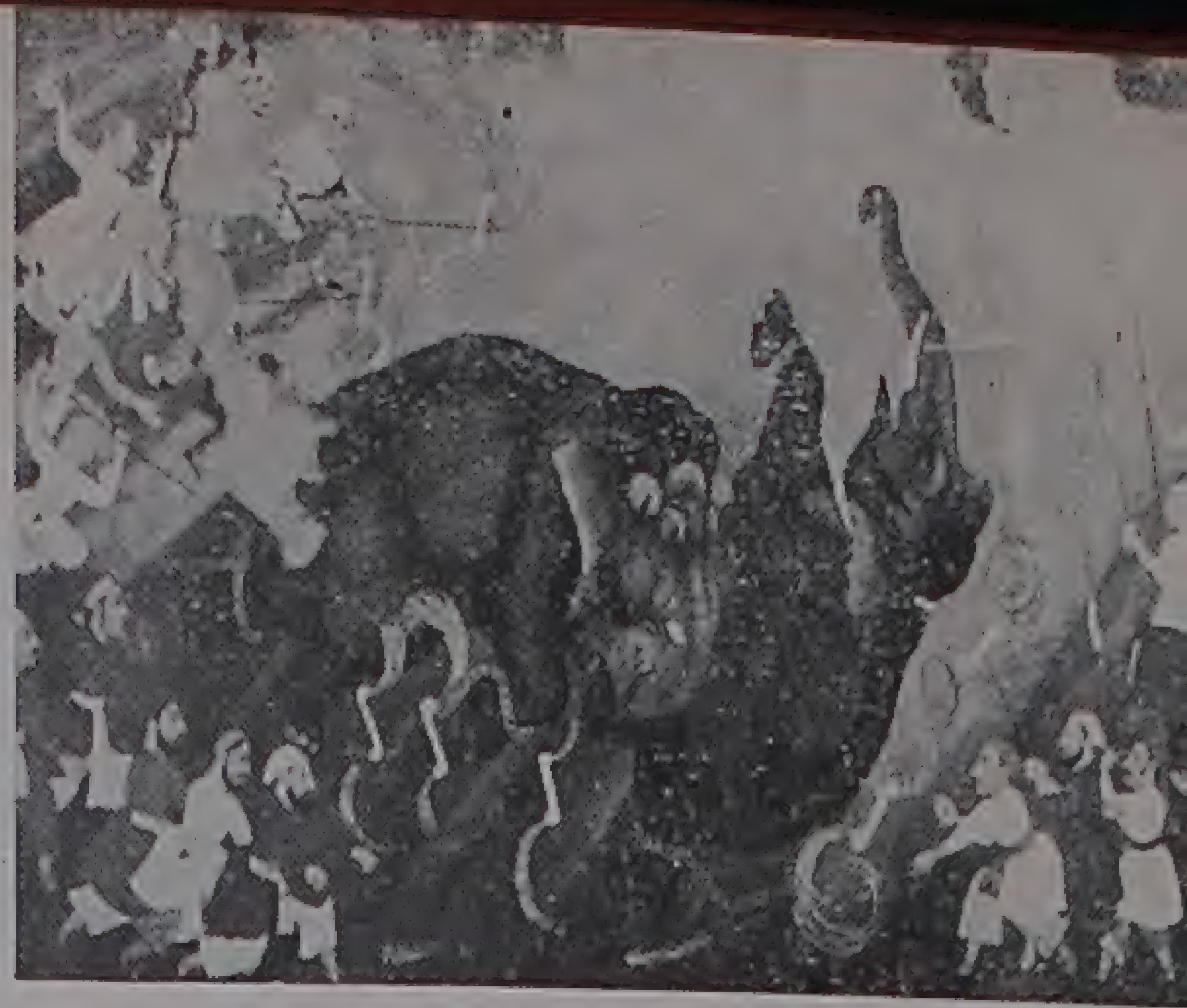
گزشتہ دنوں بھارتی وزیر برائے سائنسی تحقیقات و ثقافتی امور پروفیسر ہمایوں کبیر جنھوں نے حکومت افغانستان کی دعوت پر اس ملک کا دورہ کیا تھا، کابل میں بھارت و افغانستان کے ثقافتی معاہدے پر اپنی حکومت کی جانب سے دستخط کئے۔ افغانستان کی جانب سے وہیں کے دوسرے نائب وزیر اعظم اور وزیر تعلیم ڈاکٹر علی احمد پوپل نے دستخط کئے۔

اس معاہدے میں ۹۔آرٹیکل ہیں اور توقع ہے کہ اس سے دونوں ملکوں کے مابین تعلیم، ثقافت، فنون، اسپورٹس اور پروفیسروں و طالب علموں کے تبادلے وغیرہ کے سلسلے میں اشتراکِ عمل اور بڑھ جائے گا۔

دستخطی رسم کے ختم پر افغانی وزیر نے اس معاہدے پر مسرت کا اظہار کیا اور دونوں ملکوں کے درمیان موجودہ دوستانہ تعلقات کی مزید استواری کی تمنا کی۔

پروفیسر کبیر نے ان نیک تمناؤں کے جواب میں اپنی جانب سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ معاہدے پر عمل کی ابتداء کے طور پر بھارت بلخ، ہیر، کھدائیوں اور بامیان میں موجودہ بودھی دور کے آثار کی حفاظت کے لئے ماہرین آثار قدیمہ کی ایک ٹیم روانہ کرے گا اور مشورہ دیا کہ کیا ہی اچھا ہو گا اگر افغان یونی ورسٹی کی ہاکی ٹیم بھارت کے دورے پر آئے۔

ہاتھی اور قدیم ہندوستانی فن (مصوّری)



ہاتھیوں کی لڑائی (میواڑ اسکول، اٹھارویں صدی)



رادھا اور کرشن ہاتھی کو کھلا رہے ہیں

شہنشاہ شاہ جہان ہاتھی پر سوار، بیکانیر اسکول، سترھویں صدی) ↓







سانچی کے شمالی دروازے پر بنا ہوا ہاتھی



کونارک (اڑیسہ) کے سوریہ مندر میں بنا ہوا ہاتھی



'نیل گری کی فتح' پتھر میں تراشا گیا منظر . امراوتی



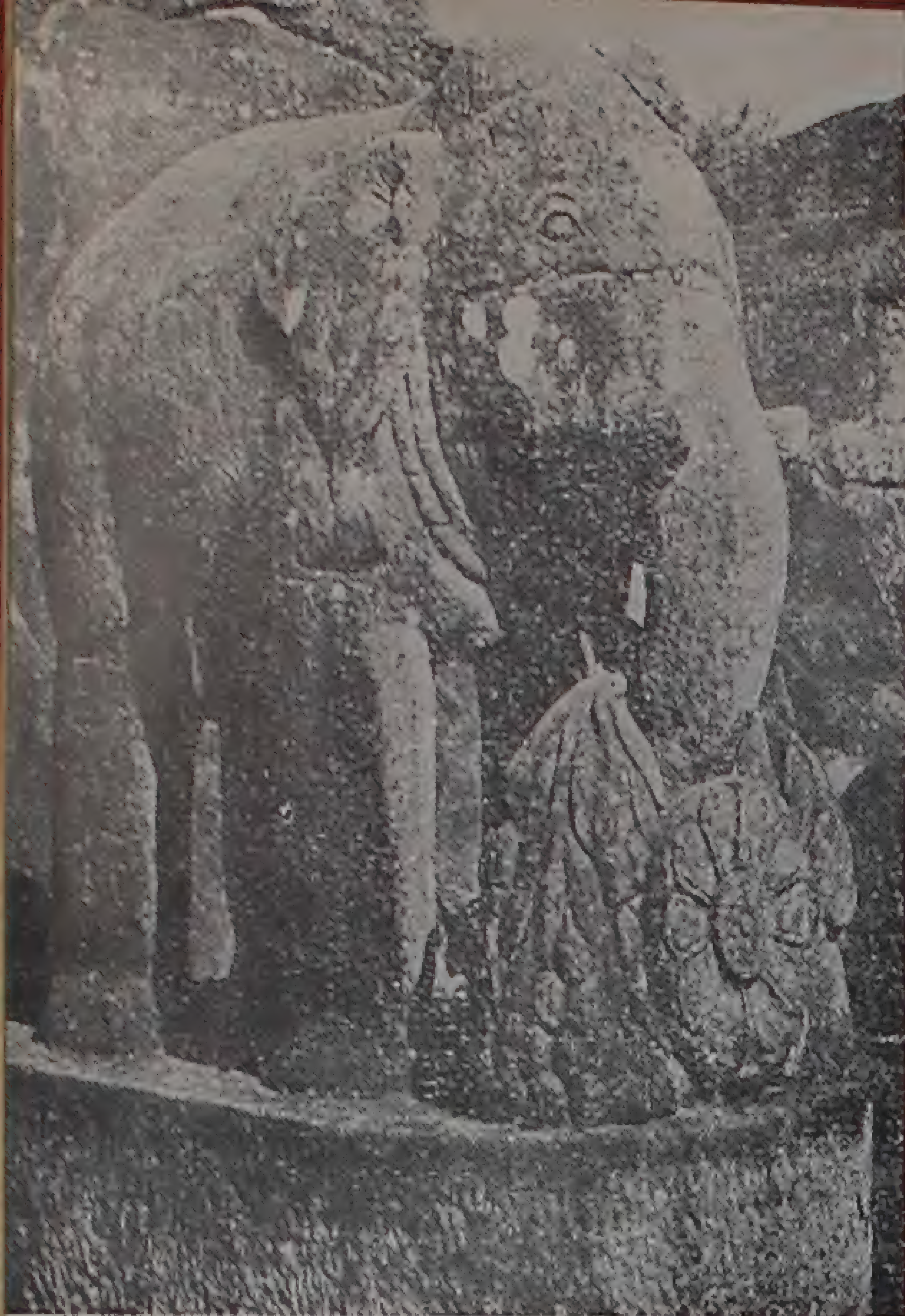
اودے گری اور کھنڈ گری کے گپھاؤں کے باہر ←
بنائے گئے ہاتھیوں کا ایک اور منظر



ہاتھی اور قدیم ہندوستانی فن (سنگ تراشی)



پتھر کو تراش کر بنایا گیا ہاتھی (اجنتا)



اودے گری میں گنیش گپھا کے باہر بنایا گیا ہاتھی

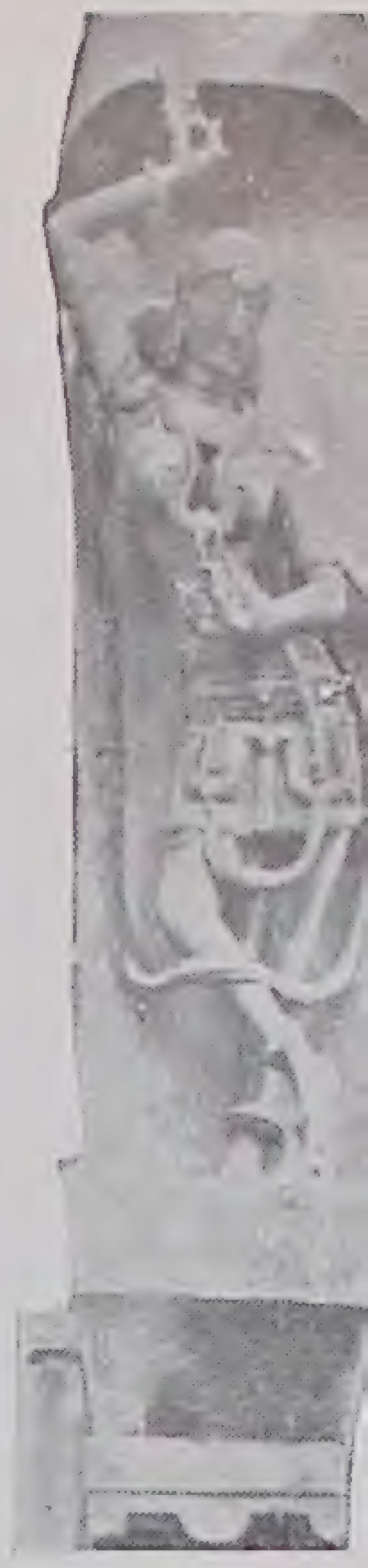


پتھر کا ہاتھی (مہابلی پورم)

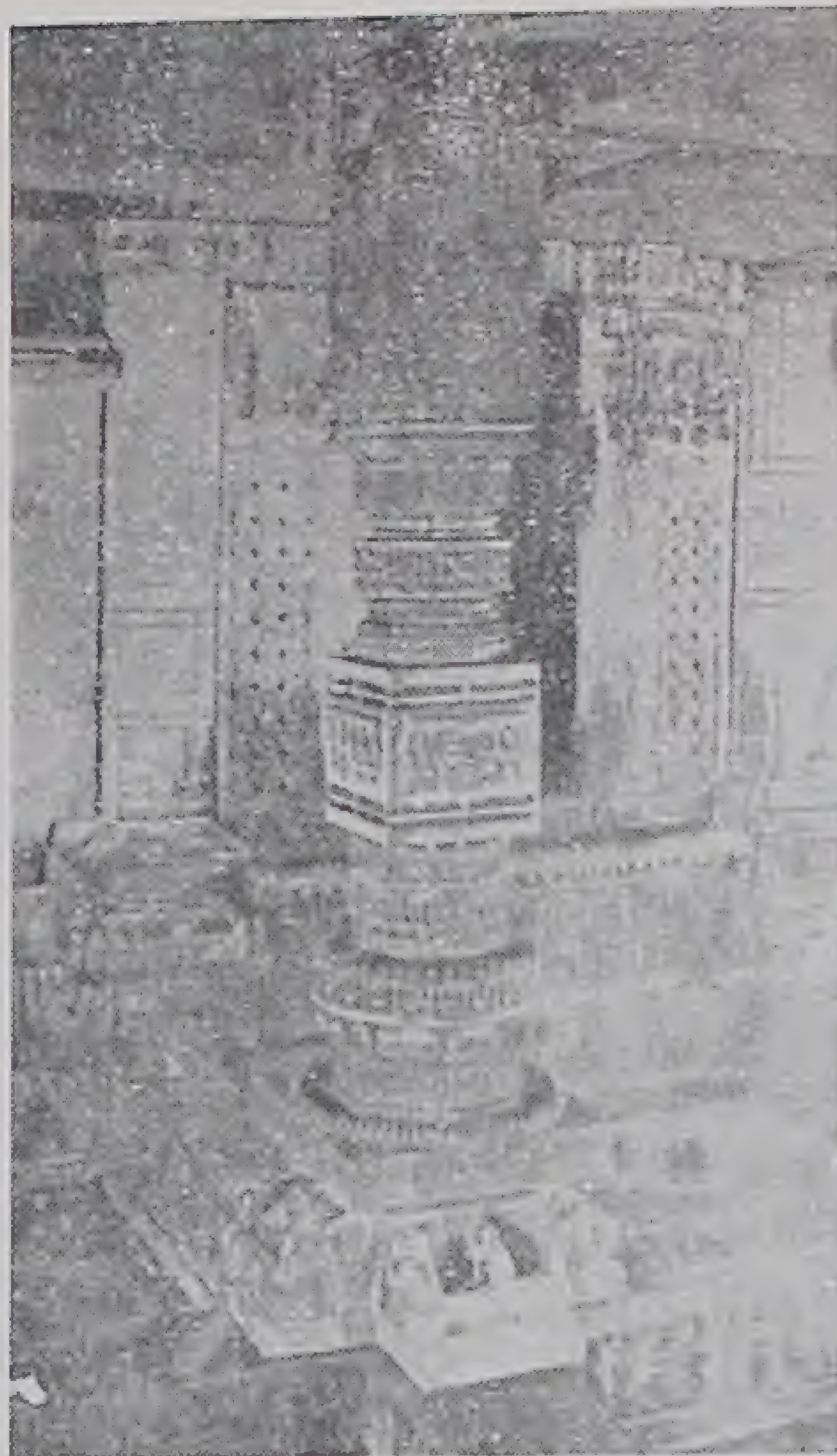
ایک استوپا کی چہار دیواری پر بنایا گیا ہاتھی (متھرا میوزیم)







مندر کے اندرونی حصے
میں بنی ہوئی مورتی



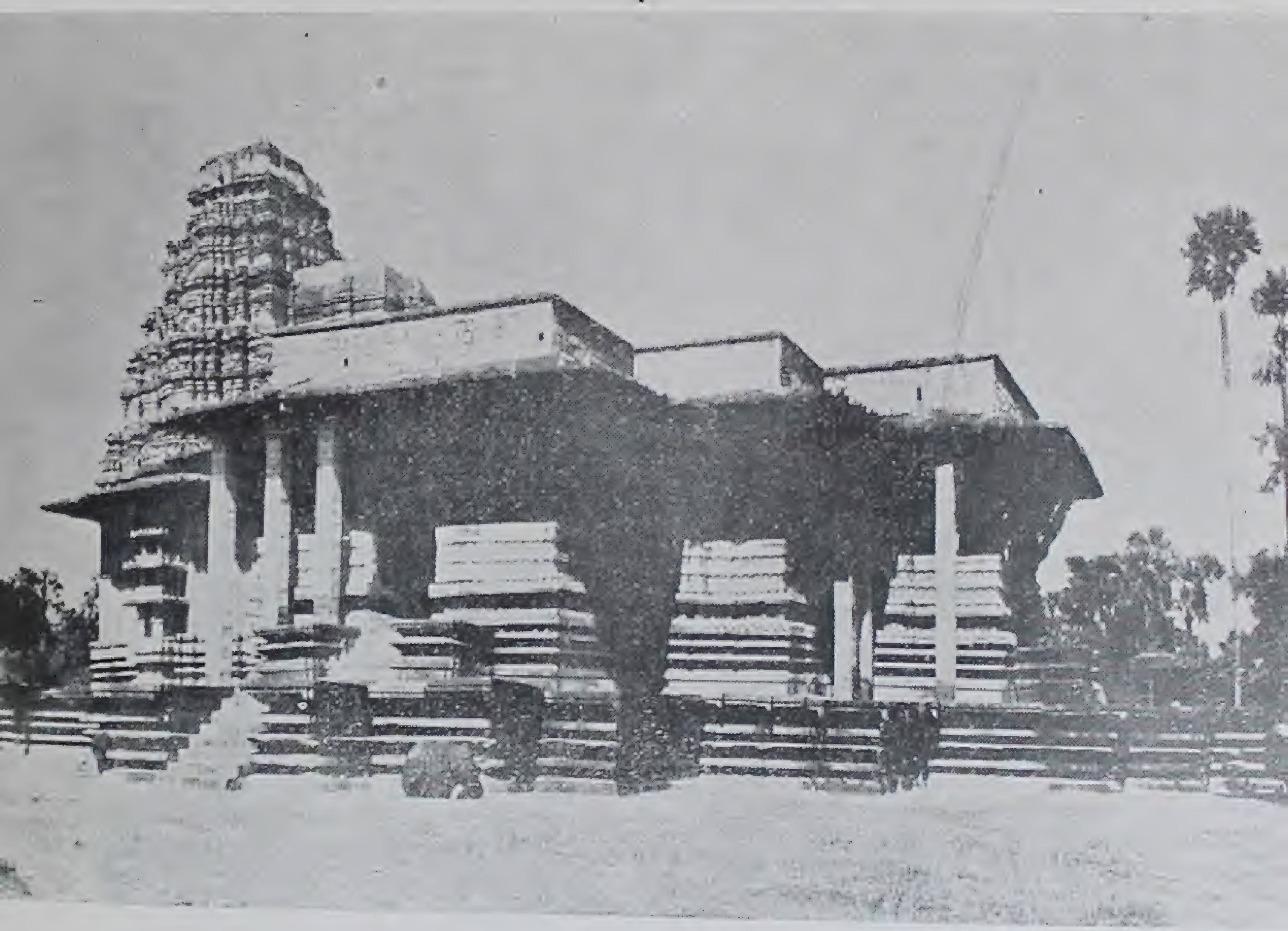
مندر کے اندرونی حصے
کا ایک ستون

مندر کے اندرونی حصے
میں بنی ہوئی مورتی





مندر کے اندرونی حصے
میں بنی ہوئی مورتی



غلام ربّانی

مندر رامپّا

دکن کے حکمران خاندانوں میں کاکتیا خاندان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ورنگل ان کی راجدھانی تھا۔ تلنگانہ اور آندھرا کا جنوب مغربی علاقہ ان کی وسیع سلطنت میں شامل تھا۔ اس پر انھوں نے تین سو برس بڑی شان سے حکومت کی۔ ملک سرسبز اور شاداب تھا۔ رعایا خوش حال تھی۔ ان کے پورے علاقے میں دریاؤں اور ندی نالوں کا بسا جال پھیلا ہوا تھا۔ ندی نالوں کو اونچے اونچے بند باندھ کر روکا گیا اور ان سے نہریں نکالی گئیں۔ چناں چہ ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد بھی آب رسانی کا وہ پرانا نظام باقی ہے اور آج تک آندھرا کا بہت بڑا رقبہ انھیں تالابوں سے سیراب ہوتا ہے۔

کاکتیائی حکمران کو فنِ تعمیر سے بہت شوق تھا، جس کے آثار اس رقبہ میں جا بجا مانے جاتے ہیں۔ دکن کے قرونِ وسطیٰ کے مندروں میں اوندھ کا ناگناتھ مندر، اُلّگی اور عالم پور کے مندر، پانگل کا سومیسورا اور ہنمکنڈہ کا دیول ہزار ستون ہندوستان کے خوب صورت مندروں میں شمار ہوتے ہیں لیکن اس کہکشاں کا سب سے روشن ستارہ پالم پیٹ کا رامپا مندر ہے جو کاکتیائی دور کا تعمیری شاہکار ہے۔ رامپا مندر ورنگل سے چالیس میل کے فاصلہ پر ہے۔

یہ مقام خوب صورت پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ چاروں طرف دُور دُور تک گھنا جنگل ہے جس میں شیر، ریچھ اور دوسرے جنگلی جانوروں کی کثرت ہے۔ اس جگہ کو رامپا تالاب نے بہت پُر فضا بنا دیا ہے۔ تالاب کیا ہے اچھی خاصی جھیل ہے جس کا رقبہ دس مربع میل کے قریب ہے۔ تالاب اونچی اونچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ پہاڑیاں درختوں سے ڈھکی ہوئی ہیں اور درختوں کے گلے میں بیلوں کے ہار پڑے ہوئے ہیں۔ قدرت بعض وقت ایسا دلآویز منظر پیش کر دیتی ہے کہ انسان اسے دیکھ کر خواہ مخواہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے یہ جگہ گیان دھیان کے لئے پسند کی گئی اور اس تالاب کے کنارے کئی خوب صورت مندر بنائے گئے ہیں جن میں سب سے بڑا مندر 'رامپا' ہے۔

یہ عظیم الشّان عمارت چالوکیہ طرز کی ہے۔ اس کا نقشہ صلیب نما ہے۔ چبوترا چھ فٹ سے زیادہ بلند ہے۔ اس کی کرسی سادہ نہیں ہے بلکہ کنگورے دار ہے جس سے عمارت کے نقشے میں رعنائی پیدا ہو گئی ہے۔ مندر کے چاروں طرف چبوترے پر دس دس فٹ جگہ چھوڑ دی گئی ہے جو پرادکشنا کا کام دیتی ہے اور یہیں سے وہ ان مورتوں کو دیکھتے ہیں جن سے عمارت کے بیرونی حصّے کو سجایا گیا ہے۔ یہ مورتیں سنگِ موسیٰ میں تراشی گئی ہیں جن میں دیوی دیوتا، جنگجو پہلوان، گانے اور ناچنے والی لڑکیاں ہیں۔ ان کے انداز بہت ہی دل کش ہیں۔ گربھ گرہ یعنی آخری حجرہ مغرب کی طرف ہے۔ باقی تین طرف برآمدے ہیں جن کے دروازوں کے دونوں طرف قدِ آدم مورتیں ہیں۔ یہ مورتیں عورتوں کی ہیں جو ستونوں کے سروں پر توڑوں کی شکل میں لگی ہوئی ہیں۔ دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چھجے کو سر پر سنبھالے ہوئے ہیں۔

اسی مندر کی سب سے خوب صورت چیز جس کے لئے یہ عمارت مشہور ہے، یہی توڑے ہیں۔ ان کو رقاصاؤں کی شکل میں تراشا گیا ہے جن کی ہر ادا مستانہ ہے۔ ہاتھ کی انگلیوں کے ناخن اتنے بڑھے ہوئے ہیں کہ خنجر معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سانپ لپٹے ہوئے ہیں۔ بدن ناگن کی طرح بل کھائے ہوئے ہیں۔ جسم کے موڑ موڑ اور مختلف ابھار بتا رہے ہیں کہ جوانی جوش پر ہے۔ ہاتھ پاؤں کی حرکات اور نرت کے انداز نے ایسی رعنائی پیدا کر دی ہے کہ مورت میں جان پڑ گئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ نرتکی ناچ کی گت پھر رہی ہے۔

انسانوں اور جانوروں کی شکل کے توڑے بودھی فنِ تعمیر سے شروع ہوئے۔ چناں چہ اجنتا اور سانچی میں اس وضع کے توڑے موجود ہیں جن میں ہاتھی، شیر، گندھروا اور اپسراؤں کے چہرے تراشے گئے ہیں مگر جو خوب صورتی اور بانکپن اس مندر کے توڑوں میں ہے، اس کا جواب ہندوستان کی کسی عمارت میں نہیں۔

جذبات کو ابھارنے کے لئے ایک اور مورت ہے جس میں عورت کو عریاں بنایا گیا ہے۔ یہ ایک ناگنی ہے۔ اس پر مستی کا عالم ہے اور جوانی پھٹی پڑتی ہے۔ ناگن کے روایتی تصور کو پیش کرنے کے لئے آرٹسٹ نے اس کو سانپوں سے لاد دیا ہے۔ پتلی پتلی نازک انگلیوں میں سانپ کا پھن دبا ہوا ہے اور بازو، گردن اور جسم پر سانپ لپٹے ہوئے ہیں گویا وِش کنیا نے فرطِ خوشی سے ان کو گرفت میں لے لیا ہے۔

عمارت میں ہر جگہ سنگ تراشی کے اعلیٰ نمونے ہیں اور بیل بوٹے اور جانوروں کی شکلیں تراشنے میں کمال دکھایا گیا ہے۔ رامائن، بھاگوت اور دوسری مذہبی کتابوں کے سین بھی دکھائے گئے ہیں۔ کرشن جی اور گوپیوں کا وستر اپہارنا، دروازوں کے واسوں پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور کئی نمایاں جگہوں پر دکھایا گیا ہے۔ کہیں شام مرلی بجا رہے ہیں۔ یہاں کی مورتیں مہاتما بودھ کی مورتوں کی طرح پُرسکون نہیں ہیں بلکہ سب پر نشاط کا عالم طاری ہے۔ یہاں تک کہ بیچ کے کھمبے میں ایک جگہ گنپتی مہاراج اپنی گول توند کے ساتھ ناچ رہے ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ دسویں صدی سے تیرھویں صدی کے دوران کی برہمنی مورتوں کا تعلق اس عہد سے معلوم ہوتا ہے جب لوگوں میں رواداری بہت تھی اور مذہبی عقیدوں کے اختلافات میں ایسی شدت نہیں تھی جس سے کسی فرقے کے لوگوں کے جذبات کو ٹھیس لگے۔ چناں چہ پالم پیٹ کے آرٹسٹ نے جس موضوع پر چاہا اپنی تخلیق میں جی کھول کر کمال دکھایا ہے۔

پالم پیٹ کی بُت تراشی کاکتیائی دور کے انتہائی کمالِ فن کو پیش کرتی ہے۔ انسانی شکلوں کے علاوہ کچھ عجیب الخلقت جانوروں کی بھی مورتیں ہیں۔ ان میں کئی جگہ ہاتھیوں کے مستکوں پر پائے بنائے گئے ہیں۔ ان پر یالی تراشے گئے ہیں۔ ان شیروں کے سر پر سینگ ہیں۔

اس مندر کے ستون خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ یہ سب ایک ڈال کے ہیں اور سنگ سیاہ میں تراشے گئے ہیں۔ دکن کے مندروں میں کہیں ایسے نفیس اور خوب صورت ستون نہیں ہیں۔ ان کو جلا دینے میں یہ کمال دکھایا ہے کہ ان کی سطح آئینہ کی طرح چمک اٹھی ہے۔ جلا کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ بعض ماہروں کا خیال ہے کہ ان کو خراد پر چڑھایا گیا ہے جس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے بنانے والے خراد کا استعمال جانتے تھے اور اگر اتنے وزنی ستونوں کو خراد پر چڑھانا ممکن نہ تھا تو پھر ان کو آئینہ کی طرح چمکانا بہت بڑا کمال ہے۔

جب ہم شرقی دروازہ سے مندر کے پاس پہونچتے ہیں تو سب سے پہلے ایک منڈپ ملتا ہے۔ یہ ایک بلند سنگین چوکی پر تعمیر ہوا ہے جس کے پہلوؤں کو منقش پٹیوں سے سجایا گیا ہے۔ ان پر بیل بوٹے ہیں اور ہاتھیوں اور گندھرواوں کی قطاریں دور تک چلی گئی ہیں۔ منڈپ کی چھت اور اس کے ستون گر گئے ہیں لیکن فرش جس پر ستون قائم کئے گئے تھے ابھی اچھی حالت میں ہے یہ مربع شکل کا ہے۔ ایک بہت بڑا نندی جواب مندر کے شرقی

دالان میں ہے غالباً پہلے اسی جگہ رکھا گیا تھا۔ یہ نندی منڈپ تھا۔

مندر کی دیواروں کو باہر کی طرف پٹوں سے سجایا گیا ہے۔ اس قسم کی پٹوں کا رواج شمالی اور جنوبی ہند کے مندروں میں عام ہے۔ کہیں یہ عمودی ہیں اور کہیں اُفقی۔ اس مندر میں افقی ہیں جو دراوڑی مندروں کی خصوصیت ہے۔

دیواروں میں بہت بڑے بڑے پتھر استعمال کئے گئے ہیں۔ ان کی سطح کو ہموار کیا گیا اور پتھر پر پتھر رکھ دئے گئے ہیں۔ دیواروں کی تعمیر میں چونا بالکل استعمال نہیں کیا گیا۔ بڑے بڑے پتھر اپنے وزن سے ایک دوسرے پر اس طرح بیٹھ گئے ہیں کہ ان کے جوڑ دکھائی نہیں دیتے۔ اس طرزِ تعمیر کو ہماڑ پنتھی طرز کہتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ کے دکن کے مندر اسی طرز پر تعمیر کئے گئے ہیں۔

مندر کی دیواریں سنگِ سُرخ کی ہیں لیکن اندر تمام سنگ سیاہ ہے جو سنگِ موسیٰ معلوم ہوتا ہے۔ یہ اعلیٰ قسم کا پتھر بہت خرچ کیا گیا ہے۔ سکھارا کا کچھ نچلا حصہ پتھر کا ہے اور اوپری حصہ اینٹوں کا ہے۔ یہ اینٹیں اسفنج کی طرح مسام دار ہیں۔ وزن میں اتنی ہلکی ہیں کہ ان کو اگر پانی میں ڈال دیا جائے تو لکڑی کی طرح تیرتی رہتی ہیں ڈوبتی نہیں۔ اس قسم کی اینٹیں عمارت کا وزن کم کرنے کی غرض سے استعمال کی گئی ہیں۔ سکھارا کے بیچ میں چھوٹے چھوٹے سکھارا بنائے گئے ہیں جو بڑے سکھارا کی نقل ہیں۔ دکن کے مندروں میں اس کا رواج عام ہے۔

کاکتیائی مندروں کی تمام خصوصیات رامپا دیول میں موجود ہیں۔ عمارت میں حسن، تناسب، موزونی، نفاست اور رعنائی کی تمام ادائیں پائی جاتی ہیں۔

ہندوستان کے اکثر دیول بند اور تاریک ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اندرونی حصوں میں دن کے وقت بھی چراغ جلانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس مندر میں کشادگی اتنی ہے کہ عمارت کے اندرونی حصے تک ہوا اور روشنی اچھی طرح سے پہونچتی ہے۔

ستونوں کو اس ترتیب سے نصب کیا گیا ہے کہ اس سے چھت کئی خانوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ یہ تمام حجرے منبّت کاری کے مرقعے ہیں۔ اس کام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ سونے چاندی میں پھٹے کے نقش بٹھائے گئے ہیں۔ عمارت کا فن تعمیر اعلیٰ اور شاندار ہے۔ اونچی کرسی (۱۰ فٹ) بلند ستون (۴۵ فٹ) وسیع ایوان (۴۱×۴۱ فٹ) وزنی شہتیر اور سلیں، عظیم سکھارا سب اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ اس کے بنانے والے کا مقصد کتنا بلند اور نقطۂ نظر کتنا وسیع تھا۔ یہ مندر قرونِ وسطیٰ کے دکنی طرزِ تعمیر کا انتہائی عروج پیش کرتا ہے۔

مندر میں داخل ہونے کے لئے تین طرف منڈپ ہیں۔ زائر کسی طرف سے جائے اس کو کئی سیڑھیوں پر چڑھنا پڑتا ہے کیونکہ عمارت کا احاطہ چبوترے سے پانچ فٹ اونچا ہے۔ اندر کا ایوان (مہا منڈپ) ۴۱ فٹ مربع ہے۔ اس کے بیچ میں ۱۰ فٹ مربع ایک اور چھوٹا سا منڈپ ہے۔ اس کے ستونوں پر بہت اعلیٰ سنگ تراشی کے نمونے ہیں مہا منڈپ کے گرد کوئی چار فٹ اونچا چبوترہ ہے جس پر آٹھ چھوٹے چھوٹے حجرے بنائے گئے ہیں۔ ان حجروں میں مختلف دیوی دیوتاؤں کی مورتیں ہیں۔

انتر آلہ کی لمبائی چوڑائی (۱۴×۱۵) فٹ ہے۔ گربھ گرہ کے اندر داخل ہونے کے لئے ایک اور دروازہ ہے اس کی سردل اور دالسے نقش و نگار سے پٹے پڑے ہیں۔ بیچ میں ایک پایہ پر لنگ ہے۔ چوکھٹ، پایہ اور لنگ سنگ سیاہ کے ہیں۔

اس دَور کے مندروں کی ایک تعمیری خصوصیت یہ بھی ہے کہ جس طرح صندوق بنانے کے لئے اس کے پائے، طول اور عرض کے تختے، اوپر کا ڈھکنا یا پٹ وغیرہ پہلے تیار کر لیتے ہیں اور پھر ان کو جوڑ کر صندوق بنا لیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ مندر بنائے گئے ہیں۔ تعمیر سے پہلے ان کے ستون سردل، دالسے، توڑے، پاکھے، چھجے کی سلیں، چھت کی پٹیاں، فرش کے چوکے، منڈپ کی چھت کے لئے مثلث پتھر، چوکھٹیں، دیواروں کے لئے بڑے بڑے تراشیدہ پتھر غرض عمارت کا ہر جزو تیار کر لیا جاتا تھا پھر ان کو اپنی اپنی جگہ نصب کر دیا جاتا تھا۔ ان کو نصب کرنے کے لئے چونا کہیں استعمال نہیں ہوا یہاں تک کہ دیواریں بھی بغیر چونے کے بنائی گئی ہیں۔

ان مندروں کے طرزِ تعمیر پر ماہروں کا ایک اعتراض ہے اور وہ

بڑی حد تک صحیح ہے ۔ یہ درزنی سنگین عمارتیں عموماً تالابوں کے کنارے یا نرم زمین پر بنائی گئی ہیں ۔ ان کی بنیادیں زیادہ گہری اور مضبوط نہیں ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً تمام کاکتیائی مندر زمین میں دھنس رہے ہیں ۔ بعض جگہ دیواروں میں کجی آگئی ہے ۔ ستون مرکزِ ثقل سے ہٹ گئے ہیں ۔ چھتوں میں شگاف پڑ گئے ہیں اور بعض عمارتیں گر کر ڈھیر ہو گئی ہیں ۔ مندر رامپا بھی ایک طرف سے دھنس رہا ہے مگر عمارت کو ابھی زیادہ نقصان نہیں پہونچا ہے ۔ آج سے کوئی ۴۰ سال پہلے حکومت حیدرآباد نے اس کی مرمت کرائی تھی اور اب چند سال سے یہ دیول مرکزی حکومت کی نگرانی میں آگیا ہے اور اس کی مرمت اور نگہداشت کا معقول انتظام ہو گیا ہے ۔

تلنگانہ میں یہ دستور تھا کہ جو لوگ مندر تعمیر کراتے یا اس کی تعمیر میں عطیے دیتے تھے ان کا ذکر ہمیشہ کتبہ میں کیا جاتا تھا ۔ یہ کتبہ دیول کے اندر دیوار میں کسی نمایاں جگہ میں لگا دیا جاتا تھا ۔ بعض اوقات کسی ستون پر کندہ کر دیا جاتا تھا ۔ کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ کتبہ کسی ستون پر کندہ کرا کے اس کو عمارت کے صحن میں نصب کر دیا جاتا تھا ۔ اس مندر میں یہی کیا گیا ہے ۔ ایک چوکور شکل کا لمبا ستون صحن میں نصب ہے جس کے چاروں پہلوؤں پر عبارت کندہ ہے اس میں ۵۰۰ سے زیادہ مصرعے ہیں[1]۔

چند اشعار کا مطلب ذیل میں بیان کیا جاتا ہے جس سے اس زمانہ کے شاعرانہ تخیل اور بلند پروازی کا اندازہ ہو سکے گا ۔

" جب وہ (گنپتی[2]) اپنے رسالہ کے ساتھ میدانِ جنگ کی طرف بڑھتا ہے تو گھوڑوں کے سموں سے زمین کی مٹی اکھڑ جاتی ہے اور ہوا کے تیز جھونکوں سے گرد بن کے اڑتی رہتی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین خود اس کے آگے آگے چل رہی ہے ۔ "

" سخت گرمی کے موسم میں بھی جب لوگ اس کے محل کے احاطہ میں جاتے ہیں تو ان کو سردی محسوس ہونے لگتی ہے ۔ بات یہ ہے کہ بہت سے راجا جو اس کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں وہ ہاتھیوں پر سوار ہوتے ہیں ۔ ان ہاتھیوں کی سونڈوں سے پانی کے فوّارے چھوٹتے رہتے ہیں اور ننھی ننھی بوندوں سے لوگ بھیگ جاتے ہیں ۔ "

" رُدرا[1] کے تیروں سے دشمنوں کے جسم میں جو زخم پیدا ہو جاتے ہیں ان سے خون نہیں نکلتا کیونکہ وہ تیروں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ڈر کے مارے پہلے ہی مر جاتے ہیں ۔ اور جب تیروں کو معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے مردہ جسموں کو چھیدا ہے تو شرم کے مارے منہ پھیر کر کسی اور طرف نکل جاتے ہیں ۔ "

" اس نے ایک تالاب بنایا جو اس شہر کے لئے آئینہ ہے ۔ بڑا اتنا ہے کہ سمندر معلوم ہوتا ہے ۔ سارے بادل یہاں آتے ہیں کیونکہ وہ ہر جگہ میٹھا پانی لے جاتے ہیں ۔ یہ بادل سمندر پر نہیں جاتے کیونکہ وہاں کھاری پانی ہوتا ہے ۔ "

" اس علاقے کا راجا میرے خاندان کا ہو یا کسی اور راجا کی نسل سے ، خواہ وہ دنیا کا بہت بڑا شہنشاہ ہو ۔ میں ہاتھ جوڑ کر ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ وہ اپنا دل گناہ سے پاک رکھیں اور میری اس عمارت کو قائم رکھیں ۔ دشمن سے بھی میری یہی پرارتھنا ہے کہ مذہبی عمارت کو قائم رکھنا چاہیئے کیونکہ دشمن محض دشمن ہو گا لیکن ایک عبادت گاہ کسی کی دشمن نہیں ہوتی ۔[2]"

---

[1] یہ کتبہ قدیم کنڑی تلگو عبارت میں ہے ۔ اس کو جرمن مستشرق ڈاکٹر ایل ۔ ڈی بارنٹ نے پڑھا ہے اور حیدرآباد آرکیولوجیکل سیریز میں شائع ہو چکا ہے ۔

[2] کاکتیائی خاندان کا راجا ، اس کے عہد میں حکومت پورے عروج پر تھی ۔

---

[1] گنپتی دیوا کا سپہ سالار جس کی نگرانی میں یہ مندر تعمیر ہوا تھا ۔

[2] شاید اس مندر کے بنوانے والے کی نیک نیتی کا پھل ہے کہ یہ عمارت شروع سے حکومتوں کی سرپرستی میں رہی ہے ۔

گزارش

غیر طلبیدہ مضامین وغیرہ اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جب کہ ان کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ بھیجے جائیں (ادارہ)

غزل

مری تخئیل جلوہ بار تھی کل شب جہاں میں تھا
وہ محفل محفلِ انوار تھی کل شب جہاں میں تھا

مرے نغمے نشاط افزا صدائیں میری بہجت زا
مری ہر لے مسرت کار تھی کل شب جہاں میں تھا

فضا ہنگامۂ شعر و سخن سے گونج اُٹھی تھی
خموشی روکشِ گفتار تھی کل شب جہاں میں تھا

مہ و انجم تھے میری شان و عظمت کے تماشائی
مری وہ گرمیٔ بازار تھی کل شب جہاں میں تھا

فرشتے سربسر مشتاق میری ہمکلامی کے
زباں بھی میری گوہر بار تھی کل شب جہاں میں تھا

نظر کے سامنے ایسے نظر آرا مناظر تھے
کہ سیرِ گل بھی وجہ عار تھی کل شب جہاں میں تھا

مے عیش و نشاطِ حُسن کی تھی وہ فراوانی
ہر اک شے مست اور سرشار تھی کل شب جہاں میں تھا

سراج اس بزمِ عشرت خیز کا عالم بیاں کیا ہو
فضا یکسر طرب آثار تھی کل شب جہاں میں تھا

تم بھی میرے ساتھ آؤ

مرے خیال، مرے خواب زندگی کی بہار!
بہت دنوں میں ملا ہے یہ نامۂ گلبار
تھا ایک ذرّۂ پامال، تم نے یاد کیا
خوشی یہ ہے کہ بہر حال تم نے یاد کیا
حسین خط کے لئے شکریہ قبول کرو
یہ شکریہ ہے گلِ خوش نما، قبول کرو

تمھارے خط میں شگفتہ گلاب کی خوشبو
تمھارے خط میں چمن زار خواب کی خوشبو
تمھارے خط میں بہارِ جمال کی نکہت
تمھارے خط میں ہے میرے خیال کی نکہت
تمھارے خط سے امیدِ حیات ملتی ہے
لطیف صبح، درخشندہ رات ملتی ہے
تمھارے خط میں ہیں طوفان بھی کنارے بھی
تمھارے خط میں ہیں پوشیدہ کچھ اشارے بھی

تمھیں یہ فکر ہے مجھ میں وہ پہلی بات نہیں
مرے رباب میں وہ نغمۂ حیات نہیں
میں بھول بیٹھا ہوں فصلِ بہار کی باتیں
وہ پربتوں، وہ حسیں آبشار کی باتیں
عجیب حال میں رہتا ہے میرا سازِ خیال
نہ داستانِ محبّت، نہ داستانِ جمال
یہ سب لطیف اشارات مجھ پہ واضح ہیں
یہ نیم گفتہ سوالات مجھ پہ واضح ہیں

تم اہلِ فکر ہو، حسّاس دل بھی رکھتی ہو
خود اپنی ایک رہِ مستقل بھی رکھتی ہو
تمھیں بتاؤ کہ اب مجھ میں کیوں وہ بات نہیں
میں کیوں وہ کج کُلہِ وادئ حیات نہیں

تمھیں خبر ہے مرا دیس ایک مندر ہے
مری کلا اسی مندر میں اک گُلِ تر ہے

بتا چکا ہوں مری شاعری عبادت ہے
کلا کی مورتی پہ اک گلِ عقیدت ہے
تمھیں بتاؤ کہ جب دیس ہو مصیبت میں
کسی نے آگ لگا دی ہو میری جنّت میں
تو شاعری میں بہاروں کا ذکر کیا ہوگا
حسین چاند ستاروں کا ذکر کیا ہوگا

مری نظر میں ابھی آتشیں نظارے ہیں
مرے رباب میں نغمے نہیں شرارے ہیں
ابھی تو خود ہی مرے مندروں کو خطرہ ہے
مرے حسین کلا مندروں کو خطرہ ہے
بیانِ تیغ ہے اب ذکرِ حور کے بدلے
ہوں رزم گاہ میں گلستانِ نور کے بدلے
یہ کیوں — ؟ تمھارے لئے حسن کی بقا کے لئے
محبتوں کے چمن کی حسیں فضا کے لئے

یہ جنگ کانٹوں سے پھولوں کی جنگ ہے بے شک!
یہ جنگ اونچے اصولوں کی جنگ ہے بے شک!
ہم اس لڑائی میں جیتیں گے، کامراں ہوں گے
تو پھر ربابِ محبّت پہ نغمہ خواں ہوں گے
بڑھا کے تم بھی ذرا اب حنائی ہاتھ، آؤ
میں رزم گاہ میں ہوں، تم بھی میرے ساتھ آؤ

قاسم شبیر نقوی

غزل

حضورِ قُرب کی فرصت ملی ہے
مگر پھر دل کو وہمِ نارسی ہے
ہے تیری مصلحت تیری خوشی ہے
کسے ورنہ مجالِ زندگی ہے
ذرا ہنگامۂ دُنیا ٹھہر جا
کوئی آواز دل سے آ رہی ہے
محبّت کے قریں آؤ تو دیکھو
محبّت میں بھی نازِ دلبری ہے
نظر کے لاکھ مے خانے لٹا دو
نظر کی تشنگی پھر تشنگی ہے
محبّت کو خموشی ہے گوارا
تری محفل مگر سونی پڑی ہے
فضائے ماہ و انجم سے بھی آگے
مری شمعِ تصوّر جل رہی ہے
تمھاری یاد کی رونق سلامت
جہاں میں ہوں وہاں پر زندگی ہے
کوئی پہنچے تو قاسم کی غزل تک
طرب کی لَے میں اک نوحہ گری ہے

عطاء الرحمٰن عطا کاکوی

تذکرۂ نادر

"تذکرۂ نادر" کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ نادر کے مخمّسوں کا ایک ضخیم مجموعۂ دیوان غریب' سے مرتب کیا گیا ہے۔ 'دیوانِ غریب' میں نادر نے تقریباً پانچ سو شاعروں کی غزلوں کا مخمّس کیا ہے اور جدّت یہ کی ہے کہ سب شاعروں کے ضروری حالات مثلاً نام، ولدیت، تلمذ وغیرہ اور اپنے دوستوں کے متعلق 'یکی از دوستاں جامع ایں اوراق' لکھے ہیں جن میں سے اکثر وبیشتر ان کے شاگرد ہیں۔ 'دیوانِ غریب' تاریخی نام ہے۔ پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی ادیبؔ شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اسی 'دیوانِ غریب' سے ان شعراء کی غزلوں کو علیحدہ کرکے اور ہر شاعر کے متعلق نادر کی معلومات کو درج کرکے ایک تذکرہ مرتّب کردیا۔ ان کی اس جدّت سے اردو شعراء کے تذکرے میں ایک مفید اضافہ ہوگیا۔ فہرست شعراء سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں پانسو اکیس (۵۲۱) شعراء کے حالات اور پانچ پانچ شعروں کی غزلیں ہیں مگر اس فہرست میں چند نام دوبارہ بھی آگئے ہیں اس لئے گویا یوں سمجھئے کہ یہ تذکرہ کم وبیش پانسو شعراء کے حالات کو محیط ہے، جن میں زیادہ تر نادر کے ہم عصر ہیں کچھ قدیم شعراء بھی شامل ہیں چند فارسی گو شعراء کی غزلیں اور حالات بھی ہیں۔

نادر کا پورا نام مرزا کلب حسین ہے، اعتصام الدولہ خان بہادر اور مبارز جنگ القاب نادرؔ تخلّص، ناسخ کے شاگرد[1] عہدہ ڈپٹی کلکٹری پر فائز تھے۔ انھیں کا یہ مشہور شعر ہے ؎

لوگ کہتے ہیں کہ فنِ شاعری منحوس ہے
شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہوگیا

نادر کو شعر وسخن سے غایت شغف تھا، شعراء کو اپنے ہاں بلاتے، مشاعرے کرتے اور ان کے ساتھ بڑے حسنِ اخلاق سے پیش آتے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ وہ کثیر التصانیف مصنّف تھے۔ چار دیوان اس کے علاوہ قصائد، مثنوی، مرثیہ کے مجموعے ان سے یادگار ہیں۔ شاعروں کا ایک تذکرہ 'شوکت نادری یا صولت نادری' جس میں تہتّر[2] شعراء ریختہ وفارسی کے حالات ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی نثری تصانیف موجود ہیں۔ آب حیات میں ان کا تذکرہ صراحت سے موجود ہے۔ نادر بنارس میں پیدا ہوئے، مختلف جگہوں میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر رہ کر ۱۲۹۵ھ میں انتقال کیا۔ 'غم نادر' مادہ تاریخ وفات ہے۔ ان کے تین بیٹے ، تینوں شاعر، ایک کلب عابد خاں بشاشؔ دوسرے کلب علی خاں عیاشؔ، تیسرے کلب سجّاد خاں شاباشؔ۔ ان تینوں کی غزلیں تذکرۂ نادر میں موجود ہیں۔

تذکرہ کے لحاظ سے گو یہ تذکرہ بہت اہم نہیں پھر بھی نادر کے ہم عصر شعراء کے کلام اور حالات پر اس سے مفید روشنی پڑتی ہے اس تذکرے میں بہت سے ایسے شعراء کے حالات اور کلام بھی ملتے ہیں جو اور کہیں دستیاب نہیں ہوتے، بعض ایسے شعراء کی غزلیں بھی ہیں جو بہ حیثیت غزل گو غیر معروف ہیں۔ مثلاً ضمیرؔ، خلیقؔ، دبیرؔ، انسؔ اور مونسؔ وغیرہ۔

---

[1] نساخ نے آتش کا شاگرد بھی لکھا ہے۔

ناسخ کے شاگردوں میں مندرجہ ذیل شعراء شامل ہیں :-
آباد - اثر (نواب حسین علی خاں) افضل (الہ آبادی) اُنس (مرزا خلف علی) بحر (شیخ امداد علی) بحر (نواب علی احمد خاں عظیم آبادی) برق - ثابت - رشک - رونق - شجاعت - شہید (محمد بخش) عاصی - عرش (میر کلو خلف میر تقی میر) مہر - نواب - وزیر -

آتش کے شاگردوں میں مندرجہ ذیل شعراء کا ذکر ہے :-
اعظم - ثنا - حزیں - خلیل - رند - شرف (سادات حسین عرف آغا جو شرف - ان کو غلطی سے ناسخ کا شاگرد بتایا ہے) شمس - صبا - صدر - عارف - فیض (میر احسان علی) قدسی - ماہ - مظفر - نسیم -

عظیم آبادی اور بہاری شعراء میں یہ لوگ ہیں :-

۱- اخگر - منشی فرزند علی وکیل نامی مرزا پور باشندہ یوسف پور من محلات عظیم آباد
۲- بحر - نواب علی احمد خاں رئیس عظیم آباد شاگرد ناسخ -
۳- سلطان - راجہ طالب علی خاں خلف خواجہ حسین علی خاں بخاری صاحب دیوان رئیس عظیم آباد
۴- صبا - نواب احمد حسین خاں خلف نواب کاظم حسین خاں رئیس حسین آباد، مونگیر
۵- صفیر - سید فرزند احمد مقیم آرہ خلف سید عبدالحی ابن سید بندہ علی بلگرامی شاگرد شیخ امان علی سحر اردو میں اور شاگرد مرزا غالب فارسی میں -
۶- فیض - نواب جعفر حسن خاں بہادر خلف نواب محمد علی خاں بہادر رئیس اعظم عظیم آباد
۷- مخلص - محمد حسین خاں ولد امانت خاں باشندہ بھاگلپور

میر کے شاگردوں میں مندرجہ ذیل شعراء کا ذکر ہے :-
برشتہ - آغا حسین علی باشندہ لکھنؤ صاحب دیوان فارسی و ریختہ
بیگم - دختر میر محمد تقی ساکنہ لکھنؤ (یہ میر کی دختر ہیں جیسا کہ بعضوں کو شبہ ہوا ہے)
صفا - رائے منولال ولد رائے پورن چند باشندہ لکھنؤ

سودا کے ایک شاگرد منشی سلاسکھ نثار کا بھی ذکر ہے۔ غالب کے دو شاگردوں مفتوں (پنڈت لچھمی نرائن) اور مداح (شیخ محمد صادق) کا بھی ذکر ہے۔

وحید الہ آبادی کی بھی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے ؎

چھٹ گئے یاروں سے ہم کیونکر وطن کیا ہو گیا
پھول تھے کثرت سے جس میں وہ چمن کیا ہو گیا

اب چند غزلیں ایسے شعراء کی لکھی جاتی ہیں جو عام طور پر غزل گو کی حیثیت سے معروف نہیں ؎

انیسؔ - وجد ہو بلبل تصویر کو جس کی بو سے
اس سے گل رنگ کا دعویٰ کرے پھر کس رو سے
شمع کے رونے پہ بس صاف ہنسی آتی ہے
آتش دل کہیں کم ہوتی ہے چار آنسو سے
ایک دن وہ تھا کہ تکیہ تھا کسی کا زانو
اب مرا اٹھتا ہی نہیں اپنے سر زانو سے
نزع میں ہوں مری مشکل کرو آساں یارو
کھولو تعویذ شفا جلد مرے بازو سے
شوخی چشم کا تو کس کے ہے دیوانہ انیس
آنکھیں ملتا ہے جو یوں نقش سم آہو سے

اُنس

دیکھو دکھلاؤ خفا ہو کے نہ ہر بار آنکھیں
اب کبھی بزم میں روئیں تو گنہگار آنکھیں
ہے قسم وصل ہوا ہو جو کبھی ہم کو نصیب
اک نظر دیکھنے کی تو ہیں گنہگار آنکھیں
رخ روشن کو تو دامن سے چھپاؤ للہ
اب نظر بھر کے جو دیکھیں تو گنہگار آنکھیں
رنگ ہے گر تمہیں منظور تو مہندی نہ ملو
مجھ کو ان تلووں سے مل لینے دو خونبار آنکھیں
اس کے موتی سے جو دانتوں کا ہوں عاشق اے اُنس
رات دن صورت نیساں ہیں گہربار آنکھیں

بحر - نواب علی احمد خاں عظیم آبادی شاگرد ناسخ

تیرے دنداں نے کئے گوہرِ غلطاں پیدا — لب رنگیں سے ہوئے لعل بدخشاں پیدا
اپنے گیسو سے ہٹا دیجئے نقاب گیسو — پردۂ ابر سے ہو مہر درخشاں پیدا
تشنہ لب آئیں گے پیاس اپنی بجھانے قاتل — آبداری تو کرے خنجرِ براں پیدا
کشتیِ نوح بھی آئے تو نہ ساحل ہو نصیب — دیدۂ تر نے کیا مرے وہ طوفاں پیدا

بحر معلوم ہوا پڑھ کے غزل ہائے عزیز
بعد مدت کے ہوا ہے یہ سخنداں پیدا

خلیق (میر مستحسن)

مرغان قفس کرتے ہیں سب نغمہ سرائی
کیا فصل بہاری کی چمن سے خبر آئی
گلشن میں یہ کس شخص کا ہے ڈھیر کہ بلبل
منقار میں لے جا کے کئی پھول دھر آئی
مدت سے ہم رہتے تھے جس گھر میں ہم اور یار
اب دیکھ کے خالی وہ مکاں آنکھ بھر آئی
کیا پوچھتے ہو حال اسیرانِ قفس کا
گلشن سے جو بے خود ہو نسیم سحر آئی
ایسا تو جہاں میں کوئی ہووے گا نہ رسوا
آفت جو خلیق جگر افگار پہ آئی

دبیر

(یہ وہ غزل ہے جو مرزا صاحب نے مشاعرۂ فتح الدولہ میں بہ عہدِ غازی الدین حیدر شاہ اودھ پڑھی)

اگر وہ غیرتِ شمشاد جائے سیرِ گلشن کو
گلوئے سرو میں پہنا دے قمری طوق گردن کو
گلوں کی بے ثباتی پہ جو اس کا دھیان جاتا ہے
تو کیا روتی ہے شبنم منہ پہ رکھ کر گل کے دامن کو
دلا ان تنگ چشموں سے نہ چشمِ مہر تو رکھیو
کسی کے حال پہ روتے نہ دیکھا چشمِ سوزن کو
سواد نامۂ اعمال کیا یہ اشک دھوئیں گے
نہ شبنم نے کیا تبدیل رنگِ برگِ سوسن کو
دبیر آئے گا کب وہ بھول کر گورِ غریباں میں
جو اکثر روندتا ہے ناز سے پھولوں کے خرمن کو

صباؔ (نواب احمد حسین خاں خلف نواب کاظم حسین خاں رئیس حسین آباد مونگیر - بہار)

سکندر کو مبارک آئینہ خاتم سلیماں کو
خدا اس دل کو رکھے اور دل پر داغ ہجراں کو
اُتارا نرگسِ شہلا کا نشہ چشمِ مے گوں نے
خجالت سے رخ رنگیں سے گل و سرو خراماں کو
لبِ غنچہ دہن جس دم تکلم میں گل افشاں ہو
ہنسی بھولے چمن میں باغباں گلہائے خنداں کو
بہ رنگِ قیس جس دم اس کو وحشت کھینچ کر لائی
نگاہِ یاس سے دیکھا در و دیوار جاناں کو
صبا کی اے صبا دیکھو بہاریں باغ میں جا کر
گل افشاں کر رہی ہے . . . . . گورِ غریباں کو

فیضؔ (نواب جعفر حسن خاں خلف نواب احمد علی[1] خاں بہادر رئیس اعظم عظیم آباد - شاگرد عاشور علی خاں)

کیا غرض شاد رہے کوئی کہ ناشاد رہے
جس کا دیوانہ ہوں راضی وہ پریزاد رہے
دم بدم رنگ بدلتا ہے مرا فرقت میں
کاغذ و خامہ لئے ہاتھ میں بہزاد رہے
دل لگا لیں گے کہیں تم نہ سہی اور سہی
کشورِ حسن سلامت رہے آباد رہے
اس شہ حسن نے جو مجھ سے گدا کو پوچھا
وہ سلامت رہے، آباد رہے، شاد رہے
کہئے دیوانہ وہ کیسے نہ ہو انساں اے فیض
روبرو آٹھ پہر جس کے پری زاد رہے

مخلص (محمد حسین خاں ولد امانت خاں باشندہ بھاگلپور)

---

[1] محمد علی خاں ۔ سخن شعراء ۔ فیض کو مصحفی سے تلمذ تھا

جو ہے اس دنیا میں وہ معذور پیراہن میں ہے
جس کو دیکھو قیدِ نخفور پیراہن میں ہے
اس قدر روشن ہوا ہے یادِ زلفِ یار میں
داغِ دل شمعِ شبِ دیجور پیراہن میں ہے
یہ بتانِ سنگ دل کی ہے محبّت کا اثر
شیشۂ دل اپنا چکنا چور پیراہن میں ہے
ہو گیا ہے ہجر میں ہر موئے تن تک جاں گزا
مثلِ نیشِ عقرب و زنبور پیراہن میں ہے
قولِ آتش سچ ہے مخلص آخر کار ایک دن
بوئے آبِ سدرۂ دکا فور پیراہن میں ہے

بیگم۔ دخترِ میر محمد تقی ساکنۂ لکھنؤ شاگردِ میر تقی میر

برسوں سرِ گیسو کا گرفتار تو رکھا
اب کہتے ہو کیا تم نے مجھے مار تو رکھا
کچھ بے ادبی اور شبِ وصل نہیں کی
ہاں یار کے رخسار پہ رخسار تو رکھا
وہ ذبح کرے یا نہ کرے غم نہیں اس کا
سر ہم نے تہِ خنجرِ خونخوار تو رکھا
اب بھی یہ غنیمت ہے کہ اس نے میری جانب
کھڑکی نہ رکھی روزنِ دیوار تو رکھا
اس عشق کی ہمّت کے میں صدقے ہوں کہ بیگم
ہر وقت مجھے مرنے پہ تیّار تو رکھا

اخگر۔ منشی فرزند علی وکیل عدالت مرزاپور باشندۂ یوسف پور من محلات عظیم آباد

خود نما تھا سب حسینانِ چمن میں آئینہ
ہے مگر حیران تیری انجمن میں آئینہ
گرمیٔ آہ شرر بارِ دلِ مغموم سے
شعلہ جوالہ ہے بیت الحزن میں آئینہ
عکسِ عارض جلوہ افزا ہے جو طشتِ آب میں
صاف یہ آیا تصوّر ہے لگن میں آئینہ
لاکھوں وعدے اے خود آرا آہ، عاشق سے کئے
پر کسی دن بھی تو اس کی انجمن میں آئی نہ

افتخار اعظمی

خلوصِ فکر کے دیئے جلاؤ پھر قدم قدم

قدم رکے نہ دوستو
یہ سر جھکے نہ دوستو
یونہیں جواں رہے صدا
یہ ولولہ
یہ حوصلہ
بہادرو، سپاہیو
خزاں کی نوچ دو قبا
ہمالیہ کی چوٹیوں سے آرہی ہے یہ ندا
بجھے نہ مشعلِ جنوں
رُکے نہ تیشۂ عمل
کہ فاصلے پہ چند پل کے جلوہ گر بہار ہے
ترنم ہزار ہے
نکھار ہی نکھار ہے
سروپ ہے سنگھار ہے

ہمارے دستِ شوق دستِ نقش گر کی دوستو
کہاں کوئی مثال ہے
نہاں ہر ایک نقش میں
جلال ہے
جمال ہے
خیال وجد آفریں
عروج لازوال ہے

یہ مدرسے یہ مدرسے
یہ ورسٹی یہ ورسٹی
یہ معبدِ سرسوتی
نہاں نگہ میں جن کی ہے تمدنوں کا بانکپن
یہ تربیت گہہِ شعورِ آدمی
یہ مخزنِ علوم وفن

یہ نہر ہے
رواں ہیں جس میں رات دن
بنا کے آنچلوں کے بادباں
سفینہ ہائے دردِ دل
محبتوں کی کشتیاں
یہ نہر جن کے فیض سے
ہری بھری ہیں کھیتیاں
ہر ایک دشتِ بے گیاہ
ایک مرغزار ہے
ہر اک قدم پہ گونجتا ترانۂ بہار ہے

'بھلائی' دو دلوں کے دھڑکنوں کی داستاں
'ریہانڈ' کا یہ بند جو مہان ہے وشال ہے
یہ 'بھاکڑہ' یہ کعبۂ زمانِ نو
یہ پل
یہ اسپتال ہے
یہ پٹڑیوں کا ریل کی ہر ایک سمت جال ہے
یہ سب ہمارے دستِ نقش گر کے شوق کا کمال ہے

مگر عزیز دوستو
ابھی نہ تیشۂ عمل رکیں
ابھی نہ گردنیں جھکیں
کہ منتظر ہمارے پائے شوق کے بلند تر مقام ہیں
ابھی بہت سے کام ہیں
وطن کی زلفِ ناز کو سنوارنا ہے اور بھی
مٹے ہوئے نقوش کو ابھارنا ہے اور بھی
چمن کے رنگ روپ کو نکھارنا ہے اور بھی

ہمارا یہ سماج جو عظیم تر سماج ہے
کہ جس میں سنگِ میل بن کے جل رہی ہیں ہر قدم
کرشن
رام
اور بدھ کے فلسفے کی مشعلیں
چلو کہ آج پھر اسے بنائیں جنتِ نظر
چلو کہ اس کے تاج میں جڑیں وہ لعل اور گہر
عرق عرق ہو کہکشاں بھی جن کی آب و تاب پر
چلو کہ دشت و در کو پھر
بنائیں رشکِ صد ارم
خلوصِ فکر کے دیئے جلائیں پھر قدم قدم
مہ و نجوم خاک سے لگائیں پھر قدم قدم

کامل نظامی دہلوی

غزل

سجا کے انجمنِ چشمِ تر میں رکھتا ہوں
وہ آرزو جو دلِ غم اثر میں رکھتا ہوں

تری نگاہِ تغافل اثر کا صدقہ ہے
وہ ایک ٹیس جو قلب و جگر میں رکھتا ہوں

میں اشک و آہ سے غافل کبھی نہیں رہتا
مذاقِ عشق کا حاصل نظر میں رکھتا ہوں

جنھیں ہے مقدرتِ سیرِ لامکاں حاصل
وہ جنبش بھی نہاں بال و پر میں رکھتا ہوں

کلیم ہیں مرے ظرفِ نگاہ کے قائل
ترے جمال کا عالم نظر میں رکھتا ہوں

اگرچہ عشق کے انجام سے بھی ہوں واقف
کسی کے عشق کا سودا ابھی سر میں رکھتا ہوں

کسے نصیب ہیں میرے سوا اسیری میں
وہ حوصلے جو غمِ بال و پر میں رکھتا ہوں

توہمات کا قائل نہیں میں اے کامل
تغیراتِ زمانہ نظر میں رکھتا ہوں

رئیس مینائی

آرزو لکھنوی اور جلیل مانکپوری کے خطوط

(نفیس بنگلوری کے نام)

ما قبل کردہ ایم دکے را نہ کشتہ ایم
الاحدیث یار کہ تکرار می کنیم

آج کی زندگی میں جیسے جیسے ادب اور ادیب کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے اور جس طرح دونوں میں نئے نئے گوشے اور پہلو تلاش کئے جارہے ہیں وہیں خطوط کی اہمیت و افادیت میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے، شاذ و نادر ہی پہلے کسی کے خطوط شائع ہوتے تھے لیکن اب ادیب کی شخصیت و کردار اور اس کے نفسیاتی میلانات و رجحانات کے لئے اس کے خطوط کی اشاعت برابر ہوتی رہتی ہے ایک مغربی ادیب تو اس باب میں کافی مبالغہ سے کام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ "اب شاعری کی بجائے ادب پہ نثر کی حکومت ہوگی۔ اس قلمرو میں جہاں انشائیہ نقد اور تاریخ کا دور دورہ ہوگا، وہاں خطوط کی بھی اہمیت بڑھتی چلی جائے گی۔" ذیل میں میرے والد مرحوم حضرت نفیس بنگلوری کے نام آئے ہوئے علامہ آرزو لکھنوی اور فصاحت جنگ جلیل مانکپوری کے چند غیر مطبوعہ خطوط پیش کئے جارہے ہیں جن میں بعض ادبی معاملات اور فنی نکات کی گتھیوں کو سلجھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مشاہیر کے ادبی مشاغل اور نجی کیفیات کا پرتو جن سے کئی اہم باتیں قاری کے علم میں آتی ہیں اس لئے امید ہے کہ یہ خطوط دلچسپی کی نظر سے دیکھے جائیں گے

سخن طرازی و دانش ہنر نظیری نیست
قبولِ دوست مگر نالۂ حزیں گردد!

مکاتیب حضرت آرزو لکھنوی

(۱)

۱۲۵ سی۔جی ایچ روڈ
خضر پور کلکتہ
۱۳۔ اگست ۴۰ء ۱۹

آرزو نواز!

سلام مسنون قبول ہو۔ بیماری کی طوالت نے جواب خط سے اب تک مجبور رکھا ذرا سنبھلا تو اپنے کو ہجوم کار و افکار میں گھرا ہوا پا رہا ہوں، بہر حال آپ کے شبہات رفع کرنے کی کوشش کی ہے ہر سوال کے جواب کو ترتیب وار دیکھئے، خدا کرے مجھے سمجھانے اور آپ کو سمجھنے میں کامیابی ہو۔

(۱) الف متحرک کے اسقاط کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ساکن ماقبل جو موزوں بہ کے مقابل حرف متحرک کی جگہ آیا ہے خود متحرک ہو کر اسقاط سے بچ جائے اور ساکن مابعد اس سے مل کر ملفوظ ہو سکے، اسی لئے اسے الف وصل کہتے ہیں۔ ب اگر ساکن

ماقبل خود بھی الف ہی ہے تو وہ آپ ساقط ہو جائے گا اور الف متحرک اپنی جگہ قائم رہے گا کیونکہ الف قبول حرکت سے معذور ہے، وہ الف تو اسی وقت تک ہے جب تک ساکن ہے اور جو بصورت الف متحرک ہے وہ ہمزہ ہے۔ اب اپنے پیش کردہ مصرع پر نظر ڈالئے۔ (فرش پا انداز کیوں سبزۂ بیگانہ ہے) اور پھر تقطیع کیجئے (فرش پ اَن مفتعلن) تو معلوم ہوگا کہ ان میں جو الف ہے یہ پا کا نہیں انداز کا ہے۔

(۲) دوسرے استفسار کا جواب پہلی ہی تشریح میں آ گیا یعنے الف قبول حرکت سے عاجز ہے، دوسرا حرف واو عطف ہو یا کوئی اور سب یکساں ہیں۔

(۳) پیاسی، اداسی کے ساتھ قافیہ ہو سکتا ہے، روانسی پھانسی کے ساتھ نہیں ہو سکتا اس لئے کہ جن حروف کی تکرار ناگزیر ہوتی ہے ان میں کمی بیشی جائز نہیں، رہا یہ سوال کہ روانسی کا نون ردف زائد ہے یا ردی مضاعف تو یہ ان میں سے کوئی نہیں کہ حروف میں شمار نہیں ہوتا برخلاف اس کے دوست پوست کا سین (جو ردف زائد و ردی مضاعف میں ما بہ النزاع ہے) تقطیع شعر کے وقت حروف میں محسوب ہو جاتا ہے۔

(۴) خورشید لکھنوی مرحوم کے پیش کردہ مصرع (دل مرا جان مری داغ سویدا اپنا) میں شتر گربہ نہیں۔ اگر میرا کے ساتھ ہمارا ہوتا تو بیشک شتر گربہ کہا جا سکتا تھا، اپنا میرا اور ہمارا دونوں کے ساتھ آتا ہے کہ واحد و جمع میں مشترک ہے۔

درحقیقت میرا کے ساتھ اپنا جو اس جگہ کانوں کو ناگوار ہوتا ہے اس کا سبب دوسرا ہے وہ یہ کہ مفہوم پر زور دینے کے لئے لفظ کی تکرار ہوتی ہے، یہاں میرا کی تکرار کے بعد اپنا کے آ جانے سے زور بیان میں ضعف آ گیا یہی چیز کھٹک رہی ہے جیسے خورشید لکھنوی کچھ کا کچھ سمجھے، آپ کے پیش کردہ اشعار میں سے کسی شعر میں بھی شتر گربہ نہیں۔

میری تصنیفات میں سے بہت کچھ چھپنے کو باقی ہے علاوہ نظام اردو اور تینوں دیوانوں کے جب کوئی کتاب شائع ہوگی تو آپ کو اطلاع ہو جائے گی

ناچیز
آرزو

(۲)

دیدیا منشن چھکتا واڑی دوسرا محلہ تاردیو روڈ بمبئی ۷
۲۴۔ نومبر ۱۹۴۲ء

حبیب دل نواز!

شرمندہ ہوں کہ پہلے آشوب چشم سے معذور رہا، اس کے بعد چوری ہو گئی پھر کاموں کے ہجوم نے جواب لکھنے کی مہلت نہ دی بہتر برس کی عمر میں جذباتی کام، اس وقت فضلی برادرس کی پکچر (فیشن) کے مکالمے اور گانے ایک طرف اور گھروندا پکچر میں تو علاوہ مکالموں اور گانوں کے کہانی بھی میری ہی ہے خدا بات رکھے کہ مہینوں کا کام دنوں میں ہو رہا ہے۔ سوال ۱ کا جواب، میں نے نفسی نفسی پر جو نوٹ لکھا تھا وہ تو یاد نہیں ہاں وہ کلیہ لکھے دیتا ہوں جس سے ہمیشہ کے لئے اسقاط حرف کا قصہ تمام ہو جائے گا اور آپ کے دوسرے سوال کا جواب بھی اس میں مل جائے گا۔ اسقاط ایسے ہر حرف کا جائز ہے جو کلام کرتے وقت دبتا ہوا محسوس ہو عام اس سے کہ وہ ہندی ہے یا غیر ہندی حروف علت میں سے ہے یا ان کے علاوہ نفسی نفسی جب زبان پر جاری ہوتا ہے پہلی۔ ے۔ دبی ہوئی ملفوظ ہوتی ہے اسی بناء پر میں نے اس کا اسقاط جائز سمجھا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

پڑی ہے ہر اک کو اپنی اپنی ہے انبیاء میں بھی نفسی نفسی
تھیں کو اک رٹ ہے امتی کی، شفیع روز جزا تمھیں ہو

ناچیز
آرزو

(۳)

عزیزی زاد لطفہٗ!

سلام مسنون پہونچے، میں تو ایک بیمار دوسرے لڑکی کی شادی کے بار جس سے فراغت تو ہو گئی مگر کچھ ایسے حالات پیش

آئے جو ناگفتنی ہیں، انھیں پریشانیوں میں جلد جواب نہ دے سکا اس وقت پر تو سلمہ آ گئے ہیں تو ان سے جواب لکھوا رہا ہوں، بعض اوقات ہاتھ کا رعشہ بالکل معذور کر دیتا ہے۔ اچھا ہوا جو آپ نے شبہات کی فہرست روانہ کر دی۔ دیکھ کر حیرت ہو گئی۔ کچھ اغلاط کتابت کے یاد تھے مگر کچھ ایسے بھی تھے جن کا الزام کاتب کو نہیں دیا جا سکتا تھا آخر بڑی تلاش کے بعد مسودہ ملا اور مطابق کرنے پر پتا چلا کہ وہ بھی کاتب صاحب ہی کی مہربانیوں کا نتیجہ ہیں، لیکن ایک شعر ؎

صادق اپنے مقام سے اُٹھا ایک مکتوب آگے رکھ کے کہا

یہ مسوّدے میں بھی بجنسہٖ موجود ہے۔ اسے میں اپنی فروگزاشت ماننے پر مجبور ہیں۔ بات یہ ہے کہ کسی طویل تصنیف میں شعر کہتے وقت تمام باتوں کا خیال کیا جائے تو روانی اور آمد کنٹرلیف لے جاتی ہے۔ نظر ثانی میں درست کر لیا جاتا ہے یہی وجہ ہوئی کہ ایک جگہ نظر چوک گئی اور ممکن ہے کہیں اور بھی کچھ رہ گیا ہو۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ یہاں کے کاتب کبھی پوری ترمیم نہیں بناتے۔ کتاب کی سرسری ورق گردانی میں صفحہ ۴۰ کے دوسرے شعر میں ایک اور غلطی ملی جو آپ کی نظر سے بھی رہ گئی ہے ؎

وہ نوشتہ نواب نے جو پڑھا چہرہ غصّے سے تمتما اُٹھا

حالانکہ مصرع دوم اصل میں یوں ہے ع

چہرہ غصّے سے تمتمانے لگا

آپ کے نشانِ آرزو میں تو اغلاط کی انتہا ہی نہیں۔ میزان الحروف میں جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ بڑی کاوش کی کہ غلطی نہ رہنے پائے۔ پھر بھی اغلاط رہ گئے مگر بہت کم جن کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ آپ کے شبہات کے جواب حسب ذیل ہیں:-

(۱) لپشتی اور کشتی ... میں آپ کو اختلاف حذو کا شبہ ہے۔ اس میں دراصل روی "ی" ہے۔ "ش، ت" حروف قافیہ نہیں اور ماقبل روی کی حرکت میں اختلاف نہیں اور اگر "ت" کو روی فرض بھی کر لیا جائے تو وہ متحرک ہے اور روی کے متحرک ہو جانے کے بعد حرکت ماقبل روی کی پابندی اُٹھ جاتی ہے۔

(۲) آپ نے بعض اشعار میں ایطائے خفی کا شبہ ظاہر کیا ہے۔ "حال پرسی" اور "کم نصیبی" میں ایطائے خفی کا لحاظ کرتا ہوں، لیکن جہاں حرف زائد قائم مقام اصلی ہو جائے وہاں تکرار مرفع المعنیٰ جائز جانتا ہوں۔ "حال پرسی" کی "ی" ایسی ہی ہے جو کلمہ سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ پھر "پرس" باقی رہتا ہے جو انفراداً اردو میں مستقل ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

(۳) "پلٹے" امر بالمعنی ہو سکتا ہے لیکن "ہو" انفراداً امر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے 'ہوئے' مستقل مانا جائے گا اور ایک جگہ روی کا مستقل ہونا کافی ہے۔

(۴) نوّاب بتشدید اصل لغت کے موافق ہے اور بلا تشدید استعمال عام ہے جو فصیح تر ہے۔

(۵) صفحہ ۳۲ شعر ۱۰ مصرع دوم اس طرح ہے۔

"ہاں وہ صولت جو ہے گرانمایا" — "صولت گرانمایہ" آیا کا قافیہ نہیں بن سکتا۔

(۶) 'احسان مند' اردو میں باخفائے نون مستعمل نہیں اس نون کو خفی کر کے بولنا زبان کو بگاڑنا ہے اور لہجہ کا خفیف سا اثر اسے حکم ہندی میں نہیں لا سکتا۔ ایسے الفاظ بہت سے ہیں۔ مثلاً "اطمینان" اگر کوئی کہے کہ یہ امر ہمارے لئے لائق اطمینان ہے تو یہاں بھی اضافت فارسی کا اثر لفظ عربی قبول نہ کرے گا۔ اس لئے کہ اخفائے نون نہ اصل لغت میں ہے نہ استعمال فصحائے اردو میں "احسان مند" کی جگہ 'منّت پذیر' بھی آ سکتا تھا۔ مگر میں اردو میں فارسی کے غلبے کو پسند نہیں کرتا۔ "احسان مند" بھی فارسی سہی مگر استعمال اردو میں ہے۔ بخلاف اس کے منّت پذیر سوا شعر کے روزمرہ میں داخل نہیں ہے۔

(۷) "ہاتھ" کی 'د' تلفظ سے بھی ساقط ہو چکی ہے۔ پھر اس بے کار کی پابندی سے کیا فائدہ اسے 'بات' کے قافیہ میں بھی لا سکتے ہیں اور 'ساتھ' کے قافیہ میں بھی۔

(۸) 'آہن' اور 'بردن' پر منحصر نہیں اشباع حرکت سے جو حرف حرف قافیہ کا قائم مقام ہو گا اس کا مکتوبی شکل میں آنا ضروری ہے۔

اسی اصول کے ماتحت ہائے مختفیہ فارسی جو اظہارِ حرکت ماقبل کے لئے آتی ہے، الف کے ساتھ قافیہ ہونے پر الف سے بدل جاتی ہے۔

(۹) نواب پاس۔ بغیر حرف اضافت صرف قدما کا طرزِ بیان نہیں آج بھی ہے" کی "یا" کے "کی علامت اضافت ہر جگہ ضروری نہیں ہے۔ صرف اسمائے اشارات کے ساتھ ضروری ہے۔ مثلاً" میں ان کے پاس گیا۔"

(۱۰) ع غم دل کو کیونکر نہ فسانہ جانے الخ اس کی تقطیع آپ نے بحر مدید میں کی ہے۔ بیشک یہ تقطیع ہو سکتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے میں نے 'فاصلہ، وتد اور سبب کے بالترتیب امتزاج سے یہ وزن پیدا کیا ہے نام جو چاہے رکھ لیجے'۔ میزان الحروف کے مقدمے میں پرتو نے اس وزن پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔

نشانِ آرزو کی تاریخیں پہونچ گئیں ان کا شکریہ۔ تصویر فی الحال کوئی موجود نہیں ہے۔ آئندہ انشاءاللہ ارسال کروں گا۔

تخلّص کے متعلق یہ عرض ہے کہ آپ اس تخلّص سے مشہور ہو چکے ہیں اب اس کا بدل دینا بجائے مفید ہونے کے مضر ہی ثابت ہو سکتا ہے۔ میزان الحروف بھیج رہا ہوں۔

ناچیز
آرزو

مکاتیب حضرت جلیل مانکپوری

(۱)

از حیدر آباد دکن

۱۶۔ محرم الحرام ۱۳۵۲ھ

دل نواز! سلام مسنون

رسالۂ عروض[1] کی شرح جو آپ لکھے ہیں مناسب ہے۔ میں نے نمونہ دیکھا پسند آیا لیکن اصل کتاب کے اندر شرح کے متعلق کوئی لفظ نہ ہونا چاہیئے۔ خواہ قوسین کے درمیان میں ہو جب بھی جائز نہیں، شرح کو بالکل الگ تھلگ رکھنا چاہیئے خواہ حاشیے پر ہو خواہ نیچے بطور نوٹ کے ہو، جس طرح میں نے ہدایت کی ہے اس پابندی کے ساتھ کتاب کی تکمیل ہو جائے تو میں انشاءاللہ اس کو آپ سے طلب کر کے دیکھوں گا بعدازاں اس کو چھپوانا چاہیئے۔ تیسرا دیوان مرتب ہو رہا ہے ابھی چھپنا شروع نہیں ہوا۔

میرا اور اپنا میں جو لوگ شترگربہ سمجھتے ہیں وہ ان کی رائے ہے اور میری رائے یہ ہے کہ شترگربہ نہیں۔ میرے روزمرہ میں یہ زبان داخل ہے۔ یہ میرا اپنا خیال ہے یہ میری اپنی رائے ہے۔ غالب کا یہ مصرع زبانوں پہ ہے ع

میرا اپنا جدا معاملہ ہے

بات یہ ہے کہ میں سے جس طرح میرا اپنا ہے اسی طرح ہم سے ہمارا مشتق ہوا ہے لہذا ان دونوں میں شترگربہ یقینی ہے۔ اگر ہم سے اپنا بھی بنا ہوتا تو میرا کے ساتھ شترگربہ ہو سکتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم سے اپنا کو کوئی لگاؤ نہیں۔ پھر شترگربہ کیسا۔ اپنا خود کا ترجمہ ہے اور میں اور ہم دونوں کے ساتھ آتا ہے، جیسا کہ 'خود' کا لفظ دونوں کے ساتھ آتا ہے۔ اگر اس کو کوئی نہیں مانتا تو وہ اپنی رائے کا ذمہ دار ہے۔ تاریخ انشاءاللہ بھیجوں گا۔ وقت بالکل نہیں ملتا میں تنہا ہوں اور کام کی کوئی حد نہیں۔

والسّلام
جلیل کان اللہ لہٗ

(۲)

دل نواز! سلام مسنون

بحمداللہ کہ یہاں خیریت ہے۔ اللہ سبحانہ کا شکر ہے۔ آپ کی والدہ محترمہ کی رحلت کا واقعہ نہایت دل خراش ہے۔ ایسی بزرگ ہستی کا سایہ سر سے اُٹھ جانا اولاد کے لئے قیامت خیز

[1] فصاحت جنگ جلیل کے 'رسالہ عروض' پر والد مرحوم نے حواشی لکھے تھے۔ خط میں اسی جانب اشارہ ہے۔

واقعہ ہے۔ مگر اللہ سبحانہ کی جو مرضی بجز راضی برضا رہنے کے اور کیا چارہ ہے۔ جس طرح آپ کے لئے وہ دنیا میں باعث رحمت و برکت تھیں اسی طرح اب ارحم الراحمین کے پاس پہونچ کر آپ کے فلاح و بہبود میں مساعی رہیں گی۔ یہ امر کچھ کم باعث تسکین ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے اور مرحومہ کو جنت میں اعلیٰ مقام نصیب کرے۔ ایک مختصر قطعۂ تاریخ لکھ کر بھیجتا ہوں۔
باقی خیریت والسلام

فصاحت جنگ جلیل

قطعۂ تاریخ

نفیس اپنی ماں کے لئے ہیں نڈھال
وہ راحت سے رحمت کے دامن میں ہیں
لکھو تم یہ تاریخ رحلت جلیل
وہ مرحومہ جنت کے گلشن میں ہیں

۱۳۵۸ھ

(۴)

حیدرآباد دکن
۶۔ نومبر ۱۹۲۴ء

دل نوازا! سلام مسنون

جناب محمد یوسف شرقی نے تاریخ ولادت فرزند کی فرمائش کی تھی، آج قطعۂ تاریخ موزوں کر کے ان کو میں نے بھیجا ہے۔ آپ کی یہ تاریخ دیکھنے میں آئی جو یوسف صاحب شرقی نے بھیجی تھی۔

ماہ وش خندہ دہن یوسف زماں پیدا ہوا

تاریخ اچھی ہے۔ لیکن یوسف زماں کی اضافت رہ گئی لہٰذا میری رائے ہے کہ اس کو شائع نہ کرنا چاہیئے اطلاعاً آپ کو لکھتا ہوں، امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے

والسلام

فصاحت جنگ جلیل کان اللہ لہٗ

جنوبی افریقہ سے چین کی تجارت — دو عملی کا بے مثال نمونہ

حال ہی میں عوامی جمہوریہ چین کے قیام کی ۱۴ ویں سالگرہ کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے چینی وزیراعظم چو۔این۔لائی نے کہا کہ "ایشیائی افریقی اور لاطینی امریکہ کے ملکوں میں عوام کی جاری کی ہوئی قومی جمہوری تحریکات کی حمایت کرنے میں ہم نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے"۔ بے شک چین نے اپنی کوششوں میں کسر تو کوئی نہیں اٹھا رکھی ہے لیکن ان کوششوں کا مقصد دوسرا ہے۔ یعنی قومی جمہوری تحریکوں سے تعاون کرنے کے بجائے اس نے ان حکومتوں سے تعاون کیا ہے جو ان تحریکوں کو کچل رہی ہیں۔

آج جنوبی افریقہ اپنی نسلی علیحدگی کی پالیسی کی وجہ سے ساری دنیا کے مہذب اور آزادی پسند ملکوں کی ملامت کا مرکز ہے۔ بیشتر ملکوں نے اس سے ہر طرح کے تعلقات منقطع کر دیئے ہیں کیوں کہ جنوبی افریقہ خود اپنے ہی باشندوں کو بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھے ہوئے ہے۔

اب یہ راز آشکار ہو چکا ہے کہ چین جو ایشیا اور افریقہ کی محکوم قوموں کی آزادی کی وکالت کا اتنا شور مچاتا ہے جنوبی افریقہ سے برابر تجارتی تعلقات قائم کئے ہوئے ہے اور اسے جنوبی افریقہ کے عوام اور افریقی و ایشیائی ملکوں سے کی ہوئی اپنی یقین دہانیوں کا قطعاً کوئی احترام نہیں۔

دائرۃ المعارف العثمانیہ

صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اپنے قیام حیدرآباد اگست ۱۹۶۳ء کے موقع پر علم کے مختلف مراکز مثلاً ایران، افغانستان جامعہ الازہر قاہرہ وغیرہ کے اپنے دورہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ دائرۃ المعارف کے عربی اور فارسی ادب کی ترقی کے سلسلے میں کئے گئے کاموں کی بے حد قدر کی جاتی ہے۔ دائرۃ المعارف کی سرگرمیوں کی ستائش کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ اس سے مشرق وسطی کے ممالک سے ہمارے تہذیبی تعلقات کو مستحکم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

۱۸۸۵ء یا ۱۸۸۶ء کی بات ہے کہ مولانا انوار اللہ خاں، نواب فضیلت جنگ مرحوم معین المہام امور مذہبی، مولانا سید حسین بلگرامی نواب عماد الملک مرحوم کے پاس بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ انھیں ایک ردی کاغذ نظر آیا جس میں بازار سے کوئی چیز باندھ کر لائی گئی تھی۔ نواب عماد الملک نے اس کاغذ کو پڑھا تو پتہ چلا کہ یہ مشہور کتاب "کنز العمال" کا ایک ورق ہے۔ یہ کتاب قلمی تھی۔ فوراً انھیں خیال آیا کہ کیوں نہ ایسی نادر الوجود کتب کو محفوظ رکھنے کا کام انجام دیا جائے۔ انھوں نے نواب فضیلت جنگ اور ملا عبد القیوم سے مشورہ کیا اور ان تینوں علماء نے قدیم اور کمیاب کتابوں کی دوبارہ اشاعت اور ان کے تحفظ کے لئے ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا، چنانچہ نواب عماد الملک نے ۱۸۸۸ء میں دائرۃ المعارف کے قیام کا فیصلہ کیا اور ملا عبد القیوم کے مکان میں یہ ادارہ قائم کر دیا گیا۔

اس ادارہ کا مقصد سنہ ایک ہجری سے ۱۳۰۰ ہجری کے دوران لکھی ہوئی عربی کتابوں کو جمع کرنا، ان کا تحفظ اور انھیں دوبارہ شائع کرنا قرار دیا گیا۔ چوں کہ اس مدت میں عربی زبان میں بہت ہی نایاب اور اعلیٰ درجہ کا ادب پیدا ہوا تھا اور اس دوران میں عربی زبان کے ادیبوں نے شاندار ادبی، سماجی، مذہبی، تہذیبی اور سائنسی خدمات انجام دی تھیں۔

اس ادارہ کو چلانے کے لئے سرمایہ بالکل نہیں تھا چناں چہ نواب عماد الملک، ملا عبد القیوم اور نواب فضیلت جنگ نے چندے جمع کئے۔ سرمایہ کے حصول کے لئے ملا عبد القیوم نے تین لاکھ روپے کی ایک لاٹری جاری کی۔ لاٹری کے آغاز پر علماء و مشائخین نے ہنگامہ برپا کر دیا کہ یہ جوا ہے اور اس میں شرکت حرام ہے۔ چناں چہ لاٹری ختم کر دی گئی۔ نواب وقار الامراء نے جو اس وقت صدر اعظم تھے حکومت کی طرف سے اس ادارہ کو ماہانہ ۵۰۰ روپے یعنی سالانہ چھ ہزار روپیوں کی امداد منظور کی۔ اسی وقت یہ طے کیا گیا کہ دائرۃ المعارف کی گورننگ باڈی کا صدر بہ اعتبار عہدہ ریاست کا صدر اعظم ہوگا۔ چناں چہ اب ریاست کے چیف منسٹر کو بہ اعتبار عہدہ میر مجلس سمجھا جاتا ہے۔

۱۹۲۶ء میں جب عماد الملک کا انتقال ہوا تو حضور نظام نے فرمان جاری کیا کہ دائرۃ المعارف کو جامعہ عثمانیہ کا ایک علمی شعبہ قرار دیا جائے۔ چناں چہ دائرہ کا جامعہ سے الحاق ہو گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ جامعہ عثمانیہ کا وائس چانسلر بہ اعتبار عہدہ دائرۃ المعارف کا نائب میر مجلس ہوا کرے گا اور آج بھی اس پر عمل جاری ہے۔ البتہ

گورننگ باڈی اس طرح تشکیل دی جاتی ہے کہ چیف منسٹر صدر، وائس چانسلر نائب صدر، معتمد فنانس، معتمد تعلیمات اور جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر عربی بہ اعتبار عہدہ ارکان ہوتے ہیں اور دائرہ کے ناظم کو کمیٹی کا معتمد بنایا جاتا ہے۔

دائرہ کو جامعہ کا علمی شعبہ قرار دینے کے ساتھ ساتھ حضور نظام نے دائرہ کو ایک مشت پانچ لاکھ روپیوں کی امداد بھی دی۔ حیدرآباد کی وزارت فنانس پر جب مسٹر غلام محمد مرحوم فائز ہوئے تو انھوں نے امداد میں اضافہ کر دیا اور ۶ ہزار کی بجائے سالانہ ۱۶ ہزار کر دیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ بھی دائرہ کو سالانہ دس ہزار روپیوں کی امداد دیتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اپنے دورِ وزارت میں دائرہ کو ۴۰ ہزار روپے سالانہ کی امداد منظور کروائی۔

۱۹۵۳ء میں دائرۃ المعارف کے دستور پر نظر ثانی کی گئی اور دو نمائندہ کمیٹیاں اس ادارہ کے نظم و نسق کی ذمہ دار ہیں۔ اس ادارہ نے اب تک تاریخ، سوانح، ادب، فلسفہ، لغت، تفسیر، حدیث، شرعی قوانین، منطق، علم نجوم، علم حساب، علم الادویہ اور دیگر قدیم و جدید علوم کے بارے میں تقریباً تین سو کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کتابوں میں بعض کی ۱۶ اور بعض کی ۲ جلدیں بھی شامل ہیں۔

اس ادارے کا اپنا ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں ۲۵۰۰ کتابیں ہیں اور دنیا بھر کا منتخبہ کمیاب بلکہ نایاب عربی ادب شامل ہے۔ ان کتابوں میں چار سو سے زیادہ کتابیں قلمی ہیں۔ اس کے علاوہ ۲۵ اعلیٰ درجے کی کتابوں پر مشتمل مائیکرو فلم بھی موجود ہے۔ اس ادارہ کا جامعہ الازہر مصر، عرب اکیڈمی دمشق اور ایران عراق ترکی کے ثقافتی اور تحقیقاتی مراکز سے گہرا ربط ہے۔

(محمد عبید اللہ شریف)

انسانی حقوق کا عالمی اعلان

انسانی حقوق کا تحفظ اور نسل، جنس، زبان اور مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق روا نہ رکھنا اقوامِ متحدہ کے قیام کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد تھا۔ تمام ممبر ملکوں نے اس کا وعدہ کیا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پوری کوشش کریں گے۔

انسانی حقوق کا مسودہ تیار کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو جنرل اسمبلی نے اس کمیشن کے پیش کردہ مسودہ کو منظور کر لیا اور اس طرح ایک بڑا اہم اور تاریخی اعلان نامہ وجود میں آیا۔

انسانی حقوق کے اس اعلان میں ۳۰ دفعات ہیں۔ پہلے دو اور آخری تین دفعات عام نوعیت کے ہیں۔ بقیہ دفعات کو موٹے طور سے دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ (۱) ذاتی، شہری اور سیاسی حقوق (دفعات ۳ تا ۲۱) اور (۲) معاشی، سماجی اور تہذیبی حقوق (دفعات ۲۲ تا ۲۷)

انسانی حقوق سے متعلق یہ اعلان اقوامِ متحدہ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس کے ذریعے ساری دنیا نے انسان کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ ذاتی، شہری اور سیاسی حقوق کو زیادہ تر ملکوں نے اپنے دستور میں شامل کر لیا ہے جن میں ہندوستان بھی ہے۔ ہمارے دستور میں ہر شہری کو یکساں حقوق دئے گئے ہیں اور جنس، ذات، مذہب یا نسل کی بنیاد پر کسی قسم کی تفریق و امتیاز کو روا نہیں رکھا گیا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے اعلان نامے میں جن معاشی، سیاسی اور تہذیبی حقوق کی ضمانت دینے کو کہا گیا ہے ہمارے دستور نے انھیں بھی اور تقریباً تمام دیگر اہم دفعات کو بھی ہمارے دستور نے اپنایا ہے۔ چند ملکوں کو چھوڑ کر (جیسے جنوبی افریقہ اور پرتگال وغیرہ) تقریباً تمام ملکوں نے انسانی حقوق پر عمل درآمد کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔

یہی چیز دنیا کے بقا و سلامتی اور امنِ عالم کی ضمانت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جب ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ کوئی قوم نہ اعلیٰ و ارفع ہے اور نہ کوئی گھٹیا۔ ہر آدمی برابر ہے اور اسے یکساں حقوق حاصل ہیں۔ کوئی قوم کسی دوسری قوم کو غلام بنا کر رکھنے کا حق نہیں رکھتی۔ ہر قوم کو آزاد رہنے اور اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے تو پھر نزاع کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے۔

اقوامِ متحدہ اور اس کا یہ اعلان ایک طرح سے امنِ عالم کی ضمانت ہے۔ صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر رادھاکرشنن نے اقوامِ متحدہ کی ۱۰ ویں سال گرہ کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے بالکل صحیح کہا ہے کہ "عالمی امن و استحکام کے لئے جو لازمی شرائط ہیں اُن میں نوآبادیاتی چنگل سے نجات، نسلی امتیاز کا خاتمہ اور پس ماندہ اقوام کی معاشی ترقی شامل ہے۔" انسانی حقوق کے اعلان نامے کا بھی یہی مقصد ہے۔ صدرِ جمہوریہ نے اپنی تقریر میں آگے چل کر ایک بڑے اہم پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے "آج انسان کو سب سے بڑا خطرہ انسان سے ہے۔۔۔ جب ہمارا علم بڑھے تو ہمارے روپ اور ہمارے چلن کو بھی ہمارے علم کے شایانِ شان ہونا چاہیئے۔ تنہا انسانی فطرت سے واقفیت کافی نہیں ہے اس کے لئے اخلاقی حس تیز تر کرنے کی ضرورت ہے۔

بہرحال دنیا میں پھیلے ہوئے شکوک و شبہات اور بعض ممالک کے جارحانہ عزائم کے باوجود اقوامِ متحدہ انسانیت کی سلامتی اور امنِ عالم کے قیام کا واحد سہارا ہے اور بقول ڈاکٹر رادھاکرشنن "ہمیں اس تنظیم کو مضبوط کرنے کے لئے حتی الامکان کوشش کرنی چاہیئے۔"

بھارتی تجربہ بالآخر کامیاب ہوگا

لبنان کے ایک اخبار "الاحد" میں حال ہی میں شائع شدہ ایک مضمون میں کہا گیا ہے کہ بھارت میں سوشلزم کے مستقبل کا فیصلہ ہو رہا ہے۔

مضمون میں کہا گیا ہے کہ دنیا میں ترقی پسند اور رجعت پسند قوتوں میں جو کشمکش جاری ہے اس میں بھارت سماجی و اقتصادی شعبوں کے لحاظ سے بے حد اہم ہے۔ اس وسیع و عریض سرزمین میں جہاں پر کہ مختلف مذہبوں، فرقوں، عقیدوں، زبانوں و قومیتوں کے لوگ بستے ہوں اور جہاں کی آب و ہوا میں جگہ جگہ فرق ہو اقتصادی شعبوں میں ترقی و توسیع سے متعلق بڑے بڑے تجربے ہو رہے ہیں تاکہ یہاں کے ۴۰ کروڑ عوام کا معیارِ زندگی بلند ہو سکے اور بیشتر پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کیا جا سکے اور اس طرح قوم کو پس ماندگی کی راہ سے ہٹا کر ترقی و خوش حالی کی ڈگر پر لگایا جا سکے۔

اس حالت پر قابو پانے کے لئے بھارت کو دو راستوں میں سے ایک کو اختیار کرنا تھا۔ یا تو انقلابی طریقہ جس سے کہ تمام نقوشِ کہن کو آنِ واحد میں ختم کر دیا جائے یا آہستہ آہستہ تدریجی تعمیر نو اور اصلاح کا طریقہ جس میں کہ زیادہ اکھاڑ پچھاڑ کئے بغیر کام ہو سکے اور جس سے کہ عوام کو دھکا نہ پہونچے اور کوئی ہیجان واقع نہ ہو۔ بھارت نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور صنعت کو آراستہ کرنا شروع کر دیا اور پیداوار بڑھانی شروع کی۔ اس نے پچھمی اور پوربی ملکوں سے ہی امداد لی اور اس طرح دیش کے اندر ایک اقتصادی اور سماجی انقلاب لانے کی کوشش کی۔

غیر وابستگی اور اعتدال کی اس پالیسی پر کاربند ہوئے اسے سولہ سال گذر گئے ہیں — اس کا کیا نتیجہ ہوا؟ اور یہ تجربہ بھارت کے ارتقاء اور ترقیاتی منصوبوں پر کس حد تک اثر انداز ہوا —؟ یہ سوال بے حد اہم ہے نہ صرف بھارتی عوام کے نقطۂ نظر سے بلکہ پوری دنیا کے نقطۂ نگاہ سے، کیوں کہ اس کے مقابلے میں ایک دوسرا تجربہ بھی موجود ہے اور وہ ہے کمیونسٹ چین کا تجربہ۔

ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے تمام پس ماندہ ملک ان مختلف تجربوں کے نتائج دیکھنے کے منتظر ہیں تاکہ انھیں معلوم ہو سکے کہ ان دونوں میں سے کون سا تجربہ کامیاب ہے اور ترقی و خوشحالی حاصل کرنے کے لئے کون سا راستہ اختیار کرنا مفید ہوگا۔

یہ بات کسی کے لئے اب ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ ماؤ سی تنگ کی عرصۂ دراز سے یہ کوشش ہے کہ وہ بھارت کو اصلاحات کی پالیسی سے ہٹا کر انقلابی راستہ پر لگا دے۔

اس مقصد کے لئے وہ ہر طرح کے ذرائع اختیار کرتا ہے — نظریاتی، سیاسی اور فوجی دباؤ استعمال کرتا ہے۔ اس فوجی دباؤ کے تحت اس نے سرحدوں پر مسلح جارحانہ اقدام کئے۔ اس نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ اس انقلاب کے بانی پنڈت نہرو کو جلد باز، ڈھل مل یقینی اور متزلزل ثابت کر کے ان کی شہرت کو بٹہ لگائے اور یہ ثابت کرے کہ وہ بھارت پر قبضہ جمانے کے خواہش مند سرمایہ داروں و سامراجیوں کے آلۂ کار ہیں۔

ترتیب

سرورق:- گاؤں کا ایک منظر ــ عمل:- شری ادیجہ
رسالے کی پُشت پر:- ایک ناگا سردار

جلد ۲۲ ــ نمبر ۷

اگہن شک سمت ۱۸۸۵
فروری ۱۹۶۴ء

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل (اردو) اولڈ سیکرٹیریٹ دہلی

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل دہلی

سالانہ چندہ:-
- ہندوستان میں:- سات روپے
- پاکستان میں:- سات روپے (پاک)
- غیر ممالک سے:- ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ:-
- ہندوستان میں:- ۶۰ نئے پیسے
- پاکستان میں:- ۶۰ پیسے (پاک)
- غیر ممالک سے:- ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

مُلاحظات

افریقی براعظم سے رفتہ رفتہ تاریکی چھٹتی جا رہی ہے۔ آزادی کا اُجالا اب اس براعظم کے ایک بڑے حصے پر پھیل چکا ہے۔ حال میں زنجبار اور کینیا نے بھی غلامی کے جُوئے کو اتار پھینکا ہے اور آزاد ملکوں کی صف میں شامل ہو گئے ہیں۔ ہندوستان ہمیشہ سے قوموں کی آزادی اور خود مختاری کا داعی رہا ہے اسی لئے صدر جمہوریہ ہند اور وزیر اعظم سری نہرو نے اس موقع پر دونوں ملکوں کے سربراہوں کو مبارکباد کا پیغام بھیجتے ہوئے اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا ہے۔ یقین ہے کہ افریقہ کے دوسرے نو آزاد ملکوں کی طرح ان ممالک سے بھی ہمارے گہرے دوستانہ تعلقات قائم ہوں گے۔

حال ہی میں نئی دلی میں آبادی سے متعلق ایشیائی ملکوں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس میں پیش کردہ ایک سروے سے پتہ چلتا ہے کہ ۵۰-۱۹۶۰ء کے درمیان اس خطے کی آبادی میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا ہے۔ اس مدت میں تھائی لینڈ، ملائشیا اور فلپائن میں تقریباً ۳۵ فی صدی کا اضافہ ہوا ہے۔ ہندوستان کی آبادی بھی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ پوری دنیا اور خصوصاً ایشیائی ملکوں کے لئے آبادی کا یہ اضافہ ایک مسئلہ بنا ہوا ہے جس کے حل ہونے پر ہی ان ملکوں کی خوش حالی اور ترقی کا دار و مدار ہے۔ ورنہ یہ کثرت آبادی خوراک، رہائش اور روزگار کے معاملے میں بڑے سنگین مسائل پیدا کر دے گی۔ ہندا یوم خاندانی منصوبہ بندی کے موقع پر صدر جمہوریہ نے اپنے پیغام میں کہا ہے کہ خاندان کے افراد کی تعداد پر منصوبہ بند طریقے سے قابو رکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنی کہ ملک کی منظّم ترقی۔ عوامی شعور کو جگانا چاہیئے اور اس مقصد سے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں سطح پر کام کرنا چاہیئے۔ سری جواہر لال نہرو نے اسے 'کلیدی اہمیت' کا کام قرار دیا ہے۔

ہندی کے مشہور ادیب اور ناول نگار شری یش پال کی ساٹھویں سال گرہ کے موقع پر نئی دلّی میں ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں ہندی کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں نے ان کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالی اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ یش پال صفِ اوّل کے لکھنے والوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ہم ان کی درازیٔ عمر کے لئے دعا گو ہیں۔

ادبی حلقوں میں یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ منشی گوری شنکر لال اختر ۲۰ دسمبر ۱۹۶۳ء کو ایک مختصر علالت کے بعد الہ آباد میں انتقال کر گئے۔ وہ آنجہانی منشی پریم چند کے ہم عصر تھے۔ موصوف انتہائی منکسر مزاج اور نیک طبیعت بزرگ تھے۔ آپ نے لاہور سے رسالہ 'مان سروور' جاری کیا تھا جو ایک عرصے تک جاری رہا۔

ہمیں موصوف کے متعلقین سے دلی ہمدردی ہے۔

رشید احمد صدیقی

اِدھر اُدھر کی

ریل کے فرسٹ کلاس میں سفر کرنا خوش نصیبی ہے بشرطیکہ سفر خرچ دوسرے کے ذمہ ہو! اس کے علاوہ حُلیہ سر بغون جیسا، لباس صاف ستھرا جس میں سب نہیں تو ایک آدھ کا کپڑا مل کا تیار کیا ہوا ضرور ہو۔ یہ اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ بعض کپڑے حسب و نسب کے اعتبار سے تو نجیب الطرفین ہوتے ہیں لیکن ان میں خاصیت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ دُھلے ہوئے ہونے پر بھی دُھلے نہیں معلوم ہوتے اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے جسم پر صاف کپڑا بھی صاف نہیں معلوم ہوتا۔ خدا کے ایسے بندے بھی پائے جاتے ہیں جن کے جسم پر مَیلا کپڑا بھی مَیلا نظر نہیں آتا! یہ کرشمے کپڑے کے ہوں یا پہننے والے کے کچھ نہیں کہا جا سکتا! ممکن ہے اس میں "غبار، دھند، جالا" وغیرہ کو دخل ہو جو فضا میں اکثر، میری آنکھ میں بلشیر اور سرمے کے اشتہارات میں ہمیشہ ملتے ہیں۔

ٹرین میں جیسا کھانا جن برتنوں اور جس شکل میں پیش کیا جاتا ہے اس سے بچنے کے لئے ستھرے ناشتہ دان میں گھر کا کھانا ہو۔ تھرمس یا صراحی میں صاف پانی ہو۔ ہولڈال ایسا ہو جیسے اسی سفر کے لئے خریدا گیا ہو نہ یہ کہ بستر پرانی اُدوان یا میلی گرہ دار نواڑ کے ٹکڑے سے بندھا ہو ساتھی مسافر ایسے نہ ہوں جن کی بیویاں ہر اسٹیشن پر کورے گرد آلود آبخورے میں دودھ اور پتّے میں دہی بڑے خرید کر شوہر کے لیے فراہم کرتی ہوں۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ نوجوان خوبصورت خوش لباس اور خوش اطوار بیویاں یہ سارے کام انجام دینے پر مامور رہتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ گرمی یا برسات کا موسم ہوا تو بار بار ہولڈال سے تولیہ نکال کر شوہر نامدار کو مسلسل پسینہ پونچھتے رہنے کے لئے دیتی رہتی ہے اور شوہر صرف بنیان میں ملبوس تکیہ لے کر کبھی اوپر کی برتھ پر جا لیٹتا ہے کبھی فوراً ہی نیچے اتر کر غسل خانے میں داخل ہو جائے گا اور وہاں سے نکل کر نچلی برتھ پر دراز ہو جائے گا۔ اس کی یہ اور دوسری اضطراری حرکتیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ فرسٹ کلاس میں اسے وہ چین یا فضا نہیں میسّر ہے جس کا وہ دراصل عادی ہے۔ تندرست ہٹّے کٹّے شوہر کا سفر میں، بیوی سے خادمہ کا کام لینا بڑی بدتمیزی ہے۔

ہمسفر کی سیرت کا اندازہ اس طرح بھی کرتے ہیں کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ کیا اور کیسا سلوک روا رکھتا ہے، نیز غسل خانہ استعمال کرنے کے طور طریقوں سے واقف ہے یا نہیں۔ ایسا تو نہیں کہ فرسٹ کلاس کا کرایہ ادا کرکے وہ یہ سمجھنے لگتا ہو کہ فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کے آداب سے بھی وہ بری ہو گیا! شریفوں کا شیوہ تو یہ ہے کہ وہ اوّل درجے ہی میں نہیں تھرڈ کلاس میں بھی فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کے آداب ملحوظ رکھتے ہیں۔ ہر اسٹیشن پر مونگ پھلی، پکوڑے، دہی بڑے، کھیرا، ککڑی یا آم وغیرہ کھانے، پتا چاٹنے اور ان کو کمپارٹمنٹ میں ڈال دینے سے مجھے بڑی گھن آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس وحشی اور گنوار نے غسل خانہ اور کمپارٹمنٹ ایک کر دیا ہو۔

مجھے دولت پسند ہے۔ سب سے زیادہ اس لئے کہ اس سے میں دوسروں کو 'مستغنی الاحوال' بنا سکتا ہوں لیکن ایسے نودولتوں

کو چھوٹے سے نبی چھونا پسند نہیں کرتا جو دولت کے زعم میں اقدارِ عالیہ کو نظر انداز کر دیتے ہوں۔ اقدارِ عالیہ جتنے ہوں ہوا کریں بذاتِ خود میں نے اس میں حفظِ مراتب اور صفائی ستھرائی کو بھی شامل کر رکھا ہے۔

یہ ساری باتیں ناخواندہ مہمان کی طرح ذہن میں آگئیں۔ ظاہر ہے ایسے مہمان سے کسی نہ کسی طرح اور جلد سے جلد گلو خلاصی کرنے کی فکر دامنگیر ہوتی ہے۔ اس کا ایک طریقہ ہے کہ اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ناظرین کو بھی اس میں شریک کرے۔ دراصل جو واقعہ بیان کرنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ ایک بار یونیورسٹی کے خرچ پر فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ ایک صاحب پہلے سے موجود تھے۔ کالے، کم رو، کم سخن، اُبشرے سے بڑے ذہین، اپنے سے مطمئن، دوسرے سے بے نیاز، عمر کے اس حصے میں جب وہ ہوتی تو ہے کسی قدر زیادہ لیکن کم کر کے بتانے کی خواہش ہوتی ہے۔ یا اس لئے لکھنا پڑا کہ ایسا وقت بھی آتا ہے جب اصل عمر سے زیادہ بتانے میں تسکین حاصل ہوتی ہے۔ اپنے کو نہیں تو دوسروں کو!

کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے موصوف کو میرا آنا پسند نہ آیا ہو۔ حلیہ شریف کا کوئی سوال نہ تھا اس لئے کہ میری صورت دیکھ کر وہ کیا کوئی بھی احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہو سکتا۔ میں نے نہایت شریفانہ لہجہ اور آداب کے ساتھ سلام کیا۔ اس کا جواب انھوں نے اس طرح دیا کہ میں ان سے آئندہ کسی قسم کی توقع نہ رکھوں۔ ان کے اس سلوک سے دل ہی دل میں بہت محظوظ ہوا۔ بد دماغ سے بد دماغی کا مظاہرہ ہو تو مجھے بڑا لطف آتا ہے جیسے وہ شخص اپنے ہی جوشاندہ میں جوش کھا رہا ہو۔ اس وقت مجھے وہ مثل یاد آئی جو کہیں پڑھ چکا تھا یعنی اس بدصورت عورت سے زیادہ بدماغ اور مغرور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا جس کی شادی ہو گئی ہو!

ان کی طرح میں، یا میری طرح وہ ٹرین سے سفر کے تو قائل تھے لیکن ٹرین کے آب و دانہ کے نہ تھے۔ اس لئے دونوں نے خورد و نوش کا انتظام پبلک سیکٹر کے بجائے پرائیویٹ سیکٹر سے کر رکھا تھا۔ ان کا ناشتہ دان تامچینی کا تھا میرا المونیم کا۔ جہاں تک اندازہ لگانے کا تعلق ہے خوراک فرد کرنے کی جو صلاحیت بظاہر ان میں معلوم ہوتی تھی اس کی رو سے ان کا ناشتہ دان بڑا اور اسی اعتبار سے میرا چھوٹا تھا۔ اسی سے ناشتہ دانوں کی مشمولات و مقدار کا بھی حساب لگایا جا سکتا ہے۔ میرے پاس پانی کی مراحی اور گلاس تھا، انھوں نے اس کا انتظام بوتلوں میں کر رکھا تھا۔ میں گلاس میں پانی انڈیل کر پیتا تھا، وہ براہ راست بوتل سے پیتے تھے۔ ان کا پینا بالجہر ہوتا میرا بالسّر۔

میں دوپہر کا کھانا گھر سے کھا کر چلا تھا۔ یوں بھی ایک زمانے میں میں کھانے میں نہ وقت کا پابند تھا نہ بھوک کا۔ جب ملا جتنا ملا کھا لیا۔ کبھی دو ایک وقت فاقہ کشی/تنگی کا بھی۔ یوں بھی کھانے کے فن کاروں نے بتایا ہے کہ کھانے کے لئے بھوک کو نہیں مواقع کو اہمیت دینی چاہیئے۔ اسی طرح اگر دو ایک وقت کھانا نہ ملے یا طبیعت کے مطابق نہ میسر آئے تو آمادۂ فساد نہ ہونا چاہیئے۔ شریف آدمی کو ٹھکانے کا کھانا بالعموم مل کر رہتا ہے۔

گھر سے کھا کر چلنے میں ایک مصلحت یہ بھی ہوتی ہے۔ روکھا پھیکا روزمرہ کا کھانا تو حسبِ معمول گھر پر کھا لیا۔ اس طرح اچھے ناشتے کی مقدار میں جو مسفر ہونے والا تھا کمی نہ آئی۔ دوسرے، گھر والوں کا کہنا یہ تھا کہ سفر شروع نہ ہو چکا ہو تو سفر کے کھانے میں ہاتھ لگانا کیسا! پھر یہ بھی ممکن ہے راستے میں دوسروں کو بھی شریکِ دسترخوان کرنا پڑے تو کھانے کی کمی کی وجہ سے اس کی نوبت نہ آئے کہ ایک دوسرے سے تا اختتامِ سفر آنکھ نہ ملا سکیں! اس لئے میں سفر میں ناشتے کی مقدار ذرا زیادہ ہی رکھتا ہوں!

لنچ کا وقت آیا۔ ہمسفر نے ناشتہ دان کھولا۔ اللہ کا دیا سب کچھ موجود تھا جسے انھوں نے اس رغبت سے اتنا جلد جلد اور اس مقدار میں کھانا شروع کیا جیسے وہ اپنا نہیں کسی دوسرے کا کھانا کھا رہے ہوں! میں اس کا منتظر تھا کہ رسماً یا اخلاقاً مجھے بھی شرکت کی دعوت دیں گے۔ چونکہ میرے پاس خود کھانے کا سامان موجود تھا اس لئے انھیں میری طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ دعوت دینے کا بدلہ میں بھی کر سکتا تھا لیکن کچھ ایسا معلوم ہوا کہ کھانے کے معاملے میں وہ ہر شبہے کو یقین پر ترجیح دینا پسند کرتے ہیں۔

انھوں نے مطلق التفات نہ کیا تو میں غور میں پڑ گیا کہ یہ کس قبیلہ یا قماش کے آدمی تھے کہ اتنا معمولی اور بے ضرر آداب ملحوظ رکھنے کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ وہ کچھ اس طرح کھانے کے شغل میں منہمک رہے کہ میں ان کی ولدیت قومیت، سکونت، وارد حال وغیرہ کے بارے میں کوئی رائے نہ قائم کر سکا۔ وہ کھاتے رہے اور میں پیچ و تاب میں مبتلا رہا۔ یکایک انھوں نے ایک مسلّم پیاز نکالی اور اوپر کا ہلکا پھیکا سرخ چھلکا دور کر کے براہ راست

دانتوں سے کاٹ کر اس طرح اس کو کھانا شروع کیا جیسے وہ پیاز نہیں "آڑو یا آلوچہ تھا۔ اس کے بعد کچھ دیر تک طرح طرح کی مٹھائیوں سے شغل فرماتے رہے۔ ایک بوتل کا نصف پانی غٹ غٹ پی گئے اور اطمینان کا "ڈکار آہنگ" سانس لیا۔ ناشتہ دان بند کر دیا اور باوجود اس کے کہ گرمی کا موسم تھا سر سے پاؤں تک کمبل تان کر لیٹ رہے۔ گرمی کا موسم، دوپہر کا وقت، کمبل کا اوڑھنا کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ذرا دیر میں خراٹے کی آواز آنے لگی۔ معلوم نہیں کیوں مجھے سونے میں خراٹے کی آواز اور باآواز بلند ڈکار لینے سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ وحشت کی بجائے کوئی اور لفظ لکھنا چاہتا تھا لیکن "سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا" کی بنا پر جہاں کا تہاں رہ گیا۔

گاڑی چلتی رہی وہ خراٹے لیتے رہے اور میں سوچتا رہا۔ کچھ اس طرح سے سوچتا جس پر دیکھنے والوں کو اونگھنے کا گمان ہو۔ ایک بڑے اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ پلیٹ فارم پر ان کی پذیرائی کے لئے اتنے اور ایسے ایسے لوگ نظر آئے کہ مجھے خدشہ ہونے لگا کہ ان کی پذیرائی میری گرفتاری پر نہ ختم ہو۔ کچھ بڑے لوگ پلیٹ فارم پر مؤدبانہ ہاتھ ملانے لگے۔ ان سے چھوٹے "اٹنشن" تھے اور جو ان سے بھی کمتر درجے کے تھے وہ کمپارٹمنٹ سے سامان اتارنے کے لیے اس طرح جھپٹے کہ میں سمٹ کر اپنی سیٹ کے گوشے میں پاؤں اٹھا کر بیٹھ گیا کہ کہیں اسباب کے ساتھ اس خاکسار "اسباب بغاوت ہند" کو بھی حراست میں نہ لے لیں۔

جس ہنگامے پر کمپارٹمنٹ اور پلیٹ فارم کی رونق تھی وہ کچھ ماند پڑی تو اپنے ہی جیسے چلیے اور اوقات کے ایک صاحب سے دریافت کیا کہ یہ بزرگ کون تھے۔ انھوں نے نام القاب اور منصب بتائے تو اطمینان ہو گیا کہ جو کچھ ان کے بارے میں خیال تھا وہ صحیح تھا اور کھانے پر رسماً بھی مدعو نہ کرنے اور سموچے پیاز علی الاعلان کھانے میں وہ بالکل حق بجانب تھے۔

ایک کام کے سلسلے میں کئی سال یونی ورسٹی لائبریری جانا پڑتا تھا جہاں دفتر واقع تھا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ عمارت کے سامنے دور دور تک شوقِ شہادت میں سرشار (غالباً گرمی کا موسم تھا) بھڑکیلے رنگ کی قمیصوں اور چست پتلونوں میں ملبوس یونیورسٹی اور اطراف وجوانب کے نوجوانوں کا ہجوم متلاطم ہے۔ مجمع بڑھتا جاتا تھا اور اس کے بے قابو ہونے کے آثار بھی پیدا ہو چلے تھے۔ قریب کے ایک صاحب سے پوچھا۔ "یہ ماجرا کیا ہے؟"

پہلے تو انھوں نے مجھے سر سے پاؤں تک اس طرح دیکھا جیسے ان کے سامنے میں نہ تھا اصحاب کہف میں سے کوئی صاحب تھے۔ پھر بولے آپ نہیں جانتے کہ لائبریری میں آج ایک فلم کی شوٹنگ ہونے والی ہے۔ ایک کمپنی آئی ہوئی ہے۔ میں نے عرض کیا تو اس میں کیا حرج ہے۔ فرمایا ہیرو اور ہیروئن کو ہماری نئی خوبصورت لائبریری میں مصروف مطالعہ یا معاشقہ دکھانے والے ہیں۔ میں نے عرض کیا یہ تو کوئی ایسی بات نہیں یہ تو یوں بھی ہوتا رہتا ہے۔ کہنے لگے آپ کہیں باہر سے آئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ پوائنٹ یہ ہے کہ لائبریری، یونیورسٹی اور "تا بہ ثریا از آں ماست" ہیرو ہیروئن بننے کا پہلا حق ہمارا ہے ورنہ پھر یہ کیا جائے کہ ان دونوں میں سے ایک پبلک سیکٹر کا ہو دوسرا پرائیوٹ کا۔

میں نے کہا پرائیوٹ اور پبلک سیکٹر کا درد سر تو حکومت کا ہے۔ ہم آپ اس جھگڑے میں کیوں پڑیں۔ ہمارا آپ کا درد تو کچھ دوسرا ہے۔ آپ تو جانتے ہوں گے ہر ڈرامے میں ہیرو ہیروئن کے علاوہ ایک اور کردار بڑا جاندار ہوتا ہے۔ بولے وہ کیا۔ میں نے کہا ویلن کا! ایک مسخرے کی بھی ضرورت ہوگی۔ پہلے پر آپ اکتفا کیجیے دوسرے پر میں! اس وقت تو ان فلم والے غریبوں کو پیٹ کا دھندا کر لینے دیجیے، ہم آپ تو نمبری ہیں کہیں اور راستہ نکال لیں گے۔ مسکرا کر بولے۔ "مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو۔" میں نے مؤدب ہو کر داد دی تو گرج کر فرمایا "ہر کہ شمشیر زند سکّہ بنامش خوانند" مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب جبکہ یہ شعر پڑھنے لگے ہیں کچھ نہ کر پائیں گے۔

اتنے میں ایک جوان، سادہ لباس میں نمودار ہوئے۔ غالباً پولیس کے محکمہ سے تعلق رکھتے تھے، پوچھا کیوں جی یہ کون تھا جس نے ابھی ابھی کرپان کا نام لیا تھا۔ میں ڈر گیا اور "....... من نہ بودم" کہتا ہوا آفس میں جا چھپا۔ تھوڑی دیر بعد جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ مجمع منتشر اور میدان صاف ہو گیا ہے۔ تعجب ہوا کہ انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگائے اور آس پاس کا حلیہ بگاڑے بغیر مجمع کس طرح پسپا ہو گیا۔

بتایا گیا کہ اربابِ یونیورسٹی نے سمجھایا، پولیس نے دھمکایا، فلم والوں نے راہِ فرار اختیار کی اس لیے "تماشا نہ ہوا"!

بات آئی گئی ہو گئی۔ "جاڑا، گرمی، بہار، برسات" اور ان کی صبح و شام اُکتا دینے والی یکسانیت کے ساتھ گزرنے لگے جن کو میں زندگی کا ناقابل برداشت خلجان سمجھنے اور محسوس کرنے لگا ہوں، ورنہ ایک زمانہ تھا جب "ہر رت میں نیا سماں نئی بات" پاتا تھا۔ خیر یہ بات تو برائے بیت تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ از کار رفتہ اور تقریباً "مابعد الطبیعات" ہو جانے کے باوجود یہ خیال برابر آتا رہتا ہے کہ تیمور کی گھر کی حمیت کہاں گئی اور کیوں گئی؟ کیوں گئی، اس کا جواب تو واضح ہے یعنی "شامتِ اعمال" کی زد میں آگئی۔ رہا یہ کہ کہاں گئی۔ اس کے بارے میں گمان ہوتا ہے وہ کہیں گئی نہیں ہے صرف متاعِ کاسد ہو کر رہ گئی ہے اس لئے کوئی اس کا خواہاں نہ رہا۔

جہاں سنئے، جدھر دیکھئے نوجوانوں کا یکساں حال ہے۔ ایک زمانہ تھا بھلا یا بُرا، جب اخلاق و عادات میں نوجوان اپنے بوڑھوں اور بزرگوں کی تقلید کرتے تھے۔ اب بوڑھے اور بزرگ نوجوانوں کے اخلاق، عادات، لباس اور طور طریقوں کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ بوڑھوں کا یہ طریقہ جتنا مضحکہ خیز ہے اتنا ہی عبرت انگیز بھی ہے۔ یوں تو زمانے کا دستور ہمیشہ سے یکساں چلا آتا ہے۔ لیکن ایک نئی بات ضرور محسوس ہوتی ہے کہ پہلے زمانے میں بوڑھا ہونے سے کچھ قبل ہی لوگ اپنے کو بوڑھوں کے زمرے میں شمار کرنے لگتے تھے اور اسے شرافت اور وضعداری کا تقاضا اور امتیاز سمجھتے تھے۔ اب بوڑھا ہونے پر بھی اپنے کو بوڑھا سمجھنا عار سمجھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اکثر ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو اپنے کو نوجوانوں سے بھی زیادہ نوجوان قرار دئے جانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ کہتے ہیں اس طرح کی خود فریبی سے عمر بڑھتی ہے۔ عقل گھٹتی ہے تو گھٹتی رہے!

اب صورت حال کچھ اس طرح کی ہے کہ فرد ہو یا جماعت اپنے کو ہر طرح کے احتساب سے آزاد سمجھتی ہے۔ جس کے جی میں جو آتا ہے کر ڈالتا ہے چاہے اس کا نتیجہ کچھ ہی ہو۔ اب گناہ گناہ نہیں رہا۔ مان یہ لیا گیا ہے کہ جرائم کا ارتکاب بُرا نہیں، صرف اتنی احتیاط ضرور کر لینی چاہیئے کہ ملک کا قانون گرفت میں لے کر سزا نہ دے سکے۔ رہے اخلاقی گناہ ان کو ہر شخص کا ذاتی معاملہ قرار دے کر نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ ایسے معاملات میں دخل دینا فرد کی آزادیٔ فکر و عمل میں مخل ہونا ہے جو سب سے بڑا گناہ یعنی Bad Taste یا رکاکت ہے۔ مثلاً ناداری اور بھوک سے مجبور ہو کر کوئی بدنصیب دو مٹھی اناج یا ایک آدھ روٹی چرالے تو اس کو جیل خانہ بھیج دیا جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو زدوکوب کرتا ہے اور دوسرے کی بیوی سے التفات کرے تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ اس میں حائل ہونا بدمذاقی ہے۔ حالانکہ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اچھے یا بُرے شخصی اعمال ہی سوسائٹی کے قوام کو بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ بالفاظ دیگر شخصی یا نجی بداعمالی جس کو ہماری تہذیب نظر انداز کرتی ہے وہی قومی و اجتماعی بداعمالی کی محرکِ اعظم ہوتی ہے۔

اسے ایک تسلیم شدہ اصول مان لیا گیا ہے کہ جو خرابیاں ہم اپنے اردگرد پاتے ہیں ان کے اسباب جہالت، افلاس، بیماری اور ناموافق ماحول ہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری کوششوں سے ان مصائب میں بہت کچھ کمی آگئی ہے اور بتدریج آتی جا رہی ہے جسے بحیثیت مجموعی ہم نے معیار زندگی کی بلندی کا نام دے رکھا ہے، پھر کیوں

ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم

معیار زندگی کے اونچا ہونے سے معیار اخلاق کیوں نہیں اونچا ہوتا؟ ایسا تو نہیں، اس نظریے میں کوئی مغالطہ راہ پا گیا ہو۔ حالات کو دیکھتے ہوئے گمان یہ ہوتا ہے کہ یا تو معیار زندگی کے نشیب و فراز کا کوئی علاقہ معیار اخلاق کے نشیب و فراز سے نہیں یا پھر معیارِ زندگی کو ہر حال میں بڑھانا چاہیئے، معیار اخلاق اپنی صحت و سلامتی کے لیے کوئی دوسرا دروازہ دیکھے!

زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے لیے جو ذرائع اور وسائل اختیار کیے جا رہے ہیں وہ ٹھیک ہیں لیکن اس کی مضرتوں سے بچنے اور بچانے کے لیے اخلاقی اقدار کو مؤثر و مستحکم کرنے کی بھی اتنی ہی کوشش کرنی چاہیئے۔ ایک ترقی یافتہ قوم اور ملک کے جرائم و ذمائم غیر ترقی یافتہ قوم اور ملک کے جرائم و ذمائم سے کہیں زیادہ سنگین اور دُور رس ہوتے ہیں۔ معیار زندگی کو یکطرفہ ترقی دینے کے خطرات کی طرف توجہ کم مائل ہوتی ہے۔ شاید اس لیے کہ ثواب کمانے سے کہیں آسان گناہ سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ اس طرح کے دور از کار خیالات میں دیر تک الجھتا رہا۔ اس کے بعد زندگی کے معمولات شروع

ہو گئے اور خس پندار و کر ایں کشاکش با ادست" کا طلسم ٹوٹ گیا۔

علی گڑھ کا گرمی کا زمانہ بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اکثر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے اس موسم میں قضا و قدر ہم سے آدمیت کا شرف چھین لیتے ہوں۔ گرد، گرمی، تیز لو، تمام موجودات پر کرب و کراہت کا عالم! موت سے ڈرنا تقاضائے فطرت ہے لیکن ہر قیمت پر زندہ رہنے کی خواہش بھی کسی لعنت سے کم نہیں! ساری زندگی نیکنامی میں بسر کرنے کے بعد علی گڑھ میں گرمی کے زمانے میں مرنا بڑی ہی بدنصیبی ہے۔ دوڑ دھوپ، تجہیز و تکفین کا انتظام، عزیزوں اور شریفوں کا میّت کو دفنانے قبرستان لے جانا اور وہاں دیر تک انتظار کی زحمت اُٹھانا بڑا تکلیف دہ خیال ہے۔ جو آدمی جتنا بڑا ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کی تجہیز و تکفین میں شریفوں کو اذیت اُٹھانی پڑتی ہے۔ یہ صورت حال مرنے والے کے لیے کسی طرح موجب فخر نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کے خیالات غالب کے رہے ہوں گے جب انھوں نے یہ لافانی شعر کہا تھا،

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا!

اس بارے میں غالب اتنے غیور تھے کہ مرنے سے ایک منزل پہلے کی بھی اپنی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ مشہور قطعہ کا صرف آخری شعر کہہ دینا کافی ہوگا۔

پڑئیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو!

جب کبھی موسم نہایت درجہ خراب ہوتا ہے۔ یا ہمارا یا آس پاس کوئی اور تقریب ہونے والی ہوتی ہے تو اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ ایسے مواقع پر میری موت واقع نہ ہو۔ نارمل حالات میں چاہے جب ہو جائے۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔

لندن میں دوشنبہ کا ۸ سے ۱۰ بجے دن تک کا وقت، آفس یا کارخانہ وغیرہ کے ملازموں کے لیے بڑی بھاگ دوڑ کا ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے کام پر ٹھیک وقت سے پہنچنا چاہتا ہے۔ زیر زمین بجلی سے چلنے والی گاڑیاں بڑی پابندی اور تیزی سے آتی جاتی رہتی ہیں۔ ایسے ہی ایک دوشنبہ کو ۸-۱۰ بجے کے درمیان چلتی گاڑی کے سامنے چھلانگ لگا کر ایک شخص نے خودکشی کر لی۔ گاڑی روک دی گئی اور نعش کو علیحدہ کیے جانے کا انتظام کیا جانے لگا۔ اس میں کچھ وقت صرف ہوا۔ سواریوں میں سے ایک خاتون نے مُنہ بنا کر فرمایا، "کمبخت کو خودکشی کے لئے دوشنبہ ہی کا دن اسی گاڑی اور اسی وقت کا انتخاب کرنا تھا!"

ایک دن گرمی انتہا پر تھی۔ لائبریری سے نکل کر دہکتی دھوپ اور تیز لُو میں گھر واپس آ رہا تھا۔ سڑک پار کی تو حاشیہ پہ لگے ہوئے ایک جیّد درخت کی جڑ پر بیٹھا ہوا ایک شخص نظر آیا۔ جسم پر صرف ایک میلی پھٹی لنگی تھی۔ چھتری سنبھالتا جھکڑ سے بچتا جلد جلد وہاں سے گزرا۔ غور سے یہ دیکھنے کی نہ ضرورت سمجھی نہ ہمّت پڑی کہ کون شخص تھا اور وہاں بیٹھا کیا کر رہا تھا۔ کچھ ہی دور نکلا تھا خیال آیا کہ درخت کے پاس سے گزرتے ہوئے کچھ آواز سنی تھی جس کا میں نے کچھ خیال نہیں کیا اور یہ سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ کوئی فقیر ہوگا جس نے پیسے مانگے ہوں گے۔ کچھ دور جانے کے بعد بھوک اور موسم دونوں کی سختی اور زیادہ محسوس ہوئی تو فقیر کا خیال آیا کہ اس پر معلوم نہیں کیا گزر رہی ہوگی۔ با دلِ ناخواستہ پلٹا جیب سے کچھ پیسے نکالے اور اس شخص کے پاس آ کر کہا۔ یہ لو تمھاری آواز اچھی طرح نہیں سن سکا تھا۔

قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ روٹی کے چند ٹکڑوں پر اُبلی ہوئی ترکاری اور ساگ کھا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور بڑے اعتماد لیکن انکسار سے کہا۔ "میاں اللہ آپ کو اچھا رکھے، آپ کو دھوکا ہوا۔ میں نے کچھ مانگا نہیں تھا۔ کھانے کا وقت تھا میں کھا رہا تھا۔ آپ بھی شاید بھوکے گزر رہے تھے۔ منہ سے نکل گیا۔ "میاں کھانا حاضر ہے۔" آپ کے لائق یہ ساگ اور سوکھی روٹی نہ تھی لیکن باپ دادا کی ڈالی ہوئی عادت کو کیا کہوں، کھانا کھاتے وقت کسی کو پاس دیکھتا ہوں تو اس طرح کی بات منہ سے نکل ہی جاتی ہے۔ کوئی شریک ہو جاتا ہے تو دل خوش ہو جاتا ہے نہیں ہوتا جب بھی ایک طرح کی تسکین ملتی ہے۔ مزدوری میں جو پیسے مل جاتے ہیں اس سے گزر بسر ہو جاتی ہے۔ اس کا شکر ہے۔ محنت مزدوری سے سارے کام چلاتا رہتا ہوں۔ پیسے آپ اپنے پاس رکھیں!"

میں نہایت شرمندہ ہوا اور اس مزدور کے فقر غیور کے مقابلہ میں اپنے تمام مناصب و مراتب پر لعنت بھیجتا ہوا گھر پہنچ گیا۔

ظ انصاری

غالب اور پوشکن

(ایک مطالعہ)

آدمی جب کسی دوسرے ملک کی سیاحت کو نکلتا ہے تو جن مناظر پر اس کی آنکھیں کھلتی ہیں، قدرتی طور سے نگاہ اپنے جانے پہچانے، اپنے وطن کے مناظر سے ان کا موازنہ کرتی جاتی ہے۔ اکثر اوقات اس میں ارادے کو بھی دخل نہیں ہوتا۔ غالب مجھے لڑکپن سے ہی عزیز تھے۔ روس میں جا بجا پوشکن کی نظمیں سنیں، اس کی تصویریں دیکھیں، مجسّے نظر آئے، عجائب خانے ملے تو ذہن کو تلاش ہوئی کہ کون سی ایسی خصوصیتیں ہوں گی جو مشترک یا نمایاں ہوں غالب اور پوشکن دونوں میں۔

مولانا حالی نے، جو غالب کے پہلے سوانح نگار ہونے کے علاوہ خود بڑے شاعر تھے، غالب کا ہمنوا گلشنِ شیراز میں حافظ کو پایا۔ اس کے کچھ عرصے بعد علاّمہ اقبال نے غالب پر جو نظم لکھی، اس کا ایک بند یوں ختم ہوتا ہے ؎

آہ تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

ویمر کے مقام پر گوئٹے کا مزار ہے۔ اقبال کا دھیان غالب کے سلسلے میں گوئٹے کی طرف گیا۔

ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری کا مقدمہ (محاسنِ کلام غالب) جب نکلا اور مغربی تعلیم کے حلقوں میں اس کی گونج ہوئی تو بعض جملے اور خیالات ہمارے کچّے ذہنوں میں نقش ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی کہ بجنوری نے غالب کو جرمن شاعر گوئٹے سے تشبیہ دی ہے اور ان کے تخلیقی عمل کا فرق بھی ایک جملے میں یوں بیان کیا ہے،

"گوئٹے کی نگاہ اشیا کے خارجی پہلو سے گزر کر داخلی کیفیت تک پہنچتی ہے۔ غالب کی نظر اندرونی کیفیت کے مشاہدے ...... سے بیرونی کیفیت کا قیاس کرتی ہے ......"

(محاسن ص۵ انجمن ترقّیِ اردو، ایڈیشن ۱۹۵۲ء)

علاّمہ اقبال اور ڈاکٹر بجنوری دونوں کو زیادہ تر جرمنی سے تعلّقِ خاطر تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے دونوں کو غالب کی مشابہت گوئٹے میں نظر آئی۔ مجنوں گورکھپوری کے مضامین کے ایک مجموعے میں غالب کو رومانی دور کے کلاسیکی انگریز شاعر شیلی سے بہت قریب بتایا گیا ہے اور اس رائے میں فراق گورکھپوری کو شریک کیا گیا ہے۔

(نکاتِ مجنوں ص۲۲۷ کتابستان الہ آباد)

گوئٹے اور شیلی کا کلام اور ان کے بارے میں پڑھنے کا اتفاق کئی بار ہوا لیکن ان بزرگوں کی رائے سے اتّفاق کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی البتہ ادھر تین چار سال سے پوشکن میرے پیشِ نظر رہتا ہے۔ غالب اور پوشکن کی زندگی، ان کے حالات، تاریخی واقعات، ادبی نظریوں میں بعض ایسی نمایاں اور مشترک خصوصیتیں نظر آئیں کہ میں حیران ہو گیا۔ اس مضمون میں ان کی صرف ایک جھلک پیش کی گئی ہے۔

——— × ———

غالب اور پوشکن دونوں ہم عصر تھے۔ غالب ۱۷۹۷ء میں

پیدا ہوئے اور پشکن ۱۷۹۹ء میں کسی طرح یہ قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں عظیم شاعر ایک دوسرے کے نام سے واقف رہے ہوں گے ۔ تاہم انھوں نے ایک سے ماحول میں آنکھ کھولی، ایک ہی جیسے مسائل سے واسطہ پڑا اور فکر و فن کی راہیں طے کرنے میں تقریباً ایک جیسے تجربوں سے گزرے ۔

پشکن اور غالب دونوں نے اعلا منصبداروں کے ایسے خاندانوں میں جنم لیا جو امرائیہ کے ٹوٹے ہوئے طبقے سے تعلق رکھتے تھے ۔ غالب کے باپ اور چچا کا انتقال ان کے بچپن میں ہو چکا تھا اس لئے انھیں سرپرستوں کے دباؤ سے سابقہ نہیں پڑا ۔ البتہ یہ خیال گزرتا ہے کہ ننھیال میں رہ کر ننھیالی عزیزوں کے ذمے بسر کرنے کے شروع عمر سے ہی انھیں ایک ذہنی خلش اور ناگواری کا احساس ہوتا ہوگا ۔ بعد کی زندگی میں غالب کی بعض تحریروں سے اس کا ثبوت بھی ملتا ہے ۔

پشکن کو باپ ایسے ملے جنھوں نے لڑکپن سے ہی اپنے بچوں کو پوری چھوٹ دے رکھی تھی اور ماں کو اولاد کے معاملات سے سروکار نہ تھا ۔ پشکن کی ماں تیز مزاج عورت تھیں اور قرینہ یہ کہتا ہے کہ پشکن کے ماں باپ میں نہیں بنتی ہوگی ۔ شروع کی عمر میں پشکن کا بے قید و بند رہنا اور بعد کی عمر میں اپنے باپ سے برہم اور ماں سے بے تعلق رہنا اس کے مزاج کی ساخت میں بچپن کے خاندانی ماحول کی وضاحت کرتا ہے ۔

غالب نے جس پیار سے اپنی پھوپھی کا ذکر کیا ہے اسی والہانہ انداز سے پشکن اپنی کھلائی 'اریناروڈیونونا' کو بار بار یاد کرتا ہے، جو جیتے جی پشکن کی ماں کے ساتھ رہی ۔ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی اسے کہانیاں سناتی، موزے اور سوئیٹر بن کر دیتی ۔ اس کی بے راہ روی کی لیپا پوتی کرتی رہتی ۔ یہ عورت روسی دیہات کی ان عمر رسیدہ عورتوں کی نمائندہ تھی جن کی بے لوث محبت اور بے غرض خدمت نے زندگی اور فن کو نہ جانے کتنی دولت بے بہا بخشی ہے ہر زمانے میں ۔

ماں باپ اور عزیزوں رشتہ داروں کی محبت کے ترسے ہوئے دل کو فطرت اور انسان سے یوں ٹوٹ کر محبت کرنا اسی خانہ زاد کسان عورت نے سکھایا اور اس کا صلہ پشکن کی کئی نظموں میں پایا ۔

×

پشکن اور غالب دونوں کو اپنے گھر سے ہی ادبی ماحول میسر آیا جس نے ان کی حساس طبیعتوں اور بے چین ذہانتوں کو ادب کی راہ سجھائی ۔ پشکن کے باپ ایک پڑھے لکھے، خوش مذاق آدمی تھے ۔ اور چچا خود شاعر اور شاعر نواز ۔ اس زمانے کے علمی اور ادبی مشاہیر سے تعلقات رکھتے تھے ۔ ماسکو اور پیٹرس برگ (لینن گراد) کے صف اوّل کے شعراء کی ان کے یہاں آمد و رفت تھی ۔ گھر میں بڑی سی لائبریری تھی جسے ۸، ۹ برس کا بچہ، جیسے جی چاہتا الٹتا پلٹتا ۔ غالب کو ۱۲،۱۳ سال کی عمر تک صرف مکتبی تعلیم میسر آئی تھی ۔ پشکن کی بھی باقاعدہ تعلیم کو صرف ۵، ۶ سال کا عرصہ ملا ۔ عمر کے اٹھارویں سال وہ بورڈنگ اسکول کی تعلیم و تربیت سے فارغ ہو کر نکل آیا اور یہ دونوں بڑے شاعر باقی تمام زندگی اپنی ناقص تعلیم کا افسوس اور مطالعے کے ذریعے اس کی بنیادی خامیوں کی تلافی کرتے رہے ۔

غالب نے تو 'بے استادا' کہلانے کے طنز سے اپنی بچت کی صورت یہ نکالی کہ ایک فرضی استاد مشہور کر دیا اور کمی یوں پوری ہوئی کہ آگرے میں ان کا محلہ اہلِ علم کا ایک مرکز تھا اور دہلی کے جس خاندان میں ان کی شادی ہوئی اس میں نواب الٰہی بخش معروف جیسے شاعر، صوفی اور اہلِ علم کی معرفت سے مولوی فضل حق خیرآبادی، نواب حسام الدین نامی خاندان شریفی اور دوسرے بزرگوں تک رسائی ہو گئی ۔

پشکن کو چوں کہ استادی شاگردی کے ماحول سے سابقہ نہیں تھا ۔ اس نے تاریخ، فلسفہ، ادبیات، تراجم کے ذریعے اپنے مطالعے کو وسیع کیا (اس کا اندازہ آج بھی لینن گراد میں اس لائبریری کو دیکھ کر ہوتا ہے جو پشکن کے گھر کے اندر اصل حالت میں محفوظ ہے اور اہلِ ادب کی زیارت گاہ ہے) کرامزین جیسے مؤرخ اور ژوکوفسکی جیسے اہلِ علم اور اہلِ قلم سے قریبی تعلق ہو گیا ۔

غالب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ گیارہ بارہ برس کی عمر سے شعر موزوں کرنے لگے تھے ۔ اس وقت تیرہ برس کی عمر ہوگی جب ان کا کلام بوڑھے میر تقی میر کو دکھایا گیا اور انھوں نے فرمایا کہ اگر کسی استاد نے اس بچے کو سیدھی راہ لگا دیا تو لاجواب شاعر بنے گا، ورنہ مہمل بکنے لگے گا ۔ یعنی شعر کہنے کی صلاحیت ان میں اس طرح پوشیدہ تھی جیسے بقول خود " فولاد میں جوہر " ۔ اور اس کو وہ نشہ بھی ملتی رہی جو

خود اعتمادی پیدا کرتی ہے ۔

پوشکن نے ۱۸ برس کی عمر تک ۱۲۰ نظمیں لکھ ڈالی تھیں اور اسی عمر میں رسائل میں اس کا کلام شائع ہونے لگا تھا۔ سولھویں سال کا واقعہ ہے کہ روس کی تاریخ ادب کی مشہور شخصیت، بوڑھا شاعر (درژان) سالانہ امتحان کے موقع پر بورڈنگ اسکول کے مجمع میں مہمان خاص کی حیثیت سے موجود تھا اور تھکن کے مارے اونگھ رہا تھا۔ جوں ہی اسکول کے ایک طالب علم پوشکن نے اپنی نظم شروع کی، اس نے آنکھیں کھول دیں اور نظم ختم ہوتے ہوتے خوشی کے مارے اُٹھ کھڑا ہوا کہ :

'مجھے اپنا جانشین مل گیا، مل گیا'

—— x ——

ذہنی اور جسمانی اٹھان کے اس دور میں ہی پوشکن اور غالب دونوں کو ذاتی رجحان اور سماجی ماحول میں تصادم کا احساس، فرد اور سماج کے درمیان ٹکراؤ اور تال میل کا شعور ہو چلا تھا۔

۱۸۱۲ء کا زمانہ ہے نپولین بونا پورٹ کی بیس زبانوں والی فوج کی دھمک سارے یورپ کے دل دہلا رہی ہے۔ بورڈنگ اسکول کی دیوار سے لگی لگی جوانوں کی پلٹنیں نپولین کے مقابلے کو چلی جا رہی ہیں۔ بچے دوڑ دوڑ کر انھیں دیکھتے، دو قدم ساتھ چلتے، دعائیں دیتے اور آنسو پونچھتے لوٹ آتے۔ تیرہ برس کا ایک شاعر لڑکا بے قرار تھا کہ پڑھائی وڑھائی چھوڑ کر وطن کے بچاؤ کی جنگ میں ان فوجیوں کے ساتھ ہو لے اور شریک نہ ہو سکنے پر خود کو قصوروار سمجھتا تھا۔

روس کو معرکوں میں شکست اور جنگ میں فتح ہوئی۔ پھر روسی لشکر پیرس تک دندناتے پہنچ گئے۔ سارے ملک میں، ایک ہلچل مچ گئی۔ سماجی زندگی میں، سیاسی اور ادبی تحریکوں میں ایک لاوا اُبل پڑا۔ جو افسر اور جوان مغرب کی ترقی یافتہ زندگی کو دیکھ کر آئے تھے وہ اپنے ملک میں غلامی کے طور طریق کا خاتمہ کرنے کے لئے خفیہ انجمنیں بنانے لگے۔

دسمبر ۱۸۲۵ء کے ایک انقلابی باغی نے جو پوشکن کا عزیز دوست بھی تھا، اپنے دوستوں کے حلقے کے بارے میں کہا ہے،

'ہم لوگ ۱۸۱۲ کی اولاد ہیں'

غیر ملکی حملہ آور کے خلاف ۱۸۱۲ء کے زبردست معرکوں میں اور پھر زار شاہی کے خلاف ۱۸۲۵ء کی ناکام بغاوت میں نوجوان پوشکن ذہنی طور پر شریک تھا، ایک سے زیادہ نظموں میں اس تڑپ نے راہ پائی ہے اور وہ اس کی زندۂ جاوید نظمیں شمار ہوتی ہیں۔ دس سال بعد جب اُسے موقع ملا تو وہ قفقاز میں روسی فوجوں کی صفِ اول میں کود پڑا اور اس وقت تک دادِ شجاعت دیتا رہا جب تک اُسے گھیر کر واپس نہیں لایا گیا۔

غالب اور پوشکن دونوں کے لیے 'سپہ گری پیشۂ آبا' ہی نہیں تھی بلکہ بیباکی اور ہمت کا جسمانی مظاہرہ بھی اور وقتِ ضرورت اخلاقی فرض بھی۔

یہاں سے ملکی حالات کا فرق دو شاعر شہریوں کو الگ کرتا ہے۔

غالب نے جس دلّی میں اپنا گڑھ بنایا، وہ بھی سیاسی اور علمی ہنگاموں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ علمی ہنگامہ وہابی تحریک کے جاں بازوں اور حنفی علما کے درمیان مذہبی مسائل پر تھا۔ سیاسی ہنگامہ ایک طرف دیسی رجواڑوں اور انگریزوں کے درمیان، تو دوسری طرف پنجاب کی سکھ حکومت اور وہابیوں کی ہتھیار بند والنٹیر جماعت کے درمیان اور انگریزوں اور حکومت پنجاب کے درمیان صف آرائی کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔

غالب خود جس ددھیال اور ننھیال سے تعلق رکھتے تھے اور دلّی کے جس امیر کبیر خاندان میں بیاہے گئے دونوں ہی انگریز کی سرپرستی میں چل رہے تھے اور اسی کو پائدار سہارا سمجھتے تھے۔ نوجوان غالب فوج کے ساتھ میدان میں نکلا بھی تو اس کے سامنے کوئی سیاسی مقصد یا ملکی بہبود کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ رئیس زادوں کی وضعداری [انگریزوں اور مغل دربار، دونوں سے بنا کر رکھنے والے] ہوشیار کمانڈر احمد بخش خاں کی رشتہ داری اور انگریزوں کی طرف داری میں نکلا۔ وہ برقی رو، جو پوشکن کی ساری زندگی اور شاعری میں سیاسی آزادی اور قومی اقتدار کا نعرۂ جنگ بن کر دوڑی ہوئی ہے، غالب کے یہاں ناپید ہے۔ پس منظر دیکھتے ہوئے اس کی تلاش بھی نہیں کرنی چاہئے۔

—— x ——

غالب اور پوشکن دونوں اپنے اپنے ملک کے مرکز میں رہے دونوں کو اپنے شہر سے والہانہ محبت بھی تھی اور اس گھٹن کا احساس بھی،

، جو بے چین طبیعتوں اور دراک روحوں کو کسی ایک مقام پہ رہتے رہتے ہونے لگتا ہے۔ غالب دلّی کے بغیر کہیں ٹھیر نہیں پاتے تھے۔ کلکتے جاتے ہوئے بنارس ٹھیرے ہیں۔ بنارس کے کافر جلوے اور روحانیت کے جھکولے دلّی پران کا ایمان بہلانے لگے۔ جوش میں یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ دلّی مٹتی ہے تو مٹ جائے، بنارس کم ہوتے کوئی غم نہیں، دنیا آباد رہے گی۔ زمین پہ جوں کہ بنارس قائم ہے اس لئے دنیا تباہی سے بچی ہوئی ہے۔ (گویا یہ شہر "اوتاد الارض" میں سے ہے) وغیرہ، لیکن دلّی کے بغیر کہیں بھی چند روز گزارنا پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔ زبان سے دلّی کی ہمیشہ بُرائی کی لیکن اس کی تباہی پر خون کے اتنے آنسو بہاسئے کہ "رگوں میں دوڑنے پھرنے" کے قابل بھی لہو نہیں بچا۔

پوشکن نے اپنی شاہکار نظم "تانبے کا شہسوار" کی تمہید میں پیترسبورگ کا اور منظوم امر کہانی "ایوگینی اینگن" کے ساتویں باب میں 'ماسکو' کا اس جوش و خروش سے والہانہ تذکرہ کیا ہے کہ نظموں کے یہ حصّے مدحیہ قصیدے اور ان شہروں کا ترانہ بن کر رہ گئے ہیں۔

پوشکن تمام عمر ملک سے باہر یورپ جانے اور ملک کے اندر جنوب کی معتدل آب و ہوا اور مشرقی زندگی میں پہنچنے کے لئے بے تاب رہا۔ ملک سے باہر کیا معنی، اسے راجدھانی سے بیس میل کے فاصلے پر اپنے گاؤں جانے کی اجازت بھی روسی ارباب اختیار کے جابرانہ مزاج نے مرتے وقت تک نہیں دی، البتہ ایک بار جلاوطنی کے طور پر، اور دوسری بار جُھپ سٹے میں کرائمیا، قفقاز اور مولداویہ کے ہنگامہ زاروں کی طرف نکل جانے کی نعمت اسے نصیب ہو گئی تھی۔ اور ہر بار وہ جھولی بھر کر وہاں سے پھرا۔

نوجوان پوشکن کے ساتھ مولداویہ کے سفر نے وہی کیا جو ۲۹ برس کی عمر میں غالب کے ساتھ کلکتے کے سفر نے۔ مولداویہ سماجی اعتبار سے اگرچہ پچھڑا ہوا علاقہ تھا، لیکن اس زمانے (۱۸۲۰-۲۵ء) میں بلقان کی جنگوں اور یونان کی جنگ آزادی کے جھٹکوں سے ہل رہا تھا۔ کرائمیا کی راہ میں قزاق اور تاتار ملے۔ گھوڑوں پہ سوار، لڑنے مرنے کو تیار۔ قفقاز اور کرائمیا کے وہ ہرے بھرے مناظر فطرت، جو زمین کی کوکھ سے نکل کر آج تک بچّوں کی طرح ویسے ہی تر و تازہ اور کھلنڈرے ہیں، مولداویہ کے صدر مقام پہ فوجی افسروں اور انقلابیوں کی خفیہ جماعتیں ان کے رہنما، اطالیہ اور اسپین میں بغاوتوں اور شورشوں کی گونج، یورپ کے جلاوطنوں اور پناہ گزینوں کے حلقے، اور سب سے بڑھ کر یونان کی جنگِ آزادی، جس نے لارڈ بائرن کو دنیا بھر کے شاعروں کی زندہ ارواح کے چونکانے پر لگا دیا تھا۔ یہ سب کچھ پوشکن کے دل کو بھا گیا۔ اور ان میں سے ایک ایک واقعے نے بعد کی عمر میں شاعر کے تصورات اور اس کے فن سے اپنا بھرپور خراج لیا ہے۔ اس کی شہرہ آفاق نظم "خانہ بدوش" نہ ہوتی اگر مولداویہ میں قیام نہ ہوتا۔ "قفقاز کے قیدی" "ڈاکو بھائی" سیاسی تاریخی ڈراما "Bo gu ullu" نہ ہوتا اور طویل افسانہ "Kupнe âuu" نہ ہوتا، اگر ان جنگی شورشوں اور آزادی کی تحریکوں سے یہاں اس کا سابقہ نہ ہوا ہوتا۔ نظم و نثر کی ان تحریروں میں پوشکن کی فکر اور فن کے بڑے جاندار عناصر اُبھرتے ہیں۔

غالب نے تقریباً اسی زمانے میں کلکتے کا سفر کیا۔ غالب کیا، دراصل نواب اسداللہ خان بہادر بڑے لاٹ صاحب کے دفتر واقع کلکتہ تشریف لے گئے تھے۔ باپ اور چچا کی جاں نثاری کی پوری پنشن مانگنے کے لیے، کیوں کہ امارت کا بھرم رکھنے کا ایک سہارا یہی تھا۔ راستے میں بنارس نے ان کے دیدہ و دل کی کائنات کو ذرا پھیلایا۔ سفر کی صعوبتوں نے ہنس اور سوادار کی عادتوں پہ تازیانے کا کام کیا۔ اور کلکتے کے نئے، نیم مشرقی نیم یورپی شہر کی کھلی کھلی فضا نے خوش گوار تلاطم ہی برپا کر دیا، یہاں سے معمولی اور گزراں اثرات نہیں لیے اس نگاہِ نکتہ سنج نے، جو ۶۲ روپے آٹھ آنے کے پنشن یافتہ کو ناکام واپس لے گئی۔ وہ نظم، جس میں کلکتے کے ذکر نے ان کے سینے پر تیر مارا ہے"، اصل نغمے کی محض الاپ ہے۔ اور اصل نغمہ ہے "آئینِ اکبری" کی وہ تقریظ، جسے انگریزوں کے ہوا خواہ سیّد احمد خاں نے رد کر دیا (ان کی جگہ کوئی اور عالی ظرف بھی ہوتا تو یہی کرتا، بہرحال وہ تقریظ نہیں تھی، "ردِ آئینِ اکبری" تھا نظم کے لباس میں) اصل نغمہ ہے فارسی کا وہ قطعہ جس میں مکالمے کے انداز میں ایک امیدوار شاعر اور اس کے گرد کی نئی تہذیب کا ٹکراؤ پیش کیا گیا ہے۔ اصل نغمہ ہے غالب کے بعض ایسے قصائد کی تشبیب، جن کا موضوع عہدِ حاضر یا زمانہ ہے، اور اصل نغمہ ہے مثنوی "ابرِ گہربار" (فارسی)

جن سے، اگر غالب کی شاعری کا قد و قامت ناپا جائے، تو ان کی غزلوں کے "طرۂ پُر پیچ و خم" کا "بھرم کھل جائے" گا۔

ناکام پنشن یافتہ امیر زادہ سفر کلکتہ کے ڈھائی سال سے وہ پھل لے کر آیا جس نے اُسے اگلی پیڑھی کا نمائندہ نثر نگار اور زندہ قوم کا صاحب بصیرت شاعر بنا دیا۔

——— × ———

غالب نے "قلندری و آزادگی"، "ایثار و کرم" کے نام سے جن صفات کا ذکر کیا ہے وہ ان کے جیسے حالات میں دراصل "فاقہ مستی" کا دوسرا پہلو ہیں۔ بزرگوں کی جائداد، شہر میں آبرو، اور قرض ادھار کے سہارے لڑکپن سے ہی غالب اور پوشکن دونوں کو اس فاقہ مستی کا بلند مقام عطا ہو گیا تھا۔ دونوں کو اچھی طرح پینے کی عادت تھی، پینے کی لت نہیں تھی۔ دونوں قرض کے بار سے دبے ہوئے اور شاہ خرچیوں میں بہت کھلے ہوئے تھے۔ دونوں "سمجھتے تھے کہ ہاں"....... ایک دن یہ شاہ خرچی "رنگ لائے گی" دونوں کم از کم اس معاملے میں "مغل بچے" تھے کہ "جس پہ مرتے تھے اُسے مار رکھا۔" دونوں کو حُسن کی تصویر سے زیادہ حسن کی تاثیر اور عشق کی تدبیر سے سروکار ہے۔ حسن کے ہر ایک منظر سے پیار ہے، لیکن یہاں وہ فرق کُھلتا ہے جسے ہم ایک زمانے تک مشرقی اور مغربی آداب کے بے تہہ عنوان کے ساتھ تمیز کرتے رہے ہیں۔

پوشکن عشق میں جیلے کرتا ہے، حُسن کی تسخیر کو شاعری اور عاشقی دونوں کا "لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ" جانتا ہے، "عرضِ مدّعا" میں للکارنے لگتا ہے، ڈون جوآن کے قصے گنگناتا ہے، رقیبوں سے صرف پستول کی زبان میں بات کرتا ہے، زخمی ہوتا پھرتا ہے، اور جب ڈوئل لڑ کر مرتا ہے تو [غالب کے گھر سے نہیں] اس کے گھر سے چند در چند "تصویرِ بتاں" اور "حسینوں کے خطوط" برآمد ہوتے ہیں۔

غالب کی آرزوئیں سب وہی ہیں۔ "دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے۔" یا "ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن" قسم کی (بلکہ "بگرد انیم" ردیف والی غزل پر تو پوشکن کو پسینہ آ جاتا) لیکن وہ کسی کی موت پر جب ضبط نہیں کر پاتے تو غزل میں بے نام مرثیہ لکھ کر جب ہو رہتے ہیں "عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا۔" "مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے، جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے" کی غزل کا اندرونی ربط ملاحظہ کیجئے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کچھ روحانی رشتہ "بیقراری ہائے ہائے" غزل نما مرثیے سے ضرور ہے۔ یعنی یہاں بے تابی سے زیادہ ضبط اور جذبۂ بے اختیارِ شوق سے زیادہ نفس کُشی کا عالم نظر آتا ہے۔

جب غالب خدا سے دو ٹوک بات کرتے وقت "ناکردہ گناہوں کی حسرت" کی داد طلب کرتے ہیں یا کہتے ہیں کہ جناب، اگر انصاف کی ترازو ہاتھ میں لے کر بیٹھے تو آپ کو مشکل کا سامنا ہو گا کیوں کہ میرے گناہ سے حسرتِ گناہ کا وزن زیادہ ہے ؎

بہر جرم کز روئے دفتر رسد	زمن حسرتے در برابر رسد
بفرمائے ایں داوری چوں بود	کہ از جرم من حسرت افزوں بود

(کلیاتِ نظم غالب ص۱۲۶ فارسی)

تو ہمیں اندیشہ ہوتا ہے کہ داورِ محشر کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ آ جائے گی اور غالب کو اپنے اس دعوے پر شرمندہ ہونا پڑے گا کیونکہ وہ بھی اس جرم کے شریک نظر آتے ہیں جس کی کالک نے ہماری شاعری کے شبستان میں یا گھٹن بڑھائی ہے یا بے شرمی۔

——— × ———

غالب اور پوشکن دونوں نے شعور کے ابتدائی مرحلے سے ہی اپنے زمانے کے مروّجہ دستور پر انگلی اُٹھائی آزادی طلب کی اور ادبی، علمی، سیاسی شکنجوں میں رہ کر جس قدر بن پڑا، اس آزادی کا استعمال کیا۔

غالب کو جس طرح انگریز سے یہ خوش فہمی ایک زمانے تک باقی رہی کہ جتنی پنشن مانگتے ہیں وہ مل جائے گی، انھیں درباری شاعر کا اعزاز عطا ہو جائے گا اور اس نئے نظام میں ملک کی بہتری ہوگی۔ ٹھیک اس طرح پوشکن نے ایک بار سے زیادہ اپنے "قومی شہنشاہوں" سے یہ توقع رکھی کہ وہ زرخرید کسانوں کے ظالمانہ نظام کو ختم کر دیں گے، روس کا وقار دنیا کی نظر میں بڑھا دیں گے اور شاعر کو وہ سب کچھ عطا کر دیں گے جو فن کی تکمیل کے لئے لازم ہے۔ دونوں ہم عصر شاعروں کو بار بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ غالب دم سادھ کر رہ گئے اور پوشکن نے قلمی مسودوں، خطوں اور نجی تحریروں میں ہجو اور ملامت کا انبار

لگادیا۔ غالب "ترکِ محبت" کرکے "دربندِ تکمیل خودم" میں بیٹھ گئے۔ پوشکن باہر بھاگنے کے لیے بے قرار رہا اور ہر دور میں ایسے موتی اچھالتا پھرا جنھیں انقلابیوں اور باغیوں نے اپنے نعروں میں، اپنے خوابوں میں پرو لیا۔

———×———

پوشکن کا ایک بڑا کارنامہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے اصنافِ سخن کی کلاسیکی تقسیم کو توڑ دیا۔ غنائی شاعری کی بحروں میں بیانیہ شاعری کی پرانی حدود کی جکڑ بندیاں ہمیشہ کے لیے ڈھیلی کر دیں۔ حضرت داؤد کا معجزہ بتایا گیا ہے کہ لوہا ان کے ہاتھ میں آتا تو موم بن جاتا تھا اور وہ اس سے جیسی چاہتے زرہ بنا لیتے۔ پوشکن نے کلاسیکی فن کے لوہے کو عین اسی طرح موم کرکے زرہیں تیار کی ہیں۔ بیس برس کی عمر میں جب اس نے اپنی طویل نیم افسانوی نظم "روسلان اور لودمیلا" شائع کی تو گویا وہی معجزہ دکھایا، اس پر فن کے وضعداروں نے سخت اعتراضات کیے تھے، لیکن آج پورے ملک میں شاید ہی کوئی خاندان ایسا ہوگا جس میں کئی کئی بار یہ نظم نہ پڑھی گئی ہو۔ اور یہ مقبولیت پوشکن کی ایسی نظموں کو، جنھوں نے فن کے قدیم سانچے بدل ڈالے ہیں، پچھلے سو برس سے حاصل ہے۔

پوشکن کے اس کارنامے کی اہمیت جاننے کے لیے یہ کافی ہے کہ غالب نے قصیدے اور غزل کی اصناف کو جو وسعت بخشی ہے اسے سمجھا جائے۔ غالب کا قصیدہ نہ مدح کے لیے ہے نہ ممدوح کے لیے۔ وہ مسائل پر مفصل بحث کرنے کے لیے، ایک ربط اور منطقی تسلسل کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے ہے اسی لیے وہ اپنے قصیدوں کی تشبیب، پر ناز کرتے ہیں اور اس شخص کو اعلا درجے کا شاعر نہیں مانتے جو اچھا قصیدہ نہ لکھ سکے۔ غزل میں تو انھوں نے کیا آہنگ، کیا زبان، کیا خیال سب کچھ بدل دیا اور وہ گنجائش پیدا کر دی کہ اقبال کی غزل اور ہمارے زمانے کی ترقی یافتہ غزل غالب کے سوا کسی کی وارث نہیں معلوم ہوتی۔

———×———

آدمی کی گھریلو زندگی دراصل اس کی پھیلی ہوئی سماجی زندگی کا ایک ابتدائی دائرہ ہے اور عموماً ایک کی فضا دوسری پر اثر انداز ہوتی ہے غالب اور پوشکن دونوں اس معاملے میں بدنصیب تھے کہ اپنی 'رفیقۂ حیات' کو صحیح معنوں میں شریکِ حیات نہیں بنا سکے۔ غالب بچپن سے اس رشتے میں بندھ گئے تھے، جوں توں ۵۵ برس نباہے گئے، لیکن خوش کبھی نہیں رہے۔ پوشکن نے برسوں تک "پتہ پتہ بوٹا بوٹا" جان لینے کے بعد اپنی پسند سے ۳۱ سال کی عمر میں گھر کی چمن بندی کی تھی، لیکن ذہنی رشتہ یہاں بھی قائم نہ ہو سکا اور یہ ناکامی، غالب کی طرح پوشکن کے یہاں بھی ایک جھنجھلاہٹ بن گئی ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ پوشکن نے شادی شدہ زندگی کے سات برس بھی پرانی بھرپور محبتوں کی یاد کیے بغیر اور نئی محبتوں سے چنگاریاں لیے بغیر نہیں گزارے۔ غالب اس معاملے میں بڑے سنبھلے ہوئے لگتے ہیں پھر رئیس زادوں کی طرح ان کی "گرہ میں مال کہاں" تھا، تاہم خطوط سے بعض غزلوں سے اور عام گھریلو رویّے سے ان کے یہاں بھی ذہانی شوخی کی حد سے گزری ہوئی کچھ باتیں پائی جاتی ہیں۔ اور آپ جانیں، یہ ایسی ظالم چارہ گری ہے جس سے مرض کچھ اور بڑھتا ہے کم نہیں ہوتا۔

یہ جو غالب اور پوشکن دونوں کے یہاں ہر پھر کر اپنے حسب و نسب پہ فخر پایا جاتا ہے۔ یہ بھی ان کی گھریلو اور سماجی ناکامیوں کے لیے ایک ڈھال کے بطور استعمال ہوا ہے۔ غالب اس پہ ناز کرتے ہیں کہ "سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری" اور یہ کہ ہم وہ ہیں جن کے باپ دادا سمرقند کے رئیسوں میں سے تھے، ہم افراسیاب کی نسل سے ہیں وغیرہ، عین اسی طرح پوشکن جھکی ہوئی گردن کو اونچا کرنے کے لیے والٹر اسکاٹ کے طرز پہ ایک ناول شروع کرتا ہے۔ "پیٹرِ اعظم کا خادمِ خاص" لکھ کر اور اس میں اپنے افریقی پرنانا ابراہیم ہنسی بال کو ایتھوپیا (حبش) کا شہزادہ ثابت کرکے یہ دکھاتا ہے کہ ہمارے پُرکھوں نے ہمیشہ اعلا منصب پائے یا باغیوں اور شہیدوں کی صف میں نمایاں رہے "بورس گودونوف" کی نیم تاریخی، نیم افسانوی ٹریجڈی میں بھی وہ اپنے بزرگوں کی شخصیت ابھارتا ہے۔ نظم 'میرا نسب' میں (جو پختہ عمر کی تصنیف ہے) اس پہ فخر کرتا ہے کہ ہم ہر زمانے میں یا تخت پر قابض رہے، یا پھانسی کے تختوں پر جھول گئے۔ یوں وہ ان امیر عزیزوں، رشتہ داروں اور منصبدار ہم نشینوں سے آنکھیں چار کرتا ہے جو اس کی مقروض اور بے منصب حالت پہ ہنکارتے ہوں۔ ہم اس کیفیت سے غالب کے سلسلے میں خوب واقف ہیں۔

غالب اور پوشکن دونوں ایسی تاریخی بغاوتوں کے وقت نمایاں حیثیت کے مالک تھے جنھوں نے ان کے ملکوں میں نئے دور کی آمد کا واضح اعلان کر دیا اور اتفاق سے یہ دونوں بغاوتیں ناکام رہیں۔ دسمبر ۱۸۲۵ء کی بغاوت پیٹرسبورگ میں فولادی پنجے سے کچل دی گئی لیکن وہ بادشاہ تبدیل کرنے کی ظاہرا کوشش کے بجائے ان ترقی پسند روشن خیال اور بیباک لوگوں کی شورش تھی جو اپنے ملک کی سرزمین میں دبے ہوئے قوت کے بے پناہ امکانات سے آگاہ ہو چکے تھے اور جنھیں یہ گوارا نہ تھا کہ شخصی جابرانہ حکومت زر خرید کسانوں کے پست درجہ نظام کی محافظ بنی رہے۔ بغاوت ناکام رہی لیکن اس نے قوم کو چونکا دیا اور کم و بیش چالیس برس بعد (۱۸۶۱ء میں) 'سرفڈم' کا قانونی طور پر خاتمہ ہو گیا۔ اور پھر چالیس برس کے وقفے سے ایک اور ناکام بغاوت ہوئی جس نے "گرمایا غلاموں کا لہو جوشِ یقیں سے" اور بتا دیا کہ روس کا ریلا سرمایہ داری نظام کی چوکھٹ پر بھی رکنے والا نہیں ہے (۱۹۰۵ء)

پوشکن بغاوت کے وقت شہر میں نہیں تھا لیکن اس کی جاگیر پر پولیس پہنچی، تلاشی لی گئی، مشتبہ قرار دیا گیا۔ جن لوگوں کو جلاوطنی یا پھانسی کے تمغے ملے، ان کے سامان سے بھی پوشکن کی نظمیں نکلیں اور یہ سلسلہ کچھ پوشکن کی زندگی کے ساتھ ہی تمام نہیں ہوا۔ بعد کے انقلابوں اور شورشوں میں بھی پوشکن کی بعض نظمیں "لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم" ثابت ہوئی ہیں۔

غالب ۱۸۵۷ء کی اینٹی برٹش بغاوت کے وقت شہر میں بھی موجود تھے، قلعے میں بھی آیا جایا کرتے تھے۔ لیکن بقول خود "بظاہر آشنا بباطن بیگانہ" بن گئے تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ نواب رام پور کو بھی انھوں نے خفیہ خطوں میں یہی مشورہ دیا کہ " ابھی تیل دیکھیے، تیل کی دھار دیکھیے"۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت بنیادی طور پر غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف پہلا زبردست نبرد جنگ تھا، اور اس کے خواب کی تعبیر پہلی بار ۱۹۲۰ء میں اور پھر ۴۷-۱۹۴۵ء میں نظر آئی۔ غالب کو اس بغاوت سے کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی، لیکن ان لوگوں سے، خواہ وہ کالے ہوں یا گورے، ضرور ہمدردی تھی جو ظلم کا شکار ہوئے اور غالب کے بعض اشعار فارسی نثر 'دستنبو' کے بعض ٹکڑے اور تمام خطوط، جو اس زمانے میں یا اس کے بعد لکھے گئے ہیں، اسی ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بن گئے ہیں۔

×

گوئٹے کی زندگی میں اس کے بعض قوم پرست ہم عصروں کو شاعر سے شکایت تھی کہ یوں تو وہ جرمنی کی عظمت کے بڑے بڑے ترانے گاتا ہے، لیکن ان فرانسیسیوں کے خلاف لب نہیں کھولتا، جن سے جرمنوں کی موت اور زندگی کی جنگ ہے۔

انگریزوں نے جب پنجاب فتح کیا (۱۸۴۶ء) تو غالب نے مبارک باد کا ایک قصیدہ لکھ مارا اور اس میں اپنے "شوقِ جہاد" کا بھی تذکرہ کر دیا۔ لیکن اس قصیدے کی تان یہاں ٹوٹتی ہے کہ اب کشمیر کا راستہ کھل جائے گا اور اچھی شراب مہیا ہونے لگے گی۔ سید اسماعیل شہید جب پنجاب کے مورچے پر اپنے بے ترتیب لشکر کو لے کر روانہ ہوئے ہیں (راستہ دینے اور سامان مہیا کرنے میں انگریزوں کی اگر امداد نہیں تو تغافل ضرور شامل تھا) تو حکومت پنجاب کے مظالم کے پروپیگنڈے نے دہلی، یو۔ پی، بہار اور بنگال کے مسلمانوں کا لہو گرما رکھا تھا، مگر غالب کے یہاں جوش و خروش تو ایک طرف، نثر و نظم کی کوئی ایک سطر بھی ایسی نہیں ملتی جس سے ان کی مذہبی یا سیاسی حمایت کا اظہار ہوتا ہو۔ اپنے قابلِ قدر ہم عصروں حکیم مومن خان اور مولانا فضل حق پر غالب کو یہ اعتراض ہے کہ ان کے یہاں مذہبی شدت اور عصبیت پائی جاتی تھی۔

مذہب یا قومیت کے معاملے میں غالب اور پوشکن دونوں کا ذہن مبالغے یا شدت سے پاک ہے۔ پولینڈ اور روس کی جنگ (۱۸۳۱ء) میں جب روس نے پوری قوت سے حملہ کر کے فتح پائی تو پوشکن نے جوش میں آکر دو رزمیہ نظمیں لکھ ڈالیں (جس پر اس کے روشن خیال اور ہوش مند دوستوں نے بہت برا بھلا کہا) لیکن نپولین کی موت پر پوشکن کی جاندار نظم اس کا ثبوت ہے کہ دنیا کے ایک زبردست کمانڈر اور بڑے انسان کی حیثیت سے شاعر "دشمن" کی اہمیت اور عظمت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کے تاریخی رول کو تسلیم کرنے میں کسی فرانسیسی شاعر سے پیچھے نہیں ہے۔

×

فطرت اور کائنات کے مطالعے نے غالب اور پشکن دونوں کو قریب قریب ایک نتیجے پر پہنچایا تھا۔ دین سے ان کے یہاں بیزاری نہیں ہے لیکن ان کی فطرت مذہبی بندشوں کو قبول نہیں کرتی۔ علم فطرت اور انسان کا تعلق پشکن کو بھی وحدتِ وجود کے قریب لے آتا ہے جو بقول شخصے دہریت کی شاعری ہے۔ غالب اگر اپنا شعر پشکن تک پہنچا سکتے ؎

رموزِ دیں نہ شناسم درست و معذورم
نہادِ من عجمی و طریقِ من عربی ست

(میں نے دین کے بھیدوں کو اچھی طرح ذہن نشین نہیں کیا اور مجھے معاف کیا جائے کہ میرا مزاج عجمی ہے۔ جس فطرت اور مادّی لذتوں کا قدر شناس ہے۔ لیکن میرا دین عربی یا اسلامی ہے) تو عجب نہیں کہ اس کو اپنی کسی نظم کا موضوع یا سرعنوان بنا لیتا جیسا اس نے سعدی کے بعض اقوال کو بنایا ہے۔

شروع میں پشکن کو مذہب سے جو بیزاری ہوئی تھی جو تمسخر اس نے شروع کیا تھا (مثلاً ولادتِ مسیح کے سلسلے میں اس کی نظم "Tabpuuaga") اس کی شدّت عمر، مشاہدے اور مطالعے کے ساتھ کم ہو گئی۔ وہ ورڈز ورتھ کی راہ سے مذہب کی آغوش میں واپس تو نہیں گیا۔ لیکن تشکیک کے مرحلے میں رک گیا۔ اس کا مادّیت پسند دل جو غالب کی طرح "وجودک ذنبٌ" (تیرا وجود ہی ایک گناہ ہے) کو غلط فلسفہ قرار دیتا ہے وجود انسانی کو "عطیۂ حق" (خدا کی نعمت) گردانتا ہے اور پیگانزم کو اپنا شعار بنائے رکھتا ہے۔ دین فطرت ہی دراصل ان دونوں کا دین ہے۔ جبر و اختیار کے مسئلے میں دونوں نے بڑا سوچ بچار کیا ہے اور دونوں بالآخر یہاں تک پہنچے ہیں ؎

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

پانی کی موج کو روانی کا اختیار بھی ہے اور پاؤں میں زنجیر بھی پڑی ہے۔ آدمی نہ تو جبر حالات (یا جبر مشیّت) سے پوری طرح آزاد ہے، نہ اس درجہ مجبور کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھے آزادی کی اس لذّت سے بھی محروم ہو جائے ("یہ جو اک لذّت ہماری سعیِ لاحاصل میں ہے")

پشکن نے یوں تو اس مسئلے کو اپنی مختصر اور طویل نظموں میں، افسانو اور ڈراموں میں ضمناً کئی بار اٹھایا لیکن ایک خوبصورت اور مفصل افسانوی نظم "612aHbI" اسی موضوع پر صرف کی ہے جس کا انت یوں ہوا ہے۔

[خانہ بدوشوں کی بے قید و بند زندگی کے ہر پہلو کو نکھرے رنگوں میں ابھار کر پیش کرتا ہے اور آخر میں کہتا ہے]

پر صاف کہوں تم سے
قدرت کے غریبی میں پالے ہوئے فرزندو!
آزاد منش بندو!
کہتے ہیں خوشی جس کو، تم نے بھی نہیں پائی
وہ راس نہیں آئی
پیوند لگے ڈیرے راحت کو ترستے ہیں
ویران زمینوں میں یہ جلتی چھپر چھایا
انسان نے اس میں بھی دکھ سے نہ مفر پایا
ہر سمت رکی راہیں، ہر سمت کھڑی ہیں یہ کم بخت تمنائیں
تقدیر کے حملوں سے تدبیر نہیں بچتی، جائیں تو کہاں جائیں! [1]

یہ وہ مقام ہے جہاں پشکن اپنے لڑکپن کے ہیرو لارڈ بائرن سے اور غالب اپنی نوجوانی کے رہنما میرزا بیدل سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

بڑے ادب کی روح کا مطالعہ کرتے وقت مجھے بارہا ایسا محسوس ہوا ہے کہ کوئی ایک جوہر ہے جس کے یہ دونوں عرض ہیں۔ یا ایک ہی سوتہ ہے جس سے دونوں دھارائیں پھوٹتی ہیں، اگر حسن خیال اور حسن کردار کی صورت میں ظاہر ہو تو آزادہ روی اور آزادی پسندی ہے، اور حسن بیان یا حسن کلام کی صورت میں وہ اعلا درجے کا ادب اور آدمیت

مذہب کا سب سے بڑا حربہ، جس کا جبر و اختیار کے مسئلے سے بھی گہرا تعلق ہے "حیات بعد الموت" کا ہے۔ پشکن کی عقل اس تصور کو گوارا نہیں کرتی۔ اور ہم جانتے ہیں کہ غالب کو بھی ارضی زندگی کے

[1] میں نے پشکن اور بعض موجودہ روسی شعرا کے تقریباً دو ہزار مصرعوں کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ یہ ٹکڑا بھی اسی کا اقتباس ہے۔ ظ انصاری

باہر صرف فنا دکھائی دیتی ہے۔ دونوں شاعر مادّی زندگی کی اس کشاکش کو صرف اسی دائرے میں دیکھتے ہیں جس میں یہ کشاکش چل رہی ہے اور ہمیں اس کا حل یا حسرتوں کی داد بھی چاہتے ہیں۔

غالب جب مرے تو کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ سنّی ہیں یا شیعہ، بلکہ لوگوں کو "یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب" کے باوجود ان کے اسلام تک میں شبہ تھا۔ آگرے کے ایک اخبار نے انھیں "فری میسن" ہی لکھ دیا۔ پوشکن نے آخری سانس لینے سے پہلے ۴۹ گھنٹے جان لیوا زخم کی ٹیسوں میں گزارے اور ایسی حالت میں بھی بمشکل اس سے مسیحی کلمہ پڑھوایا گیا۔ موت کے بعد ایک روز شہنشاہ نکولائی نے درباری شاعر ژوکوفسکی سے کہا۔ "اُوہ، کس مصیبت سے اس کو مسیحی موت مرنے پر راضی کیا گیا ہے۔"

غالب اور پوشکن دونوں کو زندگی سے، زندگی کی حرکت اور تغیّر سے، زندگی کے ہر ایک اچھے منظر سے کس قدر دیوانہ وار عشق تھا لیکن اپنی موت بھی اس قدر آسان اور گوارا ہوگئی تھی۔ یہ بات بظاہر پیراڈوکس کی سہی، لیکن درحقیقت ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ حال میں ایک تحریر ملی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ جب زخمی پوشکن کو ہوش آیا تو اس نے ڈاکٹروں اور دوستوں سے دریافت کیا کہ اگر زخم جان لیوا ہو تو گھبراؤ نہیں مجھے بتا دو، میں موت کے خیال سے پریشان نہیں ہوں گا۔ اور غالب تو ۱۶، ۱۷ برس پہلے سے اپنی تاریخِ وفات کا اعلان کرنے لگے تھے۔ غالب مرد، غالب بمرد، آہ غالب بمُرد وغیرہ۔

———— × ————

غالب کے زمانے میں جو حیثیت فارسی کو شمالی ہندستان میں حاصل تھی، تقریباً وہی فرانسیسی زبان کو دوسرے یوروپی مرکزوں میں تھی۔ شرفا کے بچے ابتدائی تعلیم ان غیرملکی زبانوں میں پاتے تھے۔ ان کے علم کے بغیر آدمی مہذب اور اہلِ علم شمار نہیں ہوتا۔ اہلِ قلم ان زبانوں میں اپنا کمال دکھانا شان کی بات سمجھتے تھے۔ غالب کی فارسی نظم مقدار میں اردو سے پانچ گنی ہے۔ نپولین کے حملے (۱۸۱۲ء) کے بعد فرانسیسی علم و ادب کا وہ اقتدار تو دلوں سے اٹھ گیا تھا، تاہم پوشکن کی تحریروں کا بھی اچھا خاصہ حصہ فرانسیسی میں ہے (جس طرح غالب کی فارسی نے تاریخِ ادبیاتِ ایران میں جگہ نہیں پائی، پوشکن بھی اس شرف سے محروم رہا) فرق یہ ہے کہ غالب اپنے فارسی کلام پر زیادہ ناز کرتے تھے اور یوں بھی ان کے اندازِ بیان پر فارسی لب و لہجہ طاری ہے۔ پوشکن نے رفتہ رفتہ اس زبان کو مزاج میں رسا بسا لیا جس زبان میں اس کے موضوعِ سخن گفتگو کرتے تھے جس زبان میں روس کا وہ آدمی سوچتا تھا جس کی کہانیاں اُسے لکھنی تھیں۔

غالب بھی اردو والوں کو ان کے فکر کی رسائی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، ہجوم کا راستہ انھیں پسند نہیں تھا۔ اس ذہنیت میں پوشکن ان کا شریک ہے، لیکن راستے بٹ جاتے ہیں۔

پوشکن اسی کرخت زبان کی نوک پلک درست کرتا ہے۔ دیہات کے لوگوں کی، زمینداروں کی، ڈاکوؤں کی، باغیوں اور شورش پسندوں کی، سپہ سالاروں کی کہانیاں (نظم و نثر میں) لکھتا ہے تو انھیں کے محاوروں کو، جن پری کی کہانیوں کو، جن گیتوں کو اس طرح اپنی مالاؤں میں پرو لیتا ہے کہ وہ ادبی خزانے کا امٹ حصّہ بن جاتی ہیں اور روسی ادب کا اپنی زمین کی عوامی زندگی سے رشتہ اور گہرا ہو جاتا ہے۔

غالب کو اوّل تو جن لوگوں نے ان کی فارسیت اور پیچیدگی پر ٹوکا، وہ خود فارسی کے بڑے دلدادہ تھے، پھر غالب نے ناکامیوں اور ناگواریوں کے ایک طویل سلسلے سے تنگ آکر خود کو ایسے حصار میں بند کر لیا جہاں گنے چنے لوگوں کی محدود محفل کے سوا کم لوگوں کا گزر تھا۔ عمر کا درمیانی حصّہ غالب نے زیادہ تر فارسی گوئی میں گزارا۔ مشاعروں سے بے تعلق ہو گئے کیوں کہ فارسی شعر کہنے اور سمجھنے والے وہاں کم آتے تھے۔

بعض تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ پچاس برس کی عمر سے تجاوز کرنے کے بعد غالب بے دلی اور ضعف کے مارے اردو میں خط لکھنے لگے تھے۔ (بلکہ بہار کے ایک گمنام صاحب نے تو اس سلسلے کا پہلا خط تاریخِ مقرر پر اپنے نانا کے ہی نام لکھوا لیا ہے) ممکن ہے [لال] قلعے سے استادی شاگردی کا تعلق ہو جانے کا بھی اثر پڑا ہو، لیکن اگر غالب کے خود اعتقادی عمل کو دیکھیے، ان کی ذہنی تبدیلیوں کا پورا سلسلہ مدِّنظر رکھیے تو نتیجہ نکالنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ غالب کا دل فارسیّت سے اُچاٹ ہو گیا تھا، انھوں نے بعد کی عمر میں بعض ایسے مضامین کو بھی اردو کا قالب دیا ہے جو وہ پہلے کبھی فارسی غزلوں، قصیدوں اور مثنویوں میں ادا

کر چکے تھے۔ اردو میں آ کردہ فارسی کے اترے ہوئے چھلکے نہیں ہیں بلکہ اپنا الگ لب ولہجہ رکھتے ہیں۔ مثلاً

اور بازار سے لے آئیں گے گر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

یہ محض ایک شعر ہوتا تب بھی اس مضمون کے مماثل فارسی میں ان کے یہاں جابجا ملتے ہیں، لیکن یہ ایک شعر نہیں، ایک رویّہ ہے۔ زندگی اور فن کا ایک عملی بیوہار ہے اور یہی بیوہار ان کے خطوں میں، جہاں انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے" ان کی غزلوں میں جو آج ہارمونیم اور طبلے تک پر گائی جاتی ہیں اور اس رائے میں صاف نظر آتا ہے کہ: "—— دلی والوں کو جو اردو ہے، اسی کو اشعار میں لکھنا چاہیے۔ آخر عمر میں ہماری تو یہی رائے قائم ہوئی ہے ......" (احوالِ غالب ص۱۵)

یہ بات انھوں نے اس وقت کہی تھی جب کسی شاگرد کے کلام میں سے فارسی الفاظ کی کثرت کو کم کر رہے تھے۔

پوشکن اس منزل پر غالب سے بہت پہلے پہنچا اور اپنی زبان کو اس کا فیض پہنچا گیا۔

غور طلب بات ہے کہ لوک کہانیاں جو پوشکن نے بچپن میں اپنی کھلائی سے سن رکھی تھیں، لطیفے، قصے، کہانیاں "ٹیبل ٹاک" وغیرہ، جو کبھی کے سُنے سنائے تھے ان سب کو پالش کرکے ادبی ذخیرے میں محفوظ کرنے کا خیال پوشکن کو بھی اس وقت آیا جب وہ نثر و نظم کے بہت سے تجربوں سے گزر چکا تھا اور ادب کے ساتھ زندگی کو مقامی (شادی) کرنے کی فکر میں تھا۔

پوشکن کو ادبی زندگی کے صرف بیس۲۰ سال ملے اور اس عرصے میں نثر و نظم کا اتنا زبردست ذخیرہ اس نے بخشا جو بغور مطالعہ کرنے والے سے بھی بیس۲۰ سال کی مدت چاہتا ہے۔

—— × ——

عمر اور مشق کی پختگی کے زمانے میں پوشکن اور غالب دونوں سلامت روی اور سلاست پسندی کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انیسویں صدی میں اپنی اپنی زبان کے سب سے بڑے شاعر تسلیم کیے جانے والے یہ دونوں فنکار نثر کے قائل ہو گئے، اور دونوں کو اپنی اپنی جگہ جدید نثر کا بانی قرار دیا گیا ہے۔

غالب جیسے مشکل گو نے دوبارہ جب اردو کی طرف توجہ کی ہے، (۱۸۵۰ء کے بعد) تو اردو نثر کی جانب ان کے رجوع ہونے کے آثار خود ان کے (سہل ممتنع) اشعار میں پہلے سے ظاہر ہونے لگے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے ترجموں اور داستانوں وغیرہ کی صورت میں کچھ اردو نثر نے پر پرزے نکال بھی لیے تھے غالب سے پہلے۔ لیکن پوشکن کے سامنے روسی نثر کا کوئی ایسا نمونہ تھا ہی نہیں جس سے وہ روشنی لے سکتا۔ کرامزن کی تاریخ روس، جس سے پوشکن نے تاریخی نظموں کا مسالہ لیا ہے، وہ بھی یا تو فرانسیسی اسٹائل کی نقالی تھی، یا مرصع نثر سے بنی ٹھنی۔ پوشکن نثر لکھتے وقت اپنی شاعری کی کائنات اور مزاج سے کیسے پیچھا چھڑاتا، اس کی جھلک بھی ملتی ہے —— مگر نثر کو اس نے شعر کے اترے موتی نہیں بننے دیا چناں چہ سادہ، منطقی، مسلسل، واضح، بے آرائش اور لوچ دار نثر کے کامیاب تجربے پیش کرکے اس نے ایک مفلس زبان میں اتنی گنجائشیں پیدا کر دی تھیں کہ اسی ایک صدی کے اندر روسی زبان نے دنیا کی تہذیب کو نثر کے تمام اصناف میں بہترین نمونے بخش دئے۔

غالب کا اردو نثر پر اس سے کچھ کم احسان نہیں ہے، اگرچہ ان کی نثر کی کائنات بہت محدود ہے تاہم اگر انھوں نے پہل نہ کی ہوتی تو سرسید اور ان کے معاصرین کو جدید اردو نثر کے جنم میں انھیں مصیبتوں کا سامنا کرنا ہوتا جو ایم۔ اے۔ او کالج (علی گڑھ) ہونے میں پیش آرہی تھیں۔

—— × ——

یہ بھی ایک اتّفاق ہے کہ پوشکن اور غالب دونوں کو عمر کے آخری حصے میں تاریخ نگاری کا اور اسی کے ساتھ قلعے کے تاریخی مسودوں کی چھان بین کا موقع ملا۔ یہاں پھر ایک ابھرتی ہوئی زندہ قوم اور ایک پسی ہوئی افسردہ قوم کا مادّی اور ذہنی ماحول دونوں شاعروں کو الگ کر دیتا ہے۔ غالب تاریخِ قدیم کے بڑے رسیا تھے۔ خاندانِ تیموری کی تاریخ نویسی کا فرض جب انھیں سونپا تو ہونا یہ چاہیئے تھا کہ واقعات کی چھان بین میں ڈوب جاتے۔ دلی لگن کے ساتھ اس کام کو انجام دیتے۔ آخر ان کے اپنے پرکھوں کی تاریخ بھی اسی ضمن میں آئی تھی۔ لیکن غالب

دیکھ رہے تھے کہ "یہ صحبت چند روزہ ہے" یہاں تاریخ کیا، سارے ملک کی کایا کلپ ہوئی جاتی ہے، انھوں نے یہ کام بڑی بے دلی سے انجام دیا۔ حکیم احسن اللہ خاں واقعات ترتیب دے کر بھیج دیتے اور غالب ان میں اپنی انشا پردازی کا رنگ بھر دیتے۔ قصہ ختم۔ حکیم صاحب نے غالب کے بزرگوں کے واقعات لکھ کر نہیں بھیجے ہوں گے لیکن "مہر نیمروز" کے دیباچے میں وہ ٹکڑا انھوں نے زور شور سے بڑھا دیا ہے۔ "آفرینشِ عالم" سے لے کر امیر تیمور تک کی تاریخ چند صفحات میں درج کر کے انھوں نے تیموری خاندان کو پیغمبروں کے شجرے سے ملا دیا اور کتاب کا دوسرا حصہ ہمیشہ کے لئے نا تمام چھوڑ دیا۔

پوشکن نے یہ کام اٹھایا تو تاریخی مسوّدے کھنگال ڈالے۔ پچاس سال پہلے کی ایک کسان بغاوت کو ناول کا موضوع بنانے کے لیے چن لیا (یہ ناول 'کپتان کی بیٹی' کے نام سے چھپ کر دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے) اس بغاوت کی تاریخ مکمل کر کے قسط اوّل کے طور پر پیش کر دی [شہنشاہ نے اس کے عنوان سے 'تاریخ' کا لفظ کاٹ دیا اور کہا کہ شورش پسندوں کی بھلا کوئی تاریخ ہوا کرتی ہے] اور جب نوکری سے استعفا دینا چاہا تو اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی کہ شاہی محافظ خانے کے مسوّدے پڑھنے کی اجازت مجھے دوامی عطا کر دی جائے۔

پوشکن نے ان چند برسوں میں محافظ خانے کے مسوّدوں سے جو فیض اٹھایا وہ آج بھی اس کے نظم و نثر کے ذخیرے میں محفوظ ہے اور زندہ نسل اسے آنکھوں سے لگائے پھرتی ہے اور غالب کا بے دلی یا رواداری سے انجام دیا ہوا کارنامہ نہ ان کی اپنی تصانیف میں کوئی خاص مقام حاصل کر سکا، نہ تیموری خاندان کی تاریخ میں۔

—— × ——

ایک موقع سے زیادہ غالب اور پوشکن نے اپنے ہم عمروں کو خطاب کر کے فنی تخلیق کا عمل بیان کیا ہے۔ ان کے یہاں فنی تخلیق کوئی قافیہ پیمائی یا لفاظی نہیں ہے بلکہ "جگر خوردن و تازہ روز لیستن" کا عمل ہے۔ غالب کے اس شعر کو پوشکن کی زبان سے عین انھیں لفظوں میں ادا کیا جاسکتا ہے (ملاحظہ ہو اس کی نظم مصنفہ ۱۸۲۶ء)

بینی ام از گدازِ دل در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیرِ من بری

(جب میں شعر کہنے بیٹھتا ہوں، اگر اس وقت کہیں تم میرے سینے میں اتر جاؤ تو دیکھوگے کہ دل پگھل گیا ہے اور جگر میں آگ کی موج رواں ہے)

—— × ——

پوشکن اور غالب دونوں کو زندگی میں ہی "اہلِ نظر اور اہلِ تمیز" اپنے وقت کا سب سے بڑا فن کار تسلیم کرنے لگے تھے، لیکن ان کو زمانے سے ناقدری کی شکایت رہی۔ اور یہ یقین بھی کہ جو زمانہ آرہا ہے وہ ہمارے کام کی پوری داد دے گا، اور جب تک دنیا تہذیب اور تفکر سے آباد رہے گی، نام زندہ رہیں گے۔

پوشکن کی موت پر جب بکوسے کی سی حالت ہو گئی تو ایک انگریز ڈپلومیٹ نے کسی روسی منصب دار سے پوچھا — اگر یہ تمھارا اتنا بڑا شاعر تھا تو تم نے آج تک بتایا کیوں نہیں؟

جب بھی مجھے غالب کی اس قطعہ بند غزل کا خیال آتا ہے جس کی ردیف ہے "خواہد شدن"۔ اور اس میں خاص کر یہ شعر:

تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن
ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

جن میں پیش گوئی ہے کہ ایک دن آئے گا جب میں نہ ہوں گا، میرا کلام ہوگا۔ اس کی شہرت ہوگی، "قحطِ خریداری" سے اس شراب کا نشہ تب تک اور تیز ہو چکا ہوگا۔

تو پوشکن کی وہ نظم یاد آجاتی ہے جو مرنے سے سال بھر پہلے کہی گئی ہے اور جس کے چند مصرعے یہ ہیں ؎

- - - - - - - - -

جب تلک سنسار میں ہے ایک بھی شاعر حیات،
راکھ ہو جاؤں، مگر گونجیں گے نغمے چار سو
ساز میں دوڑا چکا ہوں زندگانی کا لہو

ہیں نے سینوں میں جگائی ہے شرافت کی امنگ
اور اس کلجگ میں آزادی کی چھیڑی ہے ترنگ
جن کے ڈنکے بج رہے تھے ان سے آنکھیں چار کیں
بےبسوں کے واسطے پیشانیاں ہموار کیں
دل کو ناقدری کا شکوہ ہے نہ بدنامی کا غم
سر پہ سہرا کامیابی کا، نہ ناکامی کا غم

اور آخر میں، ایسا امرت ہے کلا جس نے پیا مرتا نہیں

ٹھیک نہیں معلوم کہ خواہد شدن والی غزل غالب نے زندگی کی کس منزل میں کہی لیکن اس یقین کے ساتھ یہ باتیں کہی نہیں جا سکتیں جب تک کہنے والے کو یہ یقین نہ ہو کہ اس نے اپنے فکر اور فن سے زمان و مکان کی حدود کو توڑ دیا ہے۔

غالب کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ ان کی بھرپور قدردانی اس وقت شروع ہوئی جب کالجوں سے شکسپیئر، ملٹن، بائرن اور شیلے کو پڑھے ہوئے نوجوان نکلے، جب فرد نے سماج سے آزادی کا مطالبہ کیا، جب فکرِ تازہ نے غزل کے جامے میں سمانے سے انکار کر دیا۔

وہ لوگ بدذوق نہیں تھے جنھوں نے غالب کی آنکھیں دیکھی تھیں جو فارسی اور اردو ونثر کے باریک نقطے کا شجرۂ نسب ملانا جانتے تھے لیکن غالب کے اُفق میں ایک کرن ایسی بھی تھی جسے ان کے ہم عصروں کی نگاہ گرفت میں نہ لا سکی — اور یہ مستقبل کی کرن تھی۔ مستقبل ہی اس کا امین اور وارث ثابت ہوا۔ غالب کا اچھا شعر آج اپنے وقت سے زیادہ تروتازہ معلوم ہوتا ہے۔ غالب کی پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔

پوشکن نے اپنی زندگی ہی میں نظم ونثر کی اتنی بڑی رائلٹی پبلشروں سے وصول کر لی تھی جو پچاس برس بعد بھی کسی کو نصیب نہیں ہوئی، لیکن وہ رائلٹی، جو اس صاحب کمال کی اپنی قوم پر واجب تھی، سب سے پہلے اس کی یاد دہانی شہرۂ آفاق ناول نگار دستوئیفسکی نے ۱۸۸۰ء میں کرائی اور اس کے بعد تورگنیف نے اور وہ آج تک ادا کی جا رہی ہے کوئی سال نہیں جاتا کہ پوشکن کا نیا مجسمہ کسی نہ کسی چوک میں نصب نہ کیا جاتا ہو۔ پوشکن کے نام سے منسوب نگار خانے ہیں، تھیٹر ہیں، عجائب خانے ہیں، علم وادب کے مرکز ہیں، اور ہر سال ایک نہ ایک تازہ علمی اور تحقیقی کتاب وہاں سے نکلتی رہتی ہے جن حضرات نے ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روس کے حال پر توجہ شروع کی ہے، ان کے علاوہ بھی دنیا کے گوشے گوشے میں پوشکن پہنچ چکا ہے اور قدآوروں مجسموں کی اس صف میں سینے پر ایک ہاتھ دھرے کھڑا ہے جہاں فردوسی، کالی داس، ہومر، سعدی اور شیکسپیئر کھڑے ہیں۔

×

مجھے تو پوشکن کی ساری مورتیوں میں اس مورتی سے عشق ہے جو لینن گراد سے بیس میل کے فاصلے پر ملکہ الیسکا ترینا کے محل کے باہر اسکول کے اسی باغیچے میں موجود ہے جہاں ڈیڑھ سو برس پہلے وہ کھیلتا پھرتا تھا۔ کنج میں تانبے کی ایک سیاہ بنچ ہے اور اس بنچ پر پندرہ سولہ برس کا ایک گھونگھریالا لڑکا پوشکن ایک طرف کو گردن نیوڑھائے سوچ میں گم ہے۔ اس موڈ میں بھی شرارت اور شورش اس کے چہرے سے ٹپکتی ہے۔ وہی معصومیت، وہی بے باکی، وہی فکرمندی، وہی ادائے دل ربائی!

پوشکن ساری زندگی ایسا ہی رہا۔ زندگی نے اُسے بوڑھا ہونے کی مہلت نہیں دی، لیکن اگر یہ مہلت مل جاتی تب بھی وہ بوڑھاپے کی پوست کو قبول نہ کرتا۔ وہ تو برق پارہ تھا۔ رقصِ شرر کا تماشا دکھا گیا اور رقصِ شرر کی ادا سکھا گیا۔

غالب نے عمر کی سب بہاریں ایک سلسلے سے دیکھیں۔ ان کے یہاں قاعدہ قرینہ، "نظم وضبط" "حجاب پاس وضع"، غور وفکر، احتیاط اور شکوہ شکایت بہت ہے۔ ان کا دسترخوان، لباس، شام کی محفل، مالیے کی فکر، ہوا دار کے گاؤ تکیے، غزل کی ٹھاٹھ، استادوں کی زمینوں میں زورِ طبع کی آزمائش، اور یاروں کے اوضاع کی فکر، فلسفے اور ادب کے مسلمہ دستور سے انکار کرنے کا انداز، سب ایک نہج پر ہیں۔ انھوں نے رنج وراحت کو "ہموار" کر لیا تھا۔ جو قوم "دو پاٹن کے بیچ میں" پس رہی تھی اس کا اتنا بڑا شاعر اگر تصور کی بدلیوں سے اپنے کھیت کی آبیاری نہ کرتا تو اور کیا کرتا ؎

حسرتِ وصل از چہ بُرد، چوں بخیال سرخوشیم
ابر اگر بالستد، برلب جوست گذشتِ ما

جب عالمِ خیال میں ہی سرخوشی نصیب ہو جاتی ہو تو مجھے کیا غرض، جو وصل کی حسرت میں دُکھ بھروں۔ بادل اگر نہیں برستا، نہ برسے، میری کھیتی نہر کے کنارے پڑتی ہے، اس سے سینچ لوں گا)

اور عالمِ خیال کی محفل میں جو صلے یہ ہیں ؎

ہاں غالب خلوت نشیں، بیمے چناں، عیشے چنیں
جاسوسِ سلطاں در کمیں، مطلوبِ سلطاں در بغل

دیکھو جی، خلوت نشیں غالب، یہ حرکتیں ہیں تمہاری، ایک طرف ایسا خطرہ مول لیا ہے کہ شاہی جاسوس تمہاری تاک میں ہے اور دوسری طرف عیش و عشرت کا کیا ٹھکانا کہ وہ جسے خود بادشاہ چاہے، وہ تمہاری بغل گرم کیے ہوئے ہے)

—— × ——

یہ مضمون مفصّل ہونے کے باوجود نا تمام ہے اور کچھ اور وسعت چاہتا ہے۔ کیوں کہ دو ہم عصر شاعروں کے مطالعے کی لپیٹ میں یہاں تاریخ کے دو بالکل مختلف مرحلوں پر دو قدموں کے مزاج کی ہلکی سی جھلک، ان کی یکسانی اور ان کا فرق اس طرح دیکھنے کو مل جاتا ہے، جیسے میناکاری یا Miniature Painting میں کسی رزمیہ داستان کے سین۔

فنا نظامی کان پوری

غزل

ظلمتِ شام سے بھی نورِ سحر پیدا کر
قلبِ شبنم کا ستاروں کی نظر پیدا کر

اے جنوں ایسی کوئی راہگزر پیدا کر
دلِ منزل میں بھی ارمانِ سحر پیدا کر

پھر کسی دامنِ رنگیں کی طرف آنکھ اٹھا
پہلے اشکوں کے لئے دیدۂ تر پیدا کر

رہِ دشوار میں کر منزلِ آساں کی تلاش
اسی دیوار میں ہمّت ہے تو در پیدا کر

موسمِ گل میں تو آجاتی ہے کانٹوں پہ بہار
بات تو جب ہے خزاں میں گُلِ تر پیدا کر

کام آئیں گے نہ پروانے نہ اہلِ محفل
اپنا فانوس خود اے شمعِ سحر پیدا کر

صحنِ گلشن نہ سہی دشت کا آغوش سہی
وحشتِ دل کے لیے کوئی تو گھر پیدا کر

بخش دے مردہ دلوں کو غمِ بیدار فنا
سینۂ سنگ میں طوفانِ شرر پیدا کر

اختر اورینوی

غزل

(۱)

اب ستم میں فسردگی سی ہے — کیا تعلق میں کچھ کمی سی ہے
زندگی ایک لفظِ بے معنی — آرزو ہی میں زندگی سی ہے
ہو چکا جینا اب تو خیر نہیں — آتشِ غم بجھی بجھی سی ہے
بیٹھے بیٹھے یہ کیا ہوا دل کو — نبضِ ہستی رکی رکی سی ہے
رات غم ناک و اشک آلودہ
چشمِ اخترؔ میں بھی نمی سی ہے

(۲)

کچھ اندھیرے میں روشنی سی ہے — فکر میں اک شگفتگی سی ہے
میری نظروں میں گدگدی سی ہے — ان لبوں پہ ہنسی ہنسی سی ہے
کپکپاتے ہوئے لبِ رنگیں — اک لطافت جو شبنمی سی ہے
کیسی کھنچن ہے کامنی مورت — اک تراشیدہ شستگی سی ہے
ان کے کومل بدن کی لرزش سے — کیا سراپا میں نغمگی سی ہے
ہے نزاکت میں خواب آگینی — ہر ادا میں سپردگی سی ہے
نرم لہجے کا میٹھا بھولا پن — اس نزاکت میں غنچگی سی ہے
ان کی آنکھوں کا سازِ بے تمثال — اک تجلّی جو روشنی سی ہے
سایۂ زلف میں جو ہوش آئے — دلِ ناداں کو آگہی سی ہے
ایسے ناداں نہیں ہیں وہ اخترؔ
گرچہ باتوں میں سادگی سی ہے

شیر افضل جعفری

غزل

مدھر اشاروں پہ راگ کا نور، انکھڑیوں میں شراب پیدا
نگہ نگہ میں بدکتے ہرنوں کے بھولے بھالے سے خواب پیدا

گھنیری زلفوں کی مست گھنگھور میں گھٹاؤں کی سیر گاہیں
گندھی ہوئی چوٹیوں سے تقدیر کے حسیں پیچ و تاب پیدا

بھڑکتے رخسار، آتشیں ٹھوڑی، تمتماتی ہوئی جوانی
کیا ہے شعلوں کی سرزمیں پہ سجل لبوں نے گلاب پیدا

چھلکتے انداز کے جلو میں غزل کی انگڑائیوں کے جلوے
اڈول قامت کی لاابالی سے لہلہاتا شباب پیدا

انوپ رفتار میں چراغاں لئے ہوئے صد ہزار دیپک
گداز باہوں کے جھول جانے سے بجلیوں کا جواب پیدا

حسین حسین نور نور دوشیزگی پہ بکھرے ہوئے ستارے
کنول کنول مسکراہٹوں کی بہار سے ماہتاب پیدا

قدم قدم پہ گلی گلی میں حنائی تلووں کی تابناکی
دمکتی مٹی کے ذرے ذرے سے حشر کا آفتاب پیدا

انیسویں صدی کے دو ممتاز شاعر



غالب



پوشکن

متعلقہ مضمون صفحہ ۸ پر ملاحظہ فرمائیں





ایک ناگا سردار ریاست ناگالینڈ کے افتتاح کے
بعد صدر جمہوریہ کو شال پیش کر رہے ہیں۔

ایک ناگا (زیمی) لڑکی ↓



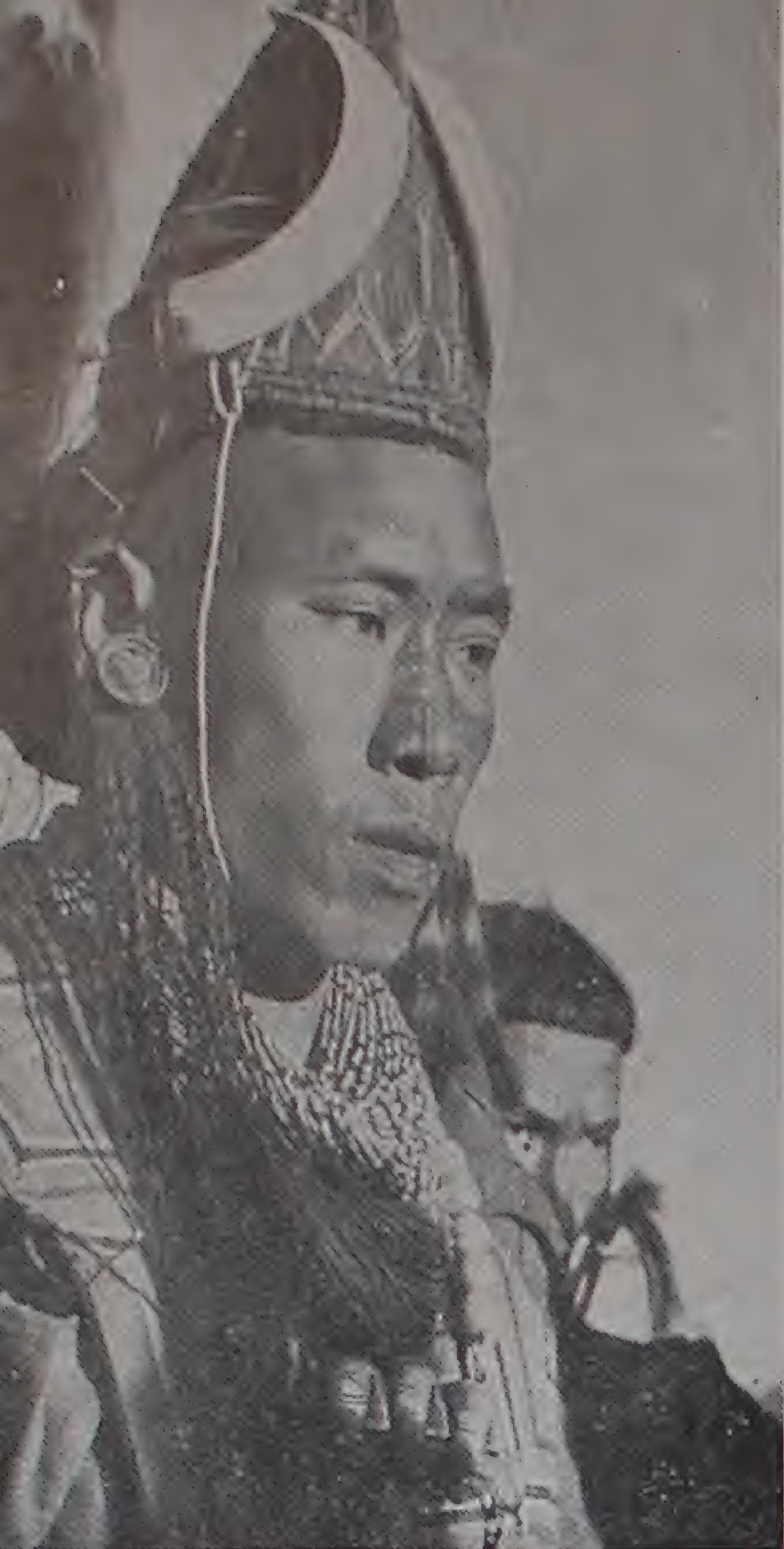


دو کونیک ناگا نوجوان

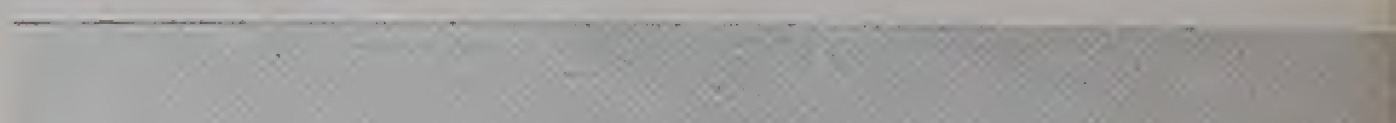




لی تھنگ یوم جمہوریہ کی پریڈ کے موقع پر ناگاؤں سے خطاب کر رہے ہیں



ایک ناگا اپنے قومی لباس میں



انگمی ناگاؤں کی ایک ٹولی

ناگا لوگ





اعلیٰ حضرت شاہ حسین والیٔ شرق اردن
گجرات کے سلطان محمود بیگڑہ کے مزار پر
سلطان محمود کا مقبرہ احمد آباد سے
پانچ میل دُور سرخیز میں ہے اور
فنِ تعمیر کا خوبصورت نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

ڈیورنڈ کپ جیتنے والی ٹیم موہن بگان (کلکتہ) تقسیم انعامات کے بعد صدر جمہوریۂ ہند کے ساتھ



ستیہ نارائن سنہا

بے میل محبت کے انوکھے ڈھنگ

بے جوڑ محبت کی پاکیزہ روایات' ان مُبہم اور کسی حد تک نامانوس لفظوں سے میری کیا مراد ہے' اس کی تشریح کرنے سے پہلے میں آپ کو وہ چھوٹی سی کہانی سنانا چاہتا ہوں جو اس عنوان کے انتخاب کا باعث ہوئی ہے۔ آج سے کوئی پندرہ بیس دن پہلے کی بات ہے' ہم کئی دوست ایک ساتھ کھڑے ہوئے حالاتِ حاضرہ پر باتیں کر رہے تھے' بات میں بات نکلی تو سر اسٹفرڈ کرپس کی صاحبزادی مس پیگی کرپس' اور گولڈ کوسٹ کے نیگرو نوجوان' اپیا' کی شادی کا ذکر آگیا جو حال ہی میں ہوئی تھی۔ ہم سب کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس شادی میں کرپس خاندان کے عزیز و اقارب اور دوستوں کے علاوہ انگلستان کے سابق وزیر اعظم شری ایٹلی اور شری بیون جیسے سرکردہ حضرات بھی نئے جوڑے کو مبارک باد دینے آئے تھے۔ لامحالہ ہمیں اسی نوعیت کا دو سال پرانا واقعہ بھی یاد آیا جب بامن گا تو قبیلے کے سردار سیرتسے کھاما نے 'رُوتھ ولیم' نامی انگریز دوشیزہ سے شادی کر لی تھی اور اس 'جرم' میں وہ نہ صرف اپنے قبیلے کی سرداری سے محروم کیا گیا بلکہ اُسے ہمیشہ کے لئے دیس نکالا بھی ملا۔ خیر — ہماری باتوں کا رُخ ان واقعات کے سیاسی اور سماجی پہلوؤں کی طرف زیادہ نہ رہا بلکہ ایک دوسری ہی بحث چل پڑی یعنی غیر ذات اور غیر کفو کے دو انسانوں کا آپس میں محبت کرنا' اس کا نفسیاتی پس منظر' نیز پچھلی تاریخ اور تجربات کی روشنی میں اس کا تجزیہ۔ یہ تھا ہماری گفتگو کا نیا رُخ۔

دنیا کی عام ضرورتوں کے پیشِ نظر ہمارے معلّمینِ اخلاق نے کہا ہے کہ محبت یا شادی جیسے رشتے حتی الوسع اپنے ہی کفو میں ہونے چاہئیں' عموماً یہی ہوتا بھی ہے لیکن ایسے رشتوں کے بارے میں عجیب بات یہ ہے' باوجودیکہ ہزاروں کی تعداد میں آئے دن ٹوٹتے اور جُڑتے رہتے ہیں' مگر ہمارے سماج کے پاس ان کا کوئی رکارڈ نہیں رہتا۔ تاریخ تو کجا مقامی روایتوں میں بھی ان کا ذکر نہیں آتا۔ اس کے برعکس اگر آپ محبت کے اُن اِکّا دکّا رشتوں کا تجزیہ کریں جہاں محبت کرنے والے دو افراد کے درمیان کوئی خاص تفریق یا نابرابری ہوتی ہے تو وہاں آپ کو زندگی کا ایک غیر معمولی رُخ نظر آئے گا۔ اس نوع کے رشتے بہت ہی کم — لاکھوں میں ایک آدھ — ملیں گے لیکن ان میں کوئی نہ کوئی انوکھا پن ضرور ہوگا۔ اور اسی انوکھے پن کے کارن انھیں عوامی قصّوں اور لوک گیتوں ہی میں نہیں بلکہ تاریخ کے صفحوں میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

تاریخی اہمیت کے لحاظ سے اس امتیاز کا سبب کیا ہے؟ یہ ایک غور طلب بات ہے۔ میرے خیال میں اس کا سب سے بڑا سبب وہ بھاری قیمت ہے جو بے میل حلقوں کے لوگوں کو آپس میں رشتہ قائم کرنے کے لیے چکانا پڑتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر ہم کفو لوگوں کی محبت ایک ایسا دیکھا بھالا سودا ہے' جس میں دونوں فریق اپنے اپنے فائدے

شری ستیہ نارائن سنہا وزیر اطلاعات و نشریات کا یہ دلچسپ مضمون अनमेलों की प्रीति की अलौकिक रीति کے عنوان سے ہندی میں ایک زمانہ ہوا نشر ہوا تھا۔ اس کا ترجمہ موصوف کی اجازت اور شکریے کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔

کے تصور سے مگن ہوتے ہیں۔ غیر کفو دلوں کا باہمی تعلق کم سے کم ایک فریق کے - ورنہ دونوں ہی کے لیے - بڑی ریاضت اور ایثار کا سبب بن جاتا ہے - یہ لازمی بات ہے کہ جس چیز کی جتنی قیمت ادا کی جائے گی اس کی اہمیت اتنی ہی بڑھے گی، یہ قیمت چاہے جذباتی سطح پر ایثار کی صورت میں ہو یا دنیاوی عزت و ذلت کے معیار سے ہو، یا سود و زیاں سے بے نیاز ہو جانے کی شکل میں۔

شنکر پاروتی کی امر کہانی

ہم دور کیوں جائیں اپنی ہی تاریخ کو اٹھا لیجیے آپ کو ایسی متعدد مثالیں ملیں گی جن میں دو غیر کفو کے انسانوں کی ایثار سے بھری ہوئی پریم کہانی فرد اور سماج دونوں کے لیے آدرش بنا کر پیش کی گئی ہے - شنکر پاروتی کی امر کہانی ہی لے لیجیے - کہاں شیل راج ہمالہ کی سگھڑ اور سلیقہ شعار، ہمہ صفت موصوف اور حسن و جمال میں لاثانی نیک نفس دختر پاروتی - اور کہاں بھنگ دھتورا کھانے والے، بھونڈے لباس پہننے والے اور شمشان میں رہنے والے دگمبر شیو - اسی نابرابری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سات رشیوں نے پاروتی سے نارد کے کپٹ کی بات کہی تھی:

نرگن، نلج، کوبیش، کپالی ۔۔۔ اکل، اگیہہ، دگمبر، ویالی
کہو نہ کون سکھ اس بر پائے ۔۔۔ بھلی بھولیو ٹھگ کے بورائے

(اس میں کوئی گن نہیں، شرم و حیا بھی نہیں، وہ کھوپڑیوں کی مالا پہنتا ہے، اس کا خاندان بھی اچھا نہیں، خانماں آوارہ بھی ہے ننگ دھڑنگ گلے میں سانپ ڈالے پھرتا ہے - سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے شوہر سے تمہیں کیا سکھ ملے گا - تم نے بڑی غلطی کی ہے اور تم اس ٹھگ کے بہکائے میں آ گئی ہو -)

مگر اس دختر ہمالہ (پاروتی) نے اپنا انتخاب کبھی کا کر لیا تھا۔ وہ ایثار نفس کے اس مقام کو پا چکی تھی جہاں محبوب کے عیب بھی ہنر معلوم ہونے لگتے ہیں - اس نے سات رشیوں کو جو تیکھا جواب دیا ہے وہ بھی سننے کے لائق ہے:

جو تم ملتیو پرتھم منیسا ۔۔۔ سنتوں سکھ تمہاری دھر سیسا
اب میں جنم شمبھو ہت ہارا ۔۔۔ کو گن دوش ہیں کرہی وچارا

(اے رشیو، تم پہلے مل جاتے تو میں بسر و چشم تمہاری نصیحت سنتی، لیکن اب تو میں نے اپنی زندگی شیو پر وار دی ہے اس لیے ان کے عیب و ہنر سوچنے کا موقع کہاں؟)

دختر ہمالہ پاروتی کا یہ خاکی جسم چاہے فنا ہو جائے لیکن وہ اپنے عہد و پیمان سے نہیں ٹل سکتی - بار بار آگ میں تپ کر بھی اپنی فطرت نہ چھوڑنے والا سونا بھی تو آخر پتھروں ہی سے نکلتا ہے:

ستیہ کہیو گری بھو تنو ایہا ۔۔۔ ہٹ نہ چھوٹ چھوٹے برو دیہا
کنکؤ پنی پکھان تے ہوئی ۔۔۔ جارہو سہج نہ پری ہر سوئی

(پربت کنیا پاروتی نے سچ کہا کہ میں اپنا پیمان نہیں توڑ سکتی چاہے جان چلی جائے - آگ میں تپ کر بھی سونا اپنی خاصیت نہیں بدلتا وہ بھی آخر پتھروں ہی سے نکلتا ہے)

خود مہادیو بھی آ کر سیکڑوں بار التجا کریں تو بھی پاروتی نارد کے اپدیش کو نہیں ٹھکرا سکتی - یہ جنم تو کیا آنے والے جنموں کے لیے بھی ان کے عہد و پیمان ہو چکے ہیں:

تجوں نہ نارد کر اپدیسو ۔۔۔ آپ کہیں شت بار مہیسو
جنم جنم لگی رگر ہماری ۔۔۔ بروں شمبھو نہ تو رہوں کماری

یہ ہے شنکر اور اماں پاروتی کی بے میل مگر دنیاوی سطح سے بلند محبت کی پاکیزہ داستان -

مہابھارت کے قصے

اس کے بعد اگر آپ مہابھارت کے زمانے کی چھان بین کریں تو آپ کو دشینت اور شکنتلا، شانتنو اور متسیہ گندھا، گاندھاری اور دھرت راشٹر اور سب سے بڑھ کر برج راج کرشن اور برج کے عشق آباد میں گوپیوں کے وہ نظارے ملیں گے جہاں محبت میں اسی بے میل جوڑ نے ان قصوں کو ناقابل فراموش بنانے میں بڑا اہم حصہ لیا ہے -

کہاں بے اندازہ شان و شوکت اور طمطراق والے محلوں میں رہنے والے چکرورتی شہنشاہ مہاراج دشینت اور کہاں بیل کے پتوں سے ڈھکے ہوئے کنو رشی کے آشرم میں پرورش پانے والی اور چھالوں کا لباس پہننے والی شکنتلا - پھر بھی بغیر یہ دیکھے بھالے کہ اس کا خاندان کیا ہے، لیاقت و صلاحیت کیسی ہے، اور وہ ان جیسے عظیم المرتبت

شہنشاہ کے قابل ہے بھی یا نہیں، دشینت مہاراج پہلے ہی سالیتے ہیں اپنا سب کچھ شکنتلا پر وار بیٹھے۔ غالباً دشینت کی یہ خود سپاری بے جا نہ تھی۔ شکنتلا کے ساتھ ان کے اس بے میل رشتے ہی کا نتیجہ وہ جیالے بھرت تھے جن کے اعلیٰ خاندانوں کی روایات آج تک قابلِ رشک ہیں اور جن کے نام سے ہمارا یہ قدیم ملک 'بھارت' منسوب ہے۔

اسی طرح بھرت خاندان کے چشم و چراغ مہاراج شانتنو ہر طرح سے خوش حال اور فارغ البال تھے۔ بھیشم پتامہ جیسے ہمہ صفت موصوف فرزندِ ارجمند کا باپ ہونے کی سعادت انھیں نصیب تھی۔ جس وقت داسی راج کی بیٹی ستیہ وتی کے لیے ان کے دل میں محبت کا ولولہ پیدا ہوا تو انھوں نے اس کے نیچ خاندان کا ذرا بھی خیال نہ کیا اور اس بے میل رشتے کو ممکن بنانے کی سعی و ایثار ہی کی بدولت آنے والی نسلوں کو برہم چاری بھیشم جیسا بے مثل مورثِ اعلیٰ مل گیا۔

مہابھارت کی تیسری کہانی جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں، گاندھاری اور دھرت راشٹر کی ہے۔ گاندھاری کے راجا سُبل کی پری جمال بیٹی دیوی گندھاری بچپن ہی سے بھگوان شنکر کی معتقد تھی اور ان سے سو بیٹوں کا بردان لے چکی تھیں۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ ان کا بیاہ اندھے دھرت راشٹر سے ہونے والا ہے تو اسی وقت سے انھوں نے بھی اپنی دونوں آنکھوں پر پٹی باندھ لی۔ گندھاری نے سوچا کہ جب میرے شوہر ہی بینائی سے محروم ہیں تو مجھے اس دنیا کو دیکھنے کا کیا حق حاصل ہے۔ شوہر کے لیے اپنی جسمانی راحت کو قربان کر دینے کی اس سے انوکھی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں اور ملنا مشکل ہے۔

مہاراج کرشن اور گوپیاں

اب آیئے تھوڑی دیر مہاراج کرشن اور ان کی محبت میں وارفتہ و شیفتہ گوپیوں کے بے مثل کردار کا ذکر کریں جو عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی طرف ترقی کرنے کی ایک اعلیٰ و ارفع مثال ہے۔ گوپی اور کرشن کے فسانۂ عشق کی دل کشی بڑی حد تک ان کے باہم بے جوڑ ہونے پر منحصر ہے۔ یہ بات شاید غلط نہیں — کہاں تو علم و عرفان اور ترک و تجرید کا نمونہ کرشن۔ اور کہاں برج کی سیدھی سادی چھوکریاں، سماجی اور ذہنی ہر دو اعتبار سے اس رشتے کا بے جوڑ ہونا ظاہر ہے۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے مہاکوی رسکھان نے کہا ہے:

شیش، گنیش، مہیش، دنیش، سریشہوں جاہے نرنتر گاویں
جاہے انادی، اننت، اکھنڈ، اچھید، ابھید، سُوید بتاویں
نارد سے شُک ویاس رٹیں، پچی ہارے تیؤ پُنی پار نہ پاویں
تاہی اہیر کی چھوہریاں، چھیا بھری چھاچھ پہ ناچ نچاویں

(یعنی شیش ناگ، گنیش، مہیش، سورج، اندر جس کی ہمیشہ مدح کرتے آئے ہیں اور جسے ویدوں نے اوّل و آخر ظاہر و باطن، روحِ کل اور برتر از قیاس و گمان کہا ہے۔ نارد سے لے کر شُک اور دیاس تک کی زبانیں جس کی حمد و ثنا میں لال ہیں مگر وہ اس کی کُنہ کو نہیں پہچان سکتے، اسی کو اہیروں کی یہ چھوکریاں چھاچھ کے پیالے دکھا دکھا کر انگلیوں پر نچاتی ہیں)

دوسری طرف ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہی "چھیا بھری چھاچھ" پر ناچنے والے گوپال کرشن دوارکا کے مہاراج بن کر برج میں بسنے والوں سے بہت دور چلے جاتے ہیں اور بے وفا کرشن کے برہ میں تڑپنے والی گوپیاں ان کے نام کی رٹ لگاتی ہیں۔ وہ کرشن کے سوا کسی اور شے کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ کرشن کا دوست اُودھو جب یوگ (ریاضت) اور ویراگ (تجرید) کی تعلیم دیتا ہے تو برہ کی ماری گوپیوں کا اس پر یہ طنز سننے کے لائق ہے:

اودھو، من نہ بھئے دس بیس
ایک ہتو سو گیو شام سنگ، کو آرادھے ایس؟

(یعنی اے اودھو، انسان کے دس بیس دل تو ہوتے نہیں۔ ایک تھا وہ شیام کے ساتھ گیا۔ اب ہم تمھارے خدا کو کس دل میں جگہ دیں؟)

جب اودھو، رادھا کو کرشن کا خط لا کر دیتے ہیں تو وہ کہتی ہے:

تو ہوں بھئے بورے اُودھو، پاتی لیے دوڑے آئے
یوگ کہاں راکھوں، یہاں رُوم رُوم شیام ہے

(اودھو تم بھی کیا دِوانے ہو، خط لے کے دوڑ آئے، ذرا عقل کے ناخن لیے ہوتے۔ یہاں رُوئیں رُوئیں میں تو شیام بسے ہوئے ہیں یوگ کی گنجائش ہے کہاں؟)

گوپیوں کی بے صبری دیکھ کر اودھو نے طرح طرح کے دم دلاسے

دیئے، مگر جب سب سے ہار گئے تو خود بھی کرشن کی بے دردی جفا شعاری کا ذکر کر کے گوپیوں کا ادھر سے دھیان ہٹانے لگے۔ لیکن اس پر تو انھیں ایسا جواب ملا کہ دم مارنے کی جگہ نہ رہی:

اُودھو من ماننے کی بات

داکھ چھُہارا چھاڑ امرت پھل، وش کیڑا وش کھات

سورداس جا کو من جا سو، سوئی تا ہے سُہات

(اودھو یہ تو دل آجانے کی بات ہے۔ رس میں پلا ہوا کیڑا ہی زہر کھانا پسند کرتا ہے۔ انگور، چھوہارے یا امرت پھل اس کے لیے بے کار ہیں۔ بقول سورداس جس دل میں جو بس گیا وہی اُسے سہاتا ہے)

وِدُر اور سداما

بھگوان شری کرشن ہی سے متعلق دو[2] اور روایتیں ہیں جو اگرچہ دوستانہ خلوص کے متعلق ہیں، پھر بھی ان کی جاذبیت اپنے انداز کی نرالی ہی ہے۔ میری مراد وِدُر اور سداما جیسے پس ماندہ و نادار طبقے کے لوگوں سے بھگوان شری کرشن کی بے پناہ محبّت ہے۔

شری کرشن جب پانڈوؤں کے سفیر بن کر ہستناپور گئے تو ان سے رشتہ داری ہونے کے ناتے دریودھن نے اپنے گھر کھانے پر مدعو کرنا چاہا لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ دریودھن کے یہاں سے چل کر وہ وِدُر کے گھر پہنچے، جو ایک شُدر کے بطن سے تھا، بہت مفلس مگر دیانت دار انسان تھا۔ اس کے گھر روکھی سوکھی ہی کھا کر وہ خوب سیر ہو گئے۔

دریودھن گھر میوا تیاگو، ساگ وِدُر گھر کھایو

(یعنی دریودھن کے گھر میوے چھوڑ کر وِدُر کے ہاں ساگ بھاجی کھایا)

بھگوان کرشن کی یہ صفت آج بھی ان کے غریب بھگتوں کے لیے دلاسہ سہارا ہے۔

ٹھیک اسی طرح دوارکا کے سردار مہاراج کرشن اور نادار سداما کی بے مثل دوستی کو یاد کر کے آج بھی دل بھر آتا ہے۔ کہاں ایک طرف سداما کی یہ ردی حالت

سیس پگا نہ جھگا تن پہ پربھو — جانے کو آہے بسے کیہی گراما
دھوتی پھٹی سی لٹی ڈپٹی — اور پائیں اُپاہنوں کی نہیں ساما

(اس کے سر پر نہ تو دستار ہے نہ جسم پر لباس، نہ جانے کون شخص آیا ہے اور کس گانو کا باسی ہے اُس کی دھوتی بھی چیکٹ اور لیر لیر ہے، پانوؤں میں جوتے بھی ندارد ہیں)

اور کہاں اسی سداما سے ہم آغوش ہو کر کرشن کا یہ محبّت بھرا شکوہ:

دیکھ سداما کی دین دسا — کرونا کر کے کرونا ندھی روئے
پانی پرات کو ہاتھ چھواؤ نہیں — نینن کے جل سُوں پگ دھوئے

سداما کو نہلا دھلا کر، اچھا لباس پہنا کر اور لذیذ کھانے کھلا کر جب بھگوان فارغ ہوئے تو انھیں مذاق سوجھا۔ ہم مکتبی کے زمانے میں گرو ماتا کے دیے ہوئے چنے اکیلے ہی اکیلے اڑا جانے کی بات یاد دلا کر کتنی محبّت سے بھابھی کے بھیجے ہوئے مُرمُرے طلب کرتے ہیں:

پوٹری کانکھ میں چاپے رہے تم — کھولت ناہیں سُدھا رس بھینے
پاچھلی بانی اجو نہ تجی تم — تیسے ہی بھابھی کے تندل لینے

(پوٹلی تم نے انٹی میں دبا رکھی ہے۔ وہ امرت میں بسے ہوئے مُرمُرے آخر دیتے کیوں نہیں۔ تمھاری پرانی حرکتیں ابھی تک نہیں گئیں۔ جیسے تم پہلے میرے حصّے کے چنے کھا جاتے تھے ایسے ہی اب بھابھی کے بھیجے ہوئے مرمرے دبا لیے!)

وہی بھگوان کرشن جو طرح طرح کے لذیذ کھانوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے وہ ایک غریب برہمن کے لائے ہوئے ساتواں کے چاولوں کو کتنی رغبت سے کھا رہے ہیں، یہ دیکھ کر سبھی حیرت کرتے ہیں:

بھون بھرے پکوان مٹھائی — لوگ کہیں ندھی ہیں سُستما کے
سانجھ سویرے پتا ابھی لاشت — داکھ نہ چاکھت سندھو چھپا کے
برہمن ایک کوؤ دکھیا بیر — پاوک چاول لایو سما کے
پریت کی ریت کہاں ہا کہیئے — تے ہی بیٹھ چباوت کنت رما کے

(جن کا محل لذیذ کھانوں اور مٹھائیوں سے بھرا ہوا ہے اور جن کے ماتا پتا صبح و شام کہہ کہہ کر انگور کھلانا چاہتے ہیں مگر وہ نہیں چکھتے۔ محبّت کا اثر تو دیکھو کہ وہی کرشن ہیں کہ ایک غریب برہمن پاؤ بھر مُرمُرے لے آیا ہے تو اسے کیا مزے لے لے کر کھا رہے ہیں)

آخر ایک ہفتے تک شاہی مہمان رہنے کے بعد جب سداما اپنے گھر جانے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں تو بھگوان انھیں کس تجمّل کے ساتھ

رخصت کرتے ہیں، یہ منظر بھی قابلِ دید ہے:

داہنے وید پڑھیں چترانن　　موہنے دھیان مہیس دھریو ہے
بائیں دُو کر جوڑ شُو سیوک　　دیون ساتھ سریس کھڑیو ہے
اینی بید انیک لیے دھن　　پا من آئی کبیر پڑیو ہے
دیکھ وَبھو اپنو شِیو　　بپر وٹے برہمن چونک پڑیو ہے

(سُداما کے داہنی طرف برہما ادب سے کھڑے ہوئے وید کا جاپ کر رہے ہیں اور سامنے شیو مجسّمے کی طرح ساکت کھڑے ہیں۔ بائیں طرف تمام دیوتاؤں کے ساتھ اندر دونوں ہاتھ جوڑے حاضر ہیں۔ بے شمار خزانوں کے مالک کُبیر بے اندازہ دولت لیے ہوئے پاؤں پڑ رہے ہیں۔ یہ شان و شوکت دیکھ کر جو سُداما کو کبھی خواب میں بھی نظر نہیں آئی تھی، غریب برہمن ہکا بکا رہ جاتا ہے)

فخرِ انسانیت رام

شری کرشن کی طرح انسانِ کامل رام کی زندگی میں بھی ایسی ہی بے جوڑ محبّت کا مثالی نمونہ نظر آتا ہے۔ رام کے بھگت جٹایو اور بھگتی میں ڈوبی ہوئی شبری نیز آڑے وقت کے ساتھی نشاد اور پناہ گیر وبھی شن کے لیے رگھوناتھ رام کی بے پناہ شفقت ایک نادر نمونہ ہے۔

دنڈک بن میں رشی متنگ کے آشرم کے قریب کٹیا بنا کر عبادت کرتے ہوئے شبری بھیلنی کو بہت دن بیت گئے تھے۔ دوسری دنیا کو سدھارنے سے پہلے متنگ رشی نے شبری کو یقین دلا دیا تھا کہ بھگوان رام چترکوٹ میں آ گئے ہیں اور ایک نہ ایک دن اسے اپنے دیدار سے ضرور مشرّف کریں گے۔ طویل انتظار کے بعد جب ایک دن رام دنڈک بن میں تشریف لائے تو سب سے پہلے انھوں نے شبری کی جھونپڑی کا راستہ پوچھا۔ شبری جو سالہا سال سے رام کی منتظر تھی انھیں اچانک اپنی جھونپڑی میں دیکھ کر فرطِ مسرّت سے ناچنے لگی۔

شیام گور دو سندر بھائی　　سبری پری چرن لپٹائی
پریم مگن مُکھ بچن نہ آوا　　پُنی پُنی پد سروج سرناوا

(گورے اور سانولے دونوں حسین و جمیل بھائیوں کے پیروں سے شبری لپٹ گئی۔ وفورِ انبساط نے انھیں کچھ بولنے کا موقع نہ دیا۔ وہ منھ سے تو کچھ نہ کہتی تھی بس بار بار اپنا سر لچھمن اور رام کے پیروں پر رکھتی تھی)

اس جنونِ عشق کے اترنے کے بعد شبری کو اپنے گھر آئے ہوئے رام کی مہمان نوازی کا خیال آیا۔ اب شبری نے انھیں خوب صورت مسند پہ بٹھایا اور وہ پھل چُن چُن کر ان کی تواضع کرنے لگی جو اس نے بہت دنوں سے جمع کر رکھے تھے۔ بھگوان کیسی خوشی خوشی شبری کے ان پھلوں کو خود کھاتے ہیں اور ایک کو دوسرے سے زیادہ میٹھا بتا کر اپنے بھائی لچھمن کی طرف بڑھاتے ہیں۔ یہ ان شعروں میں دیکھیے:

بیر بیر، بیر سراہے بیر بیر بہو
رسک بہاری دیت بندھو کہیں پھیر پھیر
چکھ چکھ بھاکیں یہ با ہو تیں مہان میٹھو
لیہ تو لکھن یوں بکھانت ہے ہیر ہیر

(یعنی ایک کے بعد دوسرا بیر اٹھاتے ہیں، پھر اس کی تعریف کے پُل باندھ دیتے ہیں اور اسے اپنے بھائی لچھمن کو دیتے ہیں۔ چکھتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ ان میں تو ایک سے ایک بڑھ کر میٹھا ہے۔ لکھن اور کھاؤ — اور کھاؤ)

بھگوان کے دیدار کی اپنی آخری آرزو پوری کر کے شبری نے تو مقامِ قُرب پا لیا، لیکن رام کے دل میں بھی اپنی بے مثال عقیدت کے لازوال نشان چھوڑ گئی۔ بھگوان جہاں بھی جاتے ہیں شبری کی تعریف سے نہیں تھکتے:

ملی مُنی برند پھرے دنڈک بن　　سو چرچا نہ چلائی
بار ہی بار گیدھ شبری کہ　　ورنت پریت اگھائی

(وہ بڑے بڑے رشیوں سے مل کر دنڈک بن واپس آئے ہیں مگر انھوں نے اس کا کبھی ذکر نہیں کیا، لیکن ایک بے حیثیت شبری کی ملاقات کا حال بار بار بیان کرتے ہیں اور اس ذکر سے کبھی نہیں تھکتے)

اور شبری کے بیر؟ اُن کی لذّت کے آگے تو گویا رام کو اچھے سے اچھا کھانا بھی بے سواد معلوم ہوتا ہے:

گھر گرہ گرو پریا سدن سا سُرے بھئی جب جہ پہنائی
تب تہہ کہیو شبری کے پھلن کی رُوچی مادھری نہ پائی

(اپنے گھر یا اپنے گروؤں کے گھر یا اپنی سسرال میں غرض کہ جہاں بھی وہ مہمان بن کر گئے وہاں انھوں نے شبری کا ذکر ضرور کیا۔ اور کہتے تھے کہ شبری کے پھلوں میں جیسی مٹھاس تھی وہ پھر مجھے کہیں حاصل نہیں ہوئی)
کیسی خوش قسمت تھی وہ شبری جس پر بھگوان رام نے ایسی مقدس شفقت کا مظاہرہ فرمایا۔

اسی طرح نیچ خاندان سے متعلق ہونے کی وجہ سے نشاد راج کے لیے بھی بھگوان رام کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا۔ سچ تو یہ ہے کہ نشاد کو رام کے قریب ہونے کی جو سعادت حاصل تھی اس پر دیوتا بھی رشک کرتے تھے۔

تھکے دیو سادھن انیک کر   سپنہوں نہیں دئیو دکھائی
کیوٹ میت کہت سکھ مانت   بانر بھال بڑائی

(سارے دیوتا کوششیں کرتے تھک گئے لیکن خواب میں بھی ان کا دیدار نہ کر سکے مگر وہی رام ایک ملاح کو اپنا دوست کہہ کر خوشی محسوس کرتے ہیں اور وہی رام بندروں اور بھالوؤں کو درشن دے کر ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں)

ان کی حمایت میں آنے والے وبھیشن کے لیے رام کی بے اندازہ شفقت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب میدانِ جنگ میں شکتی بان لگنے سے لچھمن بے ہوش ہو کر گر جاتے ہیں ہنومان نوشدارو لینے گئے ہیں۔ ان کے آنے میں دیر ہوتی جا رہی ہے۔ بھگوان رام کے پائے استقلال میں بھی لرزش پیدا ہو جاتی ہے ۔" میرو سب پُرش آرتھ تھاکو" (میرے سارے حوصلے تھکے جا رہے ہیں) یہ کہہ کر رام گریہ وزاری کرنے لگتے ہیں۔ رن میں ہار جانے کی یا دوسرے انجام وعواقب کی انھیں اتنی فکر نہیں ہے جتنی صرف ایک بات کی:

گری کانن جیہیں ساکھا مرگ   ہوں پنی انج سنگھاتی
ہوئے ہے کہا وبھیشن کی گتی   یہی سوچ بھری چھاتی

(اے جنگل کے پھول پودو، اے پہاڑوں میں بسنے والے جانورو، تم گواہ رہنا کہ میں اپنے چھوٹے بھائی کا قاتل ہوں مگر مجھے اس کی فکر نہیں ہے، اگر اندیشہ ہے تو یہ ہے کہ وبھیشن کا کیا ہوگا۔ یہ سوچ کر میری چھاتی غم کی شدت سے پھٹنے لگتی ہے۔)

یہ تھا بھگوان رام کا پیت نبھانے کا اونچا آدرش۔

پرتھوی راج اور سنجوگتا

آخر میں، اگر آپ عام تاریخ کو دیکھیں تو اس میں بھی ایسی نظیروں کی کمی نہیں ہے جہاں غیر مساوی حیثیت کے افراد میں محبت کا رشتہ ایک غیر معمولی مسرت کا ذریعہ بن گیا ہے۔ پرتھوی راج اور جے چندر کی باہمی شکر رنجی دشمنی کی حد کو پہنچ گئی تھی اور دونوں خاندانوں کے درمیان بیاہ جیسا محبت کا رشتہ قائم ہونے کا امکان تا بحدِ محال تھا۔ اپنی لڑکی سنجوگتا کے سوئمبر میں جے چندر نے پرتھوی راج کا مجسمہ اپنے دربان کی جگہ پر رکھ کر اس جیالے سورما کی توہین کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ لیکن سنجوگتا نے سوئمبر میں آئے ہوئے راجکماروں کو چھوڑ کر اپنے باپ کے مقہور پرتھوی راج کے مجسمے کو جے مالا پہنا کر غیر معمولی ہمت و جسارت کا مظاہرہ کیا۔ پرتھوی راج کا عین اس موقع پر ظاہر ہونا اور سنجوگتا کو گھوڑے پر بٹھا کر اڑا لے جانا بھی سنجوگتا جیسی بہادر عورت کے منگیتر کے لیے قطعاً مناسب حال تھا۔

دو اور مثالیں ہیں۔ جن میں شوہر اور بیوی کی عمروں میں خاصا تفاوت ہونے کے باوجود ازدواجی زندگی کا سکھ حاصل رہا۔ یعنی ستر برس کا رانا راج سنگھ اور سولہ برس کی روپ رانی اور پچپن سال کے راجا گنگا دھر اور بارہ برس کی رانی لچھمی بائی — جھانسی کی رانی لچھمی بائی کا اس ملک کی تاریخ میں کیا مرتبہ ہے اسے کون نہیں جانتا۔

جہانگیر اور انارکلی

اب جہانگیر اور انارکلی کی مثال لیجیے۔ دونوں کی حیثیتوں میں جتنا غیر معمولی تفاوت تھا اتنا ہی دونوں کی محبت بے مثال اور لازوال تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں جہانگیر اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کر دیتا ہے اور انارکلی کے سوا دنیا میں کسی سے اسے کوئی لگاؤ باقی نہیں رہتا۔ وہ انارکلی کو دیکھ کر کہتا ہے:

اب رہا نہیں کچھ باقی، تجھ کو پا کر سب کچھ پایا
دنیا ہو گئی مجھ کو پرائی جب سے تو نے اپنایا

اب آپ ذرا انارکلی کی محبت اور قربانی بھی دیکھیے۔ جیل خانے میں پڑی ہوئی وہ اپنی موت کے دن گن رہی ہے۔ موت کا اسے ذرا بھی خوف نہیں

لیکن مرنے سے پہلے وہ صرف ایک بار جہانگیر کو دیکھنا چاہتی ہے۔ کس لیے؟ یہ اسی کے لفظوں میں سنیے، کتنا نازک خیال ہے:

ہے ایک سادھ ملنے کی — مل چک چھما کرواتی
وہ ہنس دیتے سویکرتی میں — میں ہنس ہنس کر مرجاتی

(میں ایک بار، صرف ایک بار ان سے ملنے کی آرزومند ہوں تاکہ اپنی خطائیں معاف کرالوں، وہ مسکرا کر میری معذرت قبول کرلیتے تو میں ہنسی خوشی مرجاتی)

یہ ہے مثالی محبت کا اعلیٰ نمونہ۔ جو نابرابر حیثیت ہی کے افراد میں کہیں مل سکتا ہے۔

ایڈورڈ ہشتم

ایک واقعہ جو عہدِ حاضر کی تاریخ کا جزو بن چکا ہے، انگلستان کے سابق شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم اور موجودہ ڈیوک آف ونڈسر سے تعلق رکھتا ہے۔ والس سمپسن نامی ایک مطلقہ عورت سے عہدِ وفا نبھانے کے لیے ایڈورڈ کو تختِ شاہی سے دست بردار ہونا پڑا۔ محبت کی قربان گاہ پر اتنی عظیم قربانی دینے والے کسی زندہ شخص کا کم سے کم مجھے تو علم نہیں ہے۔

عربی ادب میں لیلیٰ مجنوں کو عشقِ مجازی ہی نہیں، عشقِ حقیقی کا بھی اعلیٰ نمونہ مانا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ لیلیٰ رات کی طرح سیاہ فام تھی لیکن مجنوں کی نگاہوں میں یہی اس کا حُسن تھا۔ وہ دونوں اس حد تک ایک جان دو قالب ہوگئے تھے جہاں 'من و تو' کا فرق بھی مٹ جاتا ہے۔ چناں چہ:

خوں رگِ مجنوں سے نکلا، فصد لیلیٰ کی جو لی

کعبے جانے پر مجنوں نے جو دعا مانگی وہ اس کی بے لوث محبت اور حقیقی عشق کی معراج ہے:

گیا جو کعبے کو مجنوں تو یہ دعا مانگی
الٰہی مجھ سے جدا ہو نہ الفتِ لیلیٰ

سچ پوچھا جائے تو سچی محبت کی زندگی کا آغاز و انجام اپنے نفس کی قربانی ہی میں ہے۔ جان سب کو عزیز ہوتی ہے مگر اس کلیے کا استثنا محبت ہے۔ عشق میں فنا ہو جانا عینِ زندگی ہے اور جس نے یہ راز سمجھ لیا وہ حشر صاحب کی آواز میں آواز ملائے بغیر نہیں رہ سکتا:

جب سے سنا ہے مرنے کا نام زندگی ہے
سر سے کفن لپیٹے قاتل کو ڈھونڈتے ہیں

غزل

کرشن موہن

آنکھ اشک ریز ہے اور چہرہ زرد ہے — مبتلائے عشق ہوں، دل میں سوز و درد ہے
مل گیا مگر رہا، سود تیرا التفات — جس میں جیت بھی ہے مات، عشق وہ نرد ہے
عشق کی متاع کو راہزن کا خوف کیا — گمرہی کی فکر کیا، شوق رہ نورد ہے
جو نہ ہارے اپنا دل فرطِ مشکلات میں — عرصۂ حیات میں وہ شجاع مرد ہے
کوئی آکے دفعتاً کیف و رنگ بخش دے — چھائی ہے فسردگی، بزمِ شوق سرد ہے
کر رہے ہیں میرا پاس، مجھ کو دیکھ کر اداس — ہو گئے ہیں وقفِ یاس، رُخ پہ غم کی گرد ہے

جورِ پُر غرور میں، حسنِ التفات میں
ہاں ہر ایک بات میں میرا دوست فرد ہے

پریم ناتھ در

کھڑکی

اس کھڑکی میں ایک نہیں دس باتیں تھیں جو کانتا جی کو کھینچ لیتی تھیں۔ پہلی بات تو خیر یہی تھی کہ یہاں دو منٹ ٹک جانے کو جگہ تھی، ذرا دم لینے کو۔ اماں جی آواز دیتیں، نہ کھڑا ہونا بُرا لگتا نہ دیر لگتی۔ فرش پر کہیں گھٹنے جوڑ کر بیٹھنے سے یہی اچھا تھا کہ اپنی ٹانگیں لٹکی رہیں اور کمر بھی ٹکی رہے۔ پھر چاہے اوپر آسمان کی طرف دیکھو چاہے نیچے زمین کی طرف، یا یونہی پرے مکانوں کو گھورتے رہو۔ اپنے من میں جس بات کا خیال آجائے اس کو بلا جھجک آنے دو ––– اس جگہ کوئی ایسا تھا ہی نہیں، اوپر آسمان میں نہ نیچے زمین پر، جو سامنے بیٹھا بیٹھا پپوٹوں یا ہونٹوں کی چھوٹی سی حرکت کو دیکھے اور من کی چوری کو پکڑ لے۔ یہاں تو اپنے منہ سے کوئی لفظ بھی نکلے۔ تار پر بیٹھی چیڑیا بھوگی، چی چی کرکے بھاگ اڑے گی۔ نہ اپنا مطلب اس کی سمجھ میں، نہ اس کی بولی اپنے پلّے میں۔ اندر اندر سینے میں جو اٹک گیا ہے اُسے کھڑکی پر آکر نکال دو۔ اتنی سی چیڑیا ہی بھرے بوجھ کو لے جائے گی۔

کانتا جی کی کھڑکی کے نیچے ایک چھوٹی سی سڑک تھی۔ مری مری بیمار سی سڑک، جس کے روڑے کہیں کہیں ایسے اُکھڑے ہوئے تھے جیسے یہ بھی کسی کے سینے کی ہڈیاں ہوں۔ اسی وجہ سے کانتا جی اپنی نظر کو کھڑکی سے یوں اُچھالتی کہ سڑک، کو چھوتی بھی نہیں اور ایک آن میں سڑک کے ساتھ لگی ہوئی کھلی زمین پر آجاتی اور پھر زمین کے اُسی ٹکڑے کی لمبائی چوڑائی کو ناپنے لگتی۔ ویسے تو وہاں بہت کچھ تھا جسے گھنٹوں دیکھا جاسکتا تھا، لیکن کانتا جی کے پاس گھنٹے کہاں کچھ لمحے ہی ہوتے تھے۔

کسی لمحے اس کے دماغ میں یہ خیال آتا کہ کھونٹے سے بندھی ہوئی بھینسیں سوکھتی نہیں ہیں، صبح و شام دونوں وقت دودھ کی بھری بالٹیاں دیتی ہیں۔ کسی لمحے پھر اُسے یہ خیال آتا کہ بھینسوں کو یونہی بغیر کام کاج کے کھانا ملتا ہے، بغیر کسی محنت کے خدمت ملتی ہے۔ دُودھ یونہی نہیں دیتیں۔ زمین کا وہ ٹکڑا ایک بڑا آنگن سا تھا جہاں کئی بھینسیں تھیں، بھینسوں کے کالے کالے بچّے تھے۔ لکڑی کی لمبی لمبی ناندیں تھیں، زنگ آلودہ ٹب تھے، بالٹیاں ہی بالٹیاں تھیں رسیاں تھیں، کھونٹے تھے اور ایک طرف کچھ چھپّر تھے جن کے نیچے کئی گھوسیوں کی اٹواٹی کھٹواٹی بکھری رہتی۔

کسی لمحے جب وہ رسوئی چھوڑ کر کوئلے کی دُھسک اور بھیلتے دُھوئیں سے بھاگ آتی اور کھڑکی پر سانس لیتی تو ہوا میں وہ ایک ایسی ملاوٹ پاتی جو سینکڑوں میل کیا من کے ناپوں میں اسے کروڑوں میل دُور لے جاتی۔ نہ معلوم چھپّر کے نیچے سے جلتے تمباکو کی بُو اس کی کھڑکی تک کیسے پہونچی ہوئی ہوتی، جو اس کے آتے ہی اس کی ناک میں گھُس جاتی اور ایک بار پھر بھورانی کانتا جی کو نیچے گو بر پر بٹھا دیتی اور چھُپی دبی کانتا کو جگا دیتی ننھی کانتا کو، جو دہلی بھر کی تمام اینٹوں کو ایک چھلانگ میں پیچھے چھوڑتی سوکھے میدانوں کے سینکڑوں میل طے کرتی اپنے پیارے پہاڑوں کو چوم کر گہرے نیلے آسمان سے اترتی اپنے من کے پُرانے ٹھکانے پر بہتی وِتستا کے کنارے اپنی ماں سے روٹھنے، اپنے بھائی سے جھگڑنے اور اپنے ابّا کے حقّے میں پانی بھرنے ––– !

پھر اندر سے وہی ساس کی آواز سنائی دیتی اور نہ جانے کھڑکی کی سلاخوں پر اس سیدھی سی آواز کو کیا ہو جاتا، کہ ایک آواز میں لاکھوں سیخیں گھس جاتیں اور نیلا آسمان مٹیالا نظر آتا اور زمین کانپ اٹھتی۔ اور کانتا کھو جاتی ونستا دکھائی دیتی نہ بیچ کے پہاڑ، ایک ہی لمحے میں بیچاری کانتا موٹے موٹے گوبر کے لوندوں میں لت پت ہو جاتی اور کیچڑ کے گہرے گڑھوں میں جا گرتی اور کانتا جی سر پہ پلّہ سنبھالتی ہوئی کھڑکی سے اُٹھ کر اندر چلی جاتی۔

اندر جا کے وہی پتھر کے کوئلے کا دھواں ہوتا جس نے کشمیر سے آئی ہوئی دلھن کانتا جی کا دہلی میں پہلا استقبال کیا تھا۔ نئی زندگی کے اس نئے دھوئیں کو وہ تب کیا سمجھتی؟ دھوئیں سے پہلے وہ ایک ایک لکڑی کو خوشبو سے پہچان لیتی۔ بُدلو، بید، کائرد، ہتب، دیودار، ایک ایک لکڑی جنگل کی مستی سے اپنی اپنی لہر لے کے آتی تھی۔ پھر وہ دھواں سنہری پلٹوں کے اوپر پیچدار لکیریں بناتا، نہ جانے کن پریوں کی سیڑھی بناتا اُوپر ہی اُوپر چلا جاتا، اور یہ جلے بھنے پتھر کا دھواں اپنی کڑواہٹ اور دھسک کوٹ کر سینے سے نیچے بھی چلا جاتا اور اندر اندر ہی پھیل جاتا۔ دہلی میں پتھر کا بھی ایسا کالا کوئلہ ہو جاتا ہے، اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

اور اس دھوئیں سے بھاگ کر جب کانتا جی اسی کھڑکی پہ چار سال پیچھے کا سفر کرتی تو ایک بار اس کے سینے کی کھوکھلاہٹ بھر جاتی — "دہلی سے دولھا آیا رے" — چڑیل سہیلیاں شور مچاتیں اور وہ بھی پھولی نہ سماتی۔ بڑی بات تھی کہ لڑکا بھی دہلی میں کام کرتا ہو اور لڑکے کا باپ بھی۔ لڑکا کمائے تو اپنے لیے اور باپ کمائے تو لڑکے کے لیے۔ تیسرا کوئی تھا نہیں۔ کانتا جی تو راج کرنے آئی تھی راج۔

پھر جب راجدھانی سے کانتا لوٹی تھی اس کے اپنے ماں باپ نے بھی اس کا رونا نہیں سمجھا تھا، وہی جو اس کے خوابوں کے معمار تھے اس کے خوف کو نہ سمجھ سکے۔ انھوں نے اس کے لئے نئے زیور بنائے، اس کے دولھے کے لیے کپڑے بنائے اور اس کی ساس کے لیے قیمتی تحفے سجائے اور اس کو واپس وہیں بھیج دیا۔

کھڑکی پہ بیٹھے بیٹھے کانتا کے سر میں لاکھ دہیے سے گھومنے لگتے اور میکے سے سسرال تک کا ایک بھیانک سفر شروع ہو جاتا۔ اسی وقت نیچے بھینس پر ہزاروں مکھیاں چمٹ جاتیں اور کانتا کو لگتا کہ یہی مکھیاں روپ بدل گئیں، انسان بن گئیں اور پہیوں کو ڈھکیلنے لگیں۔ انھیں خوفناک مکھیوں کے بیچ میں کانتا اپنے ماں باپ کو بھی پھنسا ہوا دیکھتی اور ڈھکیلتے ہوئے ہاتھوں میں ان کے ہاتھ بھی دیکھتی — گھوسی بھینس پہ لاٹھی مارتا، مکھیاں بھنبھنا کر اڑنے لگتیں اور اندر ساس کی آواز گونجتی اور کانتا کا سفر پورا ہو جاتا۔

ساس — ! کانتا کے گھر والے کی ماں۔ کانتا کے ماں باپ کی سمدھن۔ اس کی اپنی سانس سانس کی مالکن — ! ساس، جس کے قبضے میں گھر کے دونوں مرد تھے۔ ایک جو کانتا کا سسر تھا اور ایک جو اس کا اپنے گھر والا تھا۔ ساس — سماج کی عدالت میں جس کا ایک رتبہ تھا، جس کا منہ کھل جائے تو کانتا کو اسی کھڑکی سے نیچے پھینکا جائے اور اس قابل بھی نہ رکھا جائے کہ اس کے ماں باپ آ کر اُسے اٹھا کے لے جائیں۔ اس ساس کا جھوٹ کیا ہے، اس ساس کا سچ کیا ہے، کانتا کے لئے سوچنا بھی منع تھا۔ لیکن وہی ایک چوکھٹ تھی اُسی کھڑکی کی، جہاں سب قانون ٹوٹ جاتے جہاں کانتا کے خیال جیسے چاہتے ویسے بنتے، ویسے بگڑتے۔

کھڑکی کے باہر بھینس بھی اچھی تھی۔ لیکن کھڑکی کے اندر جو ساس تھی ...

..... خیر اڑوس پڑوس سے پوچھو، برادری کے لوگوں سے پوچھو تو یہی کہیں گے کہ ایسی اچھی کھڑکی والا مکان بنا ہی نہ ہوتا اگر وہی اندر بیٹھی اماں جی نہ ہوتیں۔ دہلی کی گھٹن میں کانتا کا سینہ دُکھنے تو لگا تھا لیکن اماں جی کے دماغ میں مکان کا خیال نہ آیا تو کانتا کو رہنے کے لیے یہ کھُلا مکان کہاں ملتا؟ وہی تھیں کہ انھوں نے علاج طے کر لیا اور شہر کے تنگ مکان سے اور کرایے کے ڈیڑھ کمرے سے صرف کانتا جی کے لیے بھاگنے کی ٹھانی اور ایک اپنے مکان کا انتظام کیا۔ مکان ویسے بھی کس کے لیے بنا تھا؟ کانتا نہیں تو اور کس کے لیے؟ اس کا نہ کوئی جیٹھ تھا نہ دیور۔ اور جب ساس کو اُسی ایک کی فکر تھی۔ کانتا کا باپ اپنی بچّی کے پیار اور اپنے بڑے نام کو کیسے بنائے رکھتا اگر وہ کم سے کم مکان کے خرچے کی آدھی رقم بھی نہ دیتا۔

خیر بیٹی کو کون نہیں دیتا؟ یہ کھو کر لڑکا مزاج سے خاموش تھا۔ رنگیلا نہیں تھا، شوقین نہیں تھا، ہوتا تو ولایت جانے کی سوچتا اور سسر کو بڑی ٹریننگ کا خرچہ اٹھانا پڑتا۔ اپنی برادری کا دستور یہی تھا کہ داماد کو

ٹریننگ کا خرچہ دیا جائے۔ مکان کی رقم ایسے خرچے کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی اور کھڑکی پر سوچتی ہوئی کانتا کو اپنے باپ کی بچت پر نامعلوم خوشی کیوں نہ ہوتی، الٹا افسوس ہوتا کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جنھیں پردیس کی ٹریننگ کا شوق ہی نہیں۔

لیکن اسی مکان کی دیواروں میں اینٹوں کی ترتیب کیسی تھی کہ کانتا جی کو سب کی سب اینٹیں اپنی ہڈیوں پر ہی گرتی دکھائی دیتی تھیں۔ ایک ہی کھڑکی سیدھی تھی اور اندر دیواروں پر سجی ہوئی تصویروں سے اچھی وہی باہر کی کیچڑ۔ کانتا چڑیا کہتی کہ مکان کے اندر دس خانے ہیں جن میں ان کے پنکھے بھی نہیں چل سکتے۔ جن میں دس طرح کے دباؤ ہیں۔ وہ کہتی کہ اندر اندر رہو کے دس نام ہیں جو دبی دبی آواز میں غصے اور نفرت کو دہراتے ہیں، کہ باہر باہر میٹھی آواز میں "کانتا جی" کا پورا نام، دھلا دھلایا سفید چہرہ، ٹیڑھی مانگ اور الٹا پلّہ، ایک سیدھی اور میٹھی زندگی کا اشتہار ہے۔ وہ کہتی کہ مکان کی دیواریں گونگی ہیں جن میں دو مرد چھپے ہوئے سے لگتے ہیں۔ لیکن دیواروں کی ہی اینٹیں سانپوں کی زبانیں نکالتی ہیں جس وقت وہ ایک عورت بولنے لگتی ہے۔ اس عورت کے لئے مکان کے اندر ایک بھی کام نہیں ہے۔ لیکن کانتا کے سینکڑوں کاموں پر نگاہ رکھنا ہے۔ اس کے سامنے کانتا ایک بھی ایسی سانس نہیں لے سکتی جس کو وہ نہ سنے اور سن کر اسے بربادی کا سبب نہ بتائے۔

مکان — ؟ کانتا کے لئے اس مکان میں دن کے پنجے رات کے اندھیرے سے زیادہ خوفناک تھے جب کانتا کا جسم سپنوں میں پگھلتا رہتا اور اندر اندر دل کا ایک اونداپن جاتا — رات کی لپیٹ میں اسے مکان کا ہوش نہ رہتا نہ مکان والوں کا۔ ادھ موئی زندگی میں اسے نہ سپنے یاد رہتے نہ ٹوٹی ہوئی نیند کے ٹکڑے۔ نیند نیند میں کبھی اسے بھرے ہوئے بھینچے کا احساس ہوتا تو ساتھ اسے گھوسی کی لاٹھی بھی سنائی دیتی اور وہ اٹھ کر یونہی کھڑکی پر چلی آتی۔ نیچے کچھ نہ دیکھ کر پرے مکانوں کی طرف نظر اٹھاتی۔ تاروں کی چھاؤں میں اسے کسی کمرے کی بتی مسکراتی دکھائی دیتی۔ ایک سایہ دوسرے کے ساتھ کھیلتا ہوا سا دکھائی دیتا۔ پھر آنکھ جھپکتے ہی وہ بتی بجھ جاتی اور وہ پھر اپنے بستر پر گر جاتی۔

کھڑکی پر کھڑے کھڑے کانتا دنیا بھر کی باتیں دیکھتی۔ چاروں طرف ایک نئی زندگی کو محسوس کرتی۔ صبح دیکھتی کہ ایک نئی بہو آئی ہے۔ شام کو دیکھتی کہ وہی اپنا گھر بسانے نکلی ہے، اپنی تمنائیں پوری کرنے کو چھپائی ہوئی تصویروں میں رنگ بھرنے کو اور من بھائے جھولے میں پینگیں لینے کو — اور یہاں ؟ یہاں تو بڑے شہر کے بیچ میں وہ بھی تھی۔ جو سینکڑوں میل دور کے رسم و رواج، پرانے وقتوں کے بندھن، سسرال والوں کے حقوق، میکے والوں کے فرائض، ساس کے اُلہنے، تہواروں کے تحفے، مالک کی ملکیت اور اپنی غلامی میں گھُل رہی تھی۔ کاش ماں باپ نے اس سے کبھی لاڈ کیا ہی نہ ہوتا، کاش ماں باپ نے اسے احساس کی مصیبت سے بچائے رکھا ہوتا، کاش اس نے پڑھا لکھا نہ ہوتا۔ پڑھائی — و اس کی پڑھائی بھی ادھوری تھی۔ نہیں تو وہ رسیاں نہ توڑتی۔ میکے سسرال کے چکر سے بھاگ نہ نکلتی۔ سماج کی ان گنت کھونٹیوں کو ایک جھٹکے سے ہٹا نہ دیتی۔

لیکن یہ سب چکر کھڑکی کی ہوا کا تھا، نہیں تو جان پہچان کے لوگ بھی جانتے تھے کہ کانتا کی ساس نے کانتا کی ہر ضرورت کو سمجھنا اپنا فرض مان لیا ہے اور یہی وجہ تھی کہ کانتا کی ساس اور اس کے ماں باپ میں کوئی غلط فہمی نہیں تھی جس ضرورت کی سمجھ ساس کے دماغ میں آجاتی اسی بات کو کانتا کے ماں باپ فوراً بھانپ لیتے اور کانتا کی وہ ضرورت پوری کرنے۔ انھیں بھلا کوئی کیسے روکتا۔ کانتا اُن کی اپنی جائی نہیں تھی کیا ؟

اماں جی نے بہو کا دل بہلانے کے لیے ایک گراموفون کی ضرورت سمجھی۔ ریکارڈوں سمیت پیش کیا گیا۔ لیکن کانتا کے اپنے توے پر اسی وقت روٹیاں جلنے لگتیں، دُھلتے کپڑے کی جگہ سوٹے کی چوٹ اس کے اپنے ہاتھ پر پڑتی، برتن کی راکھ اپنے ناخن میں چُبھتی، یا یونہی چڑ اٹھاتے نس کھچ جاتی، جب اماں جی اسی کے کام کاج کو دل چسپ بنانے کے لئے، اسی کا دل بہلانے کے لیے، اسی کے گراموفون پر ریکارڈ چلاتیں۔

کھائی ہوئی چوٹ کو بہلانے بھی وہ وہیں آتی، اسی اپنی کھڑکی پر، اور اماں جی کو بتاتی بھی نہیں، جب تک کہ اس کی ایک آدھ ہچکی اونچی نہ نکلتی اور اس کی چوری پکڑی نہ جاتی۔

باپ کے بھیجے ہوئے جیب خرچ سے ہی سہی، اماں جی کیا اپنی بہو کو پکچر دکھانے نہیں لے جاتی تھیں ؟ لیکن اندھیرا ہوتے ہی جب پردہ سیمیں

پر ایک کہانی گھومنے لگتی نہ جانے کاناجی کو کیا ہو جاتا آنسوؤں کی جھڑی لگاتی اور جب ہیرو ہیروئن کا بیاہ بھی ہو جاتا کانتا پھر بھی آنسوؤں کو نہ روکتی۔

سب جانتے تھے کہ اگر اماں جی کا دل بڑا نہ ہوتا انھیں بہو سے پیار نہ ہوتا، وہ ان سب باتوں کو کیسے برداشت کرتیں۔ اور کوئی ہوتی تو وہ یہ نہ چاہتی کہ سوکھی سسکتی کانتا جلدی جلدی مر جائے کہ راستہ صاف ہو جائے کہ ایک بار پھر بندن وار لگ جائیں، مہندی والی ایک نئی رات چمک جائے، ضیافت سے برادری میں نیا نام ہو جائے اور نئی دلھن کے جہیز سے گھر بھر جائے۔

یہاں تو ساس کو الٹی فکر لگی ہوئی تھی کہ بہو کے ہاتھ پاؤں گرم رہنے لگے ہیں کہ روز شام کو اُسے حرارت ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے کہ کہیں یہ معمولی حرارت بخار نہ بن جائے وہ کانتا کو لیٹنے نہیں دیتی تھیں۔ انھیں یقین تھا کہ موٹے بخار کو حرارت کے نرم نام سے پکارنا ہی اچھا ہے۔ نہیں تو یہ روگ لیٹنے والے کو تپ تپا کر پورا لٹا دے گا اور پھر لٹا کر ہی لے جائے گا۔ کانتا کی بات کو وہ مانتیں تو کانتا ایک شام کو لیٹ کر پھر کبھی نہ اٹھتی۔

خیران اڑوس پڑوس کے لوگوں کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ آج تمھاری بات کل دوسرے کی۔ پھر لوگ چھوٹی سی بات کا جھگڑا بنا ہی دیتے ہیں۔ کسی نے اماں جی کا پیار نہیں دیکھا، دلار نہیں دیکھا اور دس باتیں یونہی اڑا دیں اور کاناجی کے ابا کو دہلی آنا پڑا۔ ان کے آنے سے پہلے ان کا خط آیا تھا۔ کانتا کو خط کی بات تو معلوم نہیں تھی لیکن دو دنوں سے اس کا دل پہلے سے زیادہ دھڑکنے لگا تھا۔ دو دنوں سے اماں جی کئی کام خود کرنے لگی تھیں، دو دنوں سے وہ کانتا کے کپڑوں کی طرف زیادہ دھیان دینے لگی تھیں، دو دنوں سے وہ کہیں کاجل سے، کہیں سُرمے سے نوک پلک خود سنوارنے لگی تھیں۔

پھر اس صبح کو جب گھر کے سامنے ایک ٹیکسی رکی اور کانتا کو اپنی کھڑکی سے اس مری مری سڑک پر ہی اپنی آنکھوں کو جمانا پڑا، اس کے اُکھڑے ہوئے ہوئے روڑوں پر اسے اپنے پتاجی کھڑے دکھائی دئے۔ دیکھتے ہی اس کے اپنے سینے کی پسلیوں میں ایک نئی جان سی لپکی اور وہ سیڑھیوں پر سے دوڑتی چکراتی نیچے آ گئی۔

جب بادام کی بوری، سیب کی پیٹیاں اور سب پوٹلیاں اور ڈبے اوپر پہنچائے گئے تو کانتا کے ابا نے کانتا کی سجی سجائی مورتی کو دیکھا اور لمحہ بھر کے لیے اس کی سانس رک گئی۔ کانتا کے چمکدار پلّے کے نیچے اس کی مانگ چوڑی ہو چکی تھی اور اس کی گالوں کی نئی لکیروں میں اس کی ناک لمبی ہو گئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ منہ کی پیلاہٹ گہرے پوڈر کے نیچے سے بھی جھانک رہی ہے۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے بیٹی کا ہاتھ پکڑا۔ ہتھیلی میں گوشت نہ تھا نہ گرمی۔ انگلیاں ٹھنڈی تھیں اور تھرائی ہوئی۔ اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ان آنکھوں میں ایک گیلا گیلا جما ہوا تحیّر تھا۔

کانتا کی ساس کاناجی کی طبیعت کا حال سنا رہی تھی، ایک میٹھی کہانی سی جس میں پیار تھا، پریشانی تھی، دیکھ بھال تھی، دعائیں تھیں — اور جب وہ یہ بتانے لگی کہ کاناجی کے لئے اب بادام گھسیں گے، سیب کٹیں گے۔ کانتا کو نہ جانے کیا ہوا کہ وہ اپنے ابا کو وہیں چھوڑ کر اس اپنی کھڑکی پر آ کھڑی ہوئی۔

کھڑکی کی ہوا کا اثر تھا کہ اس کے جمے ہوئے آنسو کھل گئے اور اس کی رکی ہوئی سسکی پھوٹ نکلی۔ اس کا باپ وہیں اس کے پاس آ گیا اور اس سے پہلے کہ ساس پیچھے سے آواز دیتی اور کانتا عادت سے مجبور ہو کر اندر کھنچ جاتی، کانتا نے ہچکیاں لے لے کر اپنے چھلکتے ہوئے اور قیمتی پلّے کو منہ میں ٹھونس کر، اپنی ایک انگلی اٹھائی اور ایک ایسے منظر کی طرف اشارا کیا جو اس کے باپ کے لیے نیا تھا — نیچے ایک گھوسی بھینس کے تھنوں کو ہاتھ میں لئے بالٹی بھر رہا تھا۔ دوسرا اسی بھینس کے سامنے اس کے بچّے کی بھوسہ بھری کھال کو ایسے کھڑا کر رہا تھا کہ جیسے بھینس سے کہہ رہا ہو کہ لے یہ رہا تیرا بچّہ، جو مرا نہیں ہے۔ بیچاری بھینس بچّے کی کھڑی کھال ہی کو چاٹ رہی تھی اور گھوسی اپنی بالٹی بھرتا جا رہا تھا۔

گزارش

غیر طلبیدہ مضامین وغیرہ اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جبکہ ان کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ بھیجے جائیں۔ (ادارہ)

نثار احمد فاروقی

نوادرِ غالب

(ایک غیر مطبوعہ خط اور ایک قطعہ)

غالب کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ہنوز دل کاوش کا تقاضا کرتا ہے، یہی سبب ہے کہ اب تک تلاش کرنے والوں کو کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔ اسی سال کے شروع میں غالب کے بارہ غیر مطبوعہ خطوط میں نے دریافت کرکے نقوش کے سالنامہ (۱۹۶۳ء) میں چھپوائے تھے۔ آج یہاں ان کے ایک فارسی خط اور ایک قطعۂ تاریخ کا متن پیش کرتا ہوں۔

غالب اور سر سیّد

یہ خط سر سیّد احمد خاں (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) کے نام لکھا گیا ہے۔ اس زمانے میں وہ 'سر' تو نہیں ہوئے تھے، لیکن آخری تاجدارِ مغلیہ کے دربار سے انھیں "جواد الدولہ سیّد احمد خاں بہادر عارف جنگ" کا خطاب مرحمت ہو چکا تھا۔ سرکار انگریزی کی ملازمت میں منسلک ہونے کے بعد وہ مین پوری میں بہ حیثیت منصف مقرر ہوئے۔ وہاں سے ۱۰ جنوری ۱۸۴۲ء کو ان کا تبادلہ فتح پور سیکری کے لئے ہوا[1] جہاں وہ چار برس تک منصف رہے۔ ۸ فروری ۱۸۴۶ء کو فتح پور سیکری سے دہلی تبدیل ہو گئے۔[2]

اس خط کے عنوان میں سر سیّد کے "منصف فتح پور" ہونے کا ذکر ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۸۴۲ء کے بعد لکھا گیا ہے اور سر سیّد کے برادرِ بزرگ سیّد محمد (مالک سیدالاخبار دہلی) کا بھی حوالہ ہے جن کا انتقال ۱۸۴۶ء میں ہوا۔[3]

[1] حالی، حیات جاوید جلد اوّل/۱۱۱ (طبع اکادمی پنجاب لاہور)

[2] ماسبق/۱۱۳

[3] ایضاً/۱۱۳

اس طرح یہ زمانۂ کتابت ۱۸۴۲ء - ۱۸۴۶ء کے مابین قرار پاتا ہے۔

اس خط کی شانِ نزول بظاہر یہ ہے کہ سر سیّد احمد خاں نے غالب کو، غلام امام شہید[1] کے دو نعتیہ اشعار بھیج کر انھیں تضمین کرنے کی فرمائش کی تھی۔ اس پر غالب نے معذوری ظاہر کی ہے۔ اس کے دو سبب ہیں: ایک تو یہ کہ وہ فرمائشی چیزیں لکھنے سے طبعاً گھبراتے تھے، دوسرے یہ کہ غلام امام شہید اور ان کی شاعری کے بارے میں غالب کی رائے کبھی اچھی نہیں رہی۔ انھوں نے شہید کے اشعار کی تضمین کو اپنے لیے "دون مرتبت" سمجھا ہوگا۔ تیسرا سبب یہ بھی ہے کہ سر سیّد سے غالب کے تعلقات کبھی زیادہ مخلصانہ نہیں رہے، اسی خط کے لب و لہجہ سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جب انھوں نے سر سیّد کی پہلی تصنیف آثار الصنادید کے لیے تقریظ لکھی (۱۸۴۷ء) تو اس میں نری لفّاظی تھی، مصنّف کتاب کی مدح میں بہت کم تھا۔ بعد ازاں سر سیّد نے آئینِ اکبری کی تصحیح کرکے چھپوایا (۱۸۵۶ء/۱۲۷۲ھ) تو غالب سے اس پر بھی کچھ لکھنے کی فرمائش کی، غالب نے ۳۸ شعروں کی ایک مثنوی لکھ ڈالی، جو کلیات نظم فارسی میں موجود ہے، اسے سر سیّد نے کتاب میں شامل نہیں کیا، بلکہ غالب کے پاس واپس کر دیا اور لکھا کہ ایسی تقریظ مجھے درکار نہیں۔ کیوں کہ اس میں غالب نے ابو الفضل اور آئینِ اکبری کے بارے میں اچھی رائے ظاہر نہیں کی تھی اور سر سیّد کو مشورہ دیا تھا کہ

[1] الہ آباد کے باشندے تھے۔ ۷۵ سال کی عمر میں ۲۔ اکتوبر ۱۸۷۹ء کو وہیں انتقال کیا۔ شہید کے کوئی اولاد نہیں تھی (نادر روزنامچہ/۳۱)

ان گڑے مُردوں کو اکھاڑنے کی بجائے اہلِ فرنگ کی نئی ایجادیں اور سائنس کی برکتیں ملاحظہ کریں، تو معلوم ہو گا کہ آئینِ جہانبانی اسے کہتے ہیں اور آئینِ اکبری تقویم پارینہ ہو چکا ہے۔ چند اشعار اس مثنوی[1] کے ملاحظہ ہوں:

وینکہ در تصحیح آئیں رائے اوست   ننگ و عار ہمت والائے اوست
بر چنیں کارے کہ اصلش ایں بود   آں ستایدکش ریا آئیں بود
من کہ آئینِ ریا را دشمنم   در وفا اندازہ دانِ خود منم
گر بدیں کارش نگویم آفریں   جائے آں دارد کہ جویم آفریں
بابد آئیناں نسانم در سخن   کس نداند انچہ دانم در سخن
گر ز آئیں می رود با ما سخن   چشم بکشا اندریں دیر کہن
صاحبانِ انگلستاں را نگر   شیوہ و انداز اینان را نگر
تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند   انچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند
زیں ہنر منداں ہنر بیشی گرفت   سعی بر پیشینیاں پیشی گرفت
حق ایں قوم ست آئیں داشتن   کس نیارد ملک بہ زیں داشتن
داد و دانش را بہم پیوستہ اند   ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند
آتشے کس سنگ بیروں آورند   ایں ہنر منداں زخس چوں آورند
تا چہ افسوں خواندہ اند اینان بر آب   دود کشتی را ہمی راند در آب
گہ دخاں کشتی بہ جیحوں می برد   گہ دخاں گردوں بہ ہاموں می برد
غلطک گردوں بگرداز دخاں   نرہ گاو اسپ را ماند دماں
از دخاں زورق برفتار آمدہ   باد و موج ایں ہر دو بیکار آمدہ
نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند   حرف چوں طائر بہ پرواز آورند
ہیں نمی بینی کہ ایں دانا گروہ   در دو دم آرند حرف از صد کروہ
می زنند آتش بباد اندر ہمیں   می درخشد باد چوں اخگر ہمی
رو بہ لندن کاندراں رخشندہ باغ   شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ
پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار   گشتہ آئینِ دگر تقویم پار
مُردہ پروردن مبارک کار نیست   خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کے بعد رنجش پیدا ہو گئی۔ تا آنکہ جب جنوری ۱۸۶۶ء میں غالب رامپور گئے، تو واپسی میں مراد آباد کی ایک سرائے میں اترے۔ اس زمانے میں سید احمد خاں صدر الصدور تھے، انھوں نے جو مرزا کے آنے کا حال سنا تو اصرار کر کے اپنے مکان پر لے گئے۔ مولانا حالی نے اس کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

"سرسید کہتے تھے کہ جب میں مراد آباد میں تھا، اس وقت مرزا صاحب، نواب یوسف علی خاں مرحوم سے ملنے کو رامپور گئے تھے، ان کے جانے کی تو مجھے خبر نہیں ہوئی، مگر جب دلی کو واپس جاتے تھے، میں نے سنا کہ وہ مراد آباد میں سرائے میں ٹھہرے ہیں۔ میں فوراً سرائے میں پہنچا اور مرزا صاحب کو — اسباب اور تمام ہمراہیوں کے ساتھ اپنے مکان میں لے آیا۔ ظاہراً جب سے سرسید نے تقریظ کے چھاپنے سے انکار کیا تھا وہ مرزا سے اور مرزا ان سے نہیں ملے تھے، اور دونوں کو حجاب دامن گیر ہو گیا تھا اور اسی لیے مرزا نے مراد آباد میں آنے کی ان کو اطلاع نہیں دی تھی۔ الغرض جب مرزا سرائے سے سید کے مکان پر پہنچے اور پالکی سے اترے تو ایک بوتل ان کے ہاتھ میں تھی، انھوں نے اس کو مکان میں لا کر ایسے موقع پر رکھ دیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی۔ سرسید نے کسی وقت اس کو وہاں سے اٹھا کر اسباب کی کوٹھڑی میں رکھ دیا۔ مرزا نے جب بوتل کو وہاں نہ پایا تو بہت گھبرائے۔ سرسید نے کہا: 'آپ خاطر جمع رکھیے، میں نے اس کو بہت احتیاط سے رکھ دیا ہے'۔ مرزا صاحب نے کہا: 'بھئی مجھے دکھا دو تم نے کہاں رکھی ہے'۔ انھوں نے کوٹھڑی میں لے جا کر بوتل دکھا دی۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے بوتل اٹھا کر دیکھی اور مسکرا کر کہنے لگے کہ: 'بھئی اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے، سچ بتاؤ کس نے پی ہے؟ شاید اسی لیے تم نے کوٹھڑی میں لا کر رکھی تھی، حافظ نے سچ کہا ہے:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

سرسید ہنس کے چپ ہو رہے اور اس طرح وہ رکاوٹ جو کئی برس سے چلی آتی تھی، رفع ہو گئی۔ مرزا دو ایک دن وہاں ٹھہر کر دہلی چلے آئے۔"[1]

حالی نے "دو ایک دن" ٹھہرنے کا ذکر کیا ہے، لیکن غالب پانچ دن تک سرسید کے مہمان رہے تھے۔ تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:[2]

---

[1] کلیاتِ نظم غالب/۱۰۹ (طبع نولکشور ۱۹۲۴ء)

[1] حالی: حیاتِ جاوید جلد اول/۱۲۵ (حاشیہ)

[2] مہر: خطوط غالب/۲۱۴

"تو صاحب، کھچڑی کھائی، دن بہلائے، کپڑے پھاٹے گھر کو آئے، ۸ جنوری ماہ و سال حال دو شنبہ کے دن غضب الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔ تمھارا خط مضامین دردناک سے بھرا ہوا رامپور میں میں نے پایا، جواب لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ بعد روانگی کے مراد آباد میں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پانچ دن صدر الصدور صاحب کے ہاں پڑا رہا، انھوں نے بیمار داری اور غم خواری بہت کی .... "

دوسرے خط میں سیّد احمد حسن مودودی کو لکھا ہے[1]:

رام پور کی سرکار کا فقیر تکیہ دار روزینہ خوار ہوں۔ رئیس حال نے مسند نشینی کا جشن کیا۔ دعا گوے دولت کو در دولت پر جانا واجب ہوا ہشتم اکتوبر کو دلّی سے رامپور کو روانہ ہوا۔ بعد قطع منازل ستّہ وہاں پہنچا بعد اختتام بزم عازم وطن ہوا ہشتم جنوری کو دلّی پہنچا۔ غرض راہ میں بیمار ہوا، پانچ دن مراد آباد میں صاحب فراش رہا.... "

یہ ہے غالب اور سر سیّد کے تعلّقات کی روداد، جس کا ہمیں علم ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی تعلّقات کبھی رسمی تعلّقات سے آگے نہیں بڑھے۔ اس کے ظاہراً دو اسباب ہیں، ایک تو سر سیّد بسلسلۂ ملازمت دہلی سے باہر رہے، وہ شاعری تفنّن طبع سے زیادہ نہ کرتے تھے جو غالب سے خط کتابت رکھتے، دوسرے یہ کہ ۱۸۶۶ء میں صلح صفائی ہوئی اور اس کے تین سال بعد غالب کا انتقال ہو گیا۔

غالب اور غلام امام شہید

مولوی غلام امام شہید سے غالب کیوں برافروختہ تھے اس کا حال نہیں کھلتا، ایسا قیاس ہوتا ہے چونکہ وہ محمد حسن قتیل کے شاگرد تھے اور قتیل سے غالب کو خدا واسطے کا بیر تھا، اور اوائل عمر میں حامیانِ قتیل سے ان کا معرکہ کلکتے میں ہو چکا تھا، نیز شہید کے شاگردوں اور مدّاحوں کا حلقہ وسیع تھا اور وہ اپنے زمانے میں اچھے شاعر و نثر نگار شمار ہوتے تھے۔ پھر حیدر آباد میں ان کی قدر افزائی ہوئی اور نواب محی الدولہ نے انھیں ایک ہزار روپیہ زادِ راہ دے کر طلب کیا اور سرکار عالی سے چار سو روپیہ ماہوار مقرر کرا دیئے، یہی نہیں بلکہ راجا گردھاری پرشاد اور محی الدولہ نے زاد و راحلہ دے کر انھیں

[1] مہر: خطوطِ غالب/ ۴۳۱

سفر حج کے لئے روانہ کیا؛ اپنے مولود شریف اور نعتوں کی وجہ سے وہ عقیدت مندوں کا حلقہ بھی خاصا رکھتے تھے، ان سب باتوں نے غالب پر ان کا مجموعی تاثر ایسا ہی کر دیا تھا۔

جب غالب نے سنا کہ حیدر آباد میں شہید کی اچھی قدر ہو رہی ہے، تو انھیں اپنی بدقسمتی کا احساس اور بھی زیادہ ہو گیا۔ وہاں ان کے شاگردوں میں حبیب اللّٰہ ذکا موجود تھے، انھیں خط لکھ کر تفحصِ احوال کرتے رہتے تھے۔ حکیم غلام نجف خاں کو ایک خط میں لکھا[1]:

مولوی فضل رسول صاحب[2] حیدر آباد گئے ہیں، مولوی غلام امام شہید آگے سے وہاں ہیں، محی الدولہ محمد یار خاں سورتی نے ان صورتوں کو وہاں بلایا ہے؛ پر یہ نہیں معلوم کہ وہاں ان کو کیا پیش آیا ہے، اگر تم کو کچھ معلوم ہو گیا ہو تو مجھ کو ضرور لکھو۔

ان جملوں میں جو طنز چھپا ہوا ہے اس کا اندازہ "سورتی" اور "صورتوں" کے تلازمے ہی سے کیا جا سکتا ہے، مگر صحیح لطف تب آئے گا جب یہ معلوم ہو کہ غلام امام شہید بدصورت تھے، ان کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور کانوں میں قرنا لگا کر سنتے تھے۔ مولوی مظہر علی نے لکھا ہے[3]:

"مولوی غلام امام .... شہید متوطن الہ آباد آج تشریف لائے ..... شہید صاحب مولود خوب پڑھتے ہیں اور وقت پڑھنے کے عشق آں حضرت میں بے چین ہو جاتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ آواز اچھی نہیں۔ بالفعل ان کی عمر ستّر برس کی ہے۔ قرنائی لگا کر سنتے ہیں۔" (۳-اکتوبر ۱۸۷۲ء)

غالب برابر شہید کے بارے میں 'ٹوہ' لگاتے رہتے تھے۔ ۲۶- اگست ۱۸۶۳ء کو حبیب اللّٰہ ذکا کے موسومہ خط میں لکھتے ہیں[4]:

"اب آپ اس خط کی رسید لکھیے اور اس میں غلام امام شہید کا حال

[1] مہر: خطوطِ غالب/ ۳۰۵

[2] منشی فضل رسول واسطی سندیلوی (متوفی ۱۸۷۹ء) جو رشتہ میں شہید کے بھانجے تھے۔ ان کا دیوان نولکشور سے چھپ چکا ہے۔ انھیں مظفر علی اسیر (متوفی ۷ فروری ۱۸۸۲ء) سے تلمذ تھا۔ (نادر روزنامچہ/ ۳۱)

[3] ہاشمی: ایک نادر روزنامچہ/ ۲۸

[4] مہر: خطوط غالب/ ۴۶۴

مفصّل لکھیے کہ ان کی وہاں کیا صورت ہے۔ ایک شخص مجھ سے یوں کہتا تھا کہ مختار الملک نے منھ نہ لگایا مگر ممی الدولہ نے چار سو روپیہ مہینا سرکار جناب عالی سے مقرر کرا دیا ہے۔"

پھر اودھ اخبار میں انھوں نے ایک خبر دیکھی تو جھٹ ذکا کو خط لکھا:[1]

"ہاں صاحب، اودھ اخبار میں ایک قصیدہ مولوی غلام امام کا دیکھا 'مکان تنگ است، جہاں تنگ است' مدح مختار الملک میں متضمن استدعائے مسکن وسیع۔ پھر مہینے بعد اسی اودھ اخبار میں یہ خبر دیکھی کہ نواب نے مسکن تو نہ بدلا مگر تیس روپے مہینا بڑھا دیا۔ اسی اخبار میں پھر دیکھا کہ ایک صاحب نے مولوی غلام امام کے کلام پر اعتراض کیا ہے اور ان کے شاگرد وقیع تخلص نے اس کا جواب لکھا ہے۔ آپ سے اس روداد کی تفصیل اور جواب اعتراض و معترض کے نام کا طالب ہوں۔ بہ سبیل استعجال۔"

(۱۱ جنوری ۱۸۶۷ء)

اچھا لطیفہ یہ ہے کہ ذکا نے شہید کو بتا دیا یا انھیں کسی طرح معلوم ہو گیا کہ غالب ان کے بارے میں کیا لکھتے رہتے ہیں۔ اس غریب نے خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کو شکایت لکھی کہ مرزا صاحب مجھ سے بے سبب ناراض ہیں۔ بے خبر نے غالب کو لکھا کہ حضرت یہ کیا ماجرا ہے، شہید پر آپ کیوں وار کر رہے ہیں، اگر کوئی اور ہوتا تو شاید غالب جواب میں شہید تو کیا قتیل کو بھی نہ بخشتے۔ اور خوب کھری سناتے، مگر بے خبر لفٹنٹ گورنر کے میر منشی اور غالب کے دوست تھے، ان سے ذرا کور دبتی تھی، غالب نے معذرت لکھی۔ وہ بھی ملاحظہ ہو:[2]

"منشی حبیب اللہ ذکا کے اشعار آتے رہے اور میں اصلاح دے کر بھیجتا رہا۔ لبرواردہ ہونے مولوی صاحب کے ایک غزل ان کی آئی اور انھوں نے یہ لکھا کہ مولوی غلام امام شہید اکبر آبادی کی غزل پر یہ غزل لکھ کر بھیجتا ہوں۔ میں نے حسب معمول غزل کو اصلاح دے کر بھیجا اور یہ لکھا کہ مولانا شہید اکبر آباد کے نہیں، لکھنؤ اور الہ آباد کے ہیں، اس کلمے سے زیادہ کوئی بات میں نے نہیں لکھی، اس میں سے توہین کے معنی مستنبط ہوں تو میں ان کا مستحق بھی۔ اب نہیں جانتا کہ منشی صاحب نے مولوی صاحب سے کیا کہا اور مولوی صاحب نے آپ کو کیا لکھا؟"

ایک بار غالب کے دوست چودھری عبدالغفور سرور نے انھیں لکھا تھا کہ "آپ والئ دکن کی مدح میں قصیدہ کہہ کر کیوں نہیں بھیجتے، وہاں آج کل ہن برس رہا ہے، آپ کی بھی ضرور قدر دانی ہوگی۔ اس کے جواب میں غالب نے لکھا تھا:[3]

"پہلے کچھ باتیں کہ بادی النظر میں خارج از مبحث معلوم ہوں گی، لکھی جاتی ہیں:

میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا، اس کی جاگیر کے عوض میری اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں، دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے، انھوں نے نہ دیے مگر تین ہزار روپے سال۔ اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سال۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کولبرک صاحب بہادر ریزیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ ریزیڈنٹ معزول ہو گئے، سکرتر بمرگ ناگاہ مر گئے۔

واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بصلۂ مدح گستری پانسو روپے سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے، یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی، سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع محسن سوز و مربی کش کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب جو میں والئ دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والئ شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔ اے خداوند بندہ پرور یہ سب باتیں وقوعی و واقعی ہیں۔

[1] سبق / ۱۸۴
[2] ایضاً / ۳۴۶

[3] مہر: خطوط غالب / ۲-۴۹۷

اگر ان سے قطع نظر کر کے قصیدے کا قصد کروں، قصد تو کر سکتا ہوں، تمام کون کرے گا؟ سوائے ایک ملکہ کے کہ وہ پچاس پچپن برس کی مشق کا نتیجہ ہے، کوئی قوت باقی نہیں رہی۔ کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے مگر حیران رہتا ہوں کہ یہ نثر میں نے کیوں کر لکھی تھی، اور یہ شعر کیوں کر کہے تھے عبدالقادر بیدل کا یہ مصرع گویا میری زبان سے ہے:

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

پایان عمر ہے، دل و دماغ جواب دے چکے ہیں، سو روپے رامپور کے، ساٹھ روپے پنشن کے روٹی کھانے کو بہت ہیں۔ گرانی اور ارزانی امور عامہ میں سے ہے۔ دنیا کے کام خوش و ناخوش چلے جاتے ہیں۔ قافلے کے قافلے آمادۂ رحیل ہیں۔ دیکھو منشی نبی بخش مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے ماہ گزشتہ میں گذر گئے۔ مجھ میں قصیدے کے لکھنے کی قوت کہاں۔ اگر ارادہ کروں تو فرصت کہاں۔ قصیدہ لکھوں، آپ کے پاس بھیجوں، آپ دکن کو بھیجیں، متوسل کب پیش کرنے کا موقع پائے، پیش کیے پر کیا پیش آئے، ان مراحل کے طے ہونے تک میں کیوں کر جیوں گا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔ لا الٰہ الا اللہ و لا معبود الا اللہ ولا موجود الا اللہ کان اللہ و لم یکن شئی واللہ الآن کما کان"

یہ خط ۱۸۶۰ء کا ہے اور یہ بادی النظر میں خارج از مبحث "باتیں انھوں نے[۱] تکلفاً ہی لکھی ہیں۔ امر واقع یہ ہے کہ وہ ریاست حیدرآباد سے انتفاع کی برابر کوشش کرتے رہے، مگر مطلب برآری نہ ہو سکی۔ حبیب اللہ ذکا کو ایک خط میں لکھا ہے[۲]:

"صنعت سہل ممتنع میں، میں نے نواب مختار الملک کو قصیدہ بھیجا کچھ قدردانی نہ فرمائی۔ ردّ فرقۂ وہابیہ میں ایک مثنوی[۱] جو سابق میں لکھی تھی، وہ محی الدولہ کو بھیجی، رسید بھی نہ آئی۔ اب سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید، شاگرد قتیل، وہاں کوس "انا و لا غیری" بجا رہے ہیں اور سخن ناشناسوں کو اپنا زور طبع دکھا رہے ہیں۔ ایک کم ستر کی عمر میری ہوئی سوائے شہرت خشک کے فن کا کچھ پھل نہ پایا۔ "احسنت" و "مرحبا" کا شور سامعہ فرسا ہوا۔ خیر ستایش کا حق ستایش سے ادا ہوا۔ مختار الملک نے یہ بھی نہ کیا۔ نہ مدح کی داد دی، نہ مدح کا صلہ دیا۔ حیران ہوں کہ نواب مجھ کو کیا سمجھے۔ محی الدولہ سے اور کچھ نہیں کہتا مگر یہ کہ خدا سمجھے۔"

ان اقتباسات سے غالباً واضح ہو گیا ہوگا کہ شہید سے غالب کی برہمی (الف) شاگرد قتیل ہونے کی بنا پر (ب) سخن ناشناسوں میں مقبول ہونے کی وجہ سے (ج) حیدرآباد میں ان کے علی الرغم نوازے جانے کے باعث تھی۔

خیر جس زمانے کا یہ خط ہے، اس وقت تو حیدرآباد کا سلسلہ نہ تھا، پہلے دو اسباب ہی تھے چناں چہ سر سید نے شہید کے دو شعر لکھ کر تضمین کی فرمائش کی تو اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ آپ کا خط آنے سے تو خوشی ہوئی، مگر جس کام کا حکم دیا ہے اس سے رنجیدہ ہوا۔ کسی شاعر کے دو ایک شعر لے کر ان پر دو چار شعر اپنی طرف سے ٹانک دینا کون سی شاعری و معنی پروری ہے؟ اور ہو بھی تو یہ دو شعر اس قابل ہی کہاں ہیں، ان میں فارسی کے پُر شکوہ لفظوں کے سوا ہے کیا؟ کوئی نازک خیال، کوئی باریک نکتہ تو ہے نہیں۔ پھر یہ ایسی بحر میں ہیں کہ کسی ایرانی نے اس میں آج تک شناوری نہیں کی۔ ان کی تضمین، چاہے وہ مسدس ہو یا ترجیع بند، بس اسی کام آ سکتی ہے کہ بھکاری یاد کر لیں اور درد بھری آواز سے در در گاتے پھریں اور خاتم المرسلینؐ کا کوئی عاشق شعر سن کر اپنا گریبان چاک کرے۔ پھر کہتے ہیں کہ واللہ مولانا شہید نے بہت عمدہ شعر لکھے ہیں، اور ان سے بہتر لکھے نہیں جا سکتے، مگر یہ شاعری و معنی پروری نہیں ہے، مجلس مولود شریف میں پڑھنے کی چیز ہے۔ حضرت اشرف المرسلین

۱۔ یہ کلیات نظم کی مثنوی ششم ہے (ص ۹۴) جس کا عنوان ہے: "بیان نموداری شان نبوت و ولایت کہ در حقیقت پرتو نور الانوار حضرت الوہیت است" اس مثنوی میں ۱۲۸ اشعار ہیں۔

۱۔ ۲ ہر: خطوط غالب / ۳-۲-۶۴ [غالب نے مختار الملک کی مدح میں جو قصیدہ بھیجا تھا وہ کلیات نظم میں شامل ہے (طبع سوم نولکشور ۱۹۲۴ء صفحات ۴۳۲ و بعد) اور غالب کا دستخطی قصیدہ سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہے۔ اسی میں یہ شعر ہے:

کس نیست متاع مرا خریدار | با آنکہ بہا گران نگویم

علیہ السلام کی نعت میں اس فقیر نے کئی مثنویاں اور قصیدے لکھے ہیں ان میں سے ایک مثنوی نقل کرکے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں، ذرا اسے ملاحظہ فرمائیے۔ مجھ سے شیوۂ معنی پروری کے خلاف کسی قسم کے شعروں کی فرمائش نہ کیجیے۔

اس خط کا ماخذ ایک قلمی نسخہ ہے جس میں بہار دانش وغیرہ متعدد کتابیں ہیں، یہ انجمن محمدیہ آگرہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے، اسی کے ایک سادہ ورق پر کسی نے غالب کا یہ خط نقل کر دیا ہے۔ اس کی پیشانی پر ایک مہر بھی لگی ہوئی ہے جس میں (اصلح الدین ۱۲۶۷ھ) صاف پڑھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خط غالب کی زندگی میں نقل ہوا ہے۔ فارسی متن ملاحظہ ہو۔

(۲)

بنام جواد الدولہ سیّد احمد خان بہادر منصف فتح پور

نواب معلّی القاب وسیّدِ عالی جناب سلامت۔

برسیدنِ منشورِ رافت نشان شادماں شدم، وازاں چہ مرا بسرانجام آں فرمان دادہ اند غمیں۔ یک دو بیت از دیگرے گرفتن و برآں گفتار دو چار بیت از خویش افزودن کدام آئینِ سخن وری وکدام شیوۂ معنی پروری است۔ خاصہ ایں دو بیت کہ جز شکوہِ الفاظ تازی ہیچ گونہ معنی نازک ندارد وسیّما در بحرے واقع شدہ کہ ہیچ کس از ایرانیاں درآں بحر غزل نگفتہ، آنچہ بریں دو بیت افزائید خواہی آں را مسدّس نام نہند وخواہی ترجیع بند خوانند، خاص از بہر آنست کہ گدایاں یاد گیرند وبردر ہا باہنگِ حزیں بخوانند۔ کلام عاشق خاتم المرسلین لسماع ایں اشعار از خود رود وگریباں درد۔ حاشا ثم حاشا مخدومی مولوی غلام امام شہید سلّمہ اللہ تعالیٰ ہرچہ گفتہ اند خوش گفتہ اند وخوشتر ازیں نتواں گفت، لیکن ایں شاعری وسخن وری نیست، چیزے دیگر ہست کہ در مجلس مولود شریف توں خواند۔ فقیر حقیر را در نعتِ اشرف المسلین علیہ وآلہ السّلام قصیدہ ہا ومثنویہا است[1]، ازاں جملہ یکے مثنوی نقل کردہ بخدمت می فرستم، ایں را بنگرند و بخوانند واز بندہ اشعارے کہ در شیوۂ سخن گستراں باشند آرزو نکنند و بندۂ خود انگارند وبخدمت مہین برادرِ خود سلّمہ اللہ تعالیٰ سلام رسانند۔ والسلام

از اسد اللہ

(۳)

اسی کتب خانے میں ایک مجموعۂ مثنویات ہے (مد ۹ نمبر ۶۴) جس میں ۲۶ مثنویاں شامل ہیں ان میں ساقی نامہ عزّت، مثنوی نامہ علی ساقی نامہ الہی، سوز وگداز نوعی، قضا وقدر سلیم، ساقی نامہ ملا مرشد، ساقی نامہ زکی، قضا وقدر حکیم رکنا مسیح، قضا وقدر سیدائے اشرف، اور محسن فانی کی مثنوی موسی وموہنی شامل ہیں۔ اسی مجلد میں کلیات نظم غالب کے کچھ اوراق ہیں یہ صاف نستعلیق میں لکھے ہوئے ہیں۔ اس مجموعۂ مثنویات پر جا بجا مہریں بھی ثبت ہیں۔ ایک تو صاف پڑھی جاتی ہے جس پر (دین دیال ۱۲۶۸ھ) لکھا ہوا ہے۔ دوسری ہندی میں ہے، یہ مہر بھی دین دیال ہی کی ہے لیکن اس کا سال ٹھیک نہیں پڑھا گیا کہ ۱۸۴۴ء ہے یا سمبت ۱۹۔ اس میں مجھے شک ہے۔ بہرحال ان اوراق میں ذیل کا قطعہ بھی ملتا ہے جو مرزا میتا بیگ کے قطعہ تاریخ وفات سے قبل درج ہے[2]:

رفت چوں مولوی حمید الدین زیں جہاں کز فنا عمارت اوست

از خود از دہر رفت و دہر ہنوز پر ز آوازۂ فضیلت اوست

سیدالانبیاء شفیعش باد کاں سیدازل زعزت اوست

---

[1] کلیات نظم فارسی میں غالب کی دو نعتیہ مثنویاں ہیں، ایک میں ۷۵۰ اشعار ہیں اور اس شعر سے شروع ہوتی ہے؛

بنام ایزد اے کلک قدسی صریر بہر جنبش از غیب نیرو پذیر

دوسری مثنوی در بیان معراج ۲۷۵ شعروں میں ہے۔ اختصار کی وجہ سے قیاس چاہتا ہے کہ پہلی مثنوی ہی غالب نے اس خط کے ساتھ بھیجی ہوگی۔ اسی خط میں نعتیہ قصیدوں کا بھی ذکر ہے۔ کلیات میں ان کے تین قصیدے نعتِ رسول میں ملتے ہیں۔

[2] میتا بیگ کی وفات کا قطعہ تاریخ کلیاتِ نظم غالب میں موجود ہے۔

دخل راچوں فسزدں کنی برخلد
سال فوتش ہمیں حقیقت اوست

داخل خلد گشت پنداری
دخل درخلد سال رحلت اوست

رمز درباب تا غلط نہ کنی
زاں کہ تکرار خلد صورت اوست

خلد خلد است برلب غالب
فکر ہر کس بقدر ہمّت اوست

اس مادۂ تاریخ سے ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) مستنبط ہوتے ہیں۔ کلیات نظم سے اس کا اخراج ظاہرا مادۂ تاریخ کے بھونڈے پن کی وجہ سے ہوا۔ غالب تاریخ گوئی سے قاصر تھے اور اس کا انھوں نے متعدد مواقع پر اعتراف کیا ہے۔ میاں داد خاں سیاح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بھائی تمھاری جان اور اپنے ایمان کی قسم کہ فنِ تاریخ گوئی و معمّا سے بیگانۂ محض ہوں۔ اردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سنی ہوگی[1]۔ فارسی زبان میں دو چار تاریخیں ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ مادّہ اوروں کا ہے اور اشعار میرے ہیں۔ تم سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں۔ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا ہے، جب کوئی مادّہ بناؤں گا حساب درست نہ پاؤں گا۔ دو ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادّۂ تاریخ وہ مجھے ڈھونڈ لا دیتے موزوں میں کرتا۔ اگر آپ مادّے کی فکر کی ہے اور یہی حساب جمل منظور رکھا ہے تو ایسے تعمیے اور تخرجے آگئے ہیں کہ وہ تاریخ ہنسی کے قابل ہوگئی ہے۔ کلکتہ میں قاضی القضاۃ سراج الدین خاں مرحوم کی قبر پر مسجد بنی ہے۔ ان کے بھتیجے مولوی ولایت حسین خاں نے استدعائے تاریخ کی میں نے لکھی۔ چناں چہ وہ فارسی دیوان میں موجود ہے۔

مفتیٔ عقل از پئے تاریخ ایں بنا
ایما بسوے من ز رہ احترام کرد

گفتم بوے بدیہہ: خوشا خانۂ خدا
شد خشمگیں دمے کہ نظر در کلام کرد

خاشاک رفت و پائے ادب در شکنجہ ریخت
ایہام را بہ تخرجہ معنی تمام کرد

واسطے خدا کے غور کرو۔ "خوشا خانۂ خدا" مادہ پھر اس میں سے خاشاک کے عدد دور کرو۔ نو سو اکیس کا تخرجہ[1]، پھر بھی دو اور زیادہ رہے۔ پائے ادب یعنی ب کو اڑایا۔ بھلا یہ بھی کوئی تاریخ ہے!"

یہی حال مذکورہ بالا قطعہ تاریخ کا ہے۔ مادہ تاریخ ان کے عجز کا شاہد ہے۔ مولوی حمید الدین کون تھے، میں اس کی نشان دہی سے قاصر ہوں۔

[1] یہ غلط ہے، دیوان اردو نسخۂ عرشی میں اردو کے قطعات تاریخ موجود ہیں (ص ۱۲۳)

[1] خاشاک کے عدد تو ۹۲۲ ہوتے ہیں، یہاں بھی غالب نے حساب کی غلطی کر دی۔

غزل

کاوش بدری

کیا بن گئے ہیں آبلہ پایانِ جستجو
جلوہ ہمارا خلوت و جلوت میں کو بکو

تو ہے تو جرعہ جرعہ خراباتِ آگہی
ورنہ ترے بغیر یہ کیا جام کیا سبو

کونین سے وسیع مرے دل کی سرزمیں
اک بحرِ بیکراں ہے ترے غم کی آبجو

ترے لئے نزاکتِ آوازِ خستگی
اور میرے ساز کے لئے مضرابِ آرزو

یوں کر رہا ہوں مصحفِ رُخ کا مطالعہ
جیسے کوئی تلاوتِ قرآن باوضو

قدرت سے مجھ کو ایسی سماعت عطا ہوئی
میں صاف سُن رہا ہوں نوا ہائے رنگ و بو

چھیڑو خدا کے واسطے نشتر زنی کی بات
بدنام ہو گئی ہے بہت دل کی گفتگو

رکھتے ہیں ربطِ خاص فقط شعر تر سے ہم
ہو کوئی خوش گلو کہ کوئی سرمہ در گلو

پایا ہے میں نے سارے فسانے میں بس یہی
میرے لئے ہے مدح تو تیرے لئے غلو

کاوش نہیں زوال مرے فنِ شعر کو
ہے موجزن رگوں میں روایات کا لہو

ع-م
ش-ح

نئی کتابیں

بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات

مصنف شانتی رنجن بھٹاچاریہ۔ ضخامت ۲۹۶ صفحات۔ قیمت پانچ روپے، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش اوسط کتاب میں ۳۲ تصویریں بھی شامل ہیں۔

اردو کی ہمہ گیری سے کسی کو انکار نہیں۔ یہ کتاب اس ہمہ گیری کا مزید ثبوت ہے۔ اس کتاب میں کم و بیش پچھتر اردو کے بنگالی ادیبوں کا تذکرہ ہے۔ ایک باب اردو صحافت اور بنگالی ہندوؤں کے لیے مخصوص ہے۔ کتاب بڑی محنت سے مرتب کی گئی ہے۔ ملنے کا پتہ :-
اشوک نگر۔ ریجنٹ پارک، کلکتہ ۴۔

دھنک

یہ کتابچہ آنند موہن اعجاز کے قطعات پر مشتمل ہے۔ ناشر ادارۂ کاروانِ سخن ہیوی الیکٹریکلس بھوپال۔ قیمت ایک روپیہ۔ کتابت و طباعت عمدہ۔

ان قطعات سے یہ امید بندھتی ہے کہ اعجاز صاحب میں ایک اچھے شاعر بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔

دھندلکے

ملنے کا پتہ۔ باقر منش۔ کاروان حیدرآباد (آندھرا پردیش)

عامر شیبانی کا مجموعۂ کلام۔ قیمت دو روپے۔ کتابت و طباعت اوسط۔ عامر کا کلام معیاری ہے مثلاً

نمائش سے بھلا اہلِ ہنر کو کام کیا عامر
متاعِ اہلِ دانش گرمئ بازار کیا جانے
ماحول اور رسم و روایت کے سلسلے
پابندئ حیات کی زنجیر ہو گئے
مجبوریوں کے ہاتھ جو سرزد ہوئے گناہ
حیرت ہے وہ بھی لائق تعزیر ہو گئے

تذکرۂ میر
نکات الشعراء کی اہمیت
گلشنِ گفتار

ان تینوں کتابوں کے مرتب لکھنؤ یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر ایم۔ کے فاطمی صاحب ہیں۔ کتابیں اچھی چھپی ہیں

ملنے کا پتہ۔ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

تذکرۂ میر کی قیمت چار روپے۔ نکات الشعراء کی قیمت چار روپے اور گلشنِ گفتار کی قیمت دو روپے ہے۔ تذکرۂ میر، میر تقی میر کے تذکرہ نکات الشعراء کا اردو ترجمہ ہے۔ دوسری کتاب میں نکات الشعراء کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تیسری کتاب گلشنِ گفتار خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کے مشہور تذکرہ کا اردو ترجمہ ہے گلشنِ گفتار اور نکات الشعراء کا زمانۂ تالیف ایک ہی ہے۔ تینوں کتابیں مجلّد ہیں۔ (ع-م)

پھولوں کے محل

صادق حسین صاحب کے ۱۴ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جسے ادارۂ فروغِ اردو لاہور نے شائع کیا ہے۔ صادق صاحب کے افسانوں کے پلاٹ عام طور سے اُلجھے ہوئے نہیں ہوتے۔ ان کا اندازِ بیان سیدھا سادا مگر پُر تاثیر ہے۔ سبھی افسانے کامیاب اور دلچسپ ہیں۔ ان کے کردار عموماً نچلے اور متوسط طبقے سے تعلّق رکھتے ہیں اور ان کے مسائل، ان کی آرزوؤں اور امنگوں کے عکاس ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی 'پھولوں کے محل' اردو کے افسانوی ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

ادارۂ فروغ اردو لاہور نے سلیقے سے شائع کی ہے اور وہیں سے مل سکتی ہے۔ قیمت پانچ روپے۔

کاجل اور دھواں

مصنف بشیشر پردیپ۔ قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے صفحات ۲۲۶۔ مجلد مع گرد پوش۔ لکھائی چھپائی گوارا ہے۔ ناشر ادارۂ ترقی اردو۔ امین آباد لکھنؤ۔

بشیشر پردیپ کی کہانیوں کا یہ دوسرا مجموعہ ان کی ۱۴ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ پردیپ نسبتاً نئے لکھنے والوں میں ہیں لیکن انھوں نے بعض بڑے اچھے افسانے لکھے ہیں۔ علی عباس حسینی صاحب کے الفاظ میں "انھیں نفسیاتی کردار نگاری سے گہرا شغف ہے اور ان کے افسانوں میں کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور موجود ہوتا ہے۔"

بشیشر پردیپ سائنس کے طالب علم رہے ہیں۔ اس کے باوجود ان کا انداز بیان بڑا شگفتہ ہے جو کہانیوں کے لئے بے حد ضروری ہوتا ہے۔ اس مجموعے کے تمام افسانے کامیاب کہے جا سکتے ہیں مگر "جب ہم نہ ہوں گے"، اور "مصنوعی آنکھ" خاص طور سے اچھی کہانیاں ہیں۔ مستقبل میں یقیناً ان سے بڑی اچھی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

خدا اور دیوتا

مصنف خلیل جبران۔ ناشر مکتبۂ ماحول۔ کراچی۔

جبران بڑا مشہور مفکر گزرا ہے۔ اس کی متعدد تصانیف اردو میں ترجمہ ہو کر مقبول ہوئی ہیں۔ 'خدا اور دیوتا' میں چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعے جبران نے کوئی نہ کوئی فلسفیانہ بات کہی ہے جس سے انسان کو بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

قیمت دو روپے ۲۵ نئے پیسے۔ مجلد مع گرد پوش۔ صفحات ۱۲۰۔

زرد پتے

یہ خلیل جبران کا ایک ناول ہے۔ جس میں شمالی لبنان کے کسانوں کی زبوں حالی اور شیخ کے مظالم اور پھر اس کے عبرت ناک انجام کا ذکر ہے۔ قیمت دو روپے۔ مجلد صفحات ۱۰۸۔ دونوں کتابوں کی لکھائی چھپائی اچھی نہیں ہے۔ ناشر مکتبۂ ماحول۔ کراچی۔

موصولات

مزدور نامہ از حسن شہیر۔ ناشر نائرۂ ذہن و انقلاب۔ کالی داس مارگ لکھنؤ۔ قیمت درج نہیں۔

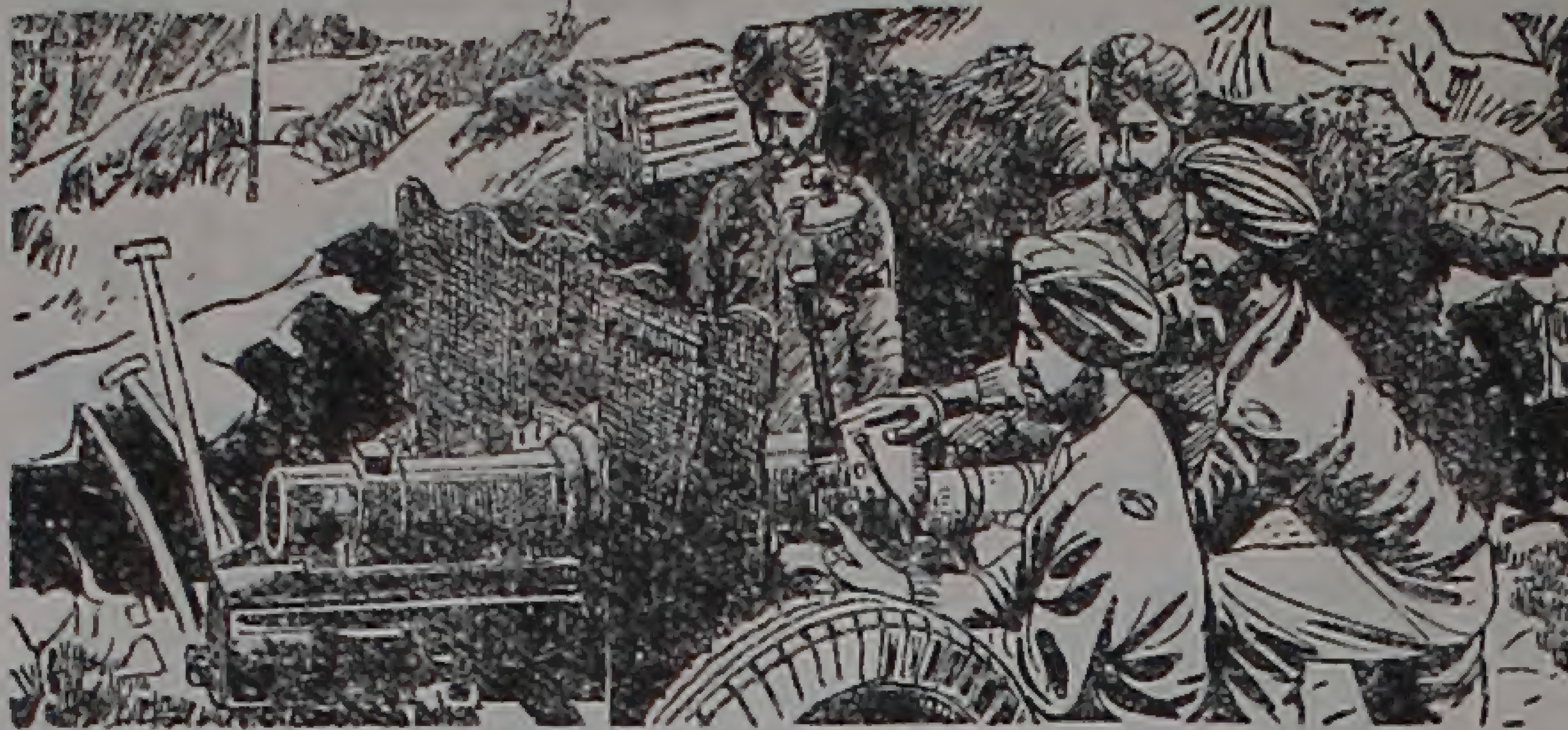
امداد باہمی کی کھیتی باڑی کے منصوبے

مرکزی وزارت اجتماعی ترقی اور امداد باہمی نے ریاستی سرکاروں سے درخواست کی ہے کہ وہ ۶۵-۱۹۶۴ء کے لیے امداد باہمی کی ترقی کے منصوبے بناتے وقت امداد باہمی کی کھیتی باڑی کو ترجیح دیں۔

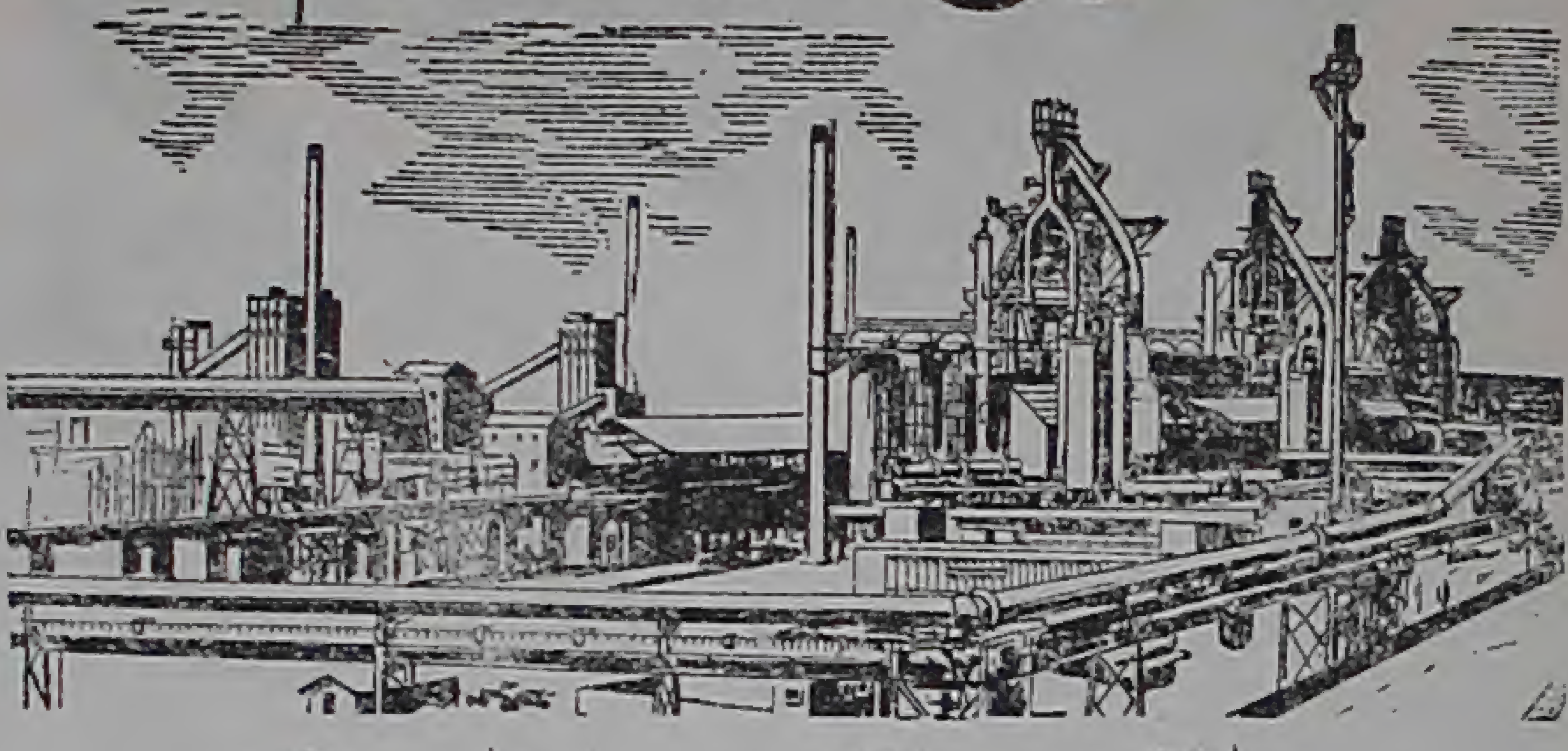
اپنے مراسلے میں مرکزی وزارت نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ۶۵-۱۹۶۴ء کے اختتام تک تیسرے منصوبہ کے نشانوں کو مکمل کر لیا جائے۔

امداد باہمی کی کھیتی باڑی کی اہمیت کے پیش نظر ۶۴-۱۹۶۳ء سے امداد کے ڈھانچہ پر نظر ثانی کی گئی ہے اور امداد باہمی کی کھیتی باڑی سے متعلقہ اسکیموں کو مرکزی وزارت کے ذریعہ چلائی گئی اسکیم میں شامل کر لیا گیا ہے۔ تجرباتی اور غیر تجرباتی سوسائٹیوں کو ان کے منصوبہ کی حد کے باہر مرکزی امداد دی جاتی ہے۔

دِفاع اور



ترقی کا کام



ساتھ ساتھ چلتا ہے

ملک کے ترقیاتی منصوبے مُلکی دِفاع کا اہم جزو ہیں ۔ ہنگامی حالات کے پیشِ نظر اب نئی ترجیحات مقرر کی گئی ہیں۔ انجینئری اور طبی عملے کی تربیت، برقی اسکیموں اور فولاد، مشین، مشینی اوزار، بجلی کا ساز و سامان، کوئلے کی کان کنی اور ریلوے جیسی بُنیادی صنعتوں کے ترقیاتی پروگراموں پر تیزی سے عمل کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔

طاقت کی ٹھوس بُنیاد پر ہی دِفاع کی تیاری کا انحصار ہے۔ ہمارے مسئلے کا ایک یہی حل ہے۔

اِس مہم کو کامیاب بنانے کے لئے جی جان سے ہاتھ بٹائیں۔ کروڑوں جیالوں کی بے غرض خِدمت اور اَن تھک کوشِش کی بدولت ہی بھارت اپنی دِفاعی طاقت کو بڑھا سکتا ہے۔



پلان کو کامیاب بنائیے

بھارت کے دِفاع کو مضبُوط کیجئے

DA 63/394

کون سا پیشہ
آپ کے لئے
موزوں ہوگا؟



اِن سے صحیح صحیح
انتخاب میں
مدد ملے گی

ری ایجر یکلچرا فیسر
،، ویٹرنری ڈاکٹر
،، فارسٹ رینجر
،، ایروناٹیکل انجینیر
،، مائنگ انجینیر
کیمیکل ٹیکنالوجسٹ
،، جیولوجسٹ
،، میٹے رجسٹ
،، ٹورسٹ گائیڈ
،، ایئر پائلٹ
،، ٹول میکر
،، ڈرافٹسمین (مکینیکل)
،، ایئرکنڈیشننگ اینڈ ریفریجریشن مکینک
،، مشین مین (پرنٹنگ)
،، میڈیکل پریکٹیشنر
،، زرعی انجینیئر(؟)
،، نرس
،، سوشل ایجوکیشن آرگنائزر
،، فزیکل ایجوکیشن ٹیچر
،، کرافٹ انسٹرکٹر
،، اکاؤنٹنٹ
،، لائف انشورنس ایجنٹ
،، سے نس مینشن(؟)
،، زراعت اور متعلقہ شعبوں کے پیشے
آئیزا نیز سائنس ریٹ؟

اور دوسرے

ہندی اور انگریزی میں
یہ کتابچے
ایمپلائمنٹ ایکسچینج
اور سرکاری
کتب فروشوں سے
مل سکتے ہیں

ڈائریکٹوریٹ جنرل آف
ایمپلائمنٹ اینڈ ٹریننگ
بھارت سرکار

DA 62/580

ترتیب

سرورق:- راجستھان کی ایک بنجارن

رسالے کی پشت پر:- "غصہ" ایم۔ الیف حسین کی ایک تصویر

جلد ۲۲ - نمبر ۸

پھالگن شک سمت ۱۸۸۵

مارچ ۱۹۶۴ء

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل دہلی

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- سات روپے
پاکستان میں:- سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے:- ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ:- ہندوستان میں:- ۶۰ نئے پیسے
پاکستان میں:- ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے:- ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل (اردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

میری شاعری پر انگریزی ادب کا اثر

انگریزی تہذیب کے لفظ سے ہم بجا طور پر مغربی تہذیب مراد لیتے ہیں یعنی یورپ اور امریکہ کی تہذیب۔ ایشیا اور خاص کر ہندوستان پر اب سے دو سو برس پہلے اس مغربی تہذیب و تمدن کا اثر پڑنا شروع ہو گیا تھا جس کی نمائندگی انگلستان کر رہا تھا۔ منفی پہلو یا منفی پہلو کے پردے میں ایک اثباتی پہلو اس کا اثر یہ تھا کہ شخصی حکومت اور سامنتی مشرقی تہذیب و تمدن کے تصور کا ہمارے ذہنوں پر تسلط کم زور پڑتا گیا۔ دوسرا اثر جو انگریزی حکومت نے ہمارے شعور پر ڈالا وہ مشینی دور کی عظمت و اہمیت کا تصور تھا۔ اب سے سوا سو برس پہلے ریل، دخانی جہاز، چھاپے خانے اور مغربی تمدن و طرز حکومت کے کئی ادارے اپنے وجود کی پرچھائیاں ہماری خارجی اور داخلی زندگی پر ڈالنے لگے۔ تہذیب و تمدن کا ایک پورا دور ہم سے الوداع کہہ رہا تھا اور ایک دوسرا دور ہم سے اپنا استقبال اور خیر مقدم کرا رہا تھا۔ اب مغربی علوم بھی ہماری ذہنی زندگی اور ہمارے شعور میں داخل ہونے لگے اور ہماری قومی نفسیات کا جزو بننے لگے۔ عظیم مفکر مارکس نے ۱۸۵۳ء میں یہ پیش گوئی کی تھی کہ انگریز ہندوستان میں تاریخ کے غیر شعوری اور غیر ارادی آلۂ کار ہیں۔ المختصر اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے نمایاں طور پر ہندوستان ایک نیا ہندوستان بننا شروع ہو گیا تھا اور یہ ردو بدل یا انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد سے نمایاں تر ہونے لگا۔

میں تو ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ اس وقت میرے دادا کی جوانی تھی اور میرے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت بھی ابھی ۱۸۵۷ء میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ اس کے دو برس بعد پیدا ہوئے۔ سیلاب مغربیت کے پہلے ریلے میں والد مرحوم کا بچپن اور ان کی جوانی نشو و نما کی منزلوں سے گزری۔ اب ہندوستان کی تمام زبانوں اور ان کے ادب پر ایک نئے ادب اور مختلف ادب اور اس کے نظریوں اور مقاصد کی اثر اندازی شروع ہو کر بڑھتی جائے گی۔ جس دور سے آزاد، حالی، نذیر احمد اور شبلی کا تعلق تھا اس دور کی دوسری دہائی میں میرے والد کی شاعری نے آنکھیں کھولیں۔ انھوں نے بہت حسین زاویے اور بہت لطیف انداز سے اپنی اردو نظموں اور غزلوں میں انگریزی ادب کا اثر لیا اور اس کا تتبع کیا۔

میری شاعری ابتداء میں اردو کی روایتی غزل گوئی کی پسندیدہ مثالوں سے متاثر رہی۔ یہاں ایک قابلِ ذکر نکتہ یہ ہے کہ انگریزی تہذیب و ادب کا ایک اثر اردو ادب پر اس انداز سے پڑنے لگا تھا کہ اردو شاعری کے ابتدائی ادوار سے بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی تک کے اردو ادب کا جو حصہ اصلیت سے مملو تھا اور جس پر دورِ ناسخ کے بعد سے ایک پردہ پڑ گیا تھا۔ اس حصے کا از سرِ نو نشاۃ الثانیہ ہونے لگا۔ میرے والد جہاں گھریلو صحبتوں میں حالی اور آزاد کا ذکر کیا کرتے تھے وہاں غالب، نظیر اکبرآبادی اور انیس کی عظیم ادبی خدمات کو بھی سراہتے تھے۔ میں خود عنفوانِ شباب میں شدید جنسی جذبات اور جنسی ناکامیوں کی مسلسل تڑپ اور اضطراب کا شکار رہا اور یہ کیفیت کوئی ایسی چیز نہ تھی جو آئی گئی ہو کر رہ جائے۔ کم و بیش چالیس برس تک مجھے یہ کرب انگیز کیفیت اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھی۔ خیریت گزری کہ میں نے جنسیت کی ہائے وائے تک اپنی خارجی و داخلی

زندگی کو محدود نہیں رکھا۔ دنیائے علوم، ہندوستانی اور عالمی کلچر اور دنیائے انسانیت اور ساتھ ہی ساتھ آفاقی ادب کی کشش اور ان کے مطالبات و مقاصد بھی مجھ پر مسلط رہے۔ مفلوج و مجہول ہو کر بھی میں نے اپنے کو مفلوج و مجہول نہ ہونے دیا۔ اپنے زخمی اور نیم شکستہ بال و پر کے باوجود اپنا ذوقِ پرواز جہاں تک ہو سکا میں نے محفوظ رکھا۔

ہاں! تو میری شاعری کا کم و بیش تین چوتھائی حصہ عشقیہ شاعری یا عشقیہ غزل گوئی کے لیے وقف رہا اور اس عشقیہ شاعری کو میں نے آفاقی کلچر اور ہندوستانی کلچر کی بلند ترین روایتوں سے مہذّب بنانے کی کوشش عمر بھر یا نصف صدی تک جاری رکھی۔ میری غزلوں میں خارجی طور سے یا براہِ راست ادھار یا مستعار لینے کے انداز سے انگریزی شاعری کا اثر نہ ملے گا لیکن انگریزی شاعری کا گمبھیر شعور اور لب و لہجہ یا طرزِ احساس ایک جاری و ساری اور رچے تحلیل شدہ عنصر یا اثر کی شکل میں ملے گا۔ میرے شعور کی مخصوص آواز اور اس کے لب و لہجہ کی تخلیق میں اور اس کے نشو و نمو میں جہاں قدیم ہندوستان کے بلند ادب کا طرزِ تفکر کارفرما رہا ہے وہاں بہترین اردو اور فارسی شاعری کی فضا اور اس شاعری کی اقدار کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کا اندازِ تفکر بھی ملی جلی شکل میں کام کرتے رہے ہیں۔ یہ سب سہی! لیکن میں نے اپنی غزل گوئی میں ایسی بات پیدا نہیں ہونے دی کہ اردو غزل گوئی کی بہترین اور لطیف ترین روایات سے اجنبیت یا غیریت یا ناہم آہنگی کا احساس میرے ان اشعار میں نظر آئے جن میں اور عناصر و اثرات کے ساتھ ساتھ انگریزی شاعری کے عناصر و اثرات بھی تعمیری و تخلیقی حیثیت سے شامل ہوں۔ شاعری ایک "کارگہِ شیشہ گراں" ہے جہاں "لے سانس بھی آہستہ" کا قانون جاری ہے۔ اردو شاعری کے علاوہ کسی بھی شاعری یا تہذیب کے اثرات کو اپنی غزل گوئی میں سمیٹتے وقت مجھے اس احتیاط سے کام لینا پڑا ہے کہ اردو غزل کی روایتوں کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ نئے پن کو پرانے پن سے ہم آہنگ کیے بغیر تخلیقی جدّت کامیاب نہیں ہوتی۔ اسی اصول کو میں نے برابر پیشِ نظر رکھا ہے۔ ایک نکتہ اور بھی بہت اہم اور قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر زبان اور ہر قوم بلکہ ہر دور کے شعر و ادب کا ایک حصہ آفاقی اور عالمگیر ہوا کرتا ہے۔ اور یہ حصہ مقامی و مخصوص نہیں ہوا کرتا بلکہ انسانیت کی وحدت کا پتہ دیتا ہے۔ چنانچہ اردو ادب میں بھی صدہا اشعار ایسے مل جاتے ہیں جنھیں محض مشرقی شاعری کہہ کے ٹالا نہیں جا سکتا بلکہ جنھیں آفاقی شاعری کہنا پڑتا ہے۔ اردو شاعری کے ایسے اشعار سنسکرت شاعری، یونانی شاعری، لاطینی شاعری اور مغرب کی موجودہ زبانوں کی شاعری، منجملہ جن کے انگریزی شاعری بھی ہے، کی نشان دہی کرتے ہیں۔ میری زندگی اور میری شاعری کے ارتقا میں وہ دور آ گیا تھا کہ اردو ادب کے عالمگیر اشعار کی آفاقیت کو پہچان لوں۔ ایسے اشعار سے شعوری یا تحت الشعوری طور پر متاثر ہو کر مجھ سے ایسے متعدد اشعار ہوتے رہے جو انگریزی ادب کے آفاقی اشعار کی دھڑکنیں اپنے اندر رکھتے تھے۔ آفاقی ادب کی صدہا اقدارِ مشترک کو اپنی شاعری میں سمونا اور ساتھ ساتھ اپنی شاعری کے خد و خال کو مسخ ہونے یا بگڑنے سے بچا لینا ہر ذمہ دار شاعر کا فرض ہے۔ دنیا ایک عالمی انسانی مشترکہ تہذیب و ادب کی طرف گامزن ہے۔ اردو شاعری بھی گزشتہ کم و بیش نصف صدی سے مقامیت یا محض مشرقیت کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو رہی ہے۔

انگریزی شاعری کا ایک نہایت رچا ہوا مذاق فطرت پرستی (Nature worship) یا مناظرِ قدرت سے والہانہ عشق رہا ہے۔ اردو ادب میں ہم کو آپ کو نیچریہ شاعری تو ملتی ہے لیکن یہ شاعری رسمیت یا محض مصوری سے آگے نہیں بڑھتی۔ نیچر کی رمزیت، انسانی زندگی اور خوابِ زندگی سے مناظرِ قدرت یا مادّی کائنات کی ہم آہنگی یا زندہ رشتے کی مثالیں مجھ سے پہلے اردو شاعری میں بہت کم ملتی تھیں۔ انسانیت کا محض انسانیت ہو کر رہ جانا اسے انسانیت سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ زمین، دریا، سمندر، پہاڑ، جنگل، وادیاں، موسموں کا جلوس، فلکیات اور قدرت کے تمام مظاہر، جانوروں کی زندگی، یہ سب ایسے حقائق ہیں جن سے انسان کو ہم آہنگ ہونا ہے۔ اور جن کے لیے پرستارانہ جذبات و احساسات کو اپنے شعور میں پرورش دینا تہذیب کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ میں نے اپنی غزلوں میں چوتھائی صدی سے اکثر ایسے اشعار کہے ہیں جن میں انسان کی عشقیہ اور غیر عشقیہ زندگی یا عام زندگی کی فطرت سے ہم آہنگی کی طرف رنگا رنگ اشارے ہیں۔ اب میں کچھ زیادہ نہ کہہ کر اپنی غزلوں کے چند اشعار پیش کیے دیتا ہوں جو روا روی میں اس مضمون کے دوران تحریر میں مجھے یاد آتے ہیں:-

کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھتا ہے — کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی
خلوتِ راز میں فقط ہم تم — ایک کمرے کو کائنات کریں

"And make one little room and everywhere"
—John Donne

فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی لیکن — پہونچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی۔
موت اک گیت رات گاتی تھی — زندگی جھوم جھوم جاتی تھی
زندگی کو وفا کی راہوں میں — موت خود روشنی دکھاتی تھی
ہر عقدۂ تقدیرِ بشر کھول رہی ہے
ہاں دھیان سے سننا یہ صدی بول رہی ہے
چھیڑتے ہی غزل بڑھتے چلے رات کے سائے
آواز مری گیسوئے شب کھول رہی ہے
کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو
شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں
یہ نکہتوں کی نرم روی یہ ہوا یہ رت — یاد آرہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات
دیکھ جب عالم یہ ہے حسن خمار آلود کا — صبح کو لیتی ہو جیسے کائنات انگڑائیاں
زلفوں کے خنک سائے میں سکوں پا جاتی ہے میری طبعِ رواں
یوں جیسے نیم شبی گنگا کروٹ لے کر سو جاتی ہے
کیف بر دوش بادلوں کو نہ دیکھ — بے خبر تو کچل نہ جائے کہیں
ہری بھری رگوں میں وہ چہکتا بولتا لہو
وہ سوچتا ہوا بدن خود اک جہاں لئے ہوئے

"Her pure and eloquent blood spoke in her cheeks, and so distinctly wrought that one might almost say, her body thought."
—John Donne

دکھاتے ہیں ستارے ایک بہتر زندگی کا خواب
نہ دیکھ ان کی طرف وہ چھین لیں گے سب خوشی تیری

کبھی پچھلی رات کو دیکھ لے کسی سانس لیتے چراغ کو
کہ غزل ہوئی تو شعور میں وہی خستگی ہے وہی تھکن
مری ہر غزل کو یہ آرزو تجھے صبح سجا کے نکالئے
مری فکر ہو ترا آئینہ مرے نغمے ہوں ترے پیرہن
کبھی ہو سکا تو بتاؤں گا تجھے رازِ عالمِ خیر و شر
کہ میں رہ چکا ہوں ازل ہی سے کبھی ایزد و کبھی اہرمن
جسے ڈس لیا ہو زمانے نے کوئی زندگی ہے وہ زندگی
یہ سوادِ شامِ اجل نما یہ ضیائے صبحِ کفن کفن
یہ اداس اداس بجھی بجھی کوئی زندگی ہے فراق کی
مگر آج کشتِ سخنوری ہے اسی کے دم سے چمن چمن
اس دور میں زندگی بشر کی — بیمار کی رات ہو گئی ہے
جس شے پہ نظر پڑی ہے تیری — تصویرِ حیات ہو گئی ہے
وہ تیری نرم دوشیزہ نگاہیں دل نہیں بھولا
پڑی جب جب نظر تیری نگاہِ اولیں نکلی
اب دورِ آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے — اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے
کون یہ لے رہا ہے انگڑائی — آسمانوں کو نیند آتی ہے
حسن اک خوابِ ناز ہے جس کے — چونک پڑنے کو عشق کہتے ہیں
شام کے سائے گھلے ہوں جس طرح آواز میں
ٹھنڈکیں جسے کھنکتی ہوں گلے کے ساز میں
حسن کی نرمیوں نے لو دے دی — مسکرانا ترا ہے یاد مجھے
جب جب اسے سوچا ہے دل تھام لیا میں نے
انسان کے ہاتھوں سے انسان پہ جو گزری
وہ عالم ہوتا ہے مجھ پر جب فکرِ غزل میں کرتا ہوں
خود اپنے خیالوں کو ہمدم میں ہاتھ لگاتے ڈرتا ہوں
جب سازِ غزل کو چھوتا ہوں راتیں لو دینے لگتی ہیں
ظلمات کے سینے میں ہمدم میں روز چراغاں کرتا ہوں
ترا وصال بڑی چیز ہے مگر اے دوست — وصال کو مری دنیائے آرزو نہ بنا
لطف و ستم، وفا جفا، یاس و امید، قرب و بعد
عشق کی عمر کٹ گئی چند توہمات میں

فراق رات گئے یہ نوائے نیم شبی   جو کائنات کے اشکوں میں ہے نہائی ہوئی
خستگی مہر و ماہ کی مت پوچھ   کون پیمانہ ہے جو چور نہیں
کیا کریں ہم بھی کیا کرو تم بھی   آدمی آدمی کا دشمن ہے

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں چراغ
ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ

جب چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقش کف پا سے جل اٹھے ہیں چراغ

دلوں میں داغ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

اٹھ گیا عشق آج دنیا سے   پرچم حسن اک ذرا خم ہے
پوچھ مت کیفیت قلب دم ذکر سخن   میں نے دیکھی ہیں خیالوں کی بھی آنکھیں پرنم
یہ دکھ یہ رنج یہ آزردہ حالیاں تیری   جو چوم چوم نہ لوں سب اداسیاں تیری
پوچھ مت کیفیتیں ان کی نہ پوچھ ان کا شمار
چلتی پھرتی ہیں مرے سینے میں جو پرچھائیاں

ترا فراق تو اس دن ترا فراق ہوا   جب ان کو پیار کیا میں نے جن سے پیار نہیں
کہاں کا وصل تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے
ترے دم بھر کے آ جانے کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں

حسن کو اک حسن ہی سمجھے نہیں اور اے فراق
مہرباں نامہرباں کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

جو ہونٹوں تک ترے محدود ہوتی ہے سحر ہوتے
افق پر دور تک وہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے
دیکھ آئے آج یادوں کا نگر   ہر طرف پرچھائیاں پرچھائیاں
زندگی کیا ہے آج اسے اے دوست   سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

"Where but to think is to be full of sorrow"
—Keats

بہت آہستہ اٹھتی ہے نگاہ شاعر فطرت   رخ ہستی سے چادر سی مگر سرکا ہی جاتی ہے
دبدھا پیدا کر دے دلوں میں ایمانوں کو دے ٹکرانے
بات وہ کہہ اے عشق کہ سن کر سب قائل ہوں کوئی نہ مانے
جو ہلکی چھاؤں میں نغموں کی نکھری سی ہے   وہی سا ہے ترے حسن کا نشیمن ہے

امن داماں کی دنیا میں بھی ایسوں کو کب ملتے ہیں ٹھکانے
کئی بار تو عشق گیا ہے موت کے منہ میں جان بچانے
اسی درد سے دنیا غافل اسی درد کا گھر گھر چرچا
ایک شب غم کی سو راتیں، ایک محبت سو افسانے
مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست   آہ اب مجھ سے تری رنجش بے جا بھی نہیں

"Love is not amity"-Francis Thomson

کوئی افسانہ چھیڑ تنہائی   رات کٹتی نہیں جدائی کی
کس کے پاؤں کی چاپ ہے دنیا   کون ہے صبح ازل سے خراماں
چاند اک گیت رات گاتا تھا   گنگناتا ہو جیسے اک مردہ
رنگیں زمیں کے مناظر کی پڑ چلیں ڈھیلی
وہیں فلک کے چراغوں کی جھلملائی ہوئی
ہنوز وقت کے سینے میں جگمگاہٹ ہے
دمکتے روپ کی دیپاولی جلائی ہوئی
ہنوز وقت کے کانوں میں چھم چھماہٹ ہے
وہ چاپ تیرے قدم کی سنی سنائی ہوئی
وہ خواب گاہ میں شعلوں کی کروٹیں دم صبح
وہ بھیرویں تری بیداریوں کی گائی ہوئی
حیات عشق بہ نیم آخری زمانے میں   دلا گئی کسی مٹتے ہوئے نظام کی یاد
پہونچ سکے گی بھی تجھ تک مری نوائے فراق
جو کائنات کے اشکوں میں ہے نہائی ہوئی
زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل   وہ رات ہے کوئی ذرہ بھی محو خواب نہیں
خراب حال بھی اچھی طرح خراب نہیں   یہ ہے عذاب جہنم کہ وہ عذاب نہیں

"Hell is uncertainty" Bernard Shaw

یہ زندگی کے کڑے کوس یاد آتا ہے   تری نگاہ کرم کا گھنا گھنا سایہ
حاصل حسن و عشق بس اتنا   آدمی آدمی کو پہچانے
بہار غنچہ بہ غنچہ چمن میں آتی ہے   قدم قدم پہ چھلکتا ہے رنگ فتنہ گری

"And Blossom by blossom the spring arrives."..............................Swinburne

تھی زندگی میں کبھی صبح نو کی تازہ دمی   شعور پہ نہ رسوم و قیود کا تھا خمار

"And custome lie on thee
Heavy as frost and deep almost as life."
--Wordsworth

اس طرح کے اتنے اشعار میری غزلوں میں مل جائیں گے جن سے ایک مختصر دیوان مرتب ہو سکتا ہے یا جن کی تعداد ایک ہزار اشعار سے بھی زیادہ تک پہونچے گی۔ کچھ آگے کہنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری تمام کی تمام غزلوں، رباعیوں اور نظموں پر محض انگریزی یا مغربی شاعری کا اثر یا اس کی پرچھائیاں نہیں ہیں۔ فارسی اور اردو شاعری کی بہترین روایتوں پر میں نے اپنی شاعری کی عمارت تعمیر کی ہے۔ جدّت یا اجتہاد کو زندہ اور مسلسل روایت سے میں نے ہم آغوش و ہم آہنگ رکھا ہے۔ منقولہ بالا اشعار میں دو چار کو چھوڑ کر بقیہ تمام اشعار میں نے اپنی غزلوں ہی سے منتخب کئے ہیں۔ یہ بات بھی نہیں کہ انگریزی شاعری کے طرزِ احساس و طرزِ بیان کا جو پرتو میرے ان اشعار اور ایسے ہی صدہا اشعار پر پڑ رہا ہے اس کا اندازہ یا اس کی پرکھ صرف انگریزی داں حضرات کو ہو۔ نہایت محبّت و خلوص اور احترام کے ساتھ اردو کے بہت سے نوجوان ہم عصروں نے مجھ سے کہا ہے کہ ہم لوگ یہ باتیں کہاں سے لائیں۔ ان کے لئے تو انگریزی شاعری سے استفادہ کرنا لازمی ہے۔ ایک بات اور اس دوران گفتگو میں عرض کر دوں۔ وہ یہ ہے کہ اردو، فارسی اور عربی شاعری میں ایک چیز کی کمی رہی اور وہ چیز ہے فضا آفرینی جس کی بہترین مثالیں سنسکرت شاعری، یونانی شاعری اور انگریزی شاعری میں مختلف انداز اور مختلف صورتوں میں ملتی ہیں۔ میرے یہاں ایسے اشعار کی تعداد بہت بڑی ہے جن میں یہ فضا آفرینی اپنی جھلک دکھا رہی ہے۔ دوسری صفت جسے ہم کئی لحاظ سے روحِ شاعری کہہ سکتے ہیں اور جو فارسی، اردو اور عربی شاعری میں بہت کم نظر آتی ہے وہ صفت ہے جسے ہم خوابناکی کہہ سکتے ہیں اور جو ہمیں انسانیت کے اس دورِ اولیں کی طرف لے جاتی ہے جب جادوگری کی آغوش میں یا منتر جگانے کے عمل میں قدیم ترین شاعری نے جنم لیا۔ آج ہم جسے کیفیت کہتے ہیں اور جس کی کمی اردو شاعری میں نہیں ہے وہ اس خوابناکی کی ذرا اتری ہوئی منزل ہے۔ انگریزی شاعر ورڈز ورتھ کہتا ہے:۔

"The light that never was on land or sea.
The Consecration and the poet's dream."

انگریزی شاعری سے جہاں میں نے بہت کچھ حاصل کیا وہاں خوابناکی کے لچھن بھی اپنی شاعری میں متعدد مقامات پر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مغربی ادب اور انگریزی شاعری کا اثر میری شاعری پر یوں نہیں پڑا کہ صدہا یا ہزارہا انگریزی نثر و نظم کے جملے یا مصرعے یا اشعار کا میں نے اردو میں ترجمہ کر دیا ہو۔ اگرچہ میری پوری شاعری میں کچھ انگریزی کی نظموں اور اشعار کا ترجمہ بھی مل جائے گا لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ایک فضا یا آب و ہوا یا مخصوص طرزِ احساس و طرزِ بیان کی شکل میں انگریزی شاعری کا اثر میری شاعری میں ملے گا۔ یہ فضا بسا اوقات میرے انفرادی جمالیاتی احساس اور ہندو روایتوں اور آدرشوں سے پیدا شدہ فضا یا خود فارسی و اردو روایات کی فضا سے اس طرح مل جل گئی ہے جیسے کسی آلہ میں مختلف الرنگ شعاعی (Spectrum) کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ یہ آلہ میری آواز ہے جس میں رنگا رنگ گونجیں یا بازگشت آوازیں بسا اوقات تھرتھراتی اور جھلملاتی ہوئی نظر آئیں گی۔ ہم چاہیں تو اس مشترکہ اثر سے پیدا شدہ رنگ شاعری کو ایک قوس قزح سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں جس میں سات رنگوں کی پھوار نظر آتی ہے۔

اپنی شاعری کے آغاز میں یعنی ۱۹۲۰ء ۲۲ ۱۹ء کے زمانے میں میں نے تین انگریزی نظموں کے ترجمے کئے جن میں دو 'روحِ کائنات' میں شامل ہیں۔ ایک نظم ٹامس ہارڈی کی ہے جو ان کے شہرۂ آفاق ڈائناسٹس سے لی گئی ہے اور دوسری نظم کے مصنّف کا نام اس وقت ذہن سے اتر گیا ہے۔ اس دوسری نظم کا اردو ترجمہ 'عشق اور موت' کے عنوان سے 'روحِ کائنات' میں شامل ہے۔ طوالت کے خوف سے اس دوسری نظم کے صرف پہلے چھ مصرعوں کا اقتباس پیش کرتا ہوں:۔

ایک پرانے کمرے میں — ہلکی ہلکی روشنی تھی
تم بیٹھے تھے جہاں گویا — ایک تصویر حیا کی تھی
اور حیات کے عاشق کی — موت اک نغمہ گاتی تھی

ہارڈی کی نظم کا ترجمہ کرنے میں میں نے یہ کوشش کی کہ ہر چھوٹے بڑے مصرعے کی بحریں اور قافیوں کی ترتیب میں اصل انگریزی نظم کا پرتو آ جائے۔ تیسری نظم جو نگار میں شائع ہوئی تھی ایمیلی برانٹی کی انگریزی نظم The Prisoner کا ترجمہ تھا اور اصل انگریزی نظم کی بحر کا پرتو

اردو ترجمے میں بھی نظر آئے گا۔

شیلی کی مشہور نظم Ode To The West Wind سے میں بہت متاثر رہا ہوں نتیجے کے طور پر میری نظم "ترانۂ خزاں" وجود میں آئی جس کے کئی مصرعوں میں اصل انگریزی نظم کے ٹکڑوں کی آوازِ بازگشت سنائی دے جائے گی۔ اب سے اندازاً پینتالیس برس قبل انگریزی کی متصوفانہ نظموں کا ایک ضخیم مجموعہ The Oxford Book of English Mystical Verse میرے مطالعہ کا مرکز و موضوع رہا۔ "روحِ کائنات" یاں "روح کا نغمہ" کے عنوان سے میری جو نظم شامل ہے اس میں اس کتاب کے اثرات جاری و ساری ہیں۔ یوں تو اس نظم کا نام میں نے "نغمۂ حقیقت" رکھا تھا اور اس کا آغاز بھگوت گیتا کے ایک باب کے اردو ترجمہ سے ہوا تھا۔ لیکن جب یہ نظم آگے بڑھی تو تصوف کے وہ حقائق جو مذکورہ بالا انگریزی کتاب سے میرے اندر پیدا ہوئے تھے اس نظم میں جلوہ گر ہونے لگے۔ تصوف کا موضوع ماضی و حال اور مشرق و مغرب کے ادب و ثقافت کو ایک مرکز پر لے آتا ہے۔ اس لئے میری یہ نظم تمام اردو حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔ زندگی کے رنگا رنگ پہلوؤں کے متضاد متصادم اجزا کی وحدت کو اس نظم میں پیش کیا گیا ہے۔

اب سے بیس برس پہلے میں نے روپ کی رباعیاں کہنا شروع کیا تھا۔ پہلی ہی رباعی میں جو مصرعہ بہت مشہور و مقبول ہوا یعنی

سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

وہ لفظ بلفظ ترجمہ ہے ہلیر بلک کے اس فقرے کا

"I Touch the boundaries of music"

روپ ہی کی ایک رباعی کے دو مصرعے یوں ہیں

جب تاروں نے جگمگاتے نیزے توڑے
جب شبنم نے فلک سے موتی رولے

یہ مصرعے پرتو ہیں انگریزی شاعر بلیک کے مندرجہ ذیل مصرعوں کے :۔

"When the stars threw down their spears
And watered heaven with their tears"

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ایک بہت گہری بات کہی ہے کہ ہر شاعر میں بربریت کے زمانے سے آج تک تہذیب میں انسانیت کے جتنے ادوار گزرے ہیں سب مرکوز ہو جاتے ہیں۔ اب یہ رباعی دیکھئے :۔

لے میں مری گونجتا ہے سورج منڈل
میرے سوزِ دروں میں مل کر ہوئی حل
دنیا میں جب آدمی نے آنکھیں کھولیں
اس وقت سے آج تک کی تاریخِ ملل

ایڈورڈ کارپینٹر نے لکھا ہے کہ ہر سچے عاشق کو یہ حق پہونچتا ہے کہ اپنے آپ کو وہ ایک دیوتا سمجھے۔ اس خیال کا پرتو مندرجہ ذیل رباعی میں نظر آئے گا۔

پیغمبرِ عشق ہوں سمجھ میرا مقام
صدیوں میں پھر سنائی دے گا یہ کلام
وہ دیکھ کہ آفتاب سجدے میں گرے
وہ دیکھ اٹھے دیوتا بھی کرنے کو سلام

انگریزی شاعر وان (Vaughan) کا مشہور مصرعہ ہے :۔

"I Saw Eternity like a ring of light"

جس کا ترجمہ میری اس رباعی میں ہو گیا ہے :۔

اک حلقۂ نور تھا ابد کا منظر
آویزاں بے شمار خورشید و قمر
تا حدِ نظر سلسلۂ موجودات
ہر شے سے ابھر رہی تھی تقدیرِ بشر

آخری مصرعے میں جس خیال کا اظہار کیا گیا ہے وہ کسی نظم سے مستعار نہیں ہے۔

ایک ادب پر دوسرے ادب کا اثر ضروری نہیں ہے کہ غلامانہ تقلید یا ترجمہ کی ہی شکل میں رونما ہو۔ جب ایک ہی ادب کے کسی عظیم فن کار کا اثر دوسرے عظیم فن کار کے کلام پر مستقل طور پر پڑتا ہے تو دونوں کے لب و لہجہ کی یکسانیت اور اندازِ احساس کی مماثلت آسانی سے پہچانی جا سکتی ہے جیسے انیس کا رنگ چکبست کے مسدس میں جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طرح ایک دورِ شاعری یا دبستانِ شاعری کے مختلف شاعروں کے کلام میں ہم آہنگی و یکسانیت سنائی اور دکھائی دے جاتی ہے۔ میری شاعری میں مصحفی کا رنگ مومن کا رنگ، آتش کا رنگ بسا اوقات نظر آئے گا۔ لیکن میری غزلوں کے

ایک معتدبہ حصے پر جس طرح میر کا رنگ تہ در تہ اور آئینہ در آئینہ نظر آجائے گا وہ میر کے ہم عصروں سے لے کر آج تک کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نظر نہ آئے گا کیونکہ میر کے احساس، میر کا وجدان اور میر کی آواز میرے خون میں حل ہو کر رہ گئے ہیں۔ انگریزی شاعری کا اثر اردو شاعری پر مختلف سطحوں سے پڑا ہے اور یہ اثر جتنا ہی کامیاب ہوگا اسی قدر یہ بتانا مشکل ہو جائے گا کہ اس کا سرچشمہ کیا ہے۔ چند باتوں سے اس اثر کی نشان دہی ہوتی ہے۔ معمولی نشان دہی تو موضوعات کے انتخاب سے ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ اہم ہے الفاظ اور فقروں کی ساخت تشبیہوں اور استعاروں اور تعبیروں کی وہ کائنات بھی اس اثر کی نشان دہی کرتی ہے جس کائنات سے انگریزی شاعری کی کائنات ملتی جلتی نظر آتی ہے۔ انگریزی ادب کا مطالعہ میں نے نہایت پُرخلوص اور حساس طریقے سے کیا ہے۔ اور انگریزی شاعری کے جواہر پارے مجھ میں ایک سپردگی اور مکمل ہم آہنگی کا عالم پیدا کرتے رہے ہیں۔ یہ سپردگی و ہم آہنگی جتنی گہری اور جتنی مکمل ہوگی اتنا ہی انگریزی شاعری کا اثر میری شاعری پر بھرپور نظر آئے گا اور یہاں تک محسوس ہونے لگے گا گویا انگریزی شاعری کی روح نے اردو شاعری کا چولا دھار لیا ہے۔ انگریزی شاعری کا حقیقی و مرکزی لب و لہجہ اس بحر (Metre) میں نظر آتا ہے جسے (Iambic Pentametre) کہتے ہیں اور جس کے دس ارکان (Syllables) ہوتے ہیں۔ یہ بحر مقفیٰ اور غیر مقفیٰ دونوں طریقوں سے انگریزی شاعری میں کثرت سے استعمال کی گئی ہے۔ پہلے مقفیٰ طور پر اصل انگریزی میں اس کی ایک مثال دیکھیں۔

"The One remains the many change and pass
Heaven's light for ever shines, earth's shadows fly,

Life like a dome of many-coloured glass
Stains the white radiance of eternity"
—Shelley

غیر مقفیٰ صورت یعنی بلینک ورس کی صورت میں اس بحر کی ایک مثال دیکھیے:

There drew he forth the Excalibur,
And o'er him drawing it, the winter moon.
Brightening the skirts of long cloud ran forth.
And sparkled keen with frost against the hilt:
For all the haft twinkled with diamond sparks,
Myriads of topaz lights and Jacinth work
of subtlest jewellry.

شکسپیئر کے تمام المیوں اور ملٹن کی فردوس گم شدہ یا بازیافت فردوس اور انگریزی شاعری کے اہم ترین کارناموں کی ستّر فی صدی بحریں یہی بحر ہے۔ میرے وجدان میں یہ بحر قریب قریب نصف صدی سے رچ گئی ہے۔ اردو کی جو بحر مجھے اس انگریزی بحر سے قریب الآہنگ محسوس ہوئی اس کی مثال میرا ہی یہ شعر ہے:۔

نہ ذکر موج نہ ذکر کہ غم کے بیڑوں کو
گداز سینۂ ساحل ڈبو چکا کب سے

معریٰ یا غیر مقفیٰ شکل میں، میں ایک مدّت تک اس فکر میں تھا کہ اردو میں کوئی ایسی نظم لکھوں جو صوتیات کے لحاظ سے انگریزی بلینک ورس کی اس بحر سے ہم آہنگ ہو۔ برسوں کی خاموش کاوش کے بعد میری وہ نظم رونما ہوتی ہے جس کا عنوان ہے "آدھی رات" اگرچہ یہ نظم نیم ارادی طور پر کہیں کہیں مقفیٰ ہو گئی ہے۔ اس کے دو اقتباسات پیش کرتا ہوں:

سیاہ پیڑ ہیں اب آپ اپنی پرچھائیں
زمیں سے تا مہ و انجم سکوت کے مینار
جدھر نگاہ کریں اک اتھاہ گم شدگی
اک ایک کر کے فسردہ چراغوں کی پلکیں
جھپک گئیں جو کھلی ہیں جھپکنے والی ہیں
جھلک رہا ہے پُرا چاندنی کے درپن میں
رسیلے کیف بھرے منظروں کا جاگتا خواب
فلک پہ تاروں کو پہلی جماہیاں آئیں

گلوں نے چادرِ شبنم میں منہ لپیٹ لیا
لبوں پہ سو گئی کلیوں کی مسکراہٹ بھی
ذرا بھی سنبل تر کی لٹیں نہیں ہلتیں
سکوت نیم شبی کی حدیں نہیں ملتیں
اب انقلاب میں شاید زیادہ دیر نہیں
گزر رہے ہیں کئی کارواں دھندلکے میں

سکوت نیم شبی ہے انھیں کے پاؤں کی چاپ
کچھ اور جاگ اٹھا آدھی رات کا جادو

دوسری نظم کا عنوان 'پرچھائیاں' ہے جس کے صرف دو اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔ پہلے یہ نظم 'دھندلکا' کے نام سے شایع ہوئی تھی۔

یہ شام اک آئینۂ نیلگوں، یہ نم، یہ مہک
یہ منظروں کی جھلک، کھیت، باغ، دریا، گاؤں
وہ کچھ سلگتے ہوئے کچھ سلگنے والے الاؤ
سیاہیوں کا دبے پاؤں آسماں سے نزول
لٹوں کو کھول دے جس طرح شام کی دیوی
پرانے وقت کے برگد کی یہ اداس جٹائیں
قریب و دور یہ گو دھول[1] کی ابھرتی گھٹائیں
یہ کائنات کا ٹھہراؤ، یہ اتھاہ سکوت
یہ نیم تیرہ فضا روز گرم کا تابوت
دھواں دھواں سی زمیں ہے گھلا گھلا سا فلک

کسی خیال میں ہے غرق چاندنی کی چمک
ہوائیں نیند کے کھیتوں سے جیسے آتی ہوں[2]
حیات و موت میں سرگوشیاں سی ہوتی ہیں
کروڑوں سال کے جاگے ستارے نم دیدہ
سیاہ گیسوؤں کے سانپ نیم خوابیدہ
یہ پچھلی رات، یہ رگ رگ میں نرم نرم کسک

جن دو نظموں کے اقتباسات آپ نے دیکھے وہ ہماری دنیائے شاعری میں بہت مقبول ہوئیں۔ ان نظموں کی تخلیق کا زمانہ ۴۵-۱۹۴۴ء ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اردو شاعری میں غیر مقفیٰ نظم رونما ہو رہی تھی۔ مجھے یہ جان کر غیر معمولی اطمینان ہوا کہ بلند ترین تنقیدی حلقوں میں ان نظموں کو اردو کی غیر مقفیٰ شاعری کا بلند ترین نمونہ قرار دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ جہاں تک یہ نظمیں پہونچی ہیں یا جن مقامات کو ان نظموں نے مس کیا ہے وہاں تک اردو شاعری آج تک پہونچ نہیں سکی تھی۔ پطرس مرحوم نے مجھے یہ نظمیں ریڈیو سے نشر کرتے سنا تھا اور والہانہ انداز میں ان کی داد دی تھی۔ جگر مرحوم نے ٹھیٹھ غزل گو شاعر ہوتے ہوئے ان نظموں میں بظاہر غیر متوقع انداز میں بالکل اچانک طور پر بادی النظر میں بے تعلق باتوں اور مصرعوں کے متعلق یہ کہا تھا کہ ان نظموں کی یہی خصوصیت جانِ نظم ہے۔ علی سردار جعفری نے بھی ان نظموں کا غیر معمولی اثر لیا تھا۔ اب اسے کیا کروں کہ لوگ اس امر کے درپے ہیں کہ فراق صرف شاعرِ غزل ہے۔

مضمون کسی قدر طویل ہو گیا ہے اس لئے بہت سی مثالیں اور بہت سے نکات چھوڑ کر صرف ایک اور نظم سے چند ٹکڑے پیش کروں گا۔ یہ اقتباس اپنی نظم 'جگنو' سے پیش کرتا ہوں،

یہ مست مست گھٹا یہ بھری بھری برسات
تمام حدِ نظر تک گھلاوٹوں کا سماں
فضائے شام میں ڈورے سے پڑتے جاتے ہیں
جدھر نگاہ کریں کچھ دھواں سا اٹھتا ہے
دہک اٹھا ہے طراوت کی آنچ سے آکاش
ز فرش تا فلک انگڑائیوں کا عالم ہے
یہ مد بھری ہوئی پروائیاں سنکتی ہوئی
جھنجھوڑتی ہے ہری ڈالیوں کو سرد ہوا
یہ شاخسار کے جھولوں میں پینگ پڑتے ہوئے
یہ لاکھوں پتیوں کا ناچنا یہ رقص نبات
یہ بے خودیٔ مسرت یہ والہانہ رقص
یہ تال سم، یہ چھما چھم کہ کان بجتے ہیں
ہوا کے دوش پہ کچھ اودی اودی شکلوں کی
نشے میں چور سی پرچھائیاں تھرکتی ہوئی
افق پہ ڈوبتے دن کی جھپکتی ہیں آنکھیں
خموش سوزِ دروں سے سلگ رہی ہے یہ شام

یہ نظم برسوں کی خاموش کاوش کا نتیجہ ہے۔ فارسی اور اردو شاعری

---

[1] گو دھول چراگاہوں سے پلٹتے ہوئے مویشی کی چالوں سے اڑتی ہوئی گرد۔

[2] "The winds seem to come from fields of sleep."……………Words Worth

میں مجھے "مادّی ٹھوس پن" کی کمی کھٹکتی رہی ہے۔ میرے ہندوستانی کاروں کا یہ تقاضا رہا ہے کہ جس طرح فنِ تعمیر میں اور زندگی کے صدہا جزویات میں مادّی وزن اور ٹھوس پن یا بھرپورپن کو ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے اور لمساتی احساس کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے اسی طرح اردو شاعری کو بھی اس دولت سے مالامال ہونا چاہیئے۔ یعنی شاعری کو بُت گری کا حریف بنا دینا چاہیئے۔ یہ خصوصیت صرف ہندو کلچر کی نہیں رہی ہے بلکہ تمام آریائی تہذیب کی خصوصیت رہی ہے جس میں قدیم ایرانی تہذیب بھی شامل ہے۔ اسی سے تو فردوسی کے شاہنامے میں وہ ٹھوس اور بھرپور مصوری یا بُت گری ہمیں اکثر مل جاتی ہے جس کا ذکر میں کر رہا ہوں۔ کہیں کہیں میر انیس بھی فردوسی کے فیضان سے مستفید ہو کر مادّیت کا جادو دکھا گئے ہیں۔ یہ صفت سب سے نمایاں شکل اختیار کرتی ہے مناظرِ فطرت کی مصوری میں جس سے انگریزی ادب معمور ہے۔ فطرت بڑی ٹھوس اور بھرپور چیز ہے۔ دوسری کمی فارسی اور اردو شاعری میں عموماً یہ رہی ہے کہ فطرت کی مصوری میں چابک دستی سے زیادہ کام لیا گیا ہے اور محویت یا ٹھہراؤ سے بہت کم کام لیا گیا ہے۔ ہماری نیچریہ شاعری کو مادّے میں ڈوبنا نہیں آیا۔ ہمیں اپنے شعور کو فطرت کے وجود میں تحلیل کرنا نہیں آیا۔ اس کا فیصلہ دوسروں پر ہے کہ جو اقتباسات اب تک پیش کئے گئے ہیں ان میں مادّیت اور مادّیت میں محویت کے عناصر پیدا کرنے میں میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔

اب میں مضمون کے خاتمے پر پہونچ گیا ہوں۔ ایک انگریزی شاعر نے بچپن کا بیان ان شعروں میں کیا ہے

"To see a world in a grain of sand
A Heaven in a wild flower
To hold divinity in the palm of your hand
And Eternity in an hour."

جن کے زیرِ اثر مندرجہ ذیل حصّہ "جگنو" نامی نظم کا مرتب ہوا۔

میں کیا بتاؤں وہ کتنی حسین دنیا تھی
جو بڑھتی عمر کے ہاتھوں نے چھین لی مجھ سے
سمجھ سکے کوئی اسے کاش عہدِ طفلی کو
جہان دیکھنا مٹی کے ایک ریزے میں
بہارِ لالۂ خود رُو میں دیکھنا جنّت
وہ کیفِ منظر کو بین اک گھروندے میں
اٹھا کے رکھ لے خدائی کو جو ہتھیلی پہ
کرے دوام کو جو قید ایک لمحے میں
سُنا ہے! وہ قادرِ مطلق ہے ایک ننھی سی جان
خدا بھی سجدے میں جھک جائے سامنے جس کے

میں اپنی نظم "تلاشِ حیات" کے آغاز میں جس بحر اور لب و لہجہ اور جن صوتیات کو کام میں لایا ہوں وہ سراسر انگریزی شاعری کی دین ہیں۔ وہی ٹھہراؤ، وہی سنجیدگی اور وہی سوچتی ہوئی آہستہ آہستہ بڑھنے والی آواز جو بسا اوقات انگریزی شاعری میں ہمیں مل جاتی ہے۔ البتہ آگے چل کر یہ ٹھہراؤ ایک چڑھتے سروں کا گانا یا صعود (Crescendo) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ میری نظم 'دھرتی کی کروٹ' میں وہی خیالات و تصویریں پیش کی گئی ہیں جو انگریزی ادب سے ہی حاصل ہو سکتی تھیں اور جنھیں الہامی اور وجدانی اندازِ بیان دے کر زندۂ جاوید بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ "ہنڈولا" بھی میری وہ نظم ہے جو صرف فارسی یا اردو جاننے والا بڑے سے بڑا شاعر لکھ نہیں سکتا تھا اور جس کے اہم ترین حصّے پر انگریزی شاعر ورڈزورتھ کے اثرات فوراً پہچان لئے جائیں گے۔ آخر میں داستانِ آدم نامی اپنی نظم کا ذکر کروں گا جس میں آغازِ آفرینش سے آج تک کی تہذیب و تمدن کے مناظر، کوائف و مسائل ایک ڈرامائی انداز میں پیش کئے گئے ہیں اور جس کے وسیع و بسیط کینوس نے ہمارے نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کو خاص طور سے متوجہ کیا تھا۔

جنوری ۱۹۶۲ء کے شمارے میں 'اوراق مصوّر'، مصنّفہ سکندر علی وجد کی قیمت غلطی سے دس روپے شائع ہو گئی ہے۔ قیمت سات روپے ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔ (ادارہ)

ثاقب کانپوری

غزل

مدّتوں درد کا عالم دلِ حیراں میں رہا
فاصلہ کچھ بھی نہ جیب و گریباں میں رہا

التفات اتنا تری چشمِ توجّہ میں نہ تھا
زور جتنا اثرِ گردشِ دوراں میں رہا

ساری آبادیِ ویرانہ مری ذات سے تھی
ایک سنّاٹا مرے بعد بیاباں میں رہا

بن گیا عشق و محبّت میں حدیثِ غمِ دل
وہی آنسو جو مرا سایۂ مژگاں میں رہا

مرحلہ میرے جنوں کا کبھی آساں نہ ہوا
ضعف سے ہاتھ مرا میرے گریباں میں رہا

راس آئی نہ مجھے اس کی جفا سے توبہ
عمر بھر کشمکشِ حسنِ پشیماں میں رہا

میں نے چاہا کہ اُسے خانۂ دل میں رکھ لوں
وہی انداز مگر حُسنِ گریزاں میں رہا

ہونے پائی نہ مجھے نزہتِ گلشن کی خبر
مجھ پہ اک رنگِ جنوں فصلِ بہاراں میں رہا

دی تو صحرا نے اسے دعوتِ شوریدہ سری
پھر بھی پابندِ جنوں کوچۂ جاناں میں رہا

مٹ نہ جائے دلِ عشّاق سے تسلیم کی خو
جور کا رنگ اگر حسنِ نگاراں میں رہا

حاصلِ عشق سمجھتا ہوں اسی کو ثاقبؔ
میرا آنسو جو کسی گوشۂ داماں میں رہا

میں ہوں

میرے نوکری نہ کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مجھے کوئی نوکری مل نہ سکی۔ دراصل میں نے کبھی نوکری کی تلاش ہی نہیں کی۔ پڑھنے کا شوق تھا۔ ڈگریاں حاصل کرنے کا جنون تھا اور میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ سیاسیات پر کسی دن ایسی معرکہ آرا کتاب لکھوں کہ افلاطون، ارسطو اور مارکس کے بعد بس وہی کتاب ہر یونیورسٹی میں پڑھائی جائے۔ یہ صرف نام پیدا کرنے کی خواہش ہی نہیں تھی بلکہ میں سمجھتا تھا کہ واقعی مجھے سیاسیات کی تھیوری میں کوئی خاص الخاص بات کہنی ہے۔ یونیورسٹی کے تمام امتحانوں میں میری پوزیشن بہت اچھی رہی اور اس طرح مجھے وظیفے بھی ملتے رہے۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد مجھے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے دو سو روپے ماہانہ وظیفہ مل گیا۔ شروع میں عام نوکری میں بھی تقریباً اتنا ہی ملتا ہے اور پھر اس میں خود مختاری کے علاوہ اپنی خواہش اور مقصد کی تکمیل کا موقع بھی مل سکتا تھا۔ لہٰذا نوکری کرنے کا جو کچھ امکان تھا وہ بھی ختم ہوگیا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے وظیفہ مجھے لکھنؤ یونیورسٹی نے دیا تھا اس لیے میں وہیں منتقل ہوگیا۔ یونیورسٹی ہوسٹل میں ریسرچ سکالروں کے لیے علیحدہ کمرے ہوتے ہیں، انھیں میں سے ایک کمرہ مجھے بھی مل گیا۔

میں لائبریری میں آٹھ گھنٹے روز کام کرتا۔ دوست میرے بہت کم تھے۔ شام میں کچھ تفریح ہو جاتی۔ ہفتے عشرے میں کبھی کبھار ایک دو گھروں میں چلا جایا کرتا تھا۔ ان میں سے ایک میرے وائس چانسلر کا گھر تھا۔ دوسرا ایک ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کا۔ ایک کوئی اور گھر تھا۔ نہ جانے ان سے واقفیت کیسے ہوگئی لیکن دھیرے دھیرے وہاں بھی آنا جانا ہوگیا۔ میری سوشل زندگی ان گھروں تک ہی محدود تھی۔

مجھے ہندوستانی انقلاب پسند اور سیاسی مفکر ایم۔ این۔ رائے کی تحریروں سے اور ان کے سیاسی طرزِ فکر سے بڑی دلچسپی تھی۔ جس دن وہ مرے، اسی دن میں نے ان کی فلاسفی پر ایک مضمون لکھا جو اگلے دن بیشتر اخباروں میں شائع ہوا۔ اس کے کچھ دن بعد ایک ایڈیٹر کی معرفت مجھے مسز رائے کا خط ملا جس میں انھوں نے میرے مضمون کی تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ اگر میں ان سے کبھی دہرہ دون میں مل سکوں تو دونوں مل کر شاید ایک اچھی سی کتاب لکھ سکیں۔ میں نے جواب دیا کہ جلد از جلد میں ان سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ ابھی یہ میرا ریسرچ کا پہلا سال ہی تھا۔ اگلے مہینے میں ان سے ملنے گیا۔ مجھے اس گھر میں جا کر عجیب سا سکون ملا۔ مشرق اور مغرب کا عجیب سا سنگم۔ مسز رائے امریکن خاتون تھیں۔ گھر کتابوں سے اٹا پڑا تھا۔ پیانو اور ریڈیو گرام کے پاس بے شمار ریکارڈ، میگزین اور اخباروں کے پلندے دھرے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہی میرے گھر کی (اگر میرا گھر کبھی ہوا تو) تصویر ہوگی۔ میں وہاں ان کے مہمان کی حیثیت سے تین دن رہا دوسرے دن شام کو انھوں نے کچھ لوگوں کو کھانے پر بلایا سب انٹیلکچوئل قسم کے لوگ تھے۔ شام بڑی اچھی گزری۔ اس پارٹی میں تقریباً سبھی لوگ مجھے پسند آئے۔ کوئی کتابیں لکھ چکا تھا، کوئی لکھ رہا تھا، کوئی لکھنے والا تھا۔ بڑا انقلابی قسم کا گروپ تھا۔ ہر عمر اور ہر صوبے اور کچھ دوسرے ملکوں کے بھی لوگ وہاں تھے۔ اس گروپ میں ایک لڑکی سے میرا تعارف کروایا تھا جو نہ لکھنے والی تھی اور نہ پڑھنے والی۔

میں نے جب اس کی تعریف پوچھی تو وہ خود ہی کہنے لگی۔ میں اس گروپ میں اجنبی ہوں۔ میرا شوق صرف سنگیت سے ہے۔ کام دام کچھ نہیں کرتی۔ ایک دو بار کچھ ڈرامے اور کنسرٹ کئے ہیں۔ میں ہندوستان کی سب سے بڑی امیر لیسا ریو بننا چاہتی ہوں۔ یہی اس گروپ کی خصوصیت تھی۔ وہاں سبھی لوگ ایسے تھے جو ہندوستان کے سب سے بڑے کچھ نہ کچھ بننا چاہتے تھے۔

میرے قیام کے آخری دن وہ پھر آئی اور ہم کافی دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ اس نے مجھے سنگیت کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ ہندوستانی موسیقی اور مغربی میوزک کا موازنہ کیا اور بتایا کہ دونوں میں کتنی ہم آہنگی ہے اور اس طرح آرٹ کے بارے میں اس نے میرے ذہن میں کتنے ہی نئے پٹ کھول دئے۔ وہ اگلے مہینے دہرہ دون میں ایک کنسرٹ کی تیاری کر رہی تھی اور اس نے اصرار کیا کہ میں بھی ضرور آؤں۔ اور اگر ہو سکے تو کچھ دن پہلے ہی۔ مسز رائے نے بھی وعدہ لے لیا تھا کہ میں ان سے جلد ہی ملوں گا تاکہ رائے پر کتاب کے بارے میں کچھ نہ کچھ جلدی ہی طے ہو جائے۔

اگلے دن میں دہرہ دون سے لکھنو واپس آگیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس بار کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار دہرہ دون کا خیال آرہا تھا۔ لائبریری میں آٹھ گھنٹے کام کرنے کے بجائے زیادہ تر ادھر اُدھر ہی گھومتا رہتا۔ اپنے دو تین شناساؤں کے گھروں میں بھی کم ہی جاتا۔ بس یونہی کسی طرح وقت کاٹنے کی فکر لگی رہتی۔

جوں توں کر کے مہینہ گزرا اور میں پھر بڑے اشتیاق سے دہرہ دون پہنچا۔ اس بار میں ایک مہینے کے لیے گیا تھا۔ اس گروپ کی ایک دو پارٹیوں میں جانے کے علاوہ میں ادھر اُدھر ہی گھومتا رہا۔ وہ لڑکی جس کو ہم راکا ہی کہیں گے مجھے سیر کے لئے لے جاتی۔ ایک دو بار وہ مجھے اپنے فلیٹ میں بھی لے گئی۔ وہاں ہم نے بہت سے ریکارڈ سنے۔ پھر کنسرٹ ہوئی جو نہایت کامیاب رہی۔ کنسرٹ کے بعد وہ بہت ہی خوش تھی۔ اس کے کہنے پر ہم دو دن کے لیے مسوری بھی گئے۔ مسوری میں پہلے بھی گیا تھا لیکن راکا کے ساتھ مسوری جانے میں کچھ اور ہی بات تھی۔ ہر جگہ، ہر چیز میں کچھ اور ہی لطف آنے لگا۔ ان دو دنوں میں ہم ایک دوسرے کے بہت ہی قریب آگئے اور میں نے بالکل ہی اپنے آپ کو کھو دیا۔ پھر وہ طلسم ٹوٹا اور مجھے واپس لکھنؤ آنا پڑا، لیکن اس وعدے کے ساتھ کہ میں جلد از جلد دہرہ دون آؤں گا۔

اور پھر میں جتنی بار ہو سکا دہرہ دون جانے لگا۔ مہینے میں دو بار کبھی تین بار۔ جب گرمیوں کی چھٹیوں میں یونیورسٹی بند ہوئی تو میں نے گھر لکھ دیا کہ اس بار نہ آسکوں گا کیونکہ مجھے مواد اکٹھا کرنے کے لیے دہرہ دون رہنا پڑے گا۔

دہرہ دون کے قیام کے دوران راکا اور میں ہر شام کو تو نہیں مل سکتے تھے۔ اس کی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے کبھی دو دو تین تین دن کے ناغے بھی پڑ جاتے تھے۔ کبھی ملاقات کی جگہ اور وقت مقرر کرنے کے بعد اس کا فون آجاتا کہ کسی اور کام کی وجہ سے اس کا آنا ممکن نہیں ہوگا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت تھی۔ اس کا اعتراف لفظی طور پر تو نہ کبھی اس نے کیا تھا اور نہ میں نے۔ لیکن ہم دونوں بخوبی جانتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہیں۔ مجھے اکثر تعجب ضرور ہوتا تھا کہ اتنی محبت کے باوجود وہ کئی بار ہماری ملاقاتیں کینسل کر دیتی۔

میں نے سن رکھا تھا کہ لڑکیاں محبت میں سب کچھ بُھلا دیتی ہیں لیکن راکا پر اس قول کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنی ہی منہمک تھی جتنی پہلے۔ اور اپنے پُرانے حلقۂ احباب کو بھی اس نے ابھی برقرار رکھا تھا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ مجھے کبھی بھی یہ خیال آیا تھا کہ مجھ سے راکا کی محبت مکمل یا پُرخلوص نہیں تھی لیکن پھر بھی مجھے اس پر تعجب ضرور ہوتا۔ اور جتنا میں اسے سمجھنے میں ناکام رہتا اتنا ہی میرا جذبہ شدید ہو جاتا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسے کسی اور سے لگاؤ نہیں اس لیے جب وہ دوسرے لوگوں سے ملتی بھی، تو مجھے حسد بالکل نہیں ہوتا تھا۔

ان دو مہینوں میں ہم اکثر گھنٹوں تنہائی میں رہے۔ میرے قیام کے آخری دنوں میں میں نے ایک اور بات محسوس کی۔ ہماری تنہائی کے ان پُرکیف لمحوں میں وہ اکثر اچانک، کسی نہ کسی بات پر اُلجھ جاتی اور مجھ سے ناراض ہو جاتی اور پھر کچھ دیر کے بعد پوچھتی۔ "تمھیں کب پیار کرنا آئے گا؟ تم کسی پُرکیف موقع کو بھی کامل طور پر خوش گوار لمحہ میں نہیں بدل سکتے۔" میں سمجھتا تھا کہ وہ ٹھیک کہتی ہوگی۔ میں ہمیشہ تنہائی پسند

اور کتابی کیڑا قسم کا انسان رہا ہوں۔ پیار میں کچھ پہل کرنی پڑتی ہے۔ کچھ پیش قدمی اور میں شاید ایسا نہیں کرتا تھا۔ اس کے اس انداز سے مجھے بہت دُکھ ہوتا۔ لیکن جب پھر اچانک وہ مسکرا کر اپنے ہاتھوں سے میرے بال پریشان کر دیتی تو گویا سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔

جب دو مہینوں کے قیام کے بعد میں لکھنؤ واپس آیا تو میرا دل بہت اداس تھا۔

اس کے بعد میں جب ہی دہرہ دون جا سکتا، جاتا۔ کبھی ایک دن کے لیے، کبھی دو دن کے لیے۔ راکا سے ملاقات ہوتی۔ آہستہ آہستہ وہ اور بھی جلدی جلدی اُلجھنے لگی اور پھر بات یہاں تک پہنچ گئی کہ کئی بار وہ سارا سارا دن اُلجھی رہتی اور جب میرے جانے کا وقت ہوتا تب وہ مسکرا کر میرا ہاتھ پکڑ لیتی اور پوچھتی۔ "پھر کب آؤ گے؟" اس سوال سے میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے اگر وہ واقعی یہ چاہتی تھی کہ میں آؤں تو میرے آنے پر اس کا میرے ساتھ ایسا برتاؤ کیوں؟

ایک بار جب اس کے فلیٹ میں پہنچا تو دیکھا کہ سب سامان بندھا پڑا ہے۔ دیواروں پر سے تصویریں اتار دی گئی ہیں۔ کتابیں اور ریکارڈ پیک کر دئے گئے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ کوچ کی تیاری ہے۔ راکا نے مجھے بتایا کہ وہ دہرہ دون چھوڑ کر جا رہی ہے۔ پچھلے چند مہینوں سے وہ ایک ٹروپ تیار کر رہی تھی۔ اب وہ ٹروپ تیار ہو گیا تھا اور حکومت ہند نے اس ٹروپ کو کچھ بیرونی ممالک کے دوروں کے لیے بھی چن لیا تھا۔ باہر جانے سے پہلے وہ ہندوستان کے مختلف حصوں کا دورہ کرنا چاہتی تھی اور اس طرح وہ تقریباً ڈیڑھ دو سال تک دورے پر رہنے والی تھی۔ اس دن وہ بہت خوش دکھائی دیتی تھی لیکن باتیں کرتے کرتے کبھی کبھی اچانک اداس بھی ہو جاتی تھی۔ اپنے اس ٹروپ کے بارے میں وہ اکثر مجھ سے باتیں کیا کرتی تھی۔ مجھے اس کی خواہش کی تکمیل پر خوشی ہوئی لیکن شدید افسوس اس بات پر تھا کہ ہمارے آپسی تعلقات کا کیا ہوگا۔ اس دن پہلی بار میں نے حسد کی کسک محسوس کی اور دعا کی کہ اس کا پروگرام کسی نہ کسی طرح منسوخ ہو جائے۔ میں اتنی ہمت بھی نہ کر سکا کہ اس سے پوچھ ہی لیتا کہ ہمارے مستقبل کا کیا ہوگا اور نہ ہی اس نے اس موضوع پر منہ کھولا تھا۔ میں نے سوچا کہ خاموشی سے اس کا انتظار کروں گا اور اگر نہ رہا گیا تو خط لکھ کر پوچھ لوں گا۔ خط و کتابت میں ایسی بات چیت کرنا آسان ہوتا ہے۔ اگر وہ چاہتی تو میں اپنا سب کام چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو لیتا۔ لیکن اس نے کبھی ایسا اشارہ تک بھی نہیں کیا اور مجھے یقین تھا کہ اگر میں خود اپنے آپ کو آفر کروں تو وہ میرا اور میرے تھیسس کا مذاق اڑائے گی۔ یہ بات مجھ سے برداشت ہونے والی نہ تھی۔

اس بار جب میں لکھنؤ آیا تو مجھے ایسا لگا جیسے میری زندگی سے مقصدیت کا عنصر نکل چکا ہے۔ مجھے زندگی کی تمام باتوں میں تمام چیزوں میں ایک کھوکھلے پن کا احساس ہونے لگا۔ ریسرچ، ڈاکٹریٹ، سیاسیات میں نئی تھیوری، کارل مارکس، سب کچھ فضول نظر آنے لگے۔

راکا کے خط لکھنے کی مجھے کوئی خاص امید نہ تھی۔ مہینے گزر گئے اور اس کا کوئی خط نہ آیا۔ کیونکہ مجھے اس کا پتہ معلوم نہیں تھا اس لیے میں بھی خط نہ لکھ سکا۔ حالانکہ ہمارے درمیان کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی پھر بھی مجھے ایسا لگتا تھا جیسے ہم میں قطع تعلق ہو گیا ہو۔ بظاہر میں اپنا ریسرچ کا کام کرتا لیکن تھیسس جوں کا توں پڑا تھا۔ میرے وظیفے کی میعاد تین سال تھی اور ابھی ایک سال سے زیادہ وقت میرے پاس باقی تھا۔ پھر بھی مجھے اب اس موضوع میں وہ دلچسپی نہ رہ گئی تھی۔ میں راکا کے پروگراموں کے بارے میں اخباروں میں اکثر پڑھ لیا کرتا تھا۔ کہیں گورنر اور کہیں چیف منسٹر اور کہیں میئر ان کا افتتاح کرتے تھے۔ پھر میں نے پڑھا کہ وہ بیرونی ممالک کے دورے پر چلی گئی ہے۔

اس طرح دو سال سے کچھ اوپر ہی بیت گئے۔ میرے وظیفے کی میعاد میں ایک سال کے لیے توسیع کر دی گئی۔ میں ابھی بھی لکھنؤ یونیورسٹی میں اپنے تھیسس کی تیاری میں جٹا ہوا تھا۔ ایک دن جب لائبریری سے واپس آیا تو مجھے دو خط ملے۔ ایک گھر سے آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ ہماری جائیداد کا بٹوارہ کر دیا گیا ہے اور میرے حصے میں دس ہزار روپے آئے ہیں اور میں انھیں جس طرح چاہوں خرچ کر سکتا ہوں۔ دوسرا خط مصر سے راکا نے لکھا تھا۔ میں دس تاریخ کو دلی

آ رہی ہوں - امپریل ہوٹل میں ٹھہروں گی - اگر مجھ سے مل سکو تو بہت اچھا ہوگا۔" راکا چھ ہی دن بعد دہلی آنے والی تھی - مجھے لگا جیسے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا ماضی کی یاد لے آیا ہو - راکا کا چہرہ، اس کے ہونٹ اس کی باتیں ذہن میں یکدم پھر سے ابھر آئیں - کیا اب بھی راکا ویسی ہی ہوگی ہم تقریباً ڈھائی سال کے بعد مل رہے تھے - اس نے مجھے خط لکھا ہے اس کا مطلب ہے، اسے میری یاد تو آتی ہی ہوگی - اب میں اسی انتظار میں تھا کہ کیسے پانچ دن گزریں اور میں اس سے ملوں -

چھٹے دن کی صبح میں دلّی میں تھا - میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا - نہ جانے راکا کیسے ملے - میں اس سے کتنے ہی گلے کروں گا - اس نے مجھے خط کیوں نہیں لکھا ؟ میں اسے یاد آیا کہ نہیں ؟ انھیں خیالات میں گم ہوٹل پہنچا -

میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی، اندر سے آواز آئی - "آ جائیے -" آواز راکا کی ہی تھی - میں نے دروازہ کھولا - سامنے راکا کھڑی تھی - پہلے سے کچھ موٹی - بال نئے طریقے سے گندھے ہوئے - کپڑے کچھ بدلے ہوئے لیکن ہو بہو وہی لڑکی - پوری پھیلی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے میرا استقبال کیا اور داہنے بازو سے اشارہ کرتے ہوئے بولی :

"آؤ بیٹھ جاؤ - جہاں جی چاہے بیٹھ جاؤ -"

میں کچھ بول نہ سکا - ہم ڈھائی سال کے بعد ملے تھے اور وہ مجھے بیٹھنے کے لیے ایسے دعوت دے رہی ہو جیسے بہت ذرّہ نوازی کے موڈ میں ہو - "جہاں جی چاہو بیٹھ جاؤ -" کہہ کر گویا اس نے مجھے جنّت میں آنے کی دعوت دی تھی -

میں نے کمرے کا جائزہ لیا - ہوٹل کے فرنیچر اور کیلنڈر کے سوا کمرے میں سجاوٹ کا کوئی سامان نہ تھا - کھڑکی کھلی تھی - میں کھڑکی کی چوکھٹ سے سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھنے لگا - دراصل اس کے ایسے استقبال سے میرا دل بجھ سا گیا تھا -

دفعتاً وہ ہنسنے لگی - زور زور سے، مجھے اس کی ہنسی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی - "تم ہنس کیوں رہی ہو ؟" میں نے پوچھا - وہ سنی ان سنی کر کے ہنستی رہی - پھر میرے پاس آ کر اور میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی - اس کی اس ادا پہ مجھے کچھ کچھ غصّہ بھی آیا - میں نے پھر پوچھا "آخر ہنسنے کی کیا بات ہے ؟"

ہنسی بند کر کے وہ میری طرف گھورتی ہوئی بولی - "تم مسکرا کیوں رہے ہو ؟ وہی طریقہ، وہی عادتیں، اور وہ لیسے کے ویسے بدھو -" بُدھو یا انگریزی میں "سلی" وہ مجھے اکثر کہا کرتی تھی لیکن آج اس کا یہ برتری والا رویّہ مجھے پسند نہ آیا - "جانتے ہو -" وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی - "تم مجھے بہت یاد آتے رہے - ہر روز، تقریباً ہر لمحہ"

"زہے نصیب" - میں نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا -

"اور جانتے ہو کیوں ؟" اس لیے کہ تم بالکل نہیں بدلے - اور میں جانتی تھی کہ تم بالکل نہیں بدلو گے - اس لیے بڑی آسانی سے تمہیں یاد کر سکتی تھی - وہی بھورے بال، چوڑا ماتھا، پتلا جسم، کالا کوٹ -" اور پھر کپڑوں کی طرف دیکھ کے اچانک بولی - "ارے وہ تمہارا کوٹ کدھر گیا ؟ میں نے غلط سمجھا تھا کہ تم بالکل نہیں بدلے - تمہارا کوٹ تو بدل گیا - کیا ہوا ؟"

"مر گیا -" میں نے کہا - "تمہارا انتظار نہ کر سکا -"

پھر میں نے بات بدلنے کے لیے پوچھا - "کہاں کہاں ہو کے آئی ہو تم ؟"

"بس یوں سمجھ لو کہ تمام دنیا کا چکر لگا آئی ہوں - لیکن اب تھک گئی ہوں - اس کام سے میرا جی بھر گیا ہے - اب تو میں بس کہیں ٹک جانا چاہتی ہوں -"

دور کہیں سے ایک کرن پھوٹی - کچھ دیئے جگمگائے - ایک دم میرے تمام جسم میں سے جیسے کوئی لہر دوڑ گئی - باہر سورج غروب ہو چکا تھا -

"کام کا کیا کرو گی اب ؟ - امیر لبنا ریو، ایکٹنگ وہ سب کچھ کیا ہوا ؟"

"بس اب ایکٹنگ کے رول مجھے پسند نہیں - کوئی بھی رول مجھے نہیں بھاتا اور پھر ٹروپ کے ساتھ میرے کچھ اختلافات ہو گئے ہیں -"

اتنے میں بیرا چائے کی ٹرے لے کر آ گیا -

اس نے دو پیالیاں بنائیں - ایک مجھے دی اور ایک خود لے لی اور ایک گھونٹ پی کر بولی - "اب تم اپنی سناؤ -"

"میرا کیا ہے تم نے خود ہی تو کہا ہے کہ میں نہیں بدلا - بس جہاں چھوڑ گئی تھی وہیں ہوں -"

وہ کچھ ہنسی - پھر پوچھا - "اچھا میں بدلی ہوں کہ نہیں ؟"

" ہاں ۔"

میری بات بیچ میں کاٹ کر اس نے کہا - " کچھ موٹی ہو گئی ہوں - اس کے علاوہ اور کوئی تبدیلی ؟ "

" اب ساری دنیا دیکھ کے آئی ہو - کتنی بدلی ہو - یہ ایک دم کہنا تو مشکل ہے -" میں نے اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا - " اچھا اب کیا پلان ہے تمہارا ؟"

" پلان ؟" اس نے بے توجہی سے جواب دیا - " بہت پلان ہیں " پھر ایک دم اپنی گھڑی دیکھ کر بولی - " اچھا دیکھو چھ بجے مجھ سے کوئی اور ملنے آ رہا ہے -"

چھ بجنے میں پانچ منٹ تھے - مجھے گویا چلے جانے کا اشارہ مل چکا تھا - میرا کلیجہ ایک دم منہ کو آ گیا - گلا ایک دم سوکھ گیا - یہ الوداع - میرے دل میں جو اسے گلے سے لگانے اور اس کا منہ چوم لینے کی خواہش پیدا ہوئی تھی وہ ایک دم ٹھنڈی ہو گئی - میں نے نہ جانے کیوں اس سے پوچھ لیا - " اب کب ملاقات ہو گی ؟"

" اب ؟ " اس نے ایک لمحہ کے لئے سوچا - جیسے اپنے ذہن میں ڈائری کے ورق الٹ رہی ہو - پھر اسے اگلے دن کا ورق مل گیا -

" کل تو میں بمبئی جا رہی ہوں ، شام کی چھ بجے کی گاڑی سے -"

" اچھا میں اسٹیشن پر آؤں گا -" میرا اشتیاق پھر جاگ اٹھا -

" نہیں ، میرے ساتھ کوئی اور ہو گا -"

" اچھا " میرے سینے پر جیسے کسی نے ہتھوڑا مار دیا - " اس سے پہلے کل میں فری ہوں گا -" میں نے بالکل یتیموں کے سے لہجے میں کہا -

" اوہو - کل تو میں بہت مصروف ہوں گی - صبح رانسن آ رہا ہے اور مجھے شاپنگ بھی کرنی ہے -"

تو یہ ہماری آخری ملاقات تھی - میں بالکل رو ہی پڑا - یہ رانسن کون تھا ؟ وہی تو نہیں جو مسز رائے کے گروپ میں بھی تھا - اکسفورڈ کا لکچرار ہندوستان کی سیاسی فلاسفی پر ڈاکٹریٹ کر رہا تھا -

" تو پھر کب ملو گی ، بمبئی سے کب واپس آ رہی ہو ؟ "

" بمبئی سے واپس نہیں آؤں گی - وہاں سے ہم انگلستان جا رہے ہیں - میں اور رانسن -" اور پھر کچھ وقفہ کے بعد بولی " رانسن کو تم جانتے ہو نا ؟ وہی جس کو تم برہمن کہہ کر چڑایا کرتے تھے -"

میں ہاں بھی نہ کہہ سکا - اب تک بڑی کوشش سے اپنے آنسو روکے ہوئے تھا - راکا نے دروازہ کھولا - ہم دونوں کچھ دیر تک ساتھ ساتھ چلتے رہے - پھر راکا ٹھہر گئی اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر بولی :

" اچھا الوداع -"

میں باہر آیا - ہوٹل کے باوردی چوکیدار نے سلام کر کے پوچھا " ٹیکسی ؟ " میں جواب دئے بغیر آگے بڑھ گیا - کدھر جا رہا تھا - مجھے خود نہیں معلوم تھا - جب بہت دیر گئے گھر واپس آیا تو کھانے کی بالکل خواہش نہیں تھی - منہ کا ذائقہ بالکل خراب ہو چکا تھا - ویسے ہی سو گیا -

دوسرے دن شام کو غیر ارادی طور پر اسٹیشن کی طرف چل پڑا - گاڑی چھ بج کر پانچ منٹ پہ چھوٹتی تھی - ابھی سوا پانچ ہی بجے تھے - میں نے ادھر ادھر گھومنا شروع کر دیا - پونے چھ بجے میں نے دیکھا گیٹ میں سے رانسن اور راکا ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے - انھوں نے مجھے دیکھا نہیں - دونوں سیدھے اپنے ڈبے میں داخل ہو گئے - پھر رانسن باہر نکلا - کچھ میگزین اور اخبار خریدے اور پھر اپنے ڈبے کی طرف مڑ گیا - میں راکا کو دیکھ رہا تھا - مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے بھی مجھے دیکھا ہے - پھر اس نے کھڑکی کا پٹ نیچے گرا دیا - وہ میرے لئے راکا کا آخری دیدار تھا -

گاڑی پتہ نہیں کب چلی گئی - پلیٹ فارم کا ہجوم باہر کی طرف نکل رہا تھا - میں بھی اس میں شامل ہو گیا - دماغ میں کتنے خیالات آ رہے تھے - راکا اب بیس پچیس میل دور جا چکی ہو گی - اس نے شاید اب کھڑکی کا شیشہ اونچا کر دیا ہو گا - اس کی آنکھوں میں بھی پانی آ رہا ہو گا -

" بدھو ہسلی -" راکا کا قہقہہ میرے کانوں میں گونجا - " پھر جذباتی بن گئے -"

سارا دن انہیں خیالوں میں غرق رہا - اگلے دن لکھنؤ کے لئے

روانہ ہو گیا۔ اپنے کمرے میں آ کر کتابوں کی الماری کو دیکھا۔ موٹی موٹی بے جان کتابیں۔ پھر اپنے تھیسس کو اٹھا کر دیکھا۔ پانچ باب ختم ہو چکے تھے۔ کاغذوں کا وزن ایک سیر کے قریب ہو گا۔ انھیں میں میری ڈاکٹریٹ پڑی ہے، انھیں میں دہرہ دون، مسز رائے، راکا اور رانسن۔ تھیسس میں ایک دو جگہ میں نے رانسن کا حوالہ بھی دیا تھا۔ تھیسس تھا۔ یہ کمرہ تھا۔ راکا تھی، راکا ہے۔ وہ اب بمبئی میں شاپنگ کر رہی ہے۔ میں ہوں، میں یہاں اس کمرے میں ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں۔ اگر میں سوچنا بند کر دوں تو؟ لیکن میں سوچنا کیسے بند کر سکتا ہوں۔ میں ہوں اور میں سوچوں گا۔ میں اپنی سوچ سے ہی راکا کو جنم دیتا۔ اس سے شاپنگ کرواتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ راکا کی ٹرین کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہو اور وہ اس وقت زندہ نہ ہو۔ لیکن میری سوچ اسے پھر بھی زندہ کر سکتی ہے۔ میرے تھیسس کا پہلا فقرہ بھی یہ تھا۔ انسان سوچنے والا جانور ہے۔

میز پر راکا کا وہ خط پڑا ہوا تھا جو مجھے دہلی لے گیا تھا۔ خط وہیں تھا اور میں دہلی ہو کر واپس بھی آگیا تھا۔ یہ دوسرا خط میری ماں کا تھا۔ یہ بھی اسی کے ساتھ آیا تھا۔ ماں نے پوچھا تھا — "تمھارا پلان کیا ہے؟" — "میرا پلان!" پلان وہ بناتے ہیں جو کچھ سوچتے ہیں۔ اور میں سوچنا بند کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اب دس ہزار روپیہ میرے نام ہے۔ اگر میں ماہانہ دو سو روپیہ بھی خرچ کرتا رہوں تو چار سال دو مہینے تک گزارا ہو سکتا ہے۔ اور اس کے بعد؟ اس کے بعد پھر وہی سوچ! میں نے بہت سوچ لیا۔ میں سوچ سوچ کے تھک گیا ہوں۔ اب فیصلہ کرنا ہے۔ بغیر سوچ کے فیصلہ۔ کم سے کم سوچ کے بعد فیصلہ — میرا پلان؟ — میں نے اس خط پر جلی حروف میں لکھ دیا — "کچھ بھی نہیں۔" پھر میں نے ایک کاغذ لیا اور یونیورسٹی کو چٹھی لکھ دی کہ اب میں ریسرچ کرنا نہیں چاہتا۔ اس کے بعد میں نے سامان باندھنا شروع کر دیا۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے سیاسیات کی فلاسفی کو کوئی خاص الخاص چیز نہیں دینا ہے۔ وہ وہم تھا میری سوچ کا افلاطون، ارسطو، ہیگل، مارکس، فرائڈ کے پوتھے پڑھ کر میرا دماغ خراب ہو گیا تھا — کون سی چیز وہ دنیا کو دے گئے تھے آخر — افلاطون کو زہر کا پیالہ پینا پڑا، ارسطو کو جلاوطنی ملی۔ مارکس ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرا، فرائڈ دوسروں کے جنسی معاملات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش میں لگا رہا۔ ان سب کو سوچ نے مارا۔ ان کی فکر نے باقی دنیا میں بھی خواہ مخواہ ہل چل مچا دی۔ لوگوں کے سکون قلب میں خلل ڈالا۔ ایم۔ این۔ رائے نے کیا کیا۔ وہ بے کار ہوا میں پر پھڑ پھڑاتا رہا۔ لیکن اس کو ایلن مل گئی تھی۔ اسے اپنے متعلق کوئی بھی فکر نہ تھی۔ وہ سوچتا تھا دوسروں کے لیے۔ یہ بھی تو عیاشی ہے — دوسروں کے لیے سوچنا۔ نہیں مجھے ایم۔ این رائے پر اور کچھ نہیں لکھنا۔ اس سے شاید چند اور سر پھرے لوگ گمراہ ہو جائیں۔ سوچ سب تکلیف کی جڑ ہے۔ میں نے اپنے متعلق کیا کچھ سوچا تھا۔ کتنے ہوائی قلعے بنائے تھے۔ میری سوچ مجھے صدیوں آگے لے گئی۔ میں اپنا مقام، اپنا آپ بھول گیا۔ میں نے راکا کے ساتھ جھولے جھولے۔ یونیورسٹی کی پروفیسری اور ایک خوب صورت گھر کے خواب دیکھے۔ میں نے کتنا سوچا تھا؟ کتنا پلان کیا تھا؟ — اور میری سب سوچ سارے پلانوں کو ایک بیس سال کی لڑکی درہم برہم کر کے چلی گئی تھی۔ میرے سارے ہوائی قلعے اس نے آن کی آن میں مسمار کر ڈالے تھے — میری سوچ کا کیا فائدہ ہوا —؟ رانسن — وہ کھلنڈرا ڈاکٹر — جسے ہم برہمن کہہ کر چڑایا کرتے تھے۔ وہ سب کچھ لے گیا۔ اس کا تھیسس مکمل ہو چکا تھا۔ اس کی کتاب چھپ رہی تھی اور اسے راکا مل گئی تھی۔

میں نے اب فیصلہ کر لیا ہے کہ سوچ کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں کہیں بھی نوکری کر سکتا ہوں — کسی کے ساتھ بھی شادی کر سکتا ہوں۔ میں نے اب سوچنا بند کر دیا ہے — میں ہوں — اتنا ہی کافی ہے — کیوں ہوں؟ — اس کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ———— کوئی فائدہ نہیں۔

اظہر علی فاروقی

ہمارا تمدن ـــ ملبوسات کی روشنی میں

'ایک نور صورت ہزار نوبہ کپڑا' یا اسی قسم کے فقرے اور جملے تو یقیناً نعمد دالی بات ہوں گے۔ ستر پوشی انسانی فطرت کا پہلا تقاضا ہے جو اس شرم و حیا کا نتیجہ ہے جو انسانی فطرت میں ودیعت ہے اور انسان کے لئے ایک برکت ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ شرم وحیا کا معیار اضافی رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس بارے میں اختلاف بھی رہا ہے کہ مرد اور عورت کو بدن کا کتنا حصّہ چھپانا ضروری ہے۔

شرم و حیا کے اس تقاضے کو انسان اگر بالائے طاق رکھ کر ستر پوشی سے بے نیازی حاصل کرنا بھی چاہتا تو اسے موسمی فضائیں تن ڈھانکنے کے لئے مجبور کرتیں۔ چناں چہ سرد ملکوں کے باشندے گرم علاقوں کے لوگوں کی بہ نسبت ملبوسات کی زیادہ ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

اس ضرورت کی تکمیل کرنے کے لئے شروع شروع میں بنی نوع انسان نے درختوں کے بڑے بڑے نرم پتے اور لمبی لمبی ملائم گھاس کا استعمال کیا۔ وثوق سے تو نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کام کب تک جاری رہا۔ لیکن اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ پتھر اور دھات کالوں تک یہ سلسلہ باقی رہا ہوگا اور ایسے تو مشرق بعید کے چند جزائر اور افریقہ کے کچھ حصّوں میں آج بھی اس قدیم رسم کی مٹی ہوئی کچھ نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ ماڈرن، واتسی اور زولو ناچ کی نقل جہاں کہیں بھی اسٹیج پر کی جاتی ہے، کمر سے لمبی لمبی گھاس بندھی رہتی ہے۔ سوئفٹ کی گلیورس ٹریولز میں، یا ہو قوم کی جو تصویریں جنرل نالج شمارہ ۶۹ میں دی گئی ہیں ان سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ستر پوشی کے لئے لمبی لمبی گھاس کا استعمال ہوتا تھا۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اس کی جگہ کھالوں نے لے لی اور یہ سلسلہ اس وقت تک حاجت مندی کے تحت چلتا رہا جب تک انسان نے سوت کاتنا اور کپڑا بُننا نہ سیکھ لیا۔ بابل، مصر اور سندھ کی تہذیبوں کا زمانہ قریب قریب ایک ہے اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے فرق سے قطع نظر کرتے ہوئے ۳۰۰۰ سال اور ۲۷۰۰ قبل مسیح مانا جاتا ہے۔ نمایشی طور پر سرد خطوں میں کھالوں کی چیزیں استعمال کرنا آج تک جاری ہے۔ ہمارے ملک میں عہدِ عتیق کے رشی۔ مُنی ہرن چیتل اور چیتے کی کھالیں ستر پوشی کے لئے استعمال کرتے تھے۔ مرگ چھالا لباس کے طور پر نہ سہی، بیٹھنے اور دوسرے کاموں میں آتی رہی اور آج بھی آتی ہے۔ سرد خطوں میں سمور، قاقم، بھیڑ، دنبا خرگوش، لومڑی وغیرہ کی کھالوں کے کپڑے بنائے جاتے رہے اور آج بھی بن رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں کپڑے کے وجود پر کھالوں کا استعمال متروک ہوگیا۔ البتہ مسلمانوں کی آمد پر یہاں کھالوں کی ٹوپیاں، اصوریاں، دستانے تو عام طور پر اور فرغل، لبادے اور قبائیں خصوصی طور پر استعمال میں رہیں۔ انگریزی دورِ حکومت میں یہ چیزیں دب گئیں۔ البتہ نرم و نازک اور حسین فربیڈیوں کے کوٹوں کے کالروں اور آستینوں پر حرف گوٹا کناری کا کام دیتا رہا۔ ولایتی گرم کپڑوں کی افراد نے کھالوں کے ملبوسات کو دبا دیا۔

ادھر آزادیٔ ہند کے ساتھ ساتھ اس سلسلے میں ایک بار پھر رجعت قہقری پیدا ہوئی اور کھالوں کی ٹوپیاں، فرکی بنڈیاں، کوٹیاں، زاکیں، لیڈی کوٹ، دستانوں کا رواج فیشن اور شان کے طور پر موسم سرما میں بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

انسان نے سوت کاتنے اور کپڑا بننے کا کام کس طرح اور کب سیکھا۔ اس بارے میں کوئی متیقن فیصلہ ذرا مشکل ہے۔ سر فلنڈرس پیٹری کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ پارچہ بافی کے ابتدائی نقوش ایران کے ریگستانی حدود کے گرد و نواح اور مصر کے شمالی اور جنوبی نواح میں ملتے ہیں۔ دریائے نیل کے شمالی حصے میں بداری قوم آباد تھی جو ہاتھ اور چوبی ڈھیرے کی مدد سے سوت بنانا جانتی تھی۔ کپڑا بننے کا طریقہ چٹائی بننے کے مثل تھا۔ بہرکیف زیادہ وقت نہیں گزرا کہ انسان نے ہاتھ اور ڈھیرے کے علاوہ چرخے سے اور بہت بعد میں مشین سے سوت کاتنا سیکھ لیا اور کرگھا سے کپڑا بننا اور پھر مشینوں اور کلوں کی مدد سے اچھے سے اچھا کپڑا بننا جان لیا۔

جغرافیائی نقطۂ نظر سے ہمارا ملک اگر براعظم نہیں تو برصغیر کہے جانے کا مستحق ہے۔ یہاں صوبائی آب و ہوا کا اختلاف، باشندوں کے طرزِ معاشرت میں عدم یکسانی، وضع قطع، عادات و اطوار، زبان اور کلچر سبھی کچھ ایک دوسرے سے جداگانہ ہے۔ پھر موسمی فضاؤں کا بھی عجیب حال ہے۔ جیٹھ بیساکھ کی چلچلاتی دھوپ۔ گرم خطوں کو مات کرنے والی تمازت اور حدت۔ ساون بھادوں کی برسات ماہ پوس کا جاڑا۔ برسات کا حبس اور سڑی گرمی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم گرمی اور برسات میں کپڑوں سے بے نیازی برتیں تو کچھ بے جا نہیں۔

معاشرہ کے دوسرے شعبوں کے مثل ملبوسات کے سلسلے میں بھی انقلاب وقت اور بیرونی اثرات کے تحت ترک و اخذ کا سلسلہ جاری رہا اور اس نقطۂ نظر سے ملبوسات کی تاریخ نہ صرف دلچسپ بلکہ بڑی دشوار بن جاتی ہے۔

ہم اپنے ملبوسات کے بارے میں (۱) مندروں کے سنگی مجسموں (۲) تصاویر (۳) اجنتا اور ایلورا کی نقاشیوں (۴) تصاویری البموں، مغل، راجپوت، کانگڑہ وغیرہ کے پینٹنگ اسکولوں (۵) عجائب خانوں (۶) لوک گیتوں (۷) دنت کتھاؤں اور (۸) شعری ادب سے بہت کچھ معلومات فراہم کر سکتے ہیں (۹) بیرونی سیاحوں کے سفرنامے اور بیانات اس سلسلے میں کافی مواد پیش کرتے ہیں (۱۰) ان سب سے زیادہ اہم وہ مذہبی کتابیں ہیں جن میں ملبوسات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ہم انھیں سند کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔

تاریخ کے مثل ہم ملبوسات کی تاریخ کے بھی مختلف دور قائم کر سکتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تاریخ اور عام تاریخ کے دوروں میں کوئی نمایاں فرق نہ ہوگا یہی وجہ ہے کہ ویدک کال سے کشان خاندان کے فرماں رواؤں تک ہمیں نہ تو سیاسی طور پر اور نہ معاشرتی نقطۂ نظر سے کوئی خصوصی فرق محسوس ہوتا ہے اور نہ ملبوسات کے سلسلے میں۔

رگ وید کال میں کپڑے رنگ برنگے ضرور ہوتے تھے اونی اور سوتی دونوں قسم کے کپڑے ملتے تھے مگر تعداد کے لحاظ سے صرف تین کپڑوں کا ذکر ملتا ہے نی وی جسے آپ تہبند یا دھوتی سمجھ لیں ادھی واس چھوٹی چادر اور واس یا پری دھان بڑی چادر یا پگڑی۔ انھیں تین کپڑوں کا ذکر میگستھنز نے اپنی کتاب انڈیکا میں کیا ہے۔

ہیون سانگ چینی سیاح نے کپڑوں کے بارے میں جو بیانات دئے ہیں کہ کپڑے بلا تراشے اور بن سئے ہوتے ہیں۔ اس سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت لوگ فن خیاطی سے ناواقف تھے، لیکن بات ایسی نہیں ہے اس لئے کہ ویدوں اور براہمن گرنتھوں میں ان چیزوں کا ذکر آیا ہے جو فن خیاطی کے لوازم ہیں مثلاً رگ وید میں قینچی کے لئے بھورج کا لفظ آیا ہے اسی طرح یجروید کے براہمن حصے میں سوئی کے لئے شوچی اور [illegible] کے لفظ آئے ہیں۔ ویدوں میں چمڑے کی سلائی کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلائی اور کشیدہ کاری کے فن سے واقفیت تھی۔ بلاشبہ

کپڑے مذہبی نقطۂ نظر سے بہتر اور سلے ہوئے کپڑے پہننا معیوب سمجھے جاتے تھے۔ پھر شدت گرمی اور بارانی حبس اور گھٹی گھٹی فضا کے لئے بلا سلے کپڑے آرام دہ ثابت ہوتے تھے۔

اس طویل مدت میں یونانی ہنشنگ، باختری، پارتھیں، تنگ کشاں قوموں کے بیرونی حملے ہوئے۔ راج بنے۔ یہاں رہ بس گئے اور میل جول بھی ہو گیا۔ سیتھین، یوچی اور کشان قوم نے کپڑوں میں کچھ اضافہ کیا۔ پاجامہ اور کوٹ رواج پذیر ہوا لیکن عام نہ ہو سکا۔ ہمارے یہاں 'ستھن' کا لفظ صاف بتاتا ہے کہ اس کا تعلق سیتھین سے رہا ہے۔ گپت کال جو ہماری تاریخ کا زریں عہد کہا جاتا ہے وہ بھی کپڑوں میں کوئی اضافہ نہ کر سکا۔ ہرش وردھن کے زمانے تک (ساتویں صدی عیسوی) ہم صرف نزی (دھوتی) اتری (چادر) پر اکتفا کرتے رہے۔ عورتیں ساری اور کنچکی (چولی) ہی پہنتی رہیں۔ اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت لہنگے کا رواج بھی ہو چکا تھا۔

شعر و ادب میں ان کپڑوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ البتہ لہنگے نے ہمیں دو فقرے دئے جو کہاوت کے طور پر آج بھی رائج ہیں۔ شوقین بڑھیا چٹائی کا لہنگا اور ننھی سی گڑیا نو گز کا لہنگا۔ گھاگرا گھنگھرا بھی لہنگا کے مترادف دو کپڑے ہیں۔ اردو میں لہنگا کی تصویر اس طرح دکھائی گئی ہے

گوٹ لہنگا میں گرنٹے کی لگوتی بیٹھ
لہنگے کو جانتا ہوں کہ جمنا کا پاٹ ہے

کنچکی اردو کے پہلے شاعر قلی قطب شاہ کے دہاں اس طرح نظم ہوتی ہے

تن ٹھنڈت لرزت جوبن گرجت   پیا لکھ دیکھت کنچکی کس بکسے آج

متی رام نے ساری۔ لہنگا۔ کنچکی تینوں کو اس طرح پیش کیا ہے:

شری سیس پھول امول تربن تاک سسندر بھال
ساری سرنگ بیل ہیل لہنگا سُرنگ کنچکی لال

گھنے گھیر کو گھس نگھرد گھونگھر بارے بال
آئے مہرے بھون بڑے بھوہ اٹھ پیارہی ہیں
ات ہر برن بنا سے باندھی پاگ ہے

پیار یگی پگڑی پی کی   ہنس بھیتر آپنے سیس سنباری

سر پاگ بڑائی کا سو ہے اور چیندن روپے ماتھے پہ (نظیر اکبر آبادی)

اس پگڑی نے پگڑی اتارنا، پگڑی اُچھالنا، پگڑی بدلنا پگڑی کی لاج رکھنا محاورے دئے

دھوتی اور ستھنا   تیرے عاشق جتنے تھے ان کا جدا انداز تھا
کوئی دھوتی باندھتا تھا کوئی ستھنے باز تھا

راجپوت کال میں چوڑی دار پاجامہ اور انگرکھا، گھیر دار پگڑی یا کھڑکی دار پگڑی اور کلغی کا رواج ہو چلا تھا۔ عوام آدھا انگرکھا یعنی دامنوں کا حصہ غائب استعمال کرتے تھے جسے انگا کہا جاتا تھا۔ پگڑی کا عام رواج ہو گیا تھا۔ ننگے سر باہر نکلنا معیوب سمجھا جانے لگا تھا۔

اس کے بعد گیارھویں صدی سے غزنی اور غوری کے افغانوں نے حملے شروع کر دئے اور آخر کار تیرھویں صدی عیسوی میں ترک غلاموں نے غلام خاندان کے نام سے دلی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور یہیں رس بس گئے۔ اپنے ساتھ ملبوسات کا ایک انبار لائے۔ سر سے پیر تک مختلف قسم کے کپڑے استعمال ہونے لگے۔ پارچہ بافی کے صدہا کارخانے کھلوائے اور اس صنعت میں بڑی بڑی ترقیاں کیں۔ زرکاری، ڈیزائن اور چھپائی کے لاکھوں دستکار پیدا کئے۔ صدہا قسم کے کپڑے بنوائے جن کی تفصیل بہت طویل ہے۔ مثال کے طور پر آپ چند نام دیکھئے:

اطلس۔ آب رواں۔ تن زیب۔ جامدانی۔ زری۔ نیم زری۔ سنگی۔ ٹسر۔ سوتی ٹسر۔ گلبدن۔ مخمل۔ مشجر۔ مشروع۔ غلطاں۔ طوس۔ جائے دار۔ ریزہ۔ کمخواب۔ اُدھی۔ محمودی۔ ململ۔ سوسی۔ موج دریا۔ طاس گجراتی۔ دارائی۔ خز۔ خاص۔ قطنی۔ انیری۔ دیبا۔ خارا وغیرہ۔

پارچہ بافی اور زرکاری کے سلسلے میں بہت سی کہاوتیں رائج ہوئیں اور اس قسم کی کہاوتیں زبان و ادب کو ملیں:

ناحق چوٹ جلاہا کھائے کرگھا چھوڑ تماشے جائے ۔ جلاہے کی عقل کرگھا میں ۔

دلّی سلطنت کے فرماں روا اور امراء سر پہ تاتاری کلاہ اور دستار باندھتے تھے ۔ مغل فرمانرواؤں نے راجپوتوں کی کھڑکی دار پگڑی پر طرّہ اور کلغی کا اضافہ کرکے اسے شاہی تاج قرار دیا ۔ بدن پر دلی سلطنت کے سلاطین ڈھیلے ڈھالے چوغے ، فرغل اور قبائیں پہنتے تھے ۔ مغلوں نے جامے اور انگرکھے کو بھی رائج کردیا ۔ شلوار ۔ شرعی پاجامہ اور چوڑی دار پاجامے کا بھی رواج ہوگیا تھا ۔

نوابین اودھ نے شلوار کی جگہ کلی دار ، سیدھا سنجافی غرارے دار پاجامے کا استعمال روا رکھا ۔ عوام زیادہ تر شلوار اور چوڑی دار پاجامہ (گھٹنا) ۔ کرتا ۔ صدری اور جنڈی پہنا کرتے تھے ۔

اواخر انیسویں صدی میں چکن چھ کلیا اور اچکن ۔ سر پہ دوپلی کشتی نما ۔ پٹاری دار ۔ گنبد نما ۔ چوگوشیا ٹوپی کا رواج ہوا ۔

ایک مدّت تک مسلمان عورتیں شلوار ، کرتا یا قمیص پہنتی رہیں البتہ نوابین اودھ کے دور میں کلی دار پاجامے نے شلوار کی جگہ لی ۔ مغل دور میں نیمہ اور پیشواز کا رواج رہا اور انگیا کرتی بھی استعمال میں آنے لگی ۔ مرزئی ، چارقب ، کمر پیچ سیلی ۔ تہ پوش ۔ شلوکا بھی اسی دور کے کپڑے ہیں ۔

اب آئیے شعری ادب میں ان کی جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے :

کلاہ ۔ کلاہ تاتاری ۔ دستار ، طرّہ ، جیغہ ، ٹوپی ، عمامہ ، صافہ کلغی ، درویش صفت باش کلاہِ تتری دار

دستار سُرخ سج کر طرّہ زری کا رکھ کر — آیا جو دل کو لینے دلدار ہنستے ہنستے
(نظیر اکبرآبادی)

پرانوں کی وہی چالیں پرانی — سروں پر ٹوپیاں ہیں کامدانی
واں زلف نے کھائے پیچ پر پیچ — طرہ کلغی پہ یاں تھا سرپیچ
افشاں ہوئی واں ستارہ افشاں — یاں جیغہ سے روشنی دوچنداں

واں مانگ سے رنگ کہکشاں ماند — یاں شملہ سر سے ہالے میں چاند

کرتا ۔ چوغا ۔ جبّہ ، انگرکھا ، قبا ، عبا ، فرغل ، دگلا ، جامہ ، انٹڈی ، صدری ، نیمہ ، شلوکا ، لبادہ ۔

اب لیڈر نہ کہو مجھے لیڈر کا خطاب — اب تو کھدر کا انگرکھا بھی مراسل آیا
تن جامہ خاصا ململ کا کلائی رنگیں پیچیر — رکھے پان گلے موتی مالا اور مونگا سونا بھی اکثر
(نظیر اکبرآبادی)

یہ لبادہ ہے پرانی چال کا اچھا لباس — کرتے کا کرتا ہے اور شلوار کی شلوار ہے

دوپٹا ۔ چادر ، دلائی ، دامنی (داؤنی) برقع ، اوڑھنی

اک دوپٹا دیا شبنم کا پھر اس گلگوں کو اوڑھا
پڑ گئی اوس حسینانِ جہاں پر ہر جا

برقع کو اٹھاتے ہی زمانے کو گرا دے — محشر کو اٹھا دے تجھے خاموش بٹھا دے

رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا — ہوا میں پلّو سکھا رہی ہے

انگیا ۔ کرتی ۔ چولی ۔ محرم ۔ پیشواز ۔ قادری ۔ چوکلیا ۔ شلوکا ۔

چاک سینے کا غضب صاف بدن موتی سا
انگیا تصویر سی کرتی کا گریبان پری

ہر اک زعفرانی دیکھ چولی — قیامت دل پہ جو ہونی تھی ہو لی
وہی کرتی انگیا وہی بند محرم — چلی جاتی ہے حسن کی پردہ داری
زیب تن اس کے پیشواز کتاں — پشت ماہی وہ اس پہ جلوہ کناں
قطع چوکلیا عجب گھیر ہے دامن کا طلسم — آستین چیت بہت اور اچاوٹ خامی
شلوکا پہنے ہوئے گلابی ہر اک سبک پنکھڑی چمن میں
قادری میں نے منگائی تھی تو لائی انگیا
تو دو ایک ہے اللہ ری حرفت بازنہ — قادری مانگی تھی تو دوڑ کے لائی پیشواز

کلی دار پاجامہ ۔ شلوار ۔ غرارہ ۔ کھڑا پاجامہ ۔ چوڑی دار پاجامہ ۔ تہ پوش ۔

سرخ اطلس کا وہ پاجامہ سجا بوٹے دار — جس کی کلیوں کا ہوا غنچہ دہن سے نہ شمار
ہاتھ میں پائنچے دونوں جو اٹھالے اک بار — کس قدر جامے سے باہر ہو وہ رشکِ بہار
پاجامہ یہ نہیں ہے تمامی کا پاؤں میں — دریائے نور میں ڈوبا ہے وہ مہ کمر کمر
سرخ پاجامہ ہے گوٹا ہر کلی میں ہے لگا — پھولوں کی چھڑیاں ہیں اس رشکِ چمن کی نیفہ کیا

تہ پوش کا نام میر امّن نے باغ و بہار میں لیا ہے ۔

پیروں میں مرد زری کے سلیم شاہی ، جے پوری جوتے ، زلفت

کی پاپوش، گھیتلے، زردوزی کے کامدار جوتے پہنتے تھے۔ عورتیں جوتیاں زیر پائی اور گھیتلے استعمال کرتی تھیں جو زیادہ تر کامدار ہوتی تھیں۔ روکے کہتے ہیں کہ عید آگئی ہم بھی حرف آپ لا دیجئے زربفت کی پاپوش مجھے

ڈانتی ہیں حسین لیڈی پمپ — کون خواہاں ہو زیر پائی کا

انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی لے کر تاجر کی حیثیت سے ہمارے یہاں آئے اور برٹش سامراج بن کر ہمارے ملک پر چھا گئے۔ ہندوستانیوں نے انگریزی پڑھی، اسکول اور کالج کھلے۔ اقتدار کے ساتھ ساتھ انگریزی تہذیب بھی ہندوستانی گھروں پر تسلط جمانے لگی اور رفتہ رفتہ اوائل بیسویں صدی تک ہم ہندوستانی انگریزی تہذیب کے تابع بن گئے اور آخر کار یہ صورت ہوئی۔

واہ کیا دھج ہے میرے بھولے کی — شکل کوئلے کی ہیٹ سولے کی

کرتے کی جگہ قمیص اور بعد میں بش شرٹ، ٹی شرٹ، فلائی شرٹ نے لی۔ ٹائی اور کالر گردنوں سے چسپاں ہو گئے۔

بڑھی نکٹائی اور کالر کی زینت — نہ وہ پہلی سی خصلت ہے نہ عادت

پاجامے کے مقام پر پتلون، اڈرین پائپ، جینس اکا دُلوائے کا غلبہ ہوا اور ہم سوٹ بوٹ میں ملبوس نظر آنے لگے

باپ کی ساری کمائی ہو گئی نذر سوٹ بوٹ — بھوت کالج میں چڑھا فیشن کا برخوردار پر

جبے اور قبائیں اتر گئیں۔ ان کی جگہ شیروانی، کوٹ، اوور کوٹ، جیسٹر، السٹر آ گئے

اب اوورکوٹ کا زمانہ ہے — نام صاحب نہ لو رضائی کا

جامہ زیبی ہے وضع مغرب میں — کیوں نہ ہو ہم کو شوق جیسٹر کا

بنڈی، صدری اور شلوکے نے منہ چھپا لیا اور ان کی جگہ پر کوٹی سویٹر اور پل اوور نے لی۔ عورتوں کے لباس میں کوئی نمایاں فرق نہیں پیدا ہوا البتہ ساری کی مقبولیت بڑھ گئی۔ شلوار، غرارہ، جمپر بلاوز اور بچیوں کے لئے اسکرٹ اور فراک موزوں سمجھا جانے لگا۔ دوپٹا اپنے حال پر قائم رہا، مگر سر سے اتر کر گردن سے لپٹ گیا پیروں میں لیڈی پمپ، لیڈی شو، سینڈل اور چپل کا رواج ہو گیا اور اب یہ حال ہے

اگر رستے میں مل جاتا ہے اگلی وضع کا کوئی
تو ہنس کر اولڈ فیشن کہہ کے اس کو یاد کرتے ہیں

ایسا حیات

محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء

روز مر مر کے بھی کرتے ہیں تمنائے حیات — ہم سے بڑھ کر بھی نہ ہوگا کوئی شیدائے حیات
طور جینے کے کوئی سیکھے تو ہم سے سیکھے — ہیں ہمیں اہلِ جنوں رمز شناسائے حیات
آج تک اس کے حقائق پہ نظر کر نہ سکی — عقل مدت سے ہے معروفِ تماشائے حیات
کوئی چکھے تو مزا خود ہی اسے مل جائے — کیا کہیں کیفیتِ نشۂ صہبائے حیات
درد و غم، جذب و خلش، سوز و گداز و مستی — یہی دو چار تو ہیں شاملِ اجزائے حیات
ذوقِ الفت کی حقیقت سے مکرنے والو — اک یہی ذوق تو ہے عین تقاضائے حیات
جو نفس ملتی ہے اسے سوزِ غمِ عشق کی آنچ — اور پاتا ہے تجلی رُخِ زیبائے حیات
جس سے بگڑی ہوئی تقدیر بھی بن جاتی ہے — ہے وہی جذب یقیں انجمن آرائے حیات
وقت ہے قافلۂ زیست کا ہلکا سا غبار — یہ مہ و سال ہیں کیا نقش کفِ پائے حیات
جرأت و جوششِ عمل، عزم جنوں کی خیرات — ندرتِ فکر و نظر حاصلِ سودائے حیات
دیکھنے والے اگر دل کی نظر سے دیکھیں — ہر ستم حسن کا ہے حاملِ ایمائے حیات
شاعری اصل میں حصہ ہے اسی کا منشاء — جس کے اشعار ہوں عکسِ رُخِ لیلائے حیات



مشاعرۂ جشنِ جمہوریت

لال قلعہ، دہلی

جناب رشید احمد صدیقی
افتتاحی خطبہ سنا رہے ہیں

شری لال بہادر شاستری
صدارتی تقریر کر رہے ہیں







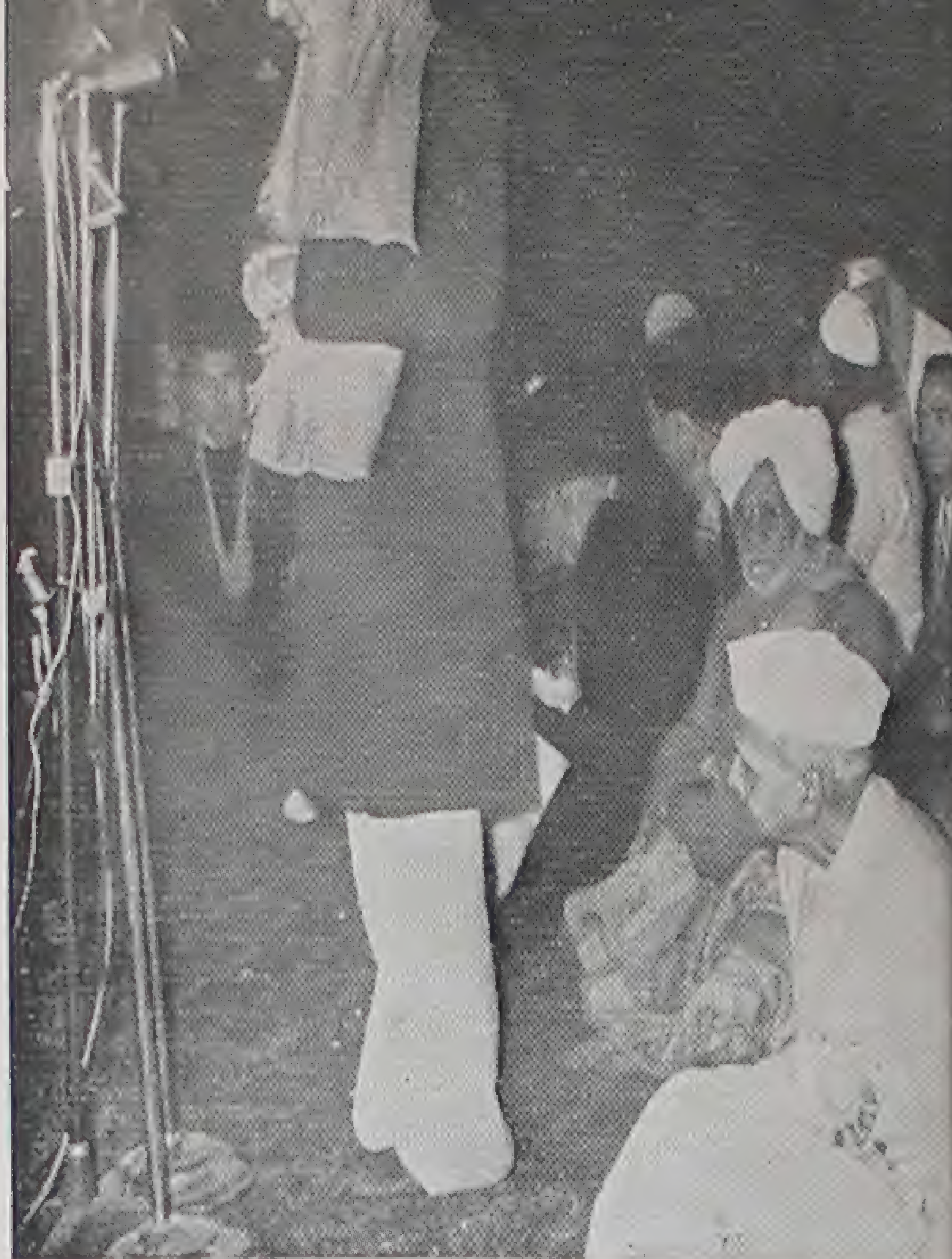
جناب فراق گورکھپوری اپنا کلام سُنا رہے ہیں

جناب گوپی

جناب نشور واحدی اپنی غزل سنا رہے ہیں







کنوینر مشاعرہ کمیٹی صدارتی تقریر کے لئے جناب صدر سے گزارش کر رہے ہیں



جناب ادیب لکھنوی اپنا کلام سنا رہے ہیں



جناب دل لکھنوی اپنی غزل پڑھ رہے ہیں

سامعین



جناب بیکل اتساہی اپنا کلام سنا رہے ہیں



صدر جمہوریہ

نے چین سے لڑائی میں بہادری دکھانے والوں کو

پرم ویر چکر

کا اعزاز دیا



شہید صوبیدار جوگندر سنگھ کا میڈل، صدر جمہوریہ ان کی
دھرم پتنی شریمتی گردیال کور کو دے رہے ہیں



صدر جمہوریہ میجر دھن سنگھ تھاپا کو پرم ویر چکر
کا میڈل دینے کے بعد مصافحہ کر رہے ہیں



صدر جمہوریہ میجر شیطان سنگھ (شہید) کا میڈل
ان کی دھرم پتنی کو دے رہے ہیں

ساغر نظامی

غزل

اے ہم نوا خودی کو کروں کس طرح بلند — جکڑا ہوا ہے جبرِ مشیّت سے بند بند
اک جانِ زار اور دو عالم کی قید و بند — دنیا بھی اک کمند مشیّت بھی اک کمند
جیسے یہ کائنات ہے اک طنزِ مستقل — ہر وقت زندگی کے لبوں پہ ہے زہرخند
ہو اُس سے کس طرح مرے دل کا معاملہ — دنیا خرد پرست محبّت جنوں پسند
دشمن سے بھی گمان نہیں اس گزند کا — ہوتا ہے آدمی کو خود اپنے سے جو گزند
آئینِ مے کشی میں طلب اک گناہ ہے — پیتے نہیں ہیں مانگ کے رندانِ سربلند
عشقِ شرابِ کہنہ پرستارئ جمال — سُن اے مریضِ غم کہ یہ نسخہ ہے سود مند
یاں دورِ جام، نغمۂ مطرب، ہجومِ حسن — ناصح کے پاس کیا ہے فقط اک خروشِ پند
اے تلخئ حیات سراپا نہ اس کا پوچھ — رفتارِ جامِ مے ہے تو گفتارِ موجِ قند
سر جس کی آرزو میں جھکانا پڑے مجھے — وہ تاج بھی نہیں ہے مری جاں مجھے پسند
جس میں نہ ہو حیات کی تلخی کی چاشنی — وہ عیشِ جاوداں بھی نہیں ہے مجھے پسند

میری نوا کی گونج ہوا از شرق تا بہ غرب
پیرو ہو ماسکو ہو وہ پیرس کہ تاشقند

مصنف :- اُرُو

مترجم :- ہنس راج رہبر

(ملیالم کہانی)

زمین کی پیاس

سنٹرل جیل کے باہر ایک بوڑھا جیل کی دیوار کے سہارے ڈگمگاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی عمر ستّر سال سے زیادہ ہوگی۔ پیشانی کشادہ جس پر جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں۔ مونچھوں کے بال پکے ہوئے اور گھنے، ناک لمبی۔ گالوں پر بڑھاپے نے دراڑیں بنا رکھی تھیں۔ ادھ ننگا، گوشت کے لوندے کمان کی ڈھیلی ڈوری کی طرح لٹک رہے تھے۔

دھوپ کیا تھی گویا چنگاریاں برس رہی تھیں۔ ایسی کڑی دھوپ میں وہ ڈگمگاتا چلا جا رہا تھا۔ نیچے دھرتی تپ رہی تھی اور اوپر آسمان۔ سائے کا کہیں نشان نہیں تھا۔ کوّے کے بیٹھنے تک کو سایہ نہیں تھا۔ وہ کہیں دور برگد کی ٹہنیوں پر بیٹھے کائیں، کائیں کر رہے تھے۔

بوڑھا کانپتا، ڈگمگاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ کمر کی پھٹی میلی لنگی ہوا میں پھہرا رہی تھی۔ کبھی اس کا سر پسینے سے تربتر اس کے پاؤں پر لپٹ جاتا تھا۔ تب وہ ذرا رک جاتا اور گھبرایا ہوا سا اوپر دیکھنے لگتا۔ گلے سے کراہنے کی سسکی نما آواز نکلتی۔ "ے... وا... جے... گا۔"...

پھر وہ پہلے کی طرح ڈگمگاتا ہوا آگے بڑھتا۔

تین دن سے وہ متواتر اس طرح چل رہا تھا۔ بہت دور کسی گاؤں سے وہ صبح تڑکے نکل پڑا تھا۔ کھیتوں اور نالوں کے پار لوگوں نے اسے چلتے ہوئے دیکھا تو پوچھ بیٹھے:

"کہاں نکلے علی کاکا؟"

اس نے انہیں جواب نہیں دیا یا ان کا سوال ہی نہیں سنا۔

زمین نے اپنی شدّت سے سُنا سا اس کے پاؤں کی آہٹ سے پوچھا "کہاں جا رہی ہو مجھے چھوڑ کر؟"

بوڑھے نے نہ کسی کا سوال سنا، نہ کسی کو جواب دیا۔ وہ بدستور آگے بڑھتا رہا۔ کوئی آواز اس کے کانوں میں گھس نہیں پاتی تھی۔ اس کا باطن یوں دہک رہا تھا جیسے کسی عالیشان مکان کو آگ لگی ہو۔ حسرتیں، امیدیں، خواہشیں سب جل کر خاک ہو رہی تھیں۔ صرف دکھ درد کا گہرا دھواں چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اور ماحول تاریک تھا۔ اس مایوسی اور تاریکی میں ایک ننھا سا کھڑا دھرو تارے کی مانند علی کی آنکھوں کے سامنے چمک رہا تھا۔

بوڑھا ماضی کی یادوں میں اُلجھ رہا تھا۔ اسے وہ زمانہ اب بھی یاد ہے جب اس کے والد نے کھیتی شروع کی تھی۔ اس وقت وہ ایک نادان لڑکا تھا۔ بیل چراتا، ان کے لئے گھاس پھونس کاٹ لاتا، دوکان سے سودا خریدنے میں ماں کی مدد کرتا۔ یہی اس کا کام تھا۔ جب کبھی مولوی تنگ کرتا تو قرآن شریف پڑھنے بیٹھ جاتا۔ اس کا باپ ایک گاڑیبان تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے پہاڑی کے دامن میں تھوڑی سی زمین لگان پر لے لی۔ لوگوں نے رائے ظاہر کی کہ پاگل ہو گیا ہے۔ اس پتھریلی زمین میں وہ کس ہاتھی کو پیدا کرے گا —؟ باپ نے یہ سب سنا مگر اپنے ارادے میں دراڑ نہیں آنے دی۔ دل میں شک کو اُبھرنے نہیں دیا۔ اس نے لوگوں کو جو جواب دیا علی کے کانوں میں وہ اب بھی گونج رہا ہے۔ "ارے مٹّی اور انسان ٹھیک کرنے سے ٹھیک ہو جاتے ہیں"۔ اس نے جو کچھ کہا کر کے دکھا دیا۔

گاڑی کا کام ختم کر کے وہ جلد ہی گھر پہنچتا۔ بیلوں کو دانہ پانی دیتا اور

اس دوران میں اس کی بیوی تھوڑی سی کنجی لے آتی۔ وہ اسے پی لیتا اور کدال کندھے پر رکھ کر زمین کی طرف چل پڑتا جب تک اندھیرا نہ ہو جاتا وہ کھودتا رہتا۔ جہاں پہلے کدال نہ لگتی تھی اب وہ زمین نرم پڑنے لگی۔ بیج بویا گیا، کونپلیں نکلنے لگیں۔

پہلی کٹائی کا دن علی کو اب بھی یاد ہے۔ اس کی ماں خوشی کے مارے اچھل پڑی تھی اور اس نے کہا تھا۔ "جو محنت کرے گا خدا اُسے کیوں نہیں دے گا۔"

'جمنی' (زمیندار) کو دھان کا لگان دینے کے بعد جو کچھ بچ رہتا اس سے اس کنبے کا گزارا مشکل سے سال کے چار یا پانچ مہینے تک ہو جاتا۔ اس کے بعد پوال کوٹنے سے جو دھان نکلتا اس سے ایک اور مہینے تک علی کی ماں کسی نہ کسی طرح کھینچ لیتی۔ اس کے بعد گاڑی کی مزدوری سے گزارہ چلانا پڑتا۔

علی جب سیانا ہوا تو اس کے باپ کو کچھ چین ملا۔ کیونکہ کھیت میں منیڈ لگانے اور ہلا جوتنے میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ دونوں نے مل کر محنت شروع کی۔ علی تین میل دور جنگل میں جاتا اور کھاد کے لئے پودے وغیرہ کاٹ کر سر پر اٹھا لاتا۔ گوبر اور راکھ اکھٹی کر کے لے آتا۔ رفتہ رفتہ ان دونوں کی محنت سے زمین زرخیز بنی اور پیداوار بھی بڑھنے لگی۔ اب سال میں قریب آٹھ مہینے کا گزارہ ہو جاتا تھا۔ ہرے بھرے کھیت کو دیکھ کر جو اس کے باپ نے کہا تھا علی کو اب بھی یاد ہے "یہی زمین بچوں کا سہارا بنے گی۔"

باپ بیٹے دونوں نے مل کر اور زیادہ محنت کی۔ علی کی ماں بھی حسب الوسع مدد کرتی رہی۔ زمین ایسی اپجاؤ ہوئی کہ سال میں ایک کے بدلے دو مرتبہ فصل تیار ہونے لگی تب جمنی کی آنکھیں کھلیں اور مطالبہ کیا کہ لگان بڑھاؤ۔

یہ سن کر علی کو اب بھی یاد ہے اسے بے حد غصہ آیا تھا اور اس نے کہا تھا۔ "زمین پرتی پڑی تھی، کسی نے محنت کی اور اس پر اناج اُگایا تو جمنی کہاں سے ٹپک پڑا لگان بڑھانے۔"

مگر باپ نے اسے سمجھایا۔ "ایسا مت کہو وہ جیسے کہتے ہیں ہمیں کرنا چاہیئے۔ اگر یہ زمین نہ ہوتی تو ہم کیا کرتے اور خدا نے چاہا تو بنتے بگڑتے کتنی دیر لگتی ہے۔"

یہ فلسفہ علی کو پسند نہیں آیا تھا مگر پھر بھی وہ اپنے باپ کے خلاف جانے کو تیار نہیں تھا۔ اس لئے جتنا لگان جمنی نے مانگا قرار نامہ لکھ کر دے دیا۔

جمنی بہت خوش ہوا اور اقرار نامہ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔۔۔ "دیکھو علی، اصل میں اس کی ضرورت نہیں۔ میں خوب جانتا ہوں۔ تم وفادار ہو۔ ایماندار ہو، نیک ہو۔ پھر بھی دنیا کیا کہے گی۔ مجھے یہ دیکھنا ہی ہے۔"

اس پر علی کا باپ بھی خوش ہو گیا، بات جو بنا کسی جھگڑے کے طے ہو گئی تھی۔

وہ برابر کھیتی کرتا رہا اور لگان چکاتا رہا۔

چار سال گزر گئے پانچویں سال کے اخیر میں علی کا نکاح ہوا۔ ماں اور باپ بوڑھے ہو گئے تھے۔ گھر کو سنبھالنے والا کوئی چاہیئے ہی تھا۔ نکاح کے دوسرے ہی سال علی کی بیوی نے ایک بچے کو جنم دیا۔

خوشی کے وہ دن یاد آتے ہی علی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اُن میں آنسو جھلکنے لگے۔

علی کا باپ ہمیشہ بچے کو اپنی گود میں لئے رہتا اور پچکارتا: "دادا کا پیارا بچو...... ہے نا تو...... ذرا مسکراؤ تو...... ارے اس کا پیٹ تو دیکھو...... بالکل خالی ہے...... تجھے دادا دے گا......"

گھر میں لاڈ پیار کا ماحول تھا۔ علی کو اس کڑی دھوپ میں بھی یاد ہے۔ باپ نے ایک مرتبہ کہا تھا...... ارے اسے بڑا ہونے دو سب کچھ ٹھیک کر دے گا۔"

یہ سن کر علی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ جاتی اور بظاہر ان سنی کر کے باہر چلا جاتا۔ اس کی بیوی دروازے کی آڑ میں کھڑی سب کچھ سنتی اور بہت خوش ہوتی۔

لیکن لاڈ پیار سے پلنے کے بعد آخر بنا کیا؟...... اُف یہ خیال آتے ہی علی کا دل پھٹ سا جاتا ہے۔ گلے تک جلن محسوس ہوتی ہے۔

دوپہر کی دھوپ تیز ہوتی جا رہی تھی پھر بھی علی چل رہا تھا۔ ٹھہر نہیں سکتا تھا اس لیے وہ چل رہا تھا۔

ایک سال بعد علی کی بیوی نے ایک بچی کو جنم دیا۔ وہ ڈیڑھ سال کی ہوئی تو ایک اور لڑکی کو جنم دیا۔ ایک سال بعد ایک اور کو۔ یوں وہ ایک لڑکے اور تین لڑکیوں کی ماں بن گئی۔ کنبے کے افراد بڑھے لیکن کمائی اتنی ہی تھی۔ محنت کرنے والے کم تھے اور کھانے والے زیادہ۔ مگر اس کے باوجود علی ذرا بھی مایوس نہیں ہوا۔ فولادی بازو تھے اس کے

محنت کرنے کی سکت بھی تھی اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر کام نہیں کریں گے تو بھوکے مریں گے۔ کھیت کو اور چوڑا کر دیا۔ گھر کے چاروں طرف جو زمین تھی وہاں بھی ساگ سبزیاں پیدا کرنے لگے۔ اس کے علاوہ وہ گاڑی چلانے بھی جایا کرتا۔ اتنی محنت کرکے ہی وہ اتنے بڑے کنبے اور بیلوں کو زندہ رکھ سکا۔ یہ سب علی کو یاد آتا ہے۔

"اتنی محنت کریں گے تو کتنے دن چلے گا؟" علی کی بیوی کبھی کبھی تاکید کرتی۔ علی کو معلوم تھا کہ اس کی بیوی بھی گھر میں بے کار نہیں بیٹھتی تھی۔ وہ صبح سے شام تک چیونٹی کی طرح کام کرتی تھی۔ کنبے کو سنبھالنے کا سارا بوجھ اس کے کندھوں پر تھا۔ ایک دن وہ اپنے شوہر سے کہنے لگی۔ "دیکھو اگر جاؤ گے تو یہ سب کچھ ڈھے جائے گا۔ سمجھے نہیں؟"

اس روز علی نے اپنی بیوی کی بات نہیں سنی تھی نہ مانی تھی۔ محنت، ہر دم محنت! صرف یہی ایک اس کی دُھن تھی۔ اس میں وہ کامیاب ہو جاتا تھا مگر اسی دوران ایک اور بلا آپڑی۔ جنمی بدلا۔ اس پرانے خاندان کی عالیشان عمارت گر پڑی اور اس کی جگہ سولے چھوٹے چھوٹے گھر بنے۔ اس گھر کے سب افراد کاہل اور نکمّے نکلے۔ اپنی خاندانی روایت کے متعلق شیخی بگھارنے میں وہ ہوشیار تھے مگر کام کرنے میں صفر، عیش و آرام میں سب سے آگے۔ عیاشی کے سامان سے گھر بھر دیا۔ سب کے سب ہمیشہ موٹر سائیکل پر سوار اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر۔ زمین جائداد تھوڑا تھوڑا کرکے ہاتھ سے نکلنے لگی۔ آخر ان ساری زمین جائداد کا مالک محمد حاجی بن گیا جس نے لکڑی کے بیوپار سے روپیہ جمع کیا تھا۔

جب جنمی بدلا تو علی کو بڑا افسوس ہوا۔ وہ بولا: "بُرا ہوا۔ ایک پُرانے خاندان کا ملیامیٹ ہو گیا۔"

یہ بات اس کے بیٹے کو پسند نہیں آئی۔ اس نے کہا۔ "ابا ایسا کیوں؟ اب تو ہمارا جنمی ایک مسلمان ہے نا؟"

"مسلمان ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ لگان تو دینا ہی ہوگا۔"

"اپنے آدمی کو دینے میں ذرا آگے پیچھے بھی ہو سکتا ہے۔" بیٹے نے دلیل پیش کی۔

باپ بیٹے میں یہ گفتگو ہوئے ایک ہفتہ بھی گزرنے نہیں پایا تھا کہ حاجی نے علی کو بلوا بھیجا۔ نئے مالک سے ملنا ضروری ہے۔ یہی بیٹے کی رائے تھی۔ چناں چہ علی گھٹنے کے مریض اپنے باپ کے پاس گیا۔

"جاؤ بیٹا۔ وہ ہمارا مالک ہے نا۔"

علی اپنے نئے آقا کے پاس پہنچا۔ سر کھجاتا ہوا وہ حاجی کے روبرو کھڑا تھا۔

"کیوں علی؟"

"آپ نے بلوایا تھا۔"

"اوہ۔ اس لیے۔" حاجی نے یاد کرتے ہوئے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا: "اس زمین کی بات کرنے کے لیے ہم نے تمھیں بلوا بھیجا تھا۔"

"ہم لوگ پہلے کی طرح چلتے رہنے کو تیار ہیں۔" علی نے جواب دیا۔

حاجی چرٹ کی راکھ شان سے جھاڑتے ہوئے بولا۔ "وہ تو تم کرو گے ہی یہ میں جانتا ہوں۔ مگر ہم نے اس میں اتنا روپیہ اس لیے لگایا ہے کہ دو چار پیسے زیادہ ملیں۔ کیا سمجھے؟"

میرے پاس دھان کا ایک دانہ بھی نہیں بچا، سرکار۔ اس بار کی فصل سے یہاں دینے کے بعد جو کچھ بچے گا وہی ہم گھر لے جائیں گے۔" علی نے وعدہ کیا۔

"وہ کافی نہیں ہے۔" چُرٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے حاجی بولا: "وہ زمین ہمیں دے دو۔ ہم خود کھیتی کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں سمجھے؟"

یہ سن کر علی سُن سا رہ گیا۔

"ایسا نہ کہیئے سرکار۔" علی نے منّت کی۔

"تم کیا بولتے ہو علی! تم سے زیادہ دینے کے لیے ہمارے پاس آدمی تیار ہے۔ مگر ہم خود ہل جوتنے کے لیے یہ زمین تم سے لے رہے ہیں۔ کیوں! سمجھے؟"

"ایسا نہ کہیے سرکار۔"

اس کا مطلب ہے کہ اپنا پیسہ خرچ کر دوں اور نقصان اٹھاؤں؟ حاجی طیش میں آکر بولا۔

علی کی درخواست پر حاجی نے توجہ نہیں دی وہ اپنے نقصان کے بارے میں تقریر جھاڑتا رہا۔

"سرکار کو نقصان ہو یہ میں نہیں چاہتا۔" علی نے درمیان میں کہا "لیکن آپ مجھ سے زمین نہ لیں یہ میری عرض ہے۔"

"ٹھیک، ہم سوچیں گے، کل آنا۔"

دوسرے دن بھی علی گیا۔ حاجی کے گھر کچھ کچھ بھیڑ تھی۔ لوگ کاروباری باتیں کر رہے تھے۔ جب ان کا کام ختم ہو گیا تو وہ سب چلے گئے۔ تب تک علی برآمدے کے ایک کونے میں کھڑا سر کھجلاتا رہا۔ بھیڑ چھٹ جانے کے بعد وہ مالک کے پاس گیا۔

مالک نے سر اُٹھایا تو دیکھا کہ سامنے علی کھڑا ہے — "کیوں، اچھا بتاؤ تمھیں کیا چاہیئے، تم نے کیا فیصلہ کیا اپنی زمین کے متعلق!"

"زمین چھوڑنے کو مت کہیئے سرکار" علی گڑگڑایا۔

حاجی نے چرٹ کا ایک دم لگایا اور بولا "تم مسلمان ہو۔ ہم بھی مسلمان ہیں اس لیے ہم سے تمھارا بھلا ہونا چاہیئے نا! لوگ پینتیس پراہ (اناج کا ایک ناپ) دینے کو تیار ہیں۔ تم ایک کام کرو۔ تیس پراہ دے دو۔ پانچ کا فرق ہے۔ پروا نہیں۔ تم مسلمان ہونا؟ میں اس سال حج کو گیا تو کتنا پیسہ خرچ ہو گیا تھا۔

علی حیران و پریشان یہ سب سن رہا تھا۔

"اس میں کمی بیشی کرنے کی بات ہی نہیں۔" حاجی نے صاف صاف اپنا آخری فیصلہ سنایا۔ "اگر منظور ہے تو کام کرو، نہیں تو زمین چھوڑ دو۔"

حاجی نے چرٹ فرش پر رگڑ کر بجھا دیا اور ٹکڑے کو کان میں لگا کر اندر چلا گیا۔

علی تذبذب میں پڑ گیا۔ اب تک وہ جو کچھ دیتا آ رہا تھا وہی وہ مشکل سے دے سکتا تھا۔ اس سے زیادہ وہ اور کہاں سے لائے گا اور اپنے گھر کے لیے کیا بچا پائے گا سو الگ۔ نہیں دے گا...... نہیں دے گا..... تو..... زمین ہاتھ سے چلی جائے گی۔ اُف! یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا، چاہے ایک مسلمان اپنی بیوی کو بھلے ہی طلاق دے دے مگر ایک کسان اپنی زمین نہیں چھوڑ سکتا۔

"اب چھوڑ دینے کا کیا مطلب؟" بیمار باپ نے علی کو سمجھایا اور تیس پراہ زیادہ لگان دینے کی شرط پر اس سے دوسرا پٹا نامہ لکھوایا گیا اور کھیتی کا کام نئے سرے سے شروع ہوا۔

علی کا لڑکا سیانا ہو رہا تھا۔ اس کے لیے یہ خوشی کی بات تھی کیونکہ ہل چلانے اور بیج بونے میں اس سے مدد ملے گی۔

اس دوران میں علی کے ماں باپ چل بسے۔ خاندانی عزت اور رواج کے مطابق ان کی تجہیز و تکفین کرنی تھی اس لیے علی کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ سب کو قرض کے پیسے سے کرنا پڑا۔

فصل دیکھی تو علی کا دل بھی ٹھنڈا ہوا۔ اگلی کٹائی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے سوچا۔

لیکن ایک اور مصیبت آ گئی۔ بڑی لڑکی سیانی ہو گئی۔ علی کی بیوی کا خیال تھا کہ اسے اب گھر میں رکھنا مناسب نہیں ہے۔ شادی کی تیاری ہونے لگی۔ پھر قرض لینا پڑا۔ جوں توں کر کے لڑکی کا بیاہ ہوا مگر مصیبت نہیں ٹلی۔ علی کا ایک بیل مر گیا۔ بیل خریدے بغیر علی کا کام کیسے چلے گا؟ اور بیل خریدنے کے لئے پیسہ کہاں سے آئے گا؟ قرض لینا ہی پڑا، مطلب یہ کہ فصل کاٹی گئی تو قرض چکانے ہی میں سارا دھان تل گیا اور اس سال کا لگان بھی باقی رہ گیا۔

"علی، تم نے کیا سوچ رکھا ہے؟" حاجی نے پوچھا۔

"اگلی فصل پر دے دوں گا۔" علی نے وثوق سے کہا۔

اگلی فصل بھی کاٹی گئی مگر وہ اس سال کا لگان دے پایا۔ اس نے طے کیا کہ آئندہ سال پورا ادا کر دوں گا۔ مگر اس بار ساری فصل ہی سوکھ گئی اور علی کی رہی سہی آس بھی ٹوٹ گئی۔

"اب حاجی سے کیا کہوں؟" علی نے بیٹے سے پوچھا۔

"میں بولوں گا، وہ مسلمان ہے نا؟" بیٹے نے کہا۔

مگر بیٹے کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ حاجی کو اسلام نہیں دھان چاہیئے۔"

"ویسے ہی دو سال کا دھان باقی رہ گیا ہے۔ زمین چھوڑ دو نا۔" حاجی نے علی کو سمجھایا۔

علی اور اس کا بیٹا اس کے لیے تیار نہیں تھے۔

حاجی معاملہ عدالت میں لے گیا۔ فیصلہ حاجی کے حق میں ہوا۔ اگلی فصل کی ضبطی کا فرمان عدالت سے جاری ہو گیا۔

علی کو اب بھی یاد ہے فصل پک گئی تھی۔ کٹائی کا وقت آ گیا تھا اس دن عدالت سے کچھ لوگ آئے اور فصل کاٹنے لگے۔ باپ بیٹا کھڑے کھڑے دیکھتے رہے۔ انھیں محسوس ہوا کہ ان کے جسم سے ماس نوچا جا رہا

ہے جو زور پر جھپٹنے والے باز کو دیکھ کر مرغی جیسے 'کٹ کٹ' کرتی ہے۔ پر پھڑپھڑاتی ہے بالکل وہی حالت بیٹے کی تھی۔

"ابا جان، میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔" وہ دو قدم آگے بڑھ گیا "ان آنکھوں نے زمین دیکھی۔ اس کے بعد ہری بھری فصل لہرائی۔ اسے پکتے دیکھا اور اب وہی آنکھیں کتوں کو لوٹتے دیکھ رہی ہیں ...."

"یہ سب خدا کا کرشمہ ہے۔ صبر کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" بوڑھے باپ نے بیٹے کو سمجھایا۔

"یہ مسلمان نہیں، کافر بھی نہیں، شیطان ہے۔"

بیٹے اور آگے بڑھنا چاہا مگر باپ نے اسے روکا۔ علی ڈر رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا مگر کچھ نہیں ہوا۔

کٹائی ختم ہوئی۔ تمام دھان وہ اٹھا کر لے گئے۔

علی نے خالی کھیت دیکھا وہ اس کی سونی زندگی سے مشابہ تھا وہ وہاں کتنی دیر کھڑا رہا۔ کہنا مشکل ہے، اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

علی آج بھی یاد کر رہا ہے۔ اس دن باپ بیٹا آپس میں نہیں بولے۔ اس دن گھر میں کوئی بھی نہیں بولا اور نہ کسی نے کچھ سنا۔ ایسا ماحول تھا جیسے کسی کی موت واقع ہوئی ہو۔

"علی کا کا کی فصل وہ لوگ لے گئے۔" دوسرے دن لوگوں کی یہ بات علی کے کانوں میں پڑی۔ کسان کے لیے یہ ہتک کی بات تھی، اس نے ہل جوتا، بیج بویا، کھیتی کی سنچائی نرائی کی، بچوں کی طرح پالا پوسا، مگر کٹائی کے وقت آئے یہ کتے .... ہتک نہیں تو اور کیا؟ .... اس نے دانت پیسے .... اس نے طے کیا کہ آگے وہ زمین سے کوئی واسطہ نہیں رکھے گا۔

"بس اتنا کافی ہے اس سے اچھا ہے حجامت کرنا۔" علی اس حد تک مایوس ہو چکا تھا۔

غصے میں بھرا ابھرا ہتھیلی پہ تھامے بیٹا یہ الفاظ سن رہا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ پانی کی پہلی بوندیں پڑتے ہی زمین گیلی اور نرم ہو گئی۔ دھرتی سے سوندھی سوندھی خوشبو نکلی۔ تب کسان سے رہا نہیں گیا۔ اس کے پاؤں کھیت کی طرف بڑھے۔

"کیا پاگل ہو گئے ہو؟" بیٹے نے پوچھا تھا۔

"ارے بیٹا، تم کیا جانو۔ دھرتی کبھی دغا نہیں دے گی۔ ہم اس دھرتی سے پیدا ہوئے۔ دھرتی ہماری ماں ہے۔" بیٹے کو اس نے سمجھایا۔

"کم سے کم لگان تو چکا دیں گے۔" کھیتی کرتے وقت علی کا یہی خیال تھا۔

کھیت میں پھر ہریالی چھائی۔ علی کے من میں اجالا پھیلا۔

"اس سال فصل بُری نہیں ہے کیا؟" علی کی بیوی نے پوچھا۔

"چپ رہو، کچھ نہ بولو۔"

"اوہ، مجھے اپنے بچوں کی فکر پڑی ہے۔ کٹائی ہوئی تو ان کو دے سکوں گی؟ کتنے دن ہوئے انھیں پیٹ بھر کر کھلائے۔"

کھیت کے ہونٹ لال ہوتے دیکھ کر علی کھیت کے پاس بیٹھتا اور لوٹتے ڈالیوں پر۔

آخر فصل کاٹنے کا وقت آ گیا۔ علی کے دل میں خوشی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

بیٹا بولا۔ "اس مرتبہ حاجی جھگڑا نہیں کرے گا۔"

مگر حاجی کی بھوک مٹی نہیں تھی۔ ایک ہفتہ کے اندر عدالت سے لوگ آئے کٹائی کے لیے۔

گاڑی چلاتا، تھکا ہارا، علی کا بیٹا دوپہر کو جب گھر پہنچا تو دیکھا کہ کٹائی ہو رہی ہے۔ اس کے سارے جسم میں چیونٹیاں دوڑنے لگیں۔ وہ غصے سے کانپنے لگا۔ اس نے قریب پڑا ہوا ہل کا ڈنڈا اٹھایا اور کھیت کی طرف لپکا۔

"نکل جاؤ یہاں سے۔" ایک آواز گونجی۔

امین اس کے پاس جا کر بولا۔ "دیکھو، یہ عدالت کا معاملہ ہے کھیل نہیں۔"

"دھت تیری۔ نکل جاؤ۔" ایک گرج سنائی دی۔

اس کے بعد کیا ہوا کسی کو معلوم نہیں کسی کے کراہنے کی آواز سنائی پڑی اور لوگوں کے بھاگنے بلانے کی آواز ہوئی۔

"سب کے سب نکل جاؤ نہیں تو میں ...."

علی کو اب تک یہ منظر یاد ہے - اس کی یاد آتے ہی اس کے جسم میں جھرجھری پیدا ہو جاتی ہے - امین کھیت میں چت پڑا تھا - اس کا سارا جسم پھٹ گیا تھا اور خون بہہ رہا تھا - دانت ٹوٹ چکے تھے اور آنکھوں کی پتلیاں اُبھری ہوئی تھیں - اس کے کاغذات خون میں لت پت ہوا میں اڑ رہے تھے - علی ہل کا ڈنڈا ہاتھ میں لئے بُت کی طرح ساکت و صامت کھڑا تھا۔

"ارے بیٹا، تم نے قتل کر دیا ہے -" علی کی بیوی کے منہ سے یہ الفاظ نکلے اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

ہوش آنے پر معلوم ہوا کہ بیٹا پولیس کی حوالات میں ہے -

وہ بوڑھا آگے بڑھ رہا تھا ....

"بیٹا، میں نے تمھیں کیسے پالا پوسا تھا - علی نے سسکیاں بھریں چلچلاتی دھوپ اور تپتی دھرتی کا اسے احساس تک نہیں تھا - وہ کانپتا آگے بڑھ رہا تھا - اسے لگ رہا تھا کہ زمین چکر کاٹ رہی ہے - اس سے آگے نہیں چلا جا رہا تھا - وہ بیٹھ گیا پتھر کی اس بھاری دیوار کے سہارے - بے رحم دھوپ اس وقت بھی اس کے جسم پر چنگاریاں اگل رہی تھی - چہرے سے پسینہ بہ رہا تھا - اس کی بوندیں بوڑھے کی چھاتی کے پکے بالوں پر ٹپ ٹپ گر رہی تھیں جیسے اوس کی بوندیں سوکھی گھاس پر پڑ رہی ہوں - وہ کراہ رہا تھا -

"بیٹا، میرا پیارا بیٹا!"

اس کا سر دیوار سے رگڑتے رگڑتے نیچے ڈھلک گیا -

ایک آدمی نے جو دور سے آ رہا تھا بوڑھے کو گرتے دیکھا - وہ جیل کا جلّاد تھا - وہ علی کے قریب ہی آ گیا -

"ہو - ہو -" اس نے بلایا -

بوڑھے کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا -

"او - رے -" اس نے پھر بلایا -

کوئی جواب نہیں ملا -

اس نے قریب جا کر دیکھا - چھاتی پر اُنگلی رکھی - دل اب بھی دھڑک رہا تھا - اس نے اپنا چھاتہ کھولا تاکہ بوڑھے کے چہرے پر دھوپ نہ پڑے - اس نے چاروں طرف دیکھا کوئی نہیں تھا - صرف ایک طرف دو کوّے کائیں کائیں کرتے اڑ گئے - اس نے ایک دو منٹ سوچا - پھر چھاتہ بند کیا - بوڑھے کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھا لیا اور آہستہ آہستہ چلنے لگا - تھوڑی دور جا کر پیڑ کے سائے میں لٹا دیا - قریب کے گھر سے تھوڑا سا پانی لا کر چہرے پر چھڑک دیا - بوڑھے کی آنکھیں ذرا کھلیں -

"بیٹا، میرا پیارا ...."

"کیا چاہتے ہو؟"

"پا ..... نی ...."

اس نے سوکھے منہ میں پانی ڈال دیا - علی نے ایک مرتبہ اور آنکھیں کھولیں -

"بیٹا تم کہاں ہو؟"

پھر آنکھیں مند گئیں - ایک دو بار سانس اوپر نیچے چلی جیسے کھیت میں ہل چل رہا ہو - گردن ایک طرف لڑھک گئی -

جلّاد نے ایک ٹھنڈی سانس لی جس نے ہزاروں کو پھانسی پر لٹکایا تھا -

اس ہاتھ نے اس کے باپ کے ہونٹوں پر پانی ڈالا جس نے بیٹے کو پھانسی پر لٹکایا تھا - مگر پانی اندر نہیں گیا - ایک طرف کو بہ گیا -

---

گزارش

غیر مطبوعہ مضامین وغیرہ اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں - جبکہ ان کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ بھیجے جائیں - (ادارہ)

حبیب احمد صدیقی

غزل

جب سے دل میں غمِ جاناں نہ رہا
عصمتِ دل کا نگہباں نہ رہا

شمعِ دل بجھتے ہی دنیا بدلی
وہ گلستاں وہ بیاباں نہ رہا

دیکھنے آئے ہیں بربادیٔ دل
خونِ دل جب سرِ مژگاں نہ رہا

اپنا جو حال ہوا خیر ہوا
شکر ہے آپ کا احساں نہ رہا

اپنے ایمان پہ کیا فخر کریں
جب کوئی دشمنِ ایماں نہ رہا

سہل سمجھے تھے بہت ترکِ طلب
اب تو یہ کام بھی آساں نہ رہا

سمجھے تھے خوابِ پریشاں جس کو
وہ فقط خوابِ پریشاں نہ رہا

رونقِ زیست تھی جس کے دم سے
حیف اب وہ دلِ ناداں نہ رہا

اس قدر مردہ دلی کیوں ہمدم
کیا کوئی چشمۂ حیواں نہ رہا

اب بتوں میں نہیں وہ عشوہ گری
کیا کوئی صاحبِ ایماں نہ رہا

دامن اور دل کا چلے ہو سینے
یاد کیا اپنا گریباں نہ رہا

لطیف حسین ادیب

للتا پرشاد لئیق

نام للتا پرشاد تخلص لئیق قوم کے کائستھ قدیمی ساکن سنڈیلہ ضلع ہردوئی کے تھے۔ آپ کے والد کا نام موتی لال تھا۔ پرورش آپ کے نانا منشی الیشری پرشاد نے کی جو کان پور کے ساکن تھے۔ آپ کمسریٹ آگرہ، بریلی اور انبالہ میں بعہدہ سرشتہ داری فائز رہے[1]۔

لئیق کی پیدائش ۱۸۲۷ء میں ہوئی۔ ان کی تاریخ پیدائش کا ثبوت ایک قطعہ سے ملتا ہے جو انھوں نے اپنے والدین کی وفات پر لکھا تھا:

مری والدہ اور والد بہم	گئے اس جہاں سے بدار البقا
میں تھا یازدہ سال اس وقت میں	کہ والا نے فرمائی دل سے دعا
لئیق اس کا سمبت ملک نے لغم	کہا وائے اب کیا غضب ہو گیا

۱۸۹۵ سمبت

۱۸۹۵ سمبت مطابق ۱۸۳۸ء اور اس میں گیارہ سال کم کئے تو ۱۸۲۷ء نکل آتے ہیں[2]۔

نیاز علی پریشاں اکبرآبادی کے بیان کے مطابق لئیق کتب درسیہ فارسی اور کچھ عربی و سنسکرت پر حاوی تھے۔ اس مصنف نے ہی لکھا ہے کہ مثنوی پنج قصہ[3]

---

[1] تذکرۂ نادر ص ۱۳۵۔ بہارِ سخن ص ۳۲۳۔ شعر و سخن از نیاز علی پریشاں اکبرآبادی مطبوعہ ۱۸۶۹ء۔ ان تینوں اصحاب نے سنڈیلہ، بریلی، آگرہ اور کانپور کا ذکر کیا ہے۔ میں نے انبالہ کا اضافہ کر دیا کیونکہ لئیق کا اردو دیوان (قلمی) پر درج ہے۔ "تمام شدہ۔ مارچ ۱۸۷۶ء مقام انبالہ چھاؤنی۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں اس کے مطابق لئیق کے بزرگوں کا مسکن سنڈیلہ ضلع ہردوئی تھا ان کی پرورش کان پور میں ہوئی۔ سکونت بریلی میں اور بہ سلسلۂ ملازمت بریلی کے علاوہ آگرہ و انبالہ میں رہے۔ لئیق کے ایک معاصر اور مشہور شاعر نواب عبدالعزیز خاں عزیز بریلوی (۱۲۵۰ھ تا ۱۳۰۹ھ) نے لئیق کو ساکن بریلی ہی لکھا ہے۔ حوالے کے لئے دیکھئے دیوان عزیز مطبوعہ ۱۳۱۰ھ مطبع شوکت اسلام لکھنؤ۔ اس کے علاوہ لئیق کی ایک صاحبزادی کی شادی منشی ہزاری لال پیشکار سے بریلی میں ہوئی تھی جن کی اولاد بہر وجوہ بریلی میں ہی ہیں۔ لئیق کا بریلی میں مکان بنوا کر رہنا بھی ثابت ہے۔

[2] نیاز علی پریشان اکبرآبادی نے شعر و سخن میں لئیق کی عمر ۱۸۶۹ء میں بنتالیس سال درج کی ہے جس سے ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۲۶ء نکلتی ہے۔ ہمارے خیال میں ۱۸۲۷ء کو ہی صحیح ماننا چاہیئے کیونکہ یہ لئیق کے بیان کے مطابق ہے۔

[3] ہمیں مثنوی پنج قصہ نہیں مل سکی۔ مذکورہ دیوان عزیز بریلوی میں تحریر ہے ؎

لئیق سخندان عالی مقام	زمانے میں ہے جن کا مشہور نام
جو کی نظم اردو میں اس نے رقم	سری کشن کے رہس کی دھوم دھام
لکھا سال اتمام میں نے عزیز	ہوا شکر یہ پنج قصہ تمام

۱۲۷۸ھ

اس قطعے سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں (۱) مثنوی پنج قصہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں تمام ہوئی (۲) مثنوی اردو زبان میں ہے (۳) مثنوی میں سری کشن کے رہس کی دھوم دھام ہے۔

دو دیوان فارسی[1] و اردو لیئق کی یادگار ہیں۔

فن شاعری میں لیئق کو تلمذ مولوی فرد سے تھا[2]۔ مولوی فرد کی تعریف میں لیئق نے لکھا ہے ؎

استاد تیرا فرد ہے ... غزل تجھ کو لیئق صاحب دیوان بنا دیا

نیاز علی پریشاں اکبرآبادی نے بھی لیئق کو مولوی فرد کا شاگرد بتایا ہے۔

لیئق کے اردو دیوان کی ترتیب اس طرح ہے:

اول غزلیات جن کی مجموعی تعداد دو سو اڑتالیس ۲۴۸ ہے۔ غزلیات کے بعد رباعیات جن کی تعداد پچیس ہے۔ ان کے بعد ایک دیوان خمسیات جن کی مجموعی تعداد چوالیس ۴۴ ہے۔ خمسیات ان شعراء کی غزلوں پر تضمین کئے گئے ہیں:

برغزل آتش ۵	برغزل ناسخ ۶	برغزل عزیز[3] ۲
برغزل ظفر ۲	برغزل وزیر ۴	برغزل آباد[4] ۲
برغزل جوش[5] ۱	برغزل رند ۴	برغزل انشاء ۲
برغزل غالب ۱	برغزل مہر[1] ۱	برغزل قبول[2] ۵
برغزل رشک ۲	برغزل اختر ۱	برغزل نصیر ۱
برغزل منیر ۱		

خمسیات کے بعد دیوان مسمط ہے۔

مثلث برغزل جرأت	۴ کوئی مرجائیگا صاحب پکا کیا جائیگا
مربع برغزل اعظم[3]	۴ پھر کیا زلف پریشاں نے پریشاں ہم کو
مخمس برغزل معروف[4]	۴ دل نہ پر عاشقی سے در گذرا
مسدس برغزل ذوق	۴ سینہ میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد
مسبع برغزل مسکین[5]	۴ تیغ زن جنبش ابرو ہے خدا خیر کرے
مثمن برغزل آتش	۴ آکے اس بازار میں یوسف کا سودا ہو گیا
متسع برغزل آباد	۴ جوش پر مستی کو لاتی ہے گھٹا برسات کی
معشر برغزل ناسخ	۴ اشک سے مہندی کی ٹٹی کو جلایا چاہیئے

دیوان مسمط کے بعد ایک واسوخت بعنوان 'غمنامۂ لیئق' مسدس کی شکل میں ۱۵۱ بندوں پر مشتمل ہے۔ غمنامۂ لیئق تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۷۶ فصلی مطابق ۱۸۷۰ء مطابق ۱۲۸۶ھ سال نکلتے ہیں۔

واسوخت کے بعد تین قصائد ہیں:

(۱) در مدح راجہ گوالیار ؎ روباہ آسکے نہ غضنفر کے سامنے
رستم کی تاب کیا ہے دلاور کے سامنے

(۲) دربیان حال اقبال و ادبار ؎ شب کو مجھ سے کہا ملک نے پکار
خواب میں کیا ہے جلد ہو بیدار

---

[1] فارسی دیوان بھی فراہم نہ ہو سکا۔ شعر و سخن میں نیاز علی پریشاں اکبرآبادی نے ایک غزل نقل کی ہے جس کا مقطع مندرجہ ذیل ہے

بے گماں ہرگز نیابی گر بجوئی روز و شب
جز لیئق با وفا در خلق رسوائے دگر

[2] "نام خدابخش خاں تخلص فرد ساکن غازی پور مصحفی کو اپنا فارسی کلام دکھاتے اور ان سے ملاقات کی خاطر ہی رنج غربت اٹھا کر لکھنؤ آئے۔"

(ریاض الفصحاء از شیخ غلام ہمدانی مصحفی ص ۲۴۶ مطبوعہ ۱۹۳۴ء)

[3] نواب عبدالعزیز خاں عزیز بریلوی ۱۲۵۰ھ تا ۱۳۰۹ھ

[4] مہدی حسن خاں فرزند غلام جعفر خاں لکھنوی بر ناسخ سخن میگذرانید در ۱۲۲۸ھ پیراہن وجود در برکشید دیوانے گذاشتہ" بزم سخن ص ۴

[5] نواب احمد حسن خاں جوش بریلوی شاگرد ظفریاب خاں راسخ اور نواب عاشور علی خاں عاشور۔ اخیر عمر میں حضرت اسیر لکھنوی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ دو دیوان مسمیٰ بہ گلدستۂ سخن معروف بہ بہارستان جوش اور چمنستان جوش اور قصہ فسانہ جوش یادگار ہیں۔ ۱۲۳۴ء میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ "یادگار ضیغم از عبداللہ خاں ضیغم ص ۲۰۶ جلد دوم۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۱۱ء

---

[1] مرزا حاتم علی لکھنوی خلف مرزا فیض علی از مشاہیر تلامذہ ناسخ است۔ در ۱۲۹۷ھ راہ عدم پیمود دیوانے گذاشتہ" طور کلیم ص ۱۰۲

[2] نواب مہدی علی خاں قبول۔ دیکھئے تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ ص ۳۰۲

[3] مرزا اعظم علی رئیس خلد آباد محلات الہ آباد شاگرد رشید حضرت آتش "تذکرہ نادر ص ۲۸

[4] نواب الہی بخش خاں بن مرزا عارف جان برادر زادۂ شرف الدولہ قاسم جان دہلوی با نصیر دہلوی نسبت تلمذ درست کردہ در پایان عمر از دنیا دل فرہاگستہ بخدا پیوست در ۱۲۴۲ھ از یں خاکداں رخت برلبست دیوانے گذاشتہ بزم سخن ص ۱۰۶

[5] میر عبداللہ مسکین۔ دیکھئے تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ ص ۳۳۱

(۲) درشانِ معشوق — ندا دی فلک نے کہ اے بے خبر
لکھ اوصافِ جاناں کے کچھ زود تر

قصائد کے بعد تاریخی قطعات ہیں۔

اس تفصیل سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ لئیق نے تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی، وافر تعداد میں اشعار لکھے اور ان کا سرمایہ شعری اس فن کے کسی استاذ سے کم نہیں ہے۔

لئیق ناسخ اسکول کے شاعر ہیں۔ اس وقت یہ بات یقیناً خارج از بحث ہے کہ لئیق نے ناسخ کا اتباع کیوں کیا۔ اس طرح ہمارا یہ سوچنا بھی مفید مطلب نہیں ہے کہ ناسخ کا رنگِ شاعری بُرا تھا یا اچھا۔ البتہ اس کے متعلق ضرور غور کرنا ہے کہ لئیق نے ناسخ کی خصوصیات شاعری کتنی کامیابی سے اپنائی ہیں۔ یعنی وہ جس منزل کے راہرو تھے اس تک پہنچ سکے یا راہ میں تھک کر بیٹھ گئے۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ لئیق نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ ناسخ کے اندازِ شاعری کو ترقی دینے کا باعث بنے۔ کیونکہ چند وہ باتیں جو خود ناسخ کے زمانے میں معائب میں داخل تھیں انھوں نے ترک کر دیں۔

ناسخ اور ان کے متبعین کے عصری حالات کچھ ایسے تھے کہ طبیعتوں میں بانکپن تھا۔ چناں چہ شاعری میں بھی بانکپن کا پیدا ہونا ناگزیر ہو گیا۔ دراصل شعر گوئی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی جاتی اور اس مقصد کے حصول کے لئے شعروں میں کاری گری کی جاتی۔ اب بانکا شعر وہی کہلایا جس میں کاریگری زیادہ ہو۔ کاریگری کے لئے اجنبی الفاظ اور مختلف صنعتوں کا سہارا لیا گیا۔ عربی و فارسی کے الفاظ و تراکیب، صنعت مبالغہ، مراۃ النظیر اور تجنیس وغیرہ ہر شاعر کا اوڑھنا بچھونا بن گئیں۔ مقابلے بازی کے شوق میں مشکل اور نامانوس زمینیں اختیار کی گئیں، دو غزلہ، سہ غزلہ اور چہار غزلہ کا رواج پڑا۔ مضامین دور دور سے پکڑ کر لائے گئے، مچھلیاں دشت میں اور ہرن پانی میں پھرنے لگے۔ یہ بانکپن تھا۔ ڈگر سے ہٹ کر چلنے کی خواہش تھی۔ یہ اعتذار داد طلبی کا۔ ہر چند نیاز و ناز کی کشمکش بدستور تھی، عشق و عاشقی کے چرچے پہلے سے کچھ زیادہ تھے مگر کیفیات دل کے پُر اثر اظہار کا ذریعہ غزل کے بجائے شوخی، واسوخت اور مستزاد تھے۔ لئیق کا تصور ان حالات کے پس منظر میں ہی کرنا ہوگا۔ وہ اس کاریگری کے مقابلے میں کسی سے "پیچھے نہیں رہے بلکہ ہماری زنجیریں پہن کر کچھ زیادہ ہی تیز دوڑے ہیں۔

انتخاب از غزلیات

بلبل و گل جو ہوا خندہ دہن پانی میں — پھول جھڑ جھڑ کے بنا صاف چمن پانی میں
غسل میں رخ پہ پڑی آکے جو مہ کی کاکل — عکس سے دیکھ پڑا صاف گہن پانی میں
میری وحشت سے سرایت گریزاں وحشی — مچھلیاں دشت میں پھرتی ہیں ہرن پانی میں

چشم کو لب کے تقرب سے تفاخر کیا ہے — جب مسیحا ہوا بیمار تو درماں کیسا
وصل کی شب میں رہا خوف ہمیں فرقت کا — ولولہ دل کا نہ نکلا تو پھر ارماں کیسا

آج فردائے قیامت دمبدم آئی نظر — چال جاناں کی ہے یا پازیب کی جھنکار ہے
رہتا ہے ظالم ہمیشہ پھول پھل سے بے نصیب — شاخ میں تلوار کی دیکھا نہ ہم نے بار ہے
جو نہ ہو مثبت نہ منفی اس کو کیا کہئے یہاں — یا چھلاوہ یا کمر ہے یا کوئی اسرار ہے

دونوں جہاں کے حسن سے جاناں بنا دیا — دل سب کا ایک عشق نے خواہاں بنا دیا
آتے ہیں دار فانی میں بہر کفن سبھی — ملک عدم نے کیا انھیں عریاں بنا دیا
اب کس طرح سے اس کو کہوں بے وفا یہاں — دل کو ہمارے یار نے عرفاں بنا دیا
پروین کا خوشہ چرخ سے لاکر زمین میں — ماتھے پہ رشک ماہ کے افشاں بنا دیا

لوٹتے سانپ ہیں چھاتی پہ مری ساری رات — یہی تعزیر ہے گیسو کے گرفتاروں کی
داغ چیچک کے ترے رخ پہ چمکتے دیکھے — چرخ پر سیر فراموش ہوئی تاروں کی

نقش پا کب ترا خورشید قیامت نہ بنا — حشر کس روز تری چال سے برپا نہ ہوا
مانع روشنی نہیں ظلمت شب — پردۂ زلف حجابِ رخِ زیبا نہ ہوا
دولتِ فقر میں ہے ایک سا عالم اپنا — دل ہمارا ہے غنی مال ہوا یا نہ ہوا

دیکھ کر رخ کو پھنسا زلف میں جا کر افسوس
راہِ آساں سے چلا کوچۂ مشکل کی طرف

ہجر میں اس کے طلبگارِ اجل ہوں ایسا
جس طرح چشم مسافر کی ہو منزل کی طرف

غل ہوا خانۂ زنجیر میں سودائیوں کا
پاؤں دیوانے کے پھیلائے سلاسل کی طرف

کاکل نے رخ کو ڈال دیا پس حجاب میں — کیا کیا نمود ابر ہوا آفتاب میں
ساقی نے دی شراب ہمیں چاندنی میں خوب — دورہ ہے آفتاب کا اب ماہتاب میں
غالب کا قول یاد ہے کیونکر پیوں لئیق — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

کیفِ نشاط و لطفِ خوشی ہے شراب میں | لیکن بڑا زیب دیتا ہے عمرِ شباب میں
کیونکر گناہ کرنے سے ہوں دست کش میں ند | بخشش کی ہے امید خدا کے حساب میں

تا گلو پانی بڑھایا گھاٹ نے تلوار کی | آبرو شاید ہماری دیدۂ قاتل میں ہے
دونوں عارض یار کے ہیں چاہِ غبغب کے قریب | دو فرشتوں کی اسیری یا چہِ بابل میں ہے

زلف رُخ سے ہٹا کے دیکھے لب | خضر کو ہم نے رہنما دیکھا

سر پہ چڑھتے ہیں تنک ظرف جو ہیں عالم میں
نالے تھوڑے ہی سے پانی میں ابل جاتے ہیں

غرق ہو جائے یہ کشتیٔ فلک مثلِ حباب | طفلِ اشک اپنا زمیں پر جو مچل جائے کہیں

پھنسا کیوں مرغِ دل تو دام میں دانہ کے لالچ سے
نہ سمجھا زلف کے نیچے نمایاں گال پہ تل ہے

ہم بھی کبھی دمساز تھے تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہر بار تم کو ناز تھے تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جاتے تھے ہم گھر پہ کبھی آتے تھے تم در پہ کبھی
کیا رشک کھاتے تھے سبھی تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سن کر سخن بولا صنم کس واسطے کھاتے ہو غم
تم پہ ہمیشہ تھا کرم تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہ سن کر سخن دل ربا ہیں نے لیا چھاتی لگا
ہنس کر کہا پچھلا مزا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

لیئق نے اپنی غزل میں تین باتوں سے گریز کیا ہے۔ اول مشکل پسندی کے شوق میں ادق الفاظ استعمال نہیں کیے ہیں حالانکہ ناسخ کا یہ محبوب مشغلہ تھا۔ دوم نہ کہنے کی باتیں عموماً نہیں کہی ہیں۔ سوم غزل کو ناہمواری سے بچانا چاہا ہے جس کی وجہ سے ان کے دیوان میں مساوات ہے۔ یہی وہ امور ہیں جنھیں میں نے ناسخ کے انداز شعر گوئی میں ترقی کا باعث سمجھا ہے۔

لیئق نے واسوخت کا تکملہ ۱۲۸۶ھ میں کیا یعنی امانت کی وفات کے گیارہ سال بعد۔ امانت کی غزل، امانت کی اندر سبھا اور واسوخت خود ان کی زندگی میں ہی اس قدر مقبول ہوئے! بایدو شاید۔ دراصل یہ تینوں چیزیں اس دور کے مذاق کی ترجمان تھیں بخصوصیت سے واسوخت میں ہر شخص کے دل کی دھڑکنیں پوشیدہ تھیں۔ واسوخت میں امانت نے ایک شاہد بازاری سے عشق کی داستان بیان کی، اس کا سراپا کھینچا، واضح اور برمحل الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اس میں لذت بھی اس میں عوام کے جذبات کی مرقع کشی تھی۔ لیئق نے جب واسوخت لکھا تو واسوخت امانت ان کے سامنے ایک نمونہ بن کر آیا۔ چناں چہ انھوں نے اپنے واسوخت کو زیادہ پھیلایا، زیادہ وسعت دی۔ انھوں نے ۳۵۱ بند لکھے جو واسوخت امانت سے تقریباً چار گنا زیادہ ہیں۔ امانت نے دو۲ سراپا لکھے، لیئق نے چھ۶۔ امانت نے جزئیات سے گریز کیا۔ لیئق نے باغ، کوٹھی اور وصل کے تفصیلی بیانات پیش کیے۔ امانت نے اپنی غزل کا طرز ترک کرکے قریب قریب بے تکلف پیرایۂ بیان اختیار کیا۔ لیئق نے اپنی غزل کے طرز کو فروغ دے کر صنعت کاری سے کام لیا۔ مثلاً لیئق نے واسوخت میں جتنی صنائع برتی ہیں ان کے نام ہر بند کے حواشی پر لکھ دیے ہیں۔ ان تمام صنعتوں کی مجموعی تعداد بتیس ہے۔ ان میں وہ صنعتیں شامل نہیں ہیں جو جزو شاعری بن چکی ہیں مثلاً صنعت مبالغہ، حسن تعلیل وغیرہ۔ اس طرح لیئق نے اپنی کاری گری کے جوہر دکھائے۔ اس اعتبار سے وہ امانت سے آگے ہی نہیں بہت آگے ہیں۔

واسوخت لیئق کے حالات واقعاتی معلوم ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ اس زمانے میں کسی گھر کی نشین سے عشق خلاف واقعہ نہیں تھا۔ بازار سے گزرتے ہوئے کسی "معشوق پری وش" پر نظر پڑنا اور اس پر عاشق ہونا شاید خلافِ وضع بھی نہیں تھا:

اتفاقاً ہوا بازار میں اک روز گزر | ایسے معشوق پری وش پہ پڑی میری نظر
جس کی ٹھوکر سے یہ کہیے کہ بپا ہو محشر | لب مسیحا تھے مژہ تیر تھی ابرو خنجر

تھی پرستاں کی پری حور تھی یا جنت کی
اس مرقع میں وہ تصویر تھی اک آفت کی

دوم اگر لیئق کے بیان کو صحیح مان لیا جائے تو واسوخت کی کہانی بھی سچی ہے:

حسن دلبر لکھوں عشق دل دیوانہ لکھوں | جلوۂ شمع لکھوں جوشش پروانہ لکھوں
داستاں وصل کی اور ہجر کا افسانہ لکھوں | صبر عاشق کا دل آزاریٔ جانانہ لکھوں

یعنی گزرا ہے جو مجھ پہ وہ بیاں کرتا ہوں
راز اپنا تھا نہاں اس کو عیاں کرتا ہوں

یا سوتیا ڈاہ میں معشوق کا کہنا:

گر مٹانا ہے تجھیں اس کو مٹاؤ جاکر شمع رو جس کو بنایا ہے بجھاؤ جاکر
آگ تن میں تو ذرا اس کے لگاؤ جاکر دل مرا ٹھنڈا ہو گر اس کو جلاؤ جاکر

اس کی صورت جو کبھی دیکھے تو اندھا ہووے
اس کے کوچے میں اگر جاوے تو لنگڑا ہووے

یہ وہ باتیں ہیں جو لئیق کا تجربہ اور مشاہدہ معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں اثر انگیزی کا خاصہ فطری ہے۔ اس واسوخت کی یہ خوبی ہے کہ جذبات نگاری کے موقع پر شاعر نے اپنے خیالات کے فطری بہاؤ پر نقش و نگار کے پشتے نہیں باندھے ہیں ورنہ شاعر نے صنعت گری، منظر کشی اور بیان سراپا میں خوب خوب کی ہے۔

ایک باغ کا منظر:

تاروں پہ کہیں جو بن کہیں پھولا گیندا دیکھا بیلے کا عجب رنگ البیلا
ایک تختے میں شگفتہ تھا اکیلا کیلا کہیں غنچہ کی چٹک تھی کہیں گلرک کھلا

چاندنی کی گل مہتاب میں آتی تھی بو
عطر گل کی کہیں نسرین بھی سنگھاتی تھی بو

کھل کھلائی جو چنبیلی ہوئی سشبو بیزار آنکھ سوسن سے لڑی ہو گئی نرگس بیمار
دل میں خوش چھپا سے ریحاں تو چمن گلزار فاختہ سرو پہ تو گل پہ فدا بلبل زار

پیچ سنبل نے وہ تھے زلف سیہ کے کھوئے
راجہ باسک نے بھی پاتال میں موتی روئے

نکہت جو بنفشہ سے ہوا میں مائل عشق پیچاں کے تھا پیچوں سے نکلنا مشکل
تازگی گل لالہ سے ہوا داغی دل اور گل مہندی سے یاقوت مرا ہر بسمل

یک قلم تخت چمن کا تھا شہنشاہ گلاب
بلبل مضطرب حال کو تھا ماہ گلاب

چہچہے کرتے تھے مرغان چمن کیا کیا خوب ہر روش اپنے فدا تھے دو جہاں کے محبوب
جھومتا وجد میں ہر نخل کا کیا خوش اسلوب باغ وہ باغ کہ رضواں کو تھا دل سے مرغوب

کیا لکھوں وصف تھا گلشن کا بیاں سے باہر
پھول تقریر میں جھڑتے تھے زباں سے باہر

مختصر انتخاب از سراپا:۔

مانگ موتی کی بھری تری ہے آماہ لقا نکلا دو کوہ کو ہے چیر کے گویا دریا
سر عشاق جو اس مانگ نے ہے مانگ لیا جاں نثاری میں رہا فرق نہ ان کے اصلا

کہکشاں ہوئے ذنب باندھ کے دل آیا ہے
چڑھ کے یا کوکب پروین پہ زحل آیا ہے

جعد پیچاں نے بنایا جو مجسم کالا کوڑیالا اسے موباف کے پیچوں نے کیا
عنبریں زلف کا جوڑا جو کہیں کھول دیا ہو گیا عطر فزا وادی ایمن سارا

زلف کی بو سے پڑا ملک ختن میں دھڑکا
دل بلبل غم و حسرت سے چمن میں دھڑکا

تیری مژگاں سے اکہ ہے گیسو کے نیزہ کی سناں رستم و زال بھی ہوں جس سے اماں کے خواہاں
صف کی صف پل میں کرے چھید کے جاں سے بے جاں آنکھ جو اس سے کرے چار یہ ہے کس کی تواں

آسماں چشم عطارد سے ادھر جھانکتا ہے
سوزن مہر سے ہر زخم جگر ٹانکتا ہے

لب جاں بخش کے توصیف سے جاں آتی ہے رشک سے جان مسیحا کی نکل جاتی ہے
اس کی شیرینی کو مصری نہ کبھی پاتی ہے شرم سے قند نبات اپنی ذرا لاتی ہے

برگ گل سے بھی زیادہ ہے نفاست لب میں
کرتے ہیں اہل سخن اس کی صداقت سب میں

دہن تنگ میں ترے نہیں جائے گفتار گلشن خلد کا غنچہ ہے ولیکن بے خوار
صاف عنقا کا وجود اس سے ہوا ہے اظہار یا چھلاوہ ہے کہ کچھ اس میں نہاں ہے اسرار

نام سنتے ہیں دہن کا نہیں دیکھا ہم نے
جیسے مضمون کمر کو نہیں سمجھا ہم نے

صاف جوتی کو سرافراز کریں اس کے پا جس کے سلمی کے لئے خط شعاعی ہے بنا
اس کا ہر ایک ستارہ ہے چمکتا اچھا نجم ثاقب بھی ہے منقیش کی جا اس میں لگا

جس زمیں پر وہ چلے اس کو فلک کر دکھلائے
کہکشاں راہ بنے ذرہ ستارہ ہو جائے

لئیق کی رباعیات میں کوئی ندرت نہیں اس لئے ان پر گفتگو لاحاصل ہے۔

لئیق نے تین قصائد لکھے۔ یہ بھی چھوٹی ہوئی پھلجھڑیاں ہیں۔ قصیدہ در بیان حال اقبال و ادبار کچھ غنیمت ہے مگر قصیدہ کا لب و لہجہ، اٹھان اور شوکت معیار کے مطابق نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لئیق جیسا قادر الکلام شاعر قصیدہ نگاری میں مایوس کن ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ بیجا تعریف اور

خوشامد لئیق کی خودداری کے منافی ہو۔

کلیات میں ایک دیوان خمسجات بھی ہے۔ حسب دستور اس کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے۔ اس دیوان سے لئیق کی قادرالکلامی کا مزید اندازہ ہوتا ہے۔ شاید ہی اردو کے کسی دوسرے شاعر نے خمسجات کا دیوان ترتیب دیا ہو۔ یہ تمام خمسجات معروف شعراء کی غزلوں پر تضمین کئے گئے ہیں۔ چونکہ تضمین اس قاعدے کا نام ہے کہ ایک مصرعے کے ساتھ دوسرے مصرعہ کو بطور تعلق معنوی لگایا جائے اس لئے یہ فن بھی مشکل ہے مگر لئیق نے بے تکلفی سے اشعار تضمین کئے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ لئیق نے اصل غزل کی مساوات اپنانے کی کوشش کی ہے یعنی اگر تضمین ناسخ کی غزل پر کی گئی تو خمسے کا انداز بھی غزل کے مطابق ہے اور اگر تضمین غالب کی غزل پر کی گئی تو اس کا ماحول غالب کی غزل جیسا ہے۔ یہ بات اس وجہ سے اور بھی اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے کہ لئیق نے سب ملا کر سولہ ۱۶ شاعروں کی غزلیات پر خمسے لکھے ہیں۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود صرف لئیق کو اردو شاعری کی تاریخ میں مقام دلوانے کے لئے "غمنامۂ لئیق" یعنی واسوخت لئیق بہت کافی ہے۔ اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ یہ واسوخت زیورِ طبع سے آراستہ ہو۔ بایں ہمہ ہمیں امید یہی ہے کہ دبستانِ لکھنؤ کا ذکر کرتے وقت اب ہمارے ناقد اور محقق للتا پرشاد لئیق کو فراموش نہیں کریں گے۔

زندۂ جاوید گشت ہر کہ نکو نام زیست
کز عقبش ذکر خیر زندہ کند نام را

مصنف:- پرشورام
مترجم:- ہنس راج رہبر

(بنگالی افسانہ)

رٹنتی کمار

اسکول میں چھٹی کے بعد مانک نے کہا۔ "ارے رٹنتی، آج شام کو ہمارے یہاں چائے پر آنا۔"

رٹنتی نے پوچھا۔ "کیوں رے، آج تیری سالگرہ ہے کیا؟"

"دھت، مورکھ کہیں کا۔ سالگرہ سال میں کتنی مرتبہ ہوتی ہے؟ ابھی چند روز پہلے تو منائی تھی۔ جب دعوت کھا کے تیرے پیٹ میں گڑبڑی ہوئی تھی۔"

"تو پھر کاہے کی دعوت ہے آج؟"

"آج شام کو جیجی کا بر آئے گا۔"

"تیری ردبی جیجی کی شادی ہو گئی کیا؟"

"دھت شادی کا ابھی کچھ ٹھکانا ہی نہیں ہوا۔ آج کھگین بابو جیجی کو ملنے آئے گا۔ اگر زیادہ میل ہو گیا تو شادی طے ہو جائے گی۔"

رٹنتی عقل مند کی طرح بولا: "اوہ، اب سمجھا۔"

دعوت میں شامل ہونے کو وہ ہمیشہ تیار رہتا ہے، خواہ وہ کسی عنوان ہو میل سے یا ان بن سے۔ بیاہ، شادی، تہوار یا شراد ھ کچھ بھی ہو۔ چنا، کیک، بسکٹ، پکوڑی، پلاؤ، سندیش، کلیا کسی سے بھی اُسے کوئی عذر نہیں تھا۔

شام کو پانچ بجے جہاں تک ہو سکا۔ صاف کپڑے پہنے رٹنتی مانک کے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ اس کی بڑی بہن نے کہا۔ "دیکھ رٹائی -- یہ ٹفن کیریر لیتا جا۔ مانک کی ماں کو دینا۔ سنبھال کر لے جانا۔ کہیں گرا نہ دینا۔ خالی ہو جانے کے بعد لوٹتے وقت لیتے آنا۔"

ٹفن کیریر ہاتھ میں لیتے ہوئے رٹنتی بولا۔ "ارے باپ کتنا بھاری ہے۔ اس میں کیا کیا ہے بہن جی! بادام کی نمکین، مچھلی کی کچوڑی، مانس کی پٹی، پپیتے کی برفی اور آم کی چٹنی، کیوں میں نے ٹھیک کہا ہے نا؟"

"ہاں ہاں، سب ہے اس میں۔"

"اس کے گھر میں کھانا پینا ہو گا تو تم نے کیوں کھانا بنایا؟ بولو نا جیجی؟"

"چپ رہ، تمھیں کیا مطلب ان سب باتوں سے؟ مانک کی ماں نے بنانے کو کہا تھا، بس بنا دیا۔"

مانک کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ رٹنتی چند منٹوں میں وہاں پہنچ گیا اور مانک کی ماں کو ٹفن کیریر تھما کر بولا۔ "موسی جی، ردبی جیجی کے جاتی بابو اب تک نہیں آئے ہیں؟"

مانک کی ماں بولی۔ "اس چھوکرے کے بولنے کے ڈھنگ سے جی جلتا ہے۔ دس برس کا ہو گیا ابھی تک عقل نہیں آئی۔ ارے وہ تو پانو کا دوست کھگین ہے۔ چائے پینے کو بلایا ہے۔ رٹائی، یاد رکھنا کہیں اس کے سامنے بدتمیزی نہ کر بیٹھنا۔"

سر ہلا کر رٹنتی نے یقین دلایا کہ وہ بدتمیزی کرنے والا لڑکا نہیں ہے۔ مانک نے اس سے کہا۔ "کھگین بابو ۶ بجے آ رہے ہیں۔ تب تک چل کر اس کمرے میں کیرم کھیلیں"

مقررہ وقت پر مانک کے بڑے بھائی پانو یا پنا لال کے ساتھ کھگین بابو

آئے۔ خوبصورت چہرہ، بڑھیا پوشاک، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی رئیس زادہ ہے۔ اپنی کار میں آیا ہے۔ عمر کوئی چھبیس ستائیس برس ہوگی۔ اس کے باپ کا ابرق یا کوئلے کا کاروبار ہے۔ روپ، گن، علم اور دولت کے لحاظ سے ایسا شخص ملنا مشکل ہے مانک کی ماں اسے اپنا داماد بنانے کے لئے بے قرار ہو اٹھی۔ فی الحال اپنے بڑے لڑکے پانو کی معرفت ہی وہ کھگین کو جانتی ہے اور وہ ماں کے اصرار سے اپنے اس دوست کو پکڑ لایا ہے۔

پھر آدمی چائے کی میز پر بیٹھے۔ کھگین خاص مہمان ہے۔ روبی سب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ مانک کی ماں میزبان ہے۔ دونوں بھائی پانو اور مانک اور اس کا دوست رٹنتی اس میں شامل ہیں۔ گھر کے مالک کافی دیر میں دفتر سے لوٹیں گے اس لئے ان کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

باقاعدہ معمولی بات چیت اور بنا کسی وجہ کے ہنسی مذاق ہونے لگا۔ روبی نے دو چار گانے گائے۔ اس کی ماں بولی: "کھگین بیٹا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں ہے۔ انفلوئنزا کے بعد روبی کی آواز ذرا اڑک سی گئی ہے۔ ورنہ اس کا گانا لوگوں کو بہت ہی پسند آتا ہے۔ دراصل اس نے استاد سے گانا سیکھا ہے۔ اب ذرا یہ تصویر غور سے دیکھنا اسے روبی نے بنایا ہے۔ اس کا نام رکھا ہے۔ مست مرال (کنول) آسمان پہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ تالاب پانی سے لبالب بھرا ہوا ہے اور اس میں لال جو ہی کھلی ہوئی ہے۔"

روبی نے ماں کو ٹوکا "— لال کنول۔"

"ہاں، ہاں۔ لال کنول کھلے ہیں۔ تالاب کے کنارے ہنس قطار میں باندھے بیٹھے ہیں۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر یوں چلا رہے ہیں گویا ان کا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ ابھی اٹھا کر یہ سب دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اور دیکھو روبی نے کتنی خوب صورت چیزیں بنی ہیں۔ یہ ٹیبل کلاتھ بالکل اجنتا پیٹرن کا ہے۔ چاروں طرف کنول اور بیچ میں ایک مرغی۔ بہت ہی خوب صورت بنایا ہے۔ کیوں! ارے پانو، کھگین کی چھاتی کا ذرا ناپ تو لے لو۔ روبی اس کے لئے ایک ویسٹ بھی کر دے گی۔ بیٹیا کھگین، لوگ کہتے ہیں کہ لڑکی جب اتنی خوب صورت ہے تو مس انڈیا کے کمپی ٹیشن میں کیوں اپنا نام نہیں دیتی۔ میں تو بہت چاہتی ہوں مگر لاکھ کہنے پر بھی باپ نہیں مانتا۔ افسر ہونے سے کیا ہوگا۔ جنم تو معمولی گاؤں میں ہوا ہے۔"

ادھر مانک نے اپنے ہونے والے بہنوئی کا سوالوں کی بوچھار سے ناک میں دم کر دیا۔ آپ کی اس گھڑی کو چابی نہیں لگانی پڑتی ہوگی؟ اس فونٹین پن کا کیا دام ہے؟ موٹر میں ریڈیو کیوں نہیں لگوایا؟ اپنا سونے کا سگرٹ کیس ذرا دکھائیے نا، ولایتی ہے کیا؟ آپ کا کیمرہ نہیں ہے؟ ہم لوگوں کا فوٹو نہیں اتار دیجئے گا؟ وغیرہ وغیرہ۔

رٹنتی کو کھگین بہت پسند آیا۔ اس نے تین چار مرتبہ بات چھیڑنے کی کوشش کی مگر جونہی وہ بولنے کو ہوا روبی یا اس کی ماں نے اس پر کڑی نگاہ ڈالی۔ آخر اسے چپ سادھ کر بیٹھے رہنا پڑا۔ اس پارٹی میں روبی کی ماں رٹنتی کو بالکل بلانا نہیں چاہتی تھی مگر گھر میں برا نہیں تھا۔ وہ پلیٹیں اٹھا کر دے گا اس لیے بلا لیا تھا۔

آخر کھانے کی چیزیں آنا شروع ہوئیں۔ گھر کا نوکر ہاف پینٹ اور ہاف شرٹ پہنے پلیٹیں اور چائے کی ٹرے ایک کے بعد ایک لایا۔ نوکر میدنی پور کا رہنے والا تھا۔ لیکن روبی کی ماں اسے 'بوائے' کہہ کر پکارنے اور ہندی میں حکم دینے لگی۔ روبی پروسنے لگی۔ رٹنتی ساری بے عزتی بھول کر چیزوں کا سواگت کرنے لگا۔

روبی کی ماں بولی۔ "کیوں بیٹا کھگین، تم تو کچھ کھاتے ہی نہیں اور دو کچوریاں اور مٹھائی لا دوں؟ اری روبی، تو بھی ذرا بول۔ اتنی محنت کر کے تم نے کھانا بنوایا۔ اگر کھگین نہ کھائیں تو تیری ساری محنت اکارت جائے گی۔ بیٹا، سب چیزیں کیسی بنیں۔ ذرا بتاؤ تو؟"

کھگین بولا۔ "کیا بتاؤں، ایسا کھانا تو میں نے آج تک نہیں کھایا۔ واقعی بہت مزے دار بنا ہے۔"

روبی کی ماں یہ سن کر خوشی سے ناچ اٹھی۔ بولی۔ "یہ سچ کہتے ہو بیٹا۔ تمہارے لئے روبی نے سبھی چیزیں اپنے ہاتھ سے بنائی ہیں۔ واقعی یہ بہت اچھا کھانا بناتی ہے۔"

رٹنتی کا منہ کچوری سے بھرا ہوا تھا۔ پھر بھی اس سے رہا نہ گیا۔ کچوڑی کا لقمہ منہ کے ایک طرف لے جا کر آواز کو روک کر کہا۔ "پر موسی جی یہ سب چیزیں تو میری بڑی بہن نے بنائی ہیں۔"

روبی کی ماں جھڑک کر بولی "چپ رہ، بدتمیز کہیں کا، جو بات تمہیں معلوم نہیں اس میں ٹانگ کیوں اڑاتا ہے؟"

کچوری کا لقمہ منہ کے اندر ڈالتے ہوئے رٹنی نے کہا: "واہ رے!
میں نے ہی یہ سب کچھ گھر سے لا کر دیا ہے نا؟"

روبی نے اپنے منہ پر جو تہیں پرت گلابی رنگ کے لگائے تھے ان میں سے بینگنی رنگت جھلک اٹھی۔ اس کی ماں پچکارتی ہوئی بولی: "بانو اس بے ہودہ پاجی چھوکرے کو ذرا اس کے گھر چھوڑ آ۔ صرف باتیں بگھارنا سیکھی ہے۔ پہلے ہی میں نے منع کیا تھا کہ اسے مت بلا۔ مانگ نہیں مانا۔ اس کا پیارا دوست جو ہے۔"

بانو رٹنی کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے گیا اور کہا "رٹنی تو نے کھا تو لیا ہے، اب گھر جا۔"

رٹنی بولا۔ "نہیں، ابھی تو کچھ بھی نہیں کھایا۔ ابھی پیٹی نمکین برفی، پکوڑا اور چائے باقی ہے۔ پھر خالی ٹفن کیریر بھی تو ساتھ لے جانا ہے۔"

"اچھا، میں سب چیزیں یہیں لائے دیتا ہوں۔ تو یہیں چپ چاپ اکیلے بیٹھے کھا لینا۔ پھر سیدھے گھر چلے جانا، کیوں ٹھیک ہے نا؟"

بانو نے جو کچھ لا کر دیا وہ اس کے لیے کافی نہیں تھا۔ جو اصلی چیزیں تھیں یعنی لنگڑے آم کا لینگچا، وہ اسے نہیں ملیں۔ جو ملیں انہیں وہ بہت دیر تک کھاتا رہا۔ پھر کسی سے کچھ کہے بغیر وہ گھر چلا گیا۔

رٹنی کی لاپروائی سے جو بات اس کے منہ سے نکل گئی تھی، اس سے اس کمرے کی چائے پارٹی قدرتے کمزور ہو گئی تھی۔ ایسا کوئی خاص ہو ہلا نہیں ہوا۔ جس مقصد سے یہ سارا اہتمام کیا گیا تھا وہ بھی آگے نہیں بڑھ سکا۔ روبی منہ پھلائے بیٹھی رہی۔ اس کے منہ سے 'ہاں نا' کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ نہیں نکل سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر بے حیا رٹائی ایک مرتبہ ہاتھ آ جائے تو وہ اسے کچا چبا جائے گی۔ اور ماں کی بھی کیسی عقل ہے۔ اپنی لڑکی نے جو کھانا بنایا تھا۔ اس بات کو وہ اشارے سے بتلا سکتی تھی۔ بلند آواز سے بتلانے کی کیا ضرورت تھی۔ ذرا بھی خیال نہیں کیا کہ شیطان بے ہودہ لڑکا وہیں بیٹھا ہے۔

اس کالے معاملے کو ڈھکنے کے لیے روبی کی ماں الم غلم بکنے لگی۔ بانو نے بھی اپنے دوست کو خوش کرنے کے لیے طرح طرح کی رسیلی باتیں چھیڑیں۔ کھگین کبھی مسکراتا اور کبھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "تو پھر موسی جی آج اجازت دیجئے دوسری جگہ جانا ہے۔ اف! آج تو آپ نے اتنا کھلا دیا ہے کہ اسے ہضم کرنے میں تین چار دن لگ جائیں گے۔"

روبی کی ماں بولی۔ "تم نے کھایا ہی کیا ہے! پھر کسی دن آنا سویرے، دوپہر یا شام کو کسی بھی وقت۔ جب تمہارا جی چاہے چلے آنا۔ تم تو اپنے بیٹے جیسے ہو۔ گھر میں جو کچھ رہے گا وہی کھاؤ گے۔"

تھوڑی دور چل کر کھگین نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا لڑکا ٹفن کیریر ہاتھ میں لیے چلا جا رہا ہے۔ گاڑی روک کر اس سے کہا۔ "ارے لڑکے سنتے ہو؟"

رٹنی فوراً رک گیا۔ "مجھے بلا رہے ہیں کیا؟"

"ہاں، ہاں۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"جی۔ رٹنی۔"

"آؤ، گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ تمہیں گھر پہنچا دوں۔"

رٹنی بیٹھ گیا۔ کھگین بولا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم ایک جگہ سے دوسری جگہ چیزیں لے جایا کرتے ہو اس لئے تمہارا نام رٹائی رکھا گیا ہے۔ کیوں میں نے ٹھیک کہا ہے نا؟"

رٹنی نے جواب دیا۔ "دھت، ایسا کیوں ہوگا۔ میرا پورا نام شری رٹنی کمار چودھری ہے۔ میرا جنم رٹنی پوجا کے دن ہوا تھا اس لیے میرے ناناجی نے میرا یہ نام رکھا۔ اور بڑی بہن کا نام ہے جگنی منگلا۔ چھوٹی بہن کا ہے ننگرا۔"

"اوہو، تم لوگوں کے بڑے بھاری بھاری نام رکھے گئے ہیں۔ گھر کتنی دور ہے، کس کلاس میں پڑھتے ہو؟ گھر میں کون کون ہیں۔"

رٹنی نے بتایا کہ اس کا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ چھٹی کلاس کا طالب علم ہے۔ پتاجی ریلوے میں ملازم ہیں، زیادہ تر باہر ہی گھوما کرتے ہیں۔ کبھی کبھی آتے ہیں۔ گھر میں دو بہنیں ہیں، ماں ہے اور وہ خود ہے۔ بہنوں کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ بھوپون کتا اور روپسی بلی بھی ہیں۔ بھوپون بڑا بیہودہ ہے۔ اس دن مال پوا چوری کر کے کھا گیا تھا۔ لیکن روپسی بڑی شریف ہے۔ جلدی ہی اس کے بچے ہوں گے۔ اگر کھگین کو ضرورت ہو تو جتنے چاہے بلی کے بچے لے جا سکتا ہے۔"

رٹنی شرمیلا نہیں تھا۔ مختصر سی ملاقات میں ساری اجنبیت دُور ہو گئی۔ اس نے پوچھا۔ "روبی جیجی سے آپ ملے تھے؟"

کھگیس ہنس کر بولا۔ "کہاں مل سکا؟ چائے کی میز پر تم نے جو بم پھینکا، اس سے تو سبھوں کا دماغ ہی بگڑ گیا۔"

"آپ خواہ مخواہ مجھ پر ناراض ہوتے ہیں مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"نہیں نہیں، تم تو بڑے ہی اچھے لڑکے ہو۔ صرف عقل کی تھوڑی کمی ہے۔ جو کہنا نہیں چاہیئے تھا وہ کہہ دیا۔"

"کیوں؟ میں نے تو سچ ہی کہا تھا۔ میری بڑی بہن ہی نے تو کہا تھا کہ مانک کی ماں کے کہنے پر اس نے وہ سب کچھ بنا دیا ہے۔"

"نہیں تم کچھ بھی نہیں جانتے۔ تمہاری روبی جیجی نے اپنے ہاتھوں سے کھانا بنایا ہے۔"

"کبھی نہیں۔ آپ کچھ نہیں جانتے۔ روبی جیجی صرف آلو اور انڈا بنانا جانتی ہیں۔ ہاں مینڈک کی جو تصویر تھی وہ اس نے بنائی ہے۔ لیکن وہ جو کنول پھول اور مرغی کی تصویر والا ٹیبل کلاتھ تھا اسے روبی جیجی نے نہیں بنایا۔ مانک کے گھر کے پاس ہماری کلاس کا ایک لڑکا کیلیئے رہتا ہے۔ اسی کی پھوپھی نے بنایا تھا۔ میں اس کے یہاں جاتا ہوں۔ اس لیے مجھے سب معلوم ہے۔"

"ارے باپ! تم تو بڑے نٹ کھٹ ہو لیکن تمہاری جٹنی "منگلا" نے وہ سب بنایا ہے اس کا ثبوت کیا؟ تمہارے گھر جانے پر ویسا کھانا کھلا سکو گے؟"

"ضرور۔ اگر نہ کھلا سکوں تو میرے کان مل دیجئے گا۔"

"اور تمہاری جیت ہوئی تو کیا تم میرے بھی دونوں کان مل دوگے؟"

"دھت، آپ تو مجھ سے بڑے ہیں۔ آپ ہار گئے تو مجھے جرمانہ دیں گے۔"

"کتنا جرمانہ دینا پڑے گا؟"

کچھ سوچ کر رٹنی بولا۔ "ایک روپیہ۔"

"بس ایک ہی روپیہ؟"

"اچھا تو دو روپے دیں۔ آخر آپ بھی میرے دونوں کان ملیں گے۔ میرے دونوں کانوں کے عوض دو روپے۔ ابھی چلیئے نا ہمارے ہاں۔"

"پاگل ہو گئے ہو کیا، ابھی اتنا کھا کر پھر تمہارے یہاں کیسے کھاؤں گا؟"

"اچھا پرسوں اتوار ہے۔ بولئے، اس دن شام کو آیئے گا نا؟"

"تمہیں کیا گھر کے مالک ہو؟ وہاں تو مجھے کوئی نہیں پہچانتا۔ اگر میں بن بلائے وہاں پہنچ جاؤں تو سب سمجھیں گے کہ میں ایک پیٹو بدتمیز آدمی ہوں۔"

"وہ کیسے سمجھیں گے؟ میں تو آپ کو جانتا ہوں۔ میرے کہنے پر اگر آپ ہمارے یہاں آئیں گے تو کون روک سکتا ہے۔ اچھا تو پھر آپ اتوار کی شام کو ضرور آرہے ہیں؟"

"ٹھیک ہے۔ تم نے جب دعوت دی ہے تو ضرور آؤں گا۔ مگر کھانا دانا کچھ نہیں بنوانا۔ صرف چائے ...."

"واہ، پھر آپ کو یقین کیسے آئے گا۔"

"کوئی کھانا بنا سکتا ہے یا نہیں یہ میں اس کے چہرے سے بھانپ لیتا ہوں۔ ہاں ایک بات اور سنو۔ مانک کے یہاں جو کچھ تم نے کیا ہے اپنے یہاں اس کی ایک بات بھی نہ بتانا۔ ہاں دیکھو اس دن مانک کو مت بلانا.... اچھا، رٹنی کمار تمہاری بڑی دیدی کا تو بڑا زوردار نام ہے، جٹنی منگلا، کالی، بھدرکالی، کپالنی۔ کھانا بنانے میں بھی تیز ہے۔ اچھا، تو وہ دیکھنے میں کیسی ہے؟"

"بہت ہی سندر۔ روبی جیجی، ایک گھنٹے تک رنگ لگا کر بھی گوری نہیں بن پاتی، لیکن بڑی جیجی کو اس کی ضرورت ہی نہیں۔ جیجی کے سنگیت کے مقابلے میں روبی جیجی کا سنگیت بالکل کوے کی آواز ہے۔ لیکن یوں کہنے پر بڑی جیجی نہیں گاتیں۔ اگر آپ کئی مرتبہ کہیں تبھی وہ گائیں گی۔ آپ تو نہیں جانتے۔ بڑی جیجی نے ایم۔ اے پاس کر لیا ہے۔ چھوٹی دیدی اگلے برس میٹرک میں بیٹھے گی۔ لیکن روبی دیدی تین بار فیل ہو چکی ہے۔ بڑی جیجی کو جلدی ہی نوکری ملے گی۔ نانا جی کیا کہتے ہیں، آپ کو معلوم ہے، لکشمی، سرسوتی اور ان پورنا، ان تینوں کو جوڑ کر تین سے تقسیم کرنے سے جو حاصل ہوتا ہے وہی بڑی

دیدی ہیں۔"

"اور وہ تمھیں کیا کہہ کر پکارتی ہیں۔"

"ہی ہی ہی" کر کے رٹائی ہنس پڑا اور بولا۔ "وہ بہت خراب ہے۔ مجھے بے پونچھ دیر ہنومان کہہ کر پکارتی ہیں۔"

اس میں خرابی کیا ہے؟ ہنومان جیسے چرتروان دیوتا کتنے ہوتے ہیں؟ میرا خیال کچھ اور ہے۔ تم نارد منی ہو، پکے دلال۔ مانک کی ماں تیرے مقابلے میں بالکل بچی ہے۔ یہی تمھارا مکان ہے نا؟ اچھا، اب چلا، پھر پرسوں ملیں گے۔

گھر پہنچ کر رٹنتی بولا۔ "جیجی، تمھیں ایک خوشخبری سناؤں گا کھگین بابو کو میں نے دعوت دی ہے، پرسوں شام کو وہ چائے پینے ہمارے یہاں آئیں گے۔"

جٹنتی بولی۔ "یہ کھگین بابو بھلا کون ہیں؟"

"وہی، جنھوں نے آج مانک کے یہاں چائے پی تھی۔ ان سے میری دوستی ہو گئی ہے۔ اُف، کتنی بڑی موٹر گاڑی ہے اس کی تمھیں زیادہ کچھ نہیں بنانا پڑے گا۔ صرف مچھلی کی کچوری، مٹن کی پیٹی، لنگڑے آم کا ٹکیا اور چائے۔"

جٹنتی نے ماں کو بلا کر کہا۔ "ماں دیکھو اپنے لاڈلے کے کرتوت۔ بنا پوچھ تاچھ کے کہاں کے کھگین بابو، دگین بابو کو دعوت دے آیا ہے۔ پھر مجھے کھانا بنانے کا آرڈر دے رہا ہے۔ کھانا بنانے کی چیزیں تجھے سستی نظر آ رہی ہیں، اس کا سارا خرچ کیا تو دے گا؟"

رٹنتی ہاتھ ہلا کر بولا: "اس کے لیے جیجی تمھیں کچھ بھی چنتا نہیں کرنی ہوگی۔ میں تمھیں دو روپے دوں گا۔ لیکن آج نہیں پرسوں۔"

"تو روپے کہاں سے لائے گا؟"

"تم نہیں جانتیں۔ یہ میں بعد کو بتاؤں گا، آج بتانا منع ہے۔"

"دیکھو، اجنبی کے لیے میں کھانا نہیں بنا سکوں گی۔"

"اجنبی کیوں؟ میری تو اس سے گہری دوستی ہو گئی ہے۔ اپنی موٹر میں انھوں نے مجھے یہاں تک پہنچایا ہے۔"

"اب سمجھی، کیوں تو ان کی اتنی طرفداری کر رہا ہے۔"

رٹنتی کی ماں بولی۔ "رٹنتی نے جب کھگین بابو کو دعوت دے دی ہے تو اُسے آنے ہی دے نا بیٹی!"

اتوار کی شام کو کھگین بابو رٹنتی کے گھر آ پہنچے۔ بیٹھک کا اسباب بہت ہی معمولی ہے۔ صرف چارپائی پر ایک چادر بچھی ہوئی ہے لیکن مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں۔ رٹنتی کی ماں کھگین سے سگے سمبندھی کی طرح باتیں کرتی رہی۔ آج کی پارٹی میں رٹائی بڑا میزبان ہے۔

کچھ دیر بعد جٹنتی اور اس کی چھوٹی بہن ناشتہ لے کر آئیں۔

کھگین بولا، رٹنتی کمار، یہ تمھارا بھاری اپیائے ہے۔ میں نے منع کیا تھا۔ پھر بھی تم نے اتنی چیزوں کا انتظام کروایا ہے۔"

رٹنتی بولا: واہ رے، کیا صرف آپ کے لیے؟ جیجی نے کھانا بنایا ہے۔ میں بھی تو کھاؤں گا۔"

کچوری چباتے چباتے کھگین کے کان سے منہ لگا کر رٹنتی بولا "کیوں، اب تو آپ کو وشواش ہوا۔ آپ ہار گئے، نکالیے دو روپے۔"

رٹنتی کی ماں بولی۔ "رٹنتی انھیں کیوں دق کرتا ہے۔ کیا انھیں کھانے نہیں دے گا؟"

جٹنتی نے کہا: "جونک کی طرح چپٹا ہوا ہے۔"

کھگین ہنس کر بولا: "نہیں نہیں، دق کاہے کو کرے گا۔ مجھے بہت پیار کرتا ہے، حالانکہ ہم دونوں کی ملاقات صرف دس منٹ ہوئی تھی۔ رٹائی اپنی جیجی کا بڑا بھگت ہے۔ میرے کان میں آپ ہی کی تعریف کر رہا تھا۔"

جٹنتی بولی: "تو بڑا بدتمیز ہے۔"

رٹنتی نے کہا۔ "تو نے میری بدتمیزی کہاں دیکھی جیجی۔ میں صرف کہہ رہا تھا کہ تم بہت اچھا کھانا بنا سکتی ہو، اس میں بدتمیزی کیا ہے۔ اچھا، ٹھیک ہے، تم کھانا نہیں بنا سکتیں، ستار نہیں بجا سکتیں، کچھ بھی نہیں جانتیں۔ جیجی تمھیں معلوم ہے کھگین بابو کی موٹر سے آواز بالکل نہیں نکلتی ہے۔"

کھگین بولا۔ "تو چلو نا میرے ساتھ۔ ذرا گھوم آئیں۔ پھر تمھیں گھر پہنچا جاؤں گا۔"

رٹنی خوشی کے مارے ہنومان کی طرح "ہپ سی" آواز نکال کر گاڑی میں جا بیٹھا۔ رٹنی کی ماں اور جیجیوں سے رخصت ہو کر اور دوبارہ آنے کا وعدہ کرکے کھگین چلا گیا۔

جاتے جاتے رٹنی کھگین سے بولا: "سچ مچ روبی کچھ نہیں جانتی ہے۔ اس کی ماں اور بھی نکمّی ہے۔ آپ میری بہن سے ملیے۔"

کھگین بولا: "بات تو تمھاری صحیح ہے، لیکن کس طرح تمھاری جیجی سے باتیں کی جائیں۔ ذرا سکھا تو دے۔ ارے بازی مارنے کی بات تو میں بھول ہی گیا۔ یہ لو دو روپے۔"

رٹنی نے روپے جیب کے حوالے کیے اور پھر کہا: "ہم لوگ اسکول میں کس طرح ایک دوسرے سے مل لیتے ہیں۔ جانتے ہیں؟ سمجھیے، کوئی نیا لڑکا آیا۔ اس کے نزدیک جا کر پوچھتے ہیں 'ارے تیرا نام کیا ہے؟' وہ کہتا ہے 'ہاباک'۔ ہم اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر کہتے ہیں: 'تجھ سے ہمارا واسطہ ہو گیا، لے کانچ کی دو گولیاں۔' پھر کسی سے باتیں بند کرنا اور بھی آسان ہے۔ ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر تین بار بولنا ہوتا ہے۔ 'تجھ سے نہیں بولوں گا، نہیں بولوں گا، نہیں بولوں گا'۔ بس۔"

"بڑا سیدھا قانون ہے۔ ہاں تمھاری روبی جیجی سے اس طرح بول سکتا ہوں، کیونکہ وہ مجھ سے بولنے کو تیار ہے۔ لیکن تمھاری جٹنی منگلا دیدی بالکل دوسری قسم کی ہے۔ پیٹھ پر تھپکی مار کر باتیں نہیں کی جا سکتیں۔ اس جیسی عورت کا دل ہزاروں سال تپ کرنے کے بعد ہی پا سکتا ہوں۔ جو بھی ہو، میں تمھارے کہنے کے مطابق کوشش کرتا جاؤں گا۔ لیکن ہزار برس تپ کرنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے۔ میرے ماں باپ میری شادی کرنے کو تیار ہیں۔ انھوں نے لکھ دیا ہے۔ جو پسند ہو، اس سے شادی کر لو۔ لیکن اب زیادہ دیر نہ ہو۔ ماگھ کے مہینے میں ہم لوگ تیرتھ یاترا کو نکلیں گے، اس سے پہلے ہی شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ دیکھوں، اس سے پہلے کچھ کر سکتا ہوں یا نہیں۔ دیکھو رٹنی، تم بڑے نٹ کھٹ ہو۔ کہیں اپنی جیجی کو مجھ سے واسطہ بنانے کے لیے تنگ مت کرنا۔"

"ارے باپ! پھر تو وہ میری اچھی طرح مرمت کر دے گی۔"
"مجھے تو کہیں مار نہ پڑے گی؟"
"نہیں، آپ سے کچھ نہ کہیں گی۔"

گھومنے کے بعد کھگین رٹنی کو اس کے گھر پہنچا کر چلا گیا۔ پھر وعدہ پورا کرنے کے لیے وہ ایک مہینے کے اندر ایک مرتبہ مانک کے یہاں اور تین مرتبہ رٹنی کے یہاں گیا۔ کھگین بڑی دبدا میں پڑ گیا ہے۔ ایک طرف روبی کی ماں اسے بار بار بلوا بھیجتی ہے، ادھر رٹانی بار بار اپنے گھر آنے کو کہتا ہے۔ بچے کی بات ٹالنا مناسب نہیں، چنانچہ کھگین نے رٹانی کے گھر ہی زیادہ آنا جانا شروع کر دیا ہے۔

کچھ دن بعد رٹنی نے پوچھا: "کیوں جیجی سے واسطہ کر لیا؟"

کھگین بولا: "دھیرے رٹنی کمار، ذرا دھیرے، پنڈتوں کا کہنا ہے۔ فاصلہ طے کرنا، پہاڑ پہ چڑھنا اور پل باندھنا دھیرے دھیرے ہونا چاہیے۔ کسی سے واسطہ لگانا بھی ایسا ہی ہے۔ جلد بازی سے سارا معاملہ بگڑ جاتا ہے۔ تمھاری جیجی کا خیال ہے کہ برابر کا مقابلہ برابر ہی سے ہو سکتا ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ تم کسی طرح بھی چھوٹی نہیں ہو۔ دیکھنے میں مجھ سے زیادہ سندر ہو۔ پڑھائی میں مجھ سے آگے ہو۔ تمھارے ناناجی نے تو کہہ دیا ہے کہ تم لکشمی، سرسوتی اور ان پورنا ان تینوں کی اوسط ہو۔ تم کتنا اچھا گاتی ہو اور میرا گلا دبانے سے بھی آواز نہیں نکلتی۔ تم کتنے قسم کی چیزیں بنا سکتی ہو، یہاں تک کہ لنگڑے کا لنگیچا بھی، اور میں ڈبل روٹی کی سلائس تک کاٹنا نہیں جانتا۔ پھر بھی تمھاری جیجی مانتی ہی نہیں۔ خیر، تم چنتا مت کرو رٹنی، سب ٹھیک ہو جائے گا اور کچھ دن ذرا دھیرج رکھو۔"

پانچ دن کے بعد پھر رٹنی نے پوچھا: "کیوں باتیں ہوئیں؟"

کھگین بولا: "ابھی ذرا باقی ہیں۔"

رٹنی نے ناراض ہو کر کہا: "اتنے دنوں میں بھی واسطہ نہیں بنا۔ مجھ سے تو آپ کا ایک منٹ میں میل جول ہو گیا تھا۔ بڑی دیدی کا یہ سچ مچ بڑا انیائے ہے۔ آپ ان سے کہہ دیجیے۔ کہ اگر تین دن میں واسطہ نہ جوڑا تو میں آپ سے نہیں بولوں گا۔"

میرے پیارے رٹنی کمار، دھیرج ایک بڑا گن ہے۔ اگر میں لنکیشور راون ہوتا تو الٹی میٹم دے دیتا۔ لیکن ایسا تو میں نہیں کر سکتا۔ جلد بازی کرنے سے تمہاری دیدی گھبرا جائیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ ناراض ہو کر اپنے کسی کلاس فرینڈ ترن کمار یا کرن کمار سے واسطہ کر لیں۔ تب لاچار ہو کر روبی جیجی کے پاس جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔"

ہاتھ پاؤں ٹیکتے ہوئے رٹنی بولا۔ "خبردار وہاں مت جائیے گا۔ میں کہے دیتا ہوں۔ ٹھیک ہے کچھ اور کوشش کیجیے۔"

تین دن اور گزر جانے کے بعد رٹنی نے سوال کیا۔ "کیا ہوا؟"

کھگین بولا: "اب کچھ امید بندھی ہے۔ تمہاری جیجی سے میں نے کہہ دیا ہے کہ روپے کے لیے اتنی چنتا نہ کرو۔ وہ تو پتاجی کا روپیہ ہے۔ میرے ہاتھ آئے گا تو تین دن میں پھونک دوں گا۔ اگر یوں نہیں مانیں تو ہسپتال ہیں، اسکول کالج ہیں، رام کرشن مشن ہے، مہاراجاؤں کے طرح طرح کے اکھاڑے ہیں، جہاں بھی کہو گی دے دوں گا۔ اس کے بعد جیسے کبوتر کبوتری ایک اونچے درخت پہ گھونسلہ بنا کر رہتے ہیں دونوں خالی ہاتھ زندگی بسر کریں گے۔"

لیکن موٹر گاڑی تو چاہیئے ہی۔"

"ہاں، چاہیئے تو ضرور۔ اسی میں بیٹھ کر تو بھیک مانگنے نکلیں گے۔ چاول، آٹا جو کچھ ملے گا اسی سے تمہاری جیجی کھانا بنائیں گی۔ ہاں، دیکھو ہماری جھونپڑی کے پاس تین منزلہ دھرم شالہ ہوگی۔ اس میں تم اور مانک، کیلئے، ٹلٹے اور ہابُل وغیرہ تمہارے دوست کبھی کبھی آکر ٹھہرا کریں گے ان کے سامنے کھیل کا ایک لمبا چوڑا میدان ہوگا۔"

"اوہو، کتنا مزا آئے گا، دیر مت کیجیے۔ جھٹ سے واسطہ کر لیجیے!"

دیر نہیں ہوئی۔ تین دن کے بعد مانک نے اسکول میں پوچھا: ارے رٹنی، کھگین بابو تیرے یہاں ہر روز آتے ہیں؟"

رٹنی نے فخر سے جواب دیا: "آئیں گے ہی، بڑی جیجی سے واسطہ ہو گیا ہے۔"

لیکن اس اطلاع سے رٹنی کے گھر والوں اور مانک کے گھر والوں میں ان بن ہو گئی۔ روبی کی ماں کیلئے کی پھوپھی سے بولی۔ "اف جٹنی کیسی بے حیا لڑکی ہے۔ جان نہیں، پہچان نہیں، لفنگے چھوکرے کھگین سے واسطہ کر لیا۔"

کیلئے کی پھوپھی نے کہا۔ "بھاڑ میں جائے، بے شرم لڑکی کہیں کی۔"

جٹنی کی شادی میں مانک کے گھر سے کوئی نہیں آیا۔ لیکن کیلئے کے گھر سے سب آئے، یہاں تک کہ اس کی پھوپھی بھی۔ وہ کپڑے کے اندر ایک تھیلی چھپا کر لائی تھی۔ پھوپھی تھوڑا یا کر ہی مطمئن تھی۔ بھنڈار میں سے صرف بیس تیس سندیش اور جٹنی کے تحفوں میں سے کہانیوں کی دو دلچسپ کتابیں اس نے تھیلے میں رکھ لی تھیں۔

شفا گوالیاری

غزل

عجب کیا تو جو حدِ زندگی سے دور ہے اب بھی
ترا احساس دردِ آدمی سے دور ہے اب بھی

ہر اک ذرّے پہ سجدہ تیرا مستحسن سہی لیکن
بایں عرفاں مقامِ بندگی سے دور ہے اب بھی

اُبھر آتے ہیں جس سے بے محابا اشک آنکھوں میں
ارے او ہنسنے والے اُس ہنسی سے دور ہے اب بھی

خرد کے گیسوئے پیچاں کو جو سلجھائے رکھتی ہے
محبّت کی تو اس دیوانگی سے دُور ہے اب بھی

رسائی بزمِ مہر و ماہ تک تجھ کو مبارک ہو
مگر اے دوست بزمِ آدمی سے دُور ہے اب بھی

فقط منظروں کی تابانی سے اتنا مطمئن کیوں ہے
ترا دل سوزِ غم کی روشنی سے دور ہے اب بھی

فرازِ دار سے او مسکرا کر دیکھنے والے
یہ راہِ زندگی ہے ازندگی سے دُور ہے اب بھی

بہ وصفِ سعیٔ پیہم آہ یہ محرومیٔ انساں
الم سے پاس ہے اب بھی خوشی سے دور ہے اب بھی

دفاع اور



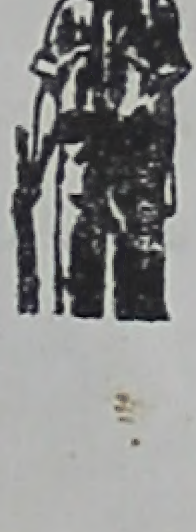
ترقی کا کام



ساتھ ساتھ چلتا ہے

دفاعی کوششوں میں براہِ راست شریک ہونے کے لئے فولاد کی صنعت نے اپنی پیداوار بڑھادی ہے اور رولنگ ملوں کے پیداواری پروگراموں میں ضروری ترمیم و تبدیلی کردی گئی ہے۔ مسلح افواج کے کام میں آنے والی موٹر گاڑیوں کا معیار مقرر کر دیا گیا ہے۔ انجینیری صنعت کی صلاحیت بھی بڑھادی گئی ہے۔ برقی پلانٹ چالو کرنے کا کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ ہنگامی صورت میں استعمال کے لئے جنریٹر سیٹوں کا ایک ذخیرہ بنایا جا رہا ہے۔ ریلوے ورکشاپوں سے زیادہ تعداد میں مال ڈبے بن کر نکل رہے ہیں۔ اہم دوسری سڑکوں کو بہتر اور جدید بنایا جا رہا ہے۔

ان نئی ترجیحات سے ملک کے دفاعی نظام کی مضبوط بنیاد تیار ہو رہی ہے۔ اس مہم کو کامیاب بنانے کے لئے جی جان سے ہاتھ بٹایئے۔



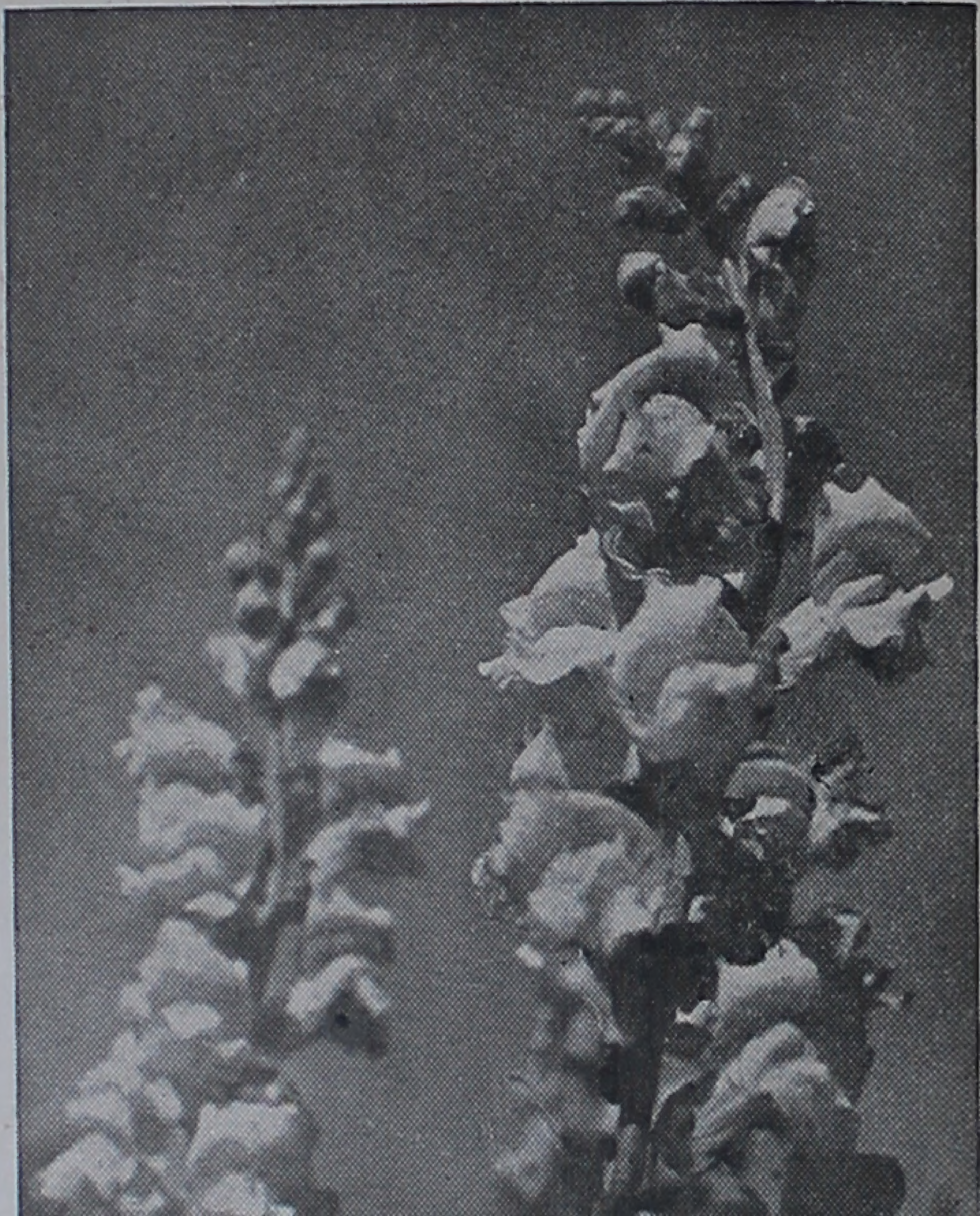
پلان کو
کامیاب
بنایئے

بھارت کے دفاع کو مضبوط کیجئے

BA 63/444



دو پھول





Edited & published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
Printed by Union Printers Co-op. Industrial Society Ltd., Karol Bagh, New Delhi-5

Regd. No. D-50